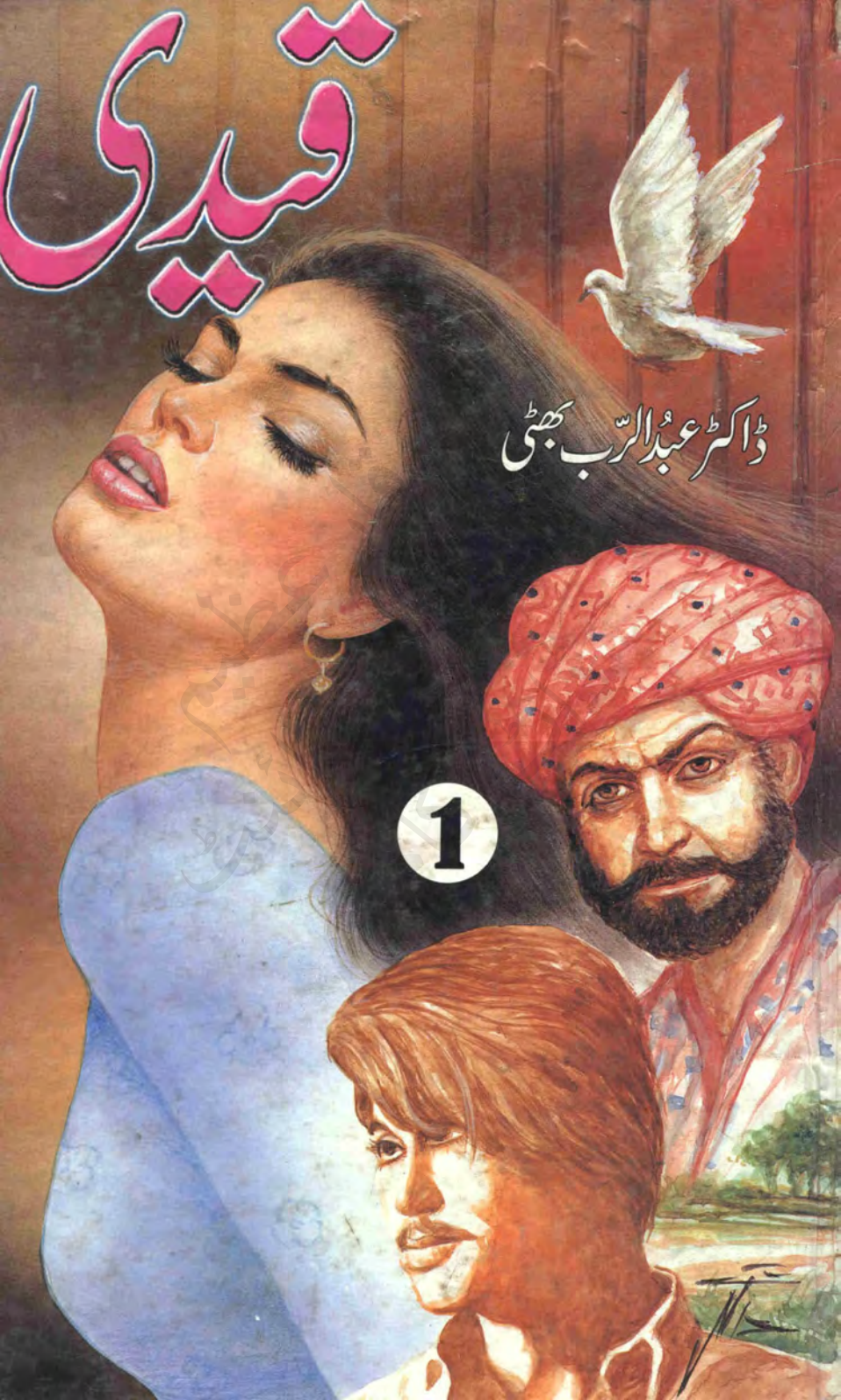


# قیدی

ڈاکٹر عبدالرّب بھٹی

1



اس عورت کے انداز میں آج بھی ویسا ہی والہانہ پن تھا۔ وہی بے تابانہ شدت ..... اور ایک زخمی سی بے نام تڑپ تھی، جو میں آج سے نہیں بلکہ اپنے بچپن سے ہی محسوس کرتا اور دیکھتا آیا تھا۔ یہ عورت کون تھی؟ اور اس کے والہانہ پن میں، اس کی بے تابانہ شدت اور تڑپ میں میرے لئے کوٹ کوٹ کر متا جیسی محبت کیوں بھری رہتی تھی؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔

جب میں چھوٹا تھا تو ماموں حیدر گل مجھے اپنی گود میں یہاں لایا کرتے تھے۔ اس وقت میں بالکل معصوم بچہ تھا مگر آج جبکہ میں گیارہ بارہ سال کا ہونے کو تھا تو مجھے اب بھی دھندلا دھندلا سایا د تھا کہ میں اس عورت کا نگہسار چہرہ اپنے بچپن سے ہی دیکھتا آ رہا تھا۔ اسی طرح ..... آنسوؤں سے تر، بجھا ہوا، غمگین چہرہ اور جسے میں ہوش سنبھالتے ہی اتنی سلاخوں کے پیچھے ہی دیکھتا آیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں اپنے ماموں حیدر گل کی انگلی پکڑ کر یہاں آنے لگا تو میرے معصوم ذہن میں اس دہکی دہکی عورت کے متعلق کئی سوال ابھرتے تھے مگر وہ معصومانہ سوال میرے ننھے ذہن تک ہی محدود رہتے تھے۔ ابھی شاید میں ان کا اظہار کرنے کی عمر تک نہیں پہنچا تھا۔ لیکن ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہی سوال میرے معصوم ذہن میں حیرت بن کر ابھرتے اور پھر جلد ہی محو بھی ہو جاتے۔ کیونکہ میرا اس عورت کے ساتھ ملاقات کا عرصہ بہت محدود رہتا تھا۔ اس کے بعد ماموں حیدر گل اس عجیب محظن زدہ، خاموش، بے کیف اور اُداس ماحول سے دوبارہ واپس گھر لے آتے تھے۔

اس عمر میں ماموں حیدر گل سے میں نے اس سیلن زدہ ماحول سے متعلق جو پہلا سوال پوچھا تھا، وہ یہ تھا۔

”ماموں! ..... یہ کون سی جگہ ہے؟“

ماموں نے مجھے اس سوال کا جتنا مختصر جواب دیا تھا، وہ اتنا ہی مشکل تھا، جو میں اس وقت نہیں سمجھ سکا تھا۔ ہاں البتہ اب مجھے اس عجیب و غریب جگہ پر آنے سے وحشت کی ضرور ہونے لگی تھی۔ اس جگہ ایک جیسا ہی ماحول ..... جیسے وقت کو موت آگئی ہو۔

کچی بات تو یہ تھی کہ مجھے اب اس اجنبی عورت سے بھی حد درجہ بیزاری اور کوفت ہونے لگی تھی اور اس بیزاری نے از خود اس فطری سوال کو جنم دیا تھا جو میں نے چڑ کر ماموں سے پوچھا تھا۔

”ماموں! ..... یہ عورت کون ہے؟“

”یہ عورت تمہاری ماں ہے۔“ حسب عادت ماموں نے مجھے مختصر جواب دیا۔

”ماں ..... وہ کیا ہوتی ہے؟“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔ ماموں نے ایک سسکاری بھری اور گھماں لہجے میں بولے۔

”ماں ..... اس کو کہتے ہیں جس نے تمہیں جنم دیا۔“

”مگر ماموں! ماسٹر صاحب تو کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ میاں نے پیدا کیا ہے؟“  
 ”ہاں..... تمہارے ماسٹر صاحب صحیح کہتے ہیں..... ہمیں اللہ میاں نے ہی پیدا کیا ہے ہم سب کو..... مگر ایک ماں کے ذریعے.....“

تب اچانک مجھے ماں کے عنوان سے کچھ یاد آیا اور میں چمک کر بولا۔

”اچھا..... ماموں! جیسے عبداللہ کی ماں ہے اور..... اور جیسے نومی اور عالی کی ماں ہے؟“  
 ”ہاں بیٹا! یہی ماں ہوتی ہے۔“

”لیکن ماموں! عبداللہ، نومی اور عالی کی مائیں تو ہر وقت ان کے پاس، ان کے ساتھ رہتی ہیں، ان کے گھروں میں رہتی ہیں، انہیں نہلاتی ہیں، انہیں کپڑے پہناتی ہیں، ان کے بالوں میں کنگھا کرتی ہیں، انہیں اپنے ساتھ سلاتی ہیں اور روٹی بھی..... اپنے ساتھ.....“

”بس..... بس کر میرا بچہ! بس کر۔“ ماموں میرے سوالات کی بوچھاڑ سے یکدم گھبرا جاتے۔ ان کا گلا شدت جذبات سے رندھ جاتا اور میں سہم کر خاموش ہو رہتا۔

پھر وقت گزرنے لگا تو مجھے ماموں سے تو نہیں البتہ گاؤں میں اپنے ساتھ کھیلتے کودتے بچوں سے رشتہ رشتہ پتہ چلنے لگا کہ میری ماں جس سلاخوں والی جگہ میں رہتی ہے، اسے جیل کہا جاتا ہے۔

”ماموں!..... جیل کیا ہوتی ہے؟“ ماموں خاموش رہتے تو میں اپنے ہم جولیوں سے سنا ہوا جواب دہرا کر پوچھتا۔ ”ماموں! جیل ایک گندی جگہ ہوتی ہے نا، جہاں گندے اور برے لوگوں کو بند کر دیا جاتا ہے..... تو کیا میری ماں بھی گندی ہے؟“

”نہیں بیٹا! تمہاری ماں گندی نہیں ہے۔ گندی نہیں ہے وہ۔ اسے گندا کہنے والے خود گندے ہیں۔“ ماموں غم سے چور لہجے میں بولتے۔

”تو پھر..... تو پھر..... عبداللہ اور نومی مجھ سے یہ کیوں کہتے ہیں کہ تمہاری ماں گندی ہے اسی لئے تو اسے جیل میں بند کر دیا ہے۔“

”جھوٹ بولتے ہیں وہ..... تم ان کی باتیں نہیں سنا کرو۔“

ماموں کی طرف سے میں بالکل مایوس ہو گیا۔ وہ میرے کسی بھی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے پائے تھے۔ پھر میں نے ہی چپ سا ادھی لٹھی اور میری زندگی کا یہی وہ دور تھا جب میری نفسیات، میرا دل میرا ذہن اور تمام احساسات شکست و ریخت کا شکار ہونے لگے۔ میں حد درجہ حساس ہوتا چلا گیا اور چپ چاپ سارے لگا۔ یہاں تک کہ میں اپنے خول میں بند ہو کر رہ گیا۔

ماموں حیدر گل مجھے تقریباً تیسرے چوتھے روز جیل میں اس عورت سے ملوانے کے لئے لے جاتے رہتے تھے۔ ایک تنگ و تاریک، ٹھنڈی آمیز اور ٹنگی اینٹوں والے کمرے میں مجھے اور ماموں کو اس عورت سے ملوایا جاتا تھا۔ دو پولیس والے میری ماں کو لے کر آتے تھے۔ اب میں اس کو ایک بے نام سی حیرت سے نہیں بلکہ بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا۔ وہ ایک گورے چنے رنگ اور چمکے نقوش والی بڑی دینگ عورت نظر آتی تھی۔ قد بھی اس کا نکلتا ہوا تھا۔ بال بھی لمبے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ مجھ سے تو وہ متا بھرے لہجے میں بولتی تھی مگر میں نے اکثر دیکھا اور محسوس کیا کہ جب وہ ماموں حیدر گل سے بات کرتی تو اس کے لہجے کی متا بھری گرمی جلتی سکتی آگ میں بدل جایا کرتی تھی۔ بعض اوقات تو وہ ماموں حیدر گل سے اس قدر غضب ناک لہجے میں عجیب و غریب گفتگو کرتی تھی کہ خود میں سہم جایا کرتا تھا۔

”گل!..... میرا نادار اب بڑا ہو گیا ہے..... اسے حقیقت بتا دو تو اچھا ہے۔“ ایک روز اس عورت

نے بڑے پیار سے میرے سر کے بال اپنی نرم انگلیوں سے سہلاتے ہوئے ماموں سے کہا۔  
 ”ابھی اس کا ذہن کچا ہے شینہ!..... یہ بچہ ہے ابھی۔“ ماموں ہولے سے میری طرف ایک نظر ڈال کر اس عورت سے کہتے۔ مجھے اس عورت کا نام ذہن نشین ہو گیا۔

”نہیں گل!.....“ وہ عورت ماموں کو دیکھ کر تیز لہجے میں کہتی۔ ”یہی وہ عمر ہوتی ہے جب دھیرے دھیرے کوئی بات اندر پروان چڑھتی ہے اور بعد میں ایک عزم مصمم کا تار و درخت اُگاتی ہے۔ ورنہ جب ادھر ادھر سے اس کو حقیقت کا علم ہو گا تو ہو سکتا ہے اس کا دل میری طرف سے خراب ہو جائے۔“  
 اس عورت کی بات پر ایک بار پھر میرے چھوٹے سے ذہن میں سوالوں کے تھوہر اُگ آئے اور میں حیرت سے سوچتا۔

’آخر وہ کیا حقیقت تھی، جو اس عورت کی طرف سے میرا دل خراب کرنے کا باعث بنتی؟‘  
 اس طرح مجھے مزید کرید لگ گئی۔ میں نے اب ماموں سے سوالات پوچھنا ترک کر دیا تھا مگر یہ سن کر مجھے مزید شل گئی تھی کہ مجھے ہم جولیوں سے اپنے سوالات کے جوابات مل سکتے تھے۔ ماموں خاموش رہے۔ اس کے بعد وہ مجھے واپس گھر لے آئے۔

ماں کے خلا کے ساتھ ساتھ میرے ننھے دل و دماغ میں باپ سے متعلق بھی سوال ابھرتا کہ میرا باپ کون تھا؟ کہاں تھا؟ مگر ماموں حیدر گل نے تو حسب دستور چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا تھا۔ وہ شاید میرے بڑے ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ میں خود ہی اس عورت ”شینہ“ سے پوچھ لوں۔ آخر وہ کون تھی؟ اگر وہ میری ماں تھی تو میرے ساتھ کیوں نہیں رہتی؟ یہاں جیل کے سینکڑوں زوہ ماحول میں آہنی سلاخوں کے پیچھے کیوں قید تھی؟..... اور وہ کیا حقیقت تھی، جواب تک مجھ سے چھپائی جا رہی تھی۔ مگر باوجود کوشش کے میں اس عورت سے کچھ بھی نہ پوچھ سکا۔

\*\*\*

ماموں حیدر گل نے میری پرورش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ انہوں نے مجھے شہر کے ایک اچھے اسکول میں داخل کروا رکھا تھا۔ میں ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ میرا اسکول ہمارے گاؤں سے تقریباً آٹھ، دس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ فصل چاچو جو ہمارا پرانا خدمت گار تھا، وہ مجھے روزانہ ایک سفید رنگ کی جین میں اسکول لے جایا کرتا تھا اور ٹھیک دو بجے چھٹی کے وقت دوبارہ لینے آ جاتا۔

مغز..... چاچا فضل کی بیوی تھی اور میں نے شروع ہی سے خود کو اس کی گود میں پایا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں پہلے پہل اسے ہی اپنی ماں سمجھتا تھا۔ وہ ایک اچھڑ عمر کی خاتون تھی۔ میری ماں سے بھی بڑی عمر کی تھی۔ وہ مجھ سے محبت بھی بہت کرتی تھی۔ فضل چاچا بھی مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ میں نے باری باری ان دونوں سے بھی اپنی ماں اور اپنے باپ کے متعلق کچھ پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر جواب نہ دار..... وہ مجھے بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا کرتے تھے۔ یقیناً ماموں نے ہی انہیں مجھے کچھ بتانے سے منع کر رکھا تھا۔

ہمارا گاؤں ڈونگا گلی اور تھیا گلی کے وسط میں ایک خوب صورت اور سرسبز وادی میں تھا جس کے چار اطراف چڑ اور صنوبر کے لائے لائے درختوں کا گھٹا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ زرد آلو، ناشپاتی اور آلوچے کے پیڑوں کا سلسلہ بھی دور تک چلا جاتا تھا۔ ان کے عقب میں دور سر ہنگل پہاڑی چوٹیاں، پُر غرور شہزادوں کی طرح برف کا تاج سجائے نظر آتیں۔ پہاڑی مقام ہونے کی وجہ سے یہاں موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ بھی لگا رہتا تھا۔ عموماً یہاں دسمبر میں برف باری ہوتی تھی۔ گنگناٹی آبشاریں

ماموں کو شاید مجھ سے ایسی بات کی توقع نہ تھی۔  
 ”کیوں بیٹا؟..... کیا تم اپنی ماں سے ملنے نہیں جاؤ گے؟“ پہلی بار ماموں نے جرح کی۔  
 ”نہیں ماموں! وہ میری ماں نہیں ہے۔“ میں نے پاٹ لہجے میں کہا۔  
 ماموں نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے ان کے چہرے کی طرف  
 دیکھا مگر ان کا چہرہ بالکل پاٹ تھا۔ اس کے بعد انہوں نے جب خاموشی سے واپس موڑ لی۔  
 میرا خیال تھا کہ ماموں اس بارے میں گھر جا کر مجھ سے خوب جرح کریں گے۔ مگر وہ مجھ سے کچھ  
 بھی نہ بولے۔ مجھے حیرت تو ہوئی مگر میں بھی چپ رہا۔

پھر یوں ہوتا رہا کہ ماموں مجھے ساتھ لے جانے کو کہتے تو میں انکار کر دیتا اور وہ خاموشی سے خود ہی  
 چلے جاتے۔

ایک روز وہ ماں سے مل کر شام گئے لوٹے۔ وادی میں اندھیرا اترنے لگے تھے۔ ماحول پر سناٹا  
 چھایا ہوا تھا۔ میں اپنے کمرے میں موجود تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ آواز پہچان کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”جی ماموں!.....!“ دروازہ کھلا اور ماموں حیدر گل اندر داخل ہوئے۔

ہمیشہ کی طرح ان کے چہرے پر گہری متانت طاری تھی۔ مگر آج ان کا چہرہ قدرے مختلف تاثرات کی  
 غمازی کر رہا تھا۔ ان کے چہرے پر دکھ کے آثار تھے۔ وہ خاموشی کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں  
 بھی ان کے سامنے بچھے بیٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ چند ثانیے میرے چہرے کو سکتے رہے، اس کے بعد بولے۔

”نادر بیٹے! تم اپنی ماں سے اب کیوں نہیں ملنا چاہتے؟“

”ماموں! میرے اس سوال کا جواب آپ کے پاس ہی ہے۔“ میں نے اپنی ذہنی وسعت کے اعتبار  
 سے کہا۔

وہ خاموش رہے جیسے مزید وضاحت چاہتے ہوں۔ میں نے دوبارہ ذرا واضح لفظوں میں کہا۔  
 ”ماموں! کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے کہ میں اپنی ماں کے متعلق آپ سے جان سکوں؟ وہ جیل میں  
 کیوں ہے؟..... میری ماں جیل میں آخر کون سی سزا بھگت رہی ہے؟ اور..... اور مزید یہ کہ میرا  
 باپ کون ہے؟ وہ کہاں ہے؟ مجھے جب تک اس بارے میں تسلی بخش جوابات نہیں مل جاتے، میں اب  
 اس عورت سے ملنے نہیں جاؤں گا۔“

میرا بیٹا پن اب پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب ماموں مجبور ہو کر مجھے ان سارے  
 سوالوں کے جوابات ضرور دیں گے۔ مگر ہمیشہ کی طرح ان کے چہرے پر برف جمی رہی۔ وہ نہیں پھسل  
 تھی۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ میں اپنے ہونٹ کاٹھا رہ گیا۔ میرے اندر بھی اب  
 اس راکھ کو کریدنے کی ایک ضدی پیدا ہونے لگی تھی۔ ایسی راکھ جس کے نیچے مجھے کسی اندر ہی اندر سلگتی  
 ہوئی چنگاری کی پیش سی محسوس ہونے لگی تھی۔

اور میں اس دہلی ہوئی چنگاری کو بھڑکانا چاہتا تھا۔ میں اس کی تپش کا اندازہ کرنا چاہتا تھا اور جاننا چاہتا  
 تھا کہ آخر یہ کون سی آگ کی پیدا کردہ خاکستر راکھ تھی؟ یہ جاننا میرا حق تھا اور جب تک مجھے میرا یہ حق  
 نہیں مل جاتا، میں اس عورت کو اپنی ماں تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔

\*\*\*

کئی موسم بدلے، پہاڑوں پر برف چھلکی رہی۔ درختوں نے نئے پیر بن اوڑھے مگر میرے اندر کا خلا

جلتنگ بجاتے جھرنے اس وادی کا قدرتی حسن دوبالا کئے دیتے تھے۔ بارشوں کے بعد تو یہ حسن مزید  
 نکھر جاتا۔ جنگلی گلاب، خوشنما پھول سب مہک اٹھتے۔ کشمیری وادیوں سے آنے والے ہمالیائی سنہو لے  
 (سنہرے مرغ) اپنے نیلے، سنہرے اور سرخ پتکے نما پر پھیلائے ترائیوں میں اپنی کلغیوں والے خوبصورت  
 سر اٹھائے سرمستی کے عالم میں گنگناتے، اڑتے رہتے تھے۔ پھر جب سنہرا سورج پہاڑیوں کی سر بفلک  
 چوٹیوں پر آن نکلتا تو جیسے ہر سو تاریکی، نیلے، پیلے، سرخ اور جامنی رنگوں کی خوب صورت قوس قزح بکھرنے  
 لگتی۔ غرض فطری حسن سے مالا مال ہمارا گاؤں قدرت کی صنائی کا ایک جیتا جاگتا شاہکار تھا۔

ہمارا پختہ اینٹوں والا مکان، گاؤں کی آبادی سے ذرا ہٹ کر خاصی بلندی پر واقع تھا۔ یہاں سے یہ  
 سب نظارے اور بھی دلفریب نظر آتے تھے۔ ہمارا قمری اینٹوں والا مکان بہت کشادہ اور خوبصورت تھا۔  
 ایک باغیچہ بھی تھا جس میں چنبیلی کے پودے اور بوگن ویلیا کی خوش رنگ پھولوں والی بیللیں بھی لگی ہوئی  
 تھیں۔ بید مشک اور شاہ بلوط کے بیڑ بھی تھے۔ دیواروں سے ملحقہ آبیوری کی بیللیں بھی جڑی ہوئی محسوس  
 ہوتی تھیں۔ ہمارے پہاڑی مکان کے سامنے ذرا دور ڈھلوان چھتوں والے ریٹ ہاؤس کی جھونپڑی نما  
 خوبصورت عمارتیں چیز کے درختوں کے عقب سے جھلکتی صاف نظر آتی تھیں۔

ماموں حیدر گل کے پاس بارہ بور کی دو عدد بندوقیں بھی تھیں۔ وہ شکار کے بھی رسیا تھے۔ ان کے  
 ساتھ کبھی کبھار میں بھی چلا جاتا تھا۔ اس موقع پر فضل چاچا ہمیشہ ان کے ہمراہ ہوتے۔ ماموں ایک  
 بندوق ان کے حوالے بھی کر دیتے۔ چہرے والے کار تو سوں کے علاوہ سکے کی گولیاں بھی رکھتے تھے۔ ان  
 کی بارہ بور کی ڈبل بیرل بندوق کی ایک نال میں چھروں والا کار تو س ڈلتا تھا جبکہ دوسری نال میں سکے  
 والی گولی۔ یہ اس احتیاط کے پیش نظر ڈالی جاتی تھی کہ کبھی کبھار چھوٹے شکار جانوروں اور پرندوں کے  
 علاوہ بھیڑیے، بچھ اور تیندوے جیسے خونخوار جانوروں سے بھی پالا پڑ جایا کرتا تھا۔ ماموں حیدر گل عموماً  
 جنگلی خرگوشوں، بکروں (آئی ٹیکس) اور سنہرے مرغوں کا شکار کرتے تھے۔ سنہرے مرغ (سنہو لے) کا  
 گوشت کم از کم تین کلو کے قریب نکلتا تھا۔ ماموں بڑی احتیاط سے ان کی کھالیں اتار کر چاچا فضل کو دے  
 دیتے۔ وہ انہیں مری یا ایبٹ آباد لے جا کر کار گیر کو دے دیتے جو ان میں مصالحہ لگا کر جس بھر دیتا اور  
 دوبارہ انہیں ناگوں پر کھڑا کر دیتا۔ بعد میں شوقین اسے کروں کے کارنس پر سجاتے۔

میرے ماموں لکڑی کی ایک بہت بڑی نال کے مالک تھے۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی مگر مجھے  
 اولاد کی طرح پالا تھا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اگر میرا باپ ہوتا تو وہ بھی ایسی ہی محبت کرتا۔

\*\*\*

ایک روز جب حسب معمول ماموں حیدر گل مجھے جیب میں بٹھا کر شہر لائے۔ میں نے تھوڑی بہت  
 شاپنگ کی۔ وہاں سے انہوں نے جیب گاؤں کی طرف موڑنے کی بجائے جب جیل جانے والی سڑک پر  
 ڈالی تو میں نے ماموں حیدر گل سے جیب روکنے کو کہا۔

وہ سمجھے شاید میں نے پیشاب وغیرہ کرنے کے لئے ایسا کہا تھا۔ جب انہوں نے سڑک کے کنارے  
 چیز کے صف بستہ ایستادہ درختوں کی چھاؤں میں جیب روکی تو میں نے پوچھا۔

”ماموں! آپ جیل جا رہے ہیں؟“

انہیں میرے سوال پر حیرت تو ہوئی تاہم انہوں نے حسب عادت اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مختصراً  
 کہا۔ ”ہاں۔“

”مگر میں اب وہاں نہیں جانا چاہتا۔“

ہاس میں نے جیت لیا۔ سروں شروع کی۔ اور پھر تو جیسے اس نازک اندام دو شیزہ نے ایسے ایسے شائش کھیلے کہ مجھے دانتوں تلے پسینہ آ گیا۔ اب میں اس کے ٹلوٹی حسن کے ٹرائس سے نکل آیا اور جم کر کھیلنے لگا۔ جب اس نے مجھے جم کر کھیلنے دیکھا تو میری حکمت عملی کو فوراً سمجھ گئی کہ میں پوائنٹ لینے کے پکڑوں میں نہیں تھا۔ اب اس نے پوائنٹ حاصل کرنے کی اپنی جستجو کو میری ساسھی کی طرف موڑا اور اگلے اوڈن میں اس نے اپنے ساسھی کو میرے مقابل چھوڑ کر تختی سے یہ ہدایت کر دی کہ وہ میری دفاعی چال کی نہ تک کھیلے اور خود اس نے پوائنٹ حاصل کرنے کے لئے تباہ توڑ میری ساسھی کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ وہ بے جاری دو ایک حملوں میں ہی چاروں شانے جت ہو گئی اور یوں اس نے اپنے پوائنٹ نہ صرف برابر کر لئے بلکہ اوپر تلے پورے چار اضافی پوائنٹ لے کر ہمیں بری طرح شکست سے دوچار کر دیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بے مثال حسن کے ساتھ ساتھ ایک زرخیز ذہن کی بھی مالک تھی۔

آخری راؤنڈ شروع ہوا تو میں نے پوری ذمہ داری کے ساتھ کھیلنا شروع کیا اور اس کی چال کو کور کرتے ہوئے اس پر ہی الٹ دیا۔ یعنی اب وہ جس طرح میری نیشیا کزور ساسھی سے پوائنٹ لینے کی کوشش کر رہی تھی، اسی طرح میں نے پوائنٹ کے لئے اس کے ساسھی کے خلاف تباہ توڑ شائش کھیلنے شروع کر دیئے۔ ادھر جب اس طرح دار اپرانے یہ دیکھا کہ میں اب دفاعی کھیل کو ترک کر کے باقاعدہ حملوں پر اتر آیا ہوں تو وہ میرے مقابل آ گئی۔

اب ہمارے درمیان کانٹے کا نفسی خیز مقابلہ شروع ہو گیا۔ میری نظریں اس کے شہابی رنگ والے رخ روشن کے بجائے بال اور نیش پر تھیں۔

بالا آخر بڑی مشکلوں سے ہمیں شخص ایک پوائنٹ کی برتری حاصل ہوئی اور یوں ہم یہ پیچ بڑے سخت مقابلے کے بعد جیت گئے۔ میں پیچ تو جیت گیا تھا مگر اپنا دل ہار بیٹھا۔ اس نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ مجھے جیت کی مبارک باد دیتے ہوئے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا روٹی جیسا نرم ہاتھ تھاتے ہی میرے اندر تہہ وبالا ہونے لگا۔

”بہت اچھا کھیلے ہیں آپ۔“ اس نے آہستگی سے ہاتھ واپس کھینچا۔

”آپ نے بھی خوب شائش کھیلے ہیں۔“ محض ایک پوائنٹ کی برتری کو میں جیت نہیں سمجھتا۔ یہ بہت کم لیڈ ہے۔“ میں نے اس کی سیاہ جمیل جیسی گہری آنکھوں میں گویا ڈوب کر ابھرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔

”نہیں..... فتح بہر حال فتح ہے۔ آپ جیت چکے ہیں۔ اور میں ہار چکی ہوں۔“

اس کی آواز ایسے تھی جیسے در کہیں مرغزاروں میں گولل کوک رہی ہو۔

”ہاں تو میری ہوئی ہے۔“ میں نے کھوئے کھوئے گہرے لہجے میں کہا۔

”جی.....؟“ اس کے چوکنے کی ادا بھی کیا تھی۔ دل بے چین کو گر ماتی ہوئی ادا۔

”آں..... ہاں، پپ..... پپ..... میں کیا کہہ گیا۔“ میں جھنجھپ کر بولا۔ میں نے اس کے گداز ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ کو کھیلنے ہوئے دیکھا اور پھر وہ اپنی اسپورٹس کٹ کندھے پر ڈالے چلی گئی۔



مجھے اس اہرا کا نام عینہ معلوم ہوا تھا۔ وہ واقعی ایک خوب صورت اور جگمگاتا ہوا عینہ تھی۔ ایسا انمول عینہ جس کا کوئی دوسرا نہ تھا۔

یہ نہ ہو سکا بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ اس قدر وسیع ہوتا چلا گیا کہ میں اپنے آپ میں ہی گم رہنے لگا اس طرح زندگی کے مزید کئی سال بیت گئے اور میں ایک کڑیل جون کے روپ میں ابھرا۔ سرخ و سپر رنگت، دراز قد، چوڑے شانے، وجہ صورت۔ دل میں نئے نئے جہان کھوجنے کی تمنا، والہانہ جذبوں، ترنگ۔ مگر گاؤں کے دیگر نوجوانوں کے برعکس میری آنکھیں نہ صرف خوف سے عاری تھیں بلکہ ان میں ہر سے ایک ادا سی ہلکورے لیتی رہتی۔ ایک سوالیہ نشان تھا جو پھانس کی صورت انک کر رہ گیا تھا۔ مگر خواب دیکھنے والا نوجوان نہ تھا۔ میں حقیقت پسند تھا۔

میشک کرنے کے بعد ماموں نے مجھے پنڈی کے ایک گورنمنٹ ڈگری کالج میں داخل کروا دیا تھا وہیں میں ہاسٹل میں رہنے لگا۔ میرا ایک روم میٹ جو میرا ہم عمر تھا، میرا گہرا دوست بن گیا۔ اس کا نام کبیر احمد تھا۔

وہ ایک سرکاری ٹھیکے دار، نظر حیات کا بیٹا تھا۔ کبیر احمد کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی۔ وہ آٹھویں میں پڑھتی تھی۔ کبیر احمد میرے برعکس ذرا لالہالی طبیعت کا مالک تھا۔ میں جتنا سنجیدہ اور خاموش خاموش رہتا تھا، وہ اتنا ہی چلبلا اور شوخ و شنگ تھا۔ پھر بھی ہمارے درمیان کوئی ایسی قدر مشترک تھی جو ہمیں دوستی کے دور میں باندھے ہوئے تھی۔ میری طرح وہ بھی خور و دو نوجوان تھا۔

ہم دونوں ابھی ایف۔ ایس۔ سی کے پہلے سال میں تھے کہ ان دنوں کالج میں سالانہ اسپورٹس دیکھ کا انعقاد کیا گیا اور ایک ہفتہ پہلے ہی گراؤنڈ میں مختلف ٹولیوں نے مختلف کھیلوں میں حصہ لینے کے لئے ریسرسل شروع کر دی۔ ہمارے کالج میں نیپل ٹینس اور اسکواش کے لئے جتنا زہم بھی تھا۔ مجھے نیپل ٹینس کا شوق تھا اس لئے میں نے نیپل ٹینس میں اپنا نام درج کروا لیا تھا۔ جبکہ کبیر احمد نے اسکواش کا انتخاب کیا، ہم اپنی پریکٹس عمل کر چکے تھے۔ اگلے ہفتے کے پہلے دن سے باقاعدہ میچوں کا انعقاد شروع ہو گیا۔ ان میچز میں دیگر کالجز اور یونیورسٹیوں کی ٹیموں نے بھی حصہ لیا۔

ہمارے پول کے ابتدائی دو میچ سینٹ جانز اور سینٹر کیمبرج والوں سے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہم نے انہی سے اگلے میچ کھیلے اور پے در پے شکست سے دوچار کر کے نہ صرف اپنے پوائنٹ برابر کر لئے بلکہ ہم نے دو پوائنٹ فائن آؤٹ کروا ڈالے۔ اب میری حکمت عملی انہی اضافی پوائنٹس کو برقرار رکھنے کی حد تک تھی اور اسی لئے ہماری ٹیم نے دفاعی کھیل کھیلنے رہنے کو آخر تک ترجیح دی۔ آخری یا فائنل میچ میں ہماری مقابل ٹیم میں لڑکے کے علاوہ جولا کی شامل تھی اس کی عمر بمشکل اٹھارہ سال ہوگی۔ بہت طرما دار، حسین اور پرنکش ہونے کے ساتھ ساتھ انٹرا ماڈرن اور شوخ و شنگ دکھائی دے رہی تھی۔ صاف ملائم جلد، صنوبر کے درخت کی طرح دراز قد، جسم بھی متناسب اور گداز تھا۔ بال شہد رنگ کے بوائے کٹ تھے۔ نکلا ہونٹ بہت ہی گداز تھا مگر اس کے حسن دل آرا اور بے داغ میں جو شے سب سے زیادہ پرنکش تھی وہ اس کی بڑی بڑی سرگیں آنکھیں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک گہرا نشہ ہلکورے لیتا محسوس ہوتا تھا اور بے اختیار ان میں ڈوب کر کھو جانے کو دل کرتا۔

”واہ..... واہ.....“ میری نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں اور دل بے اختیار نے اسے داد دے ڈالی۔ وہ بہت بولڈ اور انٹرا ماڈرن نظر آ رہی تھی۔ اس نے سرخ ربن سے اپنے ریشمی بال باندھ رکھے تھے۔ پیروں میں سفید اور نیلی لکیروں والے اسپورٹس شوز تھے، بیش قیمت مائیکل پیٹر کا بیلا ٹراؤزر اور پرب زپ والی فل آئین کی شرٹ تھی۔ میں تو اسے دیکھ کر ایک لمحے کو مبہوت رہ گیا۔ پلی بھر کو تو مجھے یوں لگا جیسے جمیل سیف الملوک سے کوئی اہرا بھٹک کر ادھر آ نکلی ہو۔

”سوری ماموں!“ میں نے ہولے سے سر جھکا کر کہا، پھر بولا۔ ”مگر ماموں! آخر مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی جا رہی ہے کہ میری ماں..... جیل میں اپنے کس جرم کی سزا بھگت رہی ہے..... آخر نہیں نے ایسا کون سا سنگین جرم کیا ہے کہ..... کہ..... میری پیدائش بھی جیل کی چہار دیواری میں ہوئی اور..... اور اب جبکہ میں اٹھارہ برس کا ہو چکا ہوں لیکن ماں کی سزا ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ میں نے تو آج تک اپنے باپ کی بھی شکل نہیں دیکھی ہے۔ وہ کہاں ہے؟ کون ہے؟“

پہلی بار میرے جذبات پر چھائی ہوئی برف محبت کی شدت سے پگھلنے لگی۔ ہاں، پہلی بار..... رنگوں کی اس خوب صورت قوس قزح سے آشنا ہونے لگا۔ مجھے آج پتہ چلا، دل کیا ہے؟ یہاں کون ہے؟ کون گھر کرتا ہے؟ اور یہ دل جسے ہم اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں شاید یہ غلط ہے۔ یہ دل تو اپنا ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہ تو کسی اور کی امانت ہوتا ہے۔ اس کا مالک تو کوئی اور ہوتا ہے۔ کنواری لڑکی طرح، ادھر جوان ہوا اور ادھر وداع ہو گیا۔ ہاں، میرا دل بھی جیسے آج وداع ہو گیا تھا۔ مگر نہیں، میرا دل کو تو کوئی چرا لے گیا تھا اور چور ایک حسین اور پری ویش اپسرا..... نگینہ تھی۔ اس روز کے بعد سے جیسے میرے اندر کا چھایا ہوا غبار کا نور ہونے لگا۔ سنجیدگی اور قنوطیت کا وہ دخل اس دن کے بعد بالکل تر کر رہ گیا۔ میٹھی میٹھی محبت کی نرم نرم دھوپ نے جیسے میرے دل پر چھائے ہوئے گلیشیر کو پگھلا دیا تھا بہار کے ایک ہی معطر، خوشگوار جھونکے نے میرے اندر کے خزاں رسیدہ سناٹے کو گلزار بنادیا تھا۔ ایک! مناظر فطرت کے حسین نظارے مجھے دلفریب محسوس ہونے لگے تھے۔ میرا چہرہ کھویا کھویا ضرور رہنے لگا لیکن اس خاموشی کے اندر سرخوشی کا عالم تھا۔

میں نے ان کی بات پر قدرے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ میری ماں تو مجھے حقیقت بتانے کے لئے ماموں سے اصرار کرتی رہی تھی۔ مگر جانے کیوں ماموں مجھے کچھ بتانے پر قطعاً راضی نہ تھے۔

”ماموں! آپ میرا مسئلہ نہیں سمجھ رہے..... میرے اندر ایک پھانس ہے، جو اب ایک ناسور بن گئی ہے۔ یہ پھانس مجھے ایک بلی کے لئے بھی جین سے نہیں رہنے دیتی۔ پہلے تو میں بچہ تھا، مگر اب تو میں جوان ہو چکا ہوں۔ شہر کے ایک بڑے کالج میں پڑتا ہوں، باشعور ہوں..... اور برے بھلے کی نیز بھی رکھتا ہوں۔ میرا اٹھنا بیٹھنا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معزز گھرانوں کے لوگوں کے درمیان ہے۔ میں اب معزز معاشرے کا ایک فرد بن چکا ہوں جہاں سب سے پہلے اپنے تعارف کی بجائے اپنے باپ کا تعارف کروایا جاتا ہے۔ آپ نے تو انڈیشن فارمز میں سرپرست کے خانے میں اپنا نام درج کروادیا ہے مگر میں لوگوں کو کیا جواب دوں جو مجھ سے سب سے پہلے میرے نام کی بجائے میرے باپ کا نام پوچھتے ہیں۔ کون ہے، کیا کرتا ہے؟ ماموں! پلیز..... میں آپ سے گستاخی کا قصور بھی نہیں کر سکتا..... مگر..... مگر ماموں! مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہئے کہ میرا باپ کون تھا؟ اگر وہ مر چکا ہے تو کیسے مرا؟..... اس کا نام کیا تھا؟ کیا..... کیا مرنے والوں کے نام بھی ان کے ساتھ مر جاتے ہیں؟ نہیں..... نہیں ماموں! نہیں..... آپ مجھے اس طرح اندھیرے میں رکھ کر بے موت نہیں مار سکتے۔ پلیز ماموں! پلیز.....“

فرط رقت و جذبات سے میرا لہجہ رندہ گیا تھا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ ماموں نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے گلے لگا لیا۔ میری غم زدہ آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے ان کا شانہ بھگو دیا۔ اس کے بعد ماموں نے آہستگی سے مجھے خود سے علیحدہ کیا اور میری آبدیدہ آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں بھی کسی سی تیر رہی تھی۔ پھر وہ میرے دونوں شانوں کو مضبوطی سے تھام کر بولے۔

”نادر! تمہارے لئے میرے دل میں ایک باپ جیسی ہی محبت ہے۔ ویسی ہی شفقت ہے جیسی ایک باپ کو اپنی اولاد سے، اپنے بیٹے سے ہوتی ہے۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم اپنے دل میں اس بات کا بھرپور اعتراف رکھتے ہو۔ تو بیٹا! میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔ میں تمہیں حکم نہیں دوں گا بلکہ ایک درخواست کروں گا کہ اس وقت تم جس کرب سے گزر رہے ہو، اس کا احساس راہک میں دہی اس چنگاری سے کبکس بہتر ہے جسے تم کریدنا چاہتے ہو۔ میرے بیٹے! میں چاہتا ہوں تم پر، تمہارے درخشاں مستقبل پر

اس روز کے بعد میرے دل کا چین غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ میں اپنی اس کیفیت پر خود حیران تھا حالانکہ جس کالج میں، میں پڑھتا تھا وہ کوانٹریشن تھا۔ پھر اپنے گاؤں کی الہڑ پہاڑی لڑکیوں کو بھی میں نے دیکھا تھا لیکن کسی مدجین کے چہرے نے میرے دل کے اک تارے کو ابھی تک نہیں چھیڑا تھا۔ نگینہ نے تو جیسے میرے دل کے تاروں کو جھنجھٹا ڈالا تھا۔

پہلی بار میرے جذبات پر چھائی ہوئی برف محبت کی شدت سے پگھلنے لگی۔ ہاں، پہلی بار..... رنگوں کی اس خوب صورت قوس قزح سے آشنا ہونے لگا۔ مجھے آج پتہ چلا، دل کیا ہے؟ یہاں کون ہے؟ کون گھر کرتا ہے؟ اور یہ دل جسے ہم اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں شاید یہ غلط ہے۔ یہ دل تو اپنا ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہ تو کسی اور کی امانت ہوتا ہے۔ اس کا مالک تو کوئی اور ہوتا ہے۔ کنواری لڑکی طرح، ادھر جوان ہوا اور ادھر وداع ہو گیا۔ ہاں، میرا دل بھی جیسے آج وداع ہو گیا تھا۔ مگر نہیں، میرا دل کو تو کوئی چرا لے گیا تھا اور چور ایک حسین اور پری ویش اپسرا..... نگینہ تھی۔ اس روز کے بعد سے جیسے میرے اندر کا چھایا ہوا غبار کا نور ہونے لگا۔ سنجیدگی اور قنوطیت کا وہ دخل اس دن کے بعد بالکل تر کر رہ گیا۔ میٹھی میٹھی محبت کی نرم نرم دھوپ نے جیسے میرے دل پر چھائے ہوئے گلیشیر کو پگھلا دیا تھا بہار کے ایک ہی معطر، خوشگوار جھونکے نے میرے اندر کے خزاں رسیدہ سناٹے کو گلزار بنادیا تھا۔ ایک! مناظر فطرت کے حسین نظارے مجھے دلفریب محسوس ہونے لگے تھے۔ میرا چہرہ کھویا کھویا ضرور رہنے لگا لیکن اس خاموشی کے اندر سرخوشی کا عالم تھا۔

سب سے پہلے ماموں حیدر گل نے میرے اندر کی اس تبدیلی کو محسوس کیا مگر حسب عادت انہوں نے مجھے کریدنا نہیں تھا۔ میرے انکار کے بعد اب وہ اکیسے جیل جایا کرتے تھے۔ میری ماں ان کی بہن تھی، بھائی کی حیثیت سے ان سے ملنے جاتے اور اپنا بھائی ہونے کا فرض ادا کرتے۔ میں تقریباً ہر ویک اینڈ پر گاؤں آتا تھا۔ چاچا فضل جیپ لے کر شہر پہنچ جاتے تھے۔ گاؤں میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ جب سے نگینہ کو میں نے دیکھا تھا، دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے کے مصداق اگر پھر دیدار کرنے کو دل بے چین رہنے لگا تھا۔ مگر ایسا موقع نہیں مل رہا تھا۔ بہر طور اس بار میں پورے بیس روز بعد گاؤں آیا۔ وہ بھی محض دو دنوں کے لئے۔ ایک بار رات ماموں حیدر گل میرے کمرے میں آئے۔

”نادر! تمہیں بہت روز ہو چکے ہیں اپنی ماں سے ملے ہوئے..... کم از کم ایک بار ان سے مل پھر نہ جانے کب تم گاؤں لوٹو۔“ انہوں نے گہری متانت سے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس بار ان لہجے میں ایک موہوم سی التجائیگی۔

جواباً میں ایک سٹیک مسکراہٹ سے بولا۔

”ماموں! پہلے میں یہ جانتا چاہوں گا کہ جس عورت کو آپ میری ماں کہتے ہیں.....“

”نادر.....!“ اچانک ماموں حیدر گل نے ذرا تیز لہجے میں میری بات کا لی اور میں ہکا بکا ان کا نکتہ لگا۔ آج پہلی بار ماموں نے مجھ سے سخت لہجے میں بات کی تھی۔

”وہ عورت نہیں، واقعی تمہاری ماں ہے..... تمہاری سگی ماں..... جس نے تمہیں جنم دیا ہے۔“

تم..... ہاں.....

میں ماموں کے اس درشت رویے کا برا نہیں مان سکتا تھا کیونکہ انہوں نے میری پرورش اسی طرح

تھی جیسے کہ کوئی ماں اپنی اولاد کی کر سکتا ہے۔ اس لئے ماموں کو مجھے ڈانٹنے کا پورا حق تھا۔



اور ہستی بستی زندگی پر تمہارے ماضی کا وہ بھیاںک سایہ نہ پڑنے دوں جسے میری دور اندیش نظریں ایک سیاہ طوفان کی صورت میں تمہاری طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہی ہیں۔ بیٹے! اس راکھ کو اسی طرح دبا رہے دو..... اسی طرح دبا رہنے دو..... اس چنگاری کو مت چھینرو..... اسے مت کریدو..... کریدو۔“ ان کا لہجہ مرتضیٰ ہو گیا۔ وہ دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔

میرے اندر عجیب سی اہل پہل ہونے لگی تھی۔ آج پہلی مرتبہ ماموں نے بڑے عجب و غریب طرز میں اور بڑی اسرار بھری باتیں کی تھیں۔ جو بظاہر مبہم تھیں مگر ماضی کے کسی ناخوشگوار واقعہ کی طرف اشارہ بھی کر رہی تھیں۔ مجھے واقعی اعتراف تھا کہ ماموں حیدر گل کی میرے لئے شفقت اور محبت غرض تھی۔ حتیٰ کہ انہوں نے تو مجھے یہ تک بھی بتا ڈالا تھا کہ وہ جس ٹال کو کامیابی کے ساتھ کاروبار بنیادوں پر چلاتے رہے، وہ ان کی ملکیت نہ تھی۔ یہی نہیں، گاؤں میں تعمیر شدہ یہ خوبصورت پہاڑی بنگلہ سارا بینک بینکس میری ماں کی ملکیت تھا اور وہ جیل جا کر اپنی بہن کو ایک ایک پائی کا حساب دیتے تھے یہی نہیں، انہوں نے اپنی بہن کی رضامندی سے پاور آف اٹارنی میرے سپرد کر دی تھی اور لکڑی وغیرہ کی خرید و فروخت، ٹینڈر وغیرہ کی مطلوبی سے متعلق دیگر کاغذات اور چیکس وغیرہ پر بھی میرے ہی دستخط ہوتے تھے۔ لیکن میری سمجھ میں ان کی یہ منطق نہیں آ رہی تھی کہ آخر میرے ماضی سے متعلق ایسی کون سی چنگاری تھی، جسے وہ کریدنا نہیں چاہتے تھے؟ اور..... اور آخر اس بھیاںک طوفان کی کیا حقیقت تھی جو ان کی دور اندیش نظریں دیکھ رہی تھیں۔

چند تائے ماحول میں گھبر سناٹے کی سی فضا طاری رہی۔ وہ میری طرف بڑھے اور پرسوج نظریں میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے بولے۔

”نادر بیٹے! تمہیں ایک اور بات بتاؤں، جس دن تم نے میرے ساتھ جیل جا کر اپنی ماں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا، یقین کرو مجھے بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔“

میں ان کی اس بات پر بری طرح چونکا۔ وہ میری کیفیت کو بھانپتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئے۔

”ہاں بیٹا! دراصل میں خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ تم اپنی ماں سے ملو۔۔۔۔۔۔ بلکہ میں تو یہ بھی چاہتا تھا کہ تمہیں یہ بھی نہ پتہ چلے کہ تمہاری ماں زندہ ہے اور جیل میں اپنے ناکردہ جرم کی طویل سزا بھگت رہی ہے۔“

ماموں کا لہجہ بری طرح کپکپا رہا تھا اور میرے سر پر جیوتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ میرا دل جیسے رک رک کر دھڑک رہا تھا۔ میرے اعصاب چھلٹی ہو رہے تھے۔

”مگر..... یہ تمہاری ماں کا اصرار تھا کہ میں تمہیں اس سے ملاتا رہوں۔“ وہ کہنے لگے۔ ان کی آواز ہنوز مرتضیٰ تھی۔ ”میں اس کی خواہش رد نہ کر سکا اور دل پر جبر کر کے میں ایسا کرتا رہا۔ لیکن تمہاری ماں اور بھی بہت کچھ جانتی تھی..... مگر میں نے اس کی مزید کوئی بات ماننے سے انکار کر دیا۔“

”کیوں..... کیوں ماموں! آپ آخر ایسا کیوں چاہتے تھے؟“ مجھ پر ایک بار پھر کرب ناک سی رقت طاری ہونے لگی۔ میں ایک تکلیف دہ کیفیت سے گزر رہا تھا کہ آخر ماموں ایسا کیوں چاہتے تھے؟ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ میرے ماں سے ملاقات سے انکار پر ماموں آخر کار تنگ آ کر مجھے اس حقیقت سے آگاہ کر دیں گے جو مجھ سے پوشیدہ رہ گئی اور جس نے میری نفسیات پر بھی بڑے اثرات مرتب کئے تھے۔ بہر طور میرے احتجاج آمیز استفسار پر ماموں نے میرے شانوں کو گرم جوشی سے تھما اور بولے۔

”نادر بیٹے! ابھی تمہاری بڑھاپی شکل، گرو، منہ، تمہیں ایک بڑا اور کامیاب آدمی کے روپ میں دکھاتا

چاہتا ہوں۔ اور یہ تمہی ممکن ہے جب تم اپنی بڑھاپی پر پوری توجہ مرکوز رکھو۔ ٹھیک ہے..... تم اپنی ماں سے نہیں ملنا چاہتے ہو تو نہ ملو مگر اپنی زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرو۔ ٹھیک ہے بیٹا! ماموں نے میرا کندھا تھپتھپایا اور پھر کمرے سے نکل گئے۔

پھر مجھے باہر جیب اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی جو لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی چلی گئی۔ اور میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ ماموں انکیلی ہی اپنی بہن سے ملنے شہر چلے گئے تھے۔

\*\*\*

اب تو میں ماموں حیدر گل کی طرف سے بالکل ہی مایوس ہو چکا تھا۔ اتنا تو میں سمجھ ہی چکا تھا کہ ماموں اپنے تئیں میرے کسی بھلے کی خاطر ہی مجھے کسی ایسی نادیہ آگ سے دور رکھنا چاہتے ہیں جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس کی پیش میری زندگی کو تپت کر کے رکھ دے گی۔ وہ مجھے میری ماں کے تلخ ماضی کے متعلق کچھ نہیں بتانا چاہتے تھے۔ حالانکہ جب میں اس سے پہلے ماموں کے ساتھ جیل، ماں سے ملنے جایا کرتا تھا تو ماں بڑے پیار سے میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے ماموں سے یہ کہا کرتی تھی کہ۔

”گل!..... نادر کو دھیرے دھیرے حقیقت سے آگاہ کرتے رہو۔ ورنہ ادھر ادھر سے اگر اسے (مجھے) حقیقت کا علم ہوا تو اس کے منفی اثرات اس کے دل و دماغ پر مرتب ہو سکتے ہیں۔ کہیں..... کہیں یہ..... میرا بیٹا ہی مجھ سے نفرت نہ کرنے لگ جائے۔“

مجھے اس وقت یہ سن کر بہت حیرت ہوئی۔ آج جب ماں کی اپنے بھائی (ماموں) کو کی گئی تاکید میرے دل و دماغ میں کوئی تو میرے اندر کی کرید مزید سوا ہونے لگی تھی کہ آخر اس حقیقت میں ایسی کون سی پراسرار بات پوشیدہ تھی جسے اگر میں ادھر ادھر سے معلوم کر لیتا تو میرے دل میں اپنی ماں کے خلاف غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی۔ حتیٰ کہ میں نے فصل چاچا اور اس کی بیوی معزماں سے بھی پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر ان دونوں بے چاروں نے نہایت غریبانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔

”چھوٹے صاحب! ہم نوکر ہیں..... ہمیں نوکر ہی رہنے دیں۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہمارے منہ پر تالے لگا دیئے گئے ہیں۔“ مجھے اور غصہ آتا۔ حالانکہ ہوتا تو ایسا چاہئے تھا کہ میں اگر ”اپنے تئیں“ نیچے وادی میں جا کر گاؤں کے کسی عمر رسیدہ شخص یا دیگر لوگوں سے استفسار کرنے کی کوششیں کرتا تو مجھے حقیقت کا کچھ نہ کچھ علم ہو سکتا تھا۔ مگر پھر سوچتا کہ کیا ان لوگوں سے اپنے خاندان کے ماضی کے بارے میں پوچھنا مناسب ہو گا؟ میں اپنا ارادہ بدل دیتا۔ البتہ مجھے اتنا تو علم اب تک ہو ہی چکا تھا کہ میری ماں، ایک قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا بھگت رہی ہے۔ اس نے کس کا اور کیوں قتل کیا تھا؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ تب اب چاکا ایک روز مجھے یہ بھی خیال آیا کہ کیوں نہ جیل سپرنٹنڈنٹ سے مل کر اپنی ماں کے بارے میں استفسار کروں؟ لیکن مجھے یہ بھی نامناسب ہی لگا تھا۔ بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ میں احتجاجاً ماموں حیدر گل کے ساتھ ماں سے ملنے ہی نہ جایا کروں۔ پھر وہ خود ہی مجھے تنگ آ کر حقیقت سے آگاہ کر دیں گے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی اُلٹ ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ تو خود بھی یہی چاہتے تھے کہ میں ماں سے نہ ملوں۔

میں تنگ آ کر ان باتوں کو ذہن سے کھرچنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر گیند سے سامنا ہونے کے بعد تو اب میں کسی اور ہی دنیا کا باسی ہو گیا تھا۔

\*\*\*

میں دو دن بعد ہی شہر آ گیا۔

گنبد کا سحر آفریں اور دل گزریں چہرہ بھلائے نہیں بھول رہا تھا مجھے۔ میں اب سنجیدگی سے اس مہ جبین کے متعلق سوچنے لگا۔ آخر اس کے دیدار کی کوئی توسیل ہوگی۔ کبیر احمد یوں تو میرا روم میٹ تھا مگر اس کا گھر شہر ہی میں ہونے کی وجہ سے وہ اکثر ہوسٹل سے غائب ہی رہتا تھا۔ البتہ امتحانات کے دنوں میں جب اسے کالج لائبریری یا ”کمانڈن اسٹڈی“ کی ضرورت پڑتی تو وہ ہاسٹل ہی میں آکر رہنے لگتا تھا۔ سنا ہے کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ میں اس مہ جبین کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا کہ ایک دن مجھے وہ زرخ روشن نظر آئی گیا۔ مگر میں اسے اپنے روم پائینٹر کبیر احمد کے ساتھ دیکھ کر دل سوس کر رہ گیا۔ گنبد اسے کالج میں ملنے آئی تھی۔ ایک پیکر فزی تھا اس لئے میں کالج لائبریری میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ میں نے پری انجینئرنگ لے رکھی تھی۔ کبیر احمد کا سبیکٹ بھی یہی تھا۔ میں پون گھنٹے تک پڑھتا رہا۔ کبیر بھی میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ معاہداری ایک کلاس میٹ نہ ہوتے ہوئے سے کبیر احمد کو مخاطب کر کے کہا۔

”کبیر!..... تمہاری مہمان آئی ہیں۔“

چونکہ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے بھی سر اٹھا کر نہ ہت کی طرف دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ اس کے ساتھ گنبد کھڑی تھی۔ وہی من موہنی صورت لئے..... وہی دلنشین سراپا اور ویسی ہی گداز لیوں پر چمکتی شوخ مسکراہٹ جس نے میرے دل کی دنیا کو تہہ وبالا کر ڈالا تھا۔ وہ لیورنگ کی جینز اور سلی گلابی شرٹ میں ملبوس تھی۔ پیروں میں سفید اور نیلے جوگرز تھے۔ سادہ سے لباس میں اس کا ملوکئی حسن مزید ٹھہرا ٹھہرا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک نگاہ مجھ پر بھی ڈالی تھی۔ کبیر احمد تو یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے مصافحہ کیا۔

”تھک یو!“ کبیر احمد نے نہ ہت کا مسکرا کر ہولے سے شکریہ ادا کیا۔ گویا اسے فارغ کرنے کے بعد کبیر احمد نے اپنی کتابیں سمیٹیں اور مجھ سے کہا۔

”یار نادرا! تم ابھی بیٹھو گے یا چلو گے کینٹین؟“

میں چونکا۔ جی تو چاہا، اس کی آفر قبول کر لوں۔ لیکن یہ عامیانہ پن ہوتا اس لئے میں نے شکریہ کہہ کر اس سے معذرت کر لی۔ وہ دونوں چلے گئے۔

اب میرا پڑھائی میں کہاں دل لگتا۔ دو باتوں نے میرے دل کو دھچکا پہنچایا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ گنبد، کبیر احمد سے ملنے آئی تھی۔ ان کی آپس میں دوستی کی نوعیت کچھ بھی کہی لیکن میں اپنے اندر رقابت کا جذبہ محسوس کرنے لگا تھا۔ جبکہ دوسری بات گنبد کی مجھ سے بے رخی تھی۔

بے شک وہ گزشتہ دنوں ہونے والے اسپورٹس ویک میں میری مد مقابل تھی اور میرا اس سے ذرا دب کا سامنا ہوا تھا لیکن پھر بھی اسے کم از کم مجھ سے تو تھوڑی بہت شناسائی ظاہر کرنا چاہئے تھی۔ بھلے سے یونیورسٹی اک ذرا ہائے بیلو ہی کہہ دیتی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔

اب میں اس ”ہونا چاہئے تھا، نہ ہونا چاہئے تھا“ کی گردان میں بری طرح الجھ کر رہ گیا۔ وہ دونوں جا چکے تھے اور میں اپنے دل کے کسی گوشے میں بھڑکتی ہوئی آتش شوق کو بری طرح محسوس کرنے لگا۔ بار بار اپنی پیش سے میری انا کے مضبوط خول کو پکھلانے کا باعث بن رہی تھی اور مجھے ایک ہیچتو وے کی کیفیت میں مبتلا کرنے کا سبب بھی بن رہی تھی۔

”کاش!..... میں کبیر احمد کی آفر قبول کر لیتا.....“

”نہیں..... محبت میں اس طرح کا عامیانہ پن رنگِ اُلفت کو پھیکا کر ڈالتا ہے۔“ دل نے دماغ کو سرزنش کی۔

”کیسا عامیانہ پن؟..... یہی تو دیوانگی ہے..... محبوب سے ملنا، اس کے دیدار کی سبیل کرنا دیوانوں کا حق ہوتا ہے۔“

”لیکن یہ حق تو تب ہی مانا جائے گا جب دونوں طرف برابر آگ لگی ہو۔ ایک طرف محبت ایک نادانی کے سوا کچھ بھی نہیں۔“ دماغ نے ایک توجیہ پیش کی۔

”ہونہ..... نادانی.....“ دل وحشی بھند رہا۔ ”یہ دیوانگی نہیں تو پھر کیا ہے؟ بے شک محبت کی آگ یکطرفہ سہی لیکن کسی کو اپنانے کی جستجو تو دل بے قرار کو دودھ کی نہر کھودنے اور سبک لگی سے بھی دوستی پر مجبور کر دیتی ہے۔ صحرا بہ صحرا لیلیٰ لیلیٰ پکارنے پر آمادہ کر کے رکھ دیتی ہے..... اور یہ سب منظور نہیں تو نادریا! محبت کا خیال ہی دل سے نکال دو۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ پھر تم اپنی انا ہی کے خول میں بند رہو۔ وہ اور ہی لوگ ہوتے ہیں جو اس جذبہ محبت میں اپنا سب کچھ وار دیتے ہیں۔“

دماغ نے بردبارانہ تنبیہ کی۔ ”خبردار نادرا! محبت کا ایک معیار ہوتا ہے۔ اس کی ایک اپنی ہی معراج ہوتی ہے۔ تمہاری یک طرفہ محبت اگر سچی ہے تو تقدیر ایک دن تمہارا خود ساتھ دے گی۔“

”لیکن تقدیر بھی تدبیر کے تابع ہوتی ہے۔“ دل نے کہا۔ اور میں نے بے اختیار جھٹکا کر اپنی کتابیں بند کر کے سر پکڑ لیا۔ کچھ دیر ای کیفیت میں رہا۔ اس کے بعد دوبارہ کتاب کھولی تو سامنے درسِ علم کی بجائے نصاب محبت وا ہو گیا جہاں گنبد کا چہرہ دک رہا تھا۔ پھر اس کے بعد میں نے کتاب دوبارہ بند کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کتابیں سمیٹیں، لائبریری سے باہر آ گیا۔ اب میرے قدم کشاں کشاں کینٹین کی جانب اٹھنے لگے۔ دل و دماغ کی اس ٹکراؤ سے مجھے چائے کی طلب ہونے لگی۔ مگر اصل مقصد تو دیدار پار تھا۔

میں سیدھا کینٹین پہنچا۔ یہ وسیع ہال تھا جہاں ذرا ذرا فاصلے پر میزیں اور کرسیاں چھپی ہوئی تھیں۔ کینٹین میں خلاف معمول رش کم تھا۔ میں نے ایک طاوانہ نظر ہال پر ڈالی تو مجھے ایک کونے میں کبیر احمد گنبد بیٹھے چائے پیتے دکھائی دے گئے۔ سموسوں اور پیٹیز کی پلٹ بھی ان کی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ گنبد سامنے کے رخ پر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ کبیر کی میری طرف پشت تھی۔ گنبد نے مجھے ہال میں داخل ہوتے دیکھا، ایک لمحے کو ہماری نگاہیں چار ہوئیں اور پھر میں جبراً اپنی نظریں اس سے بچھ کر ایک قریب کی میز پر براہمن ہو گیا۔ ویٹر نے فوراً میرے آگے پانی کا گلاس رکھ دیا۔ میں نے اسے چائے لانے کا کہا اور پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ میں نے دانستہ اپنا رخ گنبد کی طرف کر رکھا تھا۔ تاہم اس کی طرف براہ راست دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ ایک بار جو میری نظر اس کی طرف اٹھی تو مجھے لگا جیسے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی ہو۔ اچانک اس نے کبیر احمد کی طرف ذرا جھک کر کچھ کہا تھا جسے سن کر کبیر نے فوراً مڑ کر میری طرف دیکھا اور وہیں سے اپنا ایک ہاتھ بلند کر کے مجھے آواز دی۔

”نادرا! آ جاؤ یار ادھر ہی۔“ میرے دل کی دھڑکنیں یکبارگی اٹھ چھل ہونے لگی تھیں مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں اٹھ کھڑا ہوا اور ان کی میز کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

”یار! میں نے تو تم سے کہا تھا..... مگر تم..... چلو خیر، آؤ بیٹھو۔“ وہ فراخ دلی سے بولا۔

میں جھپٹتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ایک کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

”لگتا ہے آپ کے دوست کو پڑھائی سے خاصا شغف ہے۔“ گنبد نے مترنم آواز میں کبیر سے کہا اور مسکرائی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے نرم و گداز ہونٹ ویسے ہی دل موہ لینے والے تاثرات



پیش کر رہے تھے۔

میں نے ہولے سے گلا ٹھکھار کر کہا۔

”دراصل میرا بھی چائے پینے کو جی کر رہا تھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ تم دونوں کے سچ کیوں خواہ مخواہ نخل ہوا جائے۔“ میرے لہجے میں کوٹ کوٹ کر نارسائی بھری ہوئی تھی۔

”ارے یار! ہم یہاں کون سا چوچیں لڑا رہے تھے..... لو، سو سہ کھاؤ۔“ کبیر احمد نے ازراہ تفضن کہا اور پلیٹ میری طرف کھسکا دی۔ میں نے پلیٹ ہی میں سو سے کا ایک ٹکڑا توڑا اور منہ میں ڈال لیا۔ اس اثناء میں ویٹر میری چائے کا کپڑے میں اٹھائے نمودار ہوا۔ پھر مجھے یہاں بیٹھا دیکھ کر سیدھا ادھر آ گیا۔ ”ان سے ملو نادار! یہ نگینہ ہیں۔“ کبیر نے مجھ سے نگینہ کا تعارف کرواتے ہوئے کہا تو نگینہ ایک ہلکی سی مسکراتی نگاہ مجھ پر ڈال کر فوراً کبیر سے بولی۔

”جی..... یہ نادار ہیں، میں ان سے مل چکی ہوں..... اور وہ بھی بڑے ہنگامی انداز میں۔“

”اوہ، اچھا..... مگر بھئی ہنگامی انداز میں کیوں..... خیریت؟“ کبیر نے مصنوعی حیرت سے پوچھا اور نگینہ نے اسپورٹس ویک کے دوران نیبل ٹینس کے اس گرم جوش میچ کا حوالہ دے ڈالا تو کبیر احمد لالباہلی انداز میں ایک ہلکا سا تہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”اوہ..... اب سمجھا۔ ارے بھی نادار! ذرا ہوشیار رہنا، تم پر اُدھار کھائے بیٹھی ہے یہ نگینہ۔“

میرا دل مسرت سے بھر گیا۔ نگینہ نے بالآخر میچ کا حوالہ دے کر ثابت کر دیا تھا کہ میں اسے یاد تھا۔ لیکن پھر اچانک ایک کھکسی میرے دل میں اُبھری۔

اگر میں اسے یاد تھا تو اس نے لائبریری میں مجھ سے شناسائی کیوں نہ ظاہر کی تھی اور مجھے سراسر نظر انداز کر کے صرف کبیر احمد سے ہی مصافحہ کیوں کیا تھا؟ مگر پھر فوراً ہی میں نے اسے محبوب کی ایک ادائے بے نیازی پر محمول کر کے ذہن سے جھٹک دیا۔ تاہم میں کبیر احمد کی بات کے جواب میں نگینہ کے چہرے پر ایک گہری نگاہ ڈال کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

”ظاہر ہے، انہیں اب اپنا ادھار چکتا کرنے کے لئے اگلے اسپورٹس ویک کا انتظار کرنا پڑے گا۔“ میری بات پر نگینہ بے اختیار کھٹکتی ہوئی ہنسی کے ساتھ پہلی بار براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”خیر نادار صاحب! اب ایسی بات بھی نہیں..... کھیل تو کھیل ہوتا ہے۔ جس میں ہار جیت تو ہوتی ہی ہے۔“

”جی ہاں..... اور جیت آپ ہی کی ہوئی تھی۔“ میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تو وہ چونک سی گئی۔

”کیا مطلب؟..... جیتے تو آپ تھے۔“

”آں..... ہاں..... میں ہی جیتا تھا۔ لیکن آپ سے جیتنے کے لئے مجھے جس طرح دانتوں پسینہ آ

گیا تھا، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے، اس طرح جیتنا..... جیتنا نہیں ہوتا۔“

میں نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ بات بنائی تھی لیکن میں نے نگینہ کے چہرے پر پل بھر میں اُٹتے ہوئے ایک گہرے اور پُر سوچ تاثر کو فوراً محسوس کیا تھا اور اسی ایک پل میں اس نے مجھ کو بھری نگاہ سے میرے چہرے کو دیکھا، پھر اس سنجیدہ تاثر کو اپنی مخصوص کلکسلانی مترنم ہنسی میں بدل کر بولی۔

”نادار صاحب! جیتنے کا لطف بھی تو محنت کر کے جیتنے میں آتا ہے۔ کیا آپ اتنے ہی سہل پسند کھلاڑی ہیں؟“ اس نے جیسے میری اسپرٹ کو جھنجھوڑا تو میں بھی چپ نہ رہ سکا۔ اور اس کی دلنشین نگاہوں میں جیسے دور تک اترتے ہوئے بولا۔

”میں آپ سے متفق ہوں نگینہ صاحبہ! لیکن کبھی کبھی جیت کر ہارنے کا بھی تو لطف آتا ہے۔“

ایک بار پھر اس نے چوکتی ہوئی پرتاثر نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا۔

”ارے بھئی، یہ تم دونوں کیا خشک موضوع لے کر بیٹھ گئے؟“ کبیر احمد بور ہوتے ہوئے جھنجھلا کر بولا۔ ”ابھی سپورٹس ویک میں پورا سال پڑا ہے۔ بعد میں تم دونوں لڑ لینا آپس میں۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”اچھا سنو نادار!..... میں نے مری گھونسنے کا پروگرام بنایا ہے..... اور چونکہ تم ملکہ کو ہمارے دامن میں رہتے ہو اس لئے تم سے زیادہ بہترین ہمارا اور کوئی گائیڈ نہیں ہو سکتا۔“

”کیا واقعی.....؟“ میں اس کی بات پر جیسے یک گونہ خوشی سے چونک کر بولا۔ ”موسٹ ویلکم..... میں تم لوگوں کو اپنے گاؤں کی بھی سیر کراؤں گا۔ میرا تو وہ گھر ہے۔ یوں بھی آج سیزن ہے۔ تم اسنو فالنگ سے بھرپور لطف اٹھاؤ گے۔“

”بس پھر ڈن ہوا..... ہم چند دوست ایک مختصر سائپ ترتیب دے لیتے ہیں۔ پھر ہم تمہیں اپنے حتمی پروگرام سے آگاہ کر دیں گے۔ کیوں نگینہ! ٹھیک رہے گا نا یہ؟“ کبیر نے آخر میں نگینہ کی رائے لینا چاہی۔

وہ بولی۔ ”ہاں..... میری چند گہری سہیلیاں تو ابھی سے تیار بیٹھی ہیں۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم پرسوں صبح سویرے یہاں سے نکلیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے نادار! یہی پروگرام ٹھیک رہے گا۔“

”ایز یوش۔“ میں نے خوش دلی سے مسکرا کر کہا۔

\*\*\*

نگینہ سے میری یہ دوسری ملاقات با تقدیر ہی نہیں، با تدبیر بھی ثابت ہوئی تھی۔ میں بہت خوش تھا۔ انجانی مسرتوں کی خوشگوار پھوار میرے پیاسے دل کو سیراب کر رہی تھی۔

تاہم اس کے باوجود میرے اندر ایک بھانسن بھی تھی۔ وہ بھانسن نگینہ کی کبیر احمد سے دوستی کی تھی اور میں جانتا چاہتا تھا کہ اس دوستی کی نوعیت کیا تھی؟ محض دوستی تھی یا کوئی تعلق خاطر بھی تھا؟..... اور اگر ان کے سچ واقعی کوئی جذباتی وابستگی ہوئی تو.....؟ اس تصور سے میرا دل بے اختیار دہل اٹھتا تھا۔ تاہم میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ان کے درمیان ”تعلق خاطر“ کا کوئی جذبہ پنپ چکا تھا تو مجھے ان دونوں کی محبت پر شب خون مارنے کا کوئی حق نہ تھا۔ مگر میں پھر بھی ساری عمر یک طرفہ آتش عشق میں جلتا رہوں گا۔ یہ تصور ہی میرے لئے سوہان روح تھا۔

بہر طور موضوع چونکہ تازہ تھا اس لئے میں نے ہاشل آکر باتوں باتوں میں کبیر احمد کو اس طرح کریدا کہ میری نگینہ سے متعلق غیر معمولی دلچسپی بھی ظاہر نہ ہونے پائے۔

اس نے بتایا کہ نگینہ ہنڈی کے ہی ایک گرلز کالج میں ایف ایس سی کی طالبہ تھی۔ میری طرح اسے بھی اسپورٹس سے دلچسپی تھی۔ وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی، جس کا نام شاہ میر تھا۔ وہ محکمہ جنگلات میں ٹیم وارڈن (فاریسٹ آفیسر) رہ چکا تھا اور اب کنزرویٹو آفیسر تھا۔ ساتھ ہی اس کا اپنا نمبر مرچنٹ کا بھی کاروبار تھا جو بہت وسیع کاروباری بنیادوں پر پھیلا ہوا تھا۔ نگینہ کا ایک بڑا بھائی میر دادور خان اسے سنبھالتا تھا جو شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔

”تمہاری اس اپرا سے کب سے دوستی ہے؟“ بالآخر میں نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے

”ارے یار! مطلب صاف ہے، تم اس سے یونہی میرے بارے میں پوچھو کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے یا نہیں؟“

”اچھا..... تاکہ وہ ادھر سینڈلوں سے میرا سر گنجا کر دے۔ نہ بابا نہ..... میں باز آیا ایسے کاموں سے۔“ میں نے دونوں کانوں کو پکڑ کر کہا۔

”یار پلیز! دوستی کی خاطر تم اتنا بھی نہیں کر سکتے؟“ وہ دوستی جتانے لگا اور میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر گویا اسے ٹالنے کی غرض سے بولا۔ ”اچھا ٹھیک ہے، میں کوشش کر کے دیکھ لوں گا۔ مگر وعدہ نہیں کرتا۔“

”یہ ہوئی نا بات۔“ وہ خوش ہو کر مجھ سے لپٹ گیا۔

”اچھا، اب یہ مکھن بازی نہ کر اور مجھے پڑھنے دے۔“ میں نے اسے دھیرے سے الگ کیا۔

\*\*\*

اب مجھے بے چینی سے اگلے دن کا انتظار تھا جب میں، کبیر اور نگینہ مری کے نور پر روانہ ہونے والے تھے۔ ہر لمحہ نگینہ کی ہم رکابی کے جاں گداز تصور سے میرا دل عجیب سی سرشاری محسوس کرنے لگا تھا۔ نگینہ کے ساتھ اس کی چند گہری اور قریبی سہیلیوں کا نولہ بھی متونع تھا۔

پروگرام میں ترتیب پایا تھا کہ اگلے دن علی الصبح نگینہ اور کبیر اپنی اپنی گاڑیوں میں روانہ ہوں گے اور جاتے وقت مجھے یہاں کالج کیمپس سے ”پک“ کرتے چلیں گے۔

نور بس اس حد تک تھا کہ سر شام مری سے واپس لوٹ آنا تھا۔ مگر میں نے سوچ رکھا تھا کہ کم از کم ایک رات انہیں اپنے ہاں ضرور مہمان رکھوں گا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری برسوں کی امید بر آ رہی تھی نگینہ کی، ہم سفری کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ میں نے احتیاطاً پہلے ہی فون کر کے ماموں حیدر گل کو دوستوں سمیت اپنی آمد کے بارے میں مطلع کر دیا تھا۔

کبیر احمد حسب معمول کالج ٹائم کے بعد اپنے گھر جا چکا تھا۔ میں نے کالج میں دوپہر کا کھانا کھایا اور واپس ہاسٹل روم میں آ گیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں قیلولہ کرنے کا قائل تھا۔ اس لئے میں کپڑے بدل کر سونے کے لئے بیڈ پر جا لیٹا۔

شام پانچ بجے اٹھا تو میرے موبائل کی بیل مگلتا رہی تھی۔

”ہیلو.....!“ میں نے موبائل کان سے لگا کر کہا۔

”نادر!..... میں ہوں..... کبیر۔“ دوسری طرف سے اس کی آواز ابھری۔

”ہاں کہو..... تیار ہے نا پھر؟“ میں نے پوچھا

”نہیں یار!“ اس کی مری مری سی آواز ابھری۔

”کیوں..... خیریت تو ہے؟“ میں نے کسی قدر چونک کر پوچھا۔

”بس یار! باقی تفصیل کالج آ کر بتاؤں گا۔ تم کل کا پروگرام کینسل سمجھو۔ میں نے یہی بتانے کے لئے فون کیا تھا۔“ اس کی آواز میں عجیب سا ارتعاش تھا۔ اس کے لہجے سے مایوسی کے علاوہ پریشانی بھی جھلک رہی تھی۔ ”اچھا پھر..... ابھی میں ذرا پریشان ہوں، کل کالج آیا تو ساری تفصیل بتا دوں گا۔ خدا حافظ!“ یہ کہہ کر اس نے مجھ سے کچھ سے بغیر رابطہ منقطع کر دیا اور میں ہکا بکا سا رہ گیا۔

نہ جانے اچانک کیا ہوا تھا؟ میں سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے کبیر کا لب و لہجہ حد درجہ پریشان سا محسوس ہوا تھا۔

دوستانہ شوخی سے پوچھا۔

میری بات پر کبیر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور میرا دل ڈوبنے لگا۔

”یار!..... دوستی تو خاصی پرانی ہے مگر..... یہ ہے ذرا لاپرواہی سی لڑکی۔

”کیا مطلب.....؟“ میں نے خوش امید سے قدرے چونک کر پوچھا۔

”بس..... اپنے دل کا کچھ پتہ نہیں چلنے دیتی۔ بل میں تولد پل میں ماشہ۔“

”تم اپنی کہو کہ تم اس میں کس حد تک انوا لو ہو؟“ میں نے کسی خاص خیال کے تحت پوچھا۔

”یار! ایسی کافر ادا حسینہ تو ہر نوجوان شخص کا خواب ہوتی ہے میں تو اسے بہت چاہتا ہوں.....“

”مگر کیا.....؟“ میں نے جلدی سے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”یہی کہ اب تک اس نے ایسا کوئی خاص رسا نس مجھے نہیں دیا ہے۔“

”پھر بھی، کوئی عندیہ تو لیا ہوتا اس کا۔ خاصی بولڈ اور تعلیم یافتہ ہے۔ پھر تم دونوں کی دوستی بھی اتنی پرانی ہے۔ اب جھپکنے کا زمانہ کہاں رہا؟ اب تو پہلی ہی نظر میں پروپوزل دے دیا جاتا ہے۔“ میں اسے بدستور کریدے جا رہا تھا۔

”ہاں..... عندیہ تو میں نے لینے کی بارہا کوشش کی تھی اس سے۔“

”پھر.....؟“ ایک بار پھر میرا دل ڈوبنے لگا۔ وہ حسرت زدہ لہجے میں بولا۔

”میں نے کہا نا، اپنے دل کا کچھ پتہ نہیں چلنے دیتی ہے۔ ہمیشہ ٹال دیتی ہے۔“

”پھر بھی، کچھ تو کہا ہو گا..... تم سے تو بڑی گہری دوستی لگتی ہے۔ آج تو باقاعدہ تم سے کالج میں ملنے آگئی۔“

”چھوڑو یار! میں نے کہا نا، وہ عجیب فطرت اور کلنڈر اندہ طبیعت کی مالک ہے۔ پہلے میں بھی اسی خوش فہمی میں تھا مگر پل میں تولد پل میں ماشہ۔ اس کی ہائے ہیلو بس لڑکوں سے رہتی ہے۔ اب تم خود کو ہی دیکھ لیٹا، وہ تم سے راہ و رسم بڑھانے میں دیر نہ کرے گی اور تم سمجھو گے کہ تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔“

”ہاں یار! بعض لڑکیاں فلٹ، کریزی بھی ہوتی ہیں۔ دوسروں کو خواہ مخواہ ہی سودائی بنانے کا جنون ہوتا ہے ان میں۔“ یہ الفاظ میں نے بظاہر برا سامنا بنا کر کہے تھے۔

میرے سینے سے بے اختیار طمانیت بھری سانس خارج ہوئی مگر میں نے کبیر احمد پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔

”ہوں..... اس کا مطلب ہے، نگینہ کہیں بھی منسوب نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی میں لچپی رکھتی ہے۔ میں نے خوش امید سے سوچا۔

پھر اچانک کبیر احمد نے قدرے چونک کر اسرار بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں ڈر گیا، کہیں اسے مجھ پر کسی بات کا شک تو نہیں ہو گیا۔

”یار نادر! تم میرا ایک کام کرو گے؟ دیکھو، تم میرے اچھے دوست ہو نا؟“ وہ قریب آ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوستانہ لہجہ سے بولا۔

”ہاں، ہاں..... بولو، کون سا کام ہے؟“

”تم ذرا اپنے طور پر نگینہ کو میرے بارے میں ٹولنے کی کوشش کرو۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے اسے گھورا۔

ہی دیدہ زیب تھے۔  
 شگن من، جس کا نام بابو خان تھا، وہ مجھے دروازہ کھول کر اندر لے آیا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بابو خان وہاں موجود ایک ادھڑ عمر ملازمہ کو اندر میری اطلاع دینے کی تاکید کر کے واپس لوٹ گیا۔

میں نے ذرا کھڑے کھڑے یونہی کمرے کا طائرانہ جائزہ لیا۔ دیواروں پر شکاری جانوروں کے سر نصب تھے۔ جبکہ کئی نایاب پرندوں اور آبی نیکیں کے حوط شدہ مجسمے بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف دھاڑتے ہوئے انداز میں بھس بھرا تیندوا بھی کھڑا نظر آ رہا تھا جس پر اصل ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کبیر اندر داخل ہوا۔  
 ”مجھے پورا یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔“ وہ مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”بیٹھو.....!“

”یار! خیریت تو ہے؟ تم.....؟“

”ہاں، بتا رہا ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ، کیا پیو گے؟“ وہ میری بات کاٹ کر یکدم بولا۔

”کچھ نہیں یار! جی نہیں چاہ رہا۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔ مگر کبیر نے ملازم سے کولڈ ڈرنک لانے کا کہہ ہی دیا اور میرے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا۔ وہ ہلکے پھلکے گھریلو لباس میں تھا اور پیروں میں سوئی پہن رکھی تھی۔

”یار! آخر بتاؤ تو..... کیا بات ہے؟ یہ اچانک تم لوگوں کا پروگرام کیوں کینسل ہو گیا؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا تو وہ ایک گہری متشکری ہنکاری خارج کر کے بولا۔

”بس یار نادور! کیا بتاؤں۔ ایک ٹریڈی ہو گئی۔“

”کیسی ٹریڈی؟“ میں نے یکدم قدرے پریشان ہو کر پوچھا اور جانے کیوں نگینہ کے متعلق میں کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔

”ٹریڈی تو نہیں البتہ کچھ خندوش اور عجیب ہی صورت حال سے دوچار رہے ہم۔ ایک بہت ہی عجیب سی، پراسرار اور شگن من صورت حال۔“

”ارے یار کبیر! تم کیا عورتوں کی طرح پہیلیاں بچھوانے لگے۔ اب کچھ بتا بھی چکو۔“ میں نے آخر تک آکر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”نگینہ ہے نا.....“

”ہاں..... کیا ہوا نگینہ کو.....؟“ میں نے یکدم دھڑکتے دل کے ساتھ اور پریشان کن بے قراری سے پوچھا۔

”اس پر کل سہ پہر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔“

”کک..... کیا.....؟“ میں لرز اٹھا۔

”ہاں..... لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ اس حملے سے بال بال بچ گئی۔“ کبیر احمد نے بتایا۔

میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔

”کک..... کیسی ہے اب وہ؟..... کہاں ہے؟“ میں نے اپنی بے ترتیب دھڑکن پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا۔

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اپنے گھر پر ہی ہے۔“ وہ بولا۔

”کک..... کہیں خدا نخواستہ..... نگینہ کی طبیعت تو اچانک خراب نہیں ہو گئی تھی؟“ میں پریشانی سے بڑبڑایا۔ آخر کبیر کو مجھے کچھ تو بتانا ہی چاہئے تھا۔ ایسی بھی کیا پریشانی تھی کہ اس نے موبائل پر مجھ سے مزید بات کرنا بھی ضروری نہ سمجھا تھا۔ مجھے نظر آمیز پریشانی نے آن گھیرا تھا۔

بہر طور میں نے اسی وقت ماموں حیدر گل کو اپنے گاؤں نہ پہنچنے کی اطلاع دی کہ کہیں وہ ہمارے انتظار میں پریشان نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد میں پریشان کن خیالات میں گرفتار ہو گیا۔

\*\*\*

اگلے دن کالج پہنچا تو کبیر نہیں آیا۔ میں نے موبائل پر اس سے رابطہ کرنے کا سوچا مگر پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیا۔ اس روز میرا کالج میں دل نہ لگا۔ میں نے میس میں جا کر دوپہر کا کھانا بے دلی سے کھایا اور اپنے روم میں آ گیا۔ مجھے ایک پل کو بھی چین نہیں مل رہا تھا۔ مجھے نگینہ کی طرف سے زیادہ فکر ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی مجھے کبیر احمد پر بھی غصہ آ رہا تھا جس نے ادھوری بات کر کے مجھے بھی پریشان کر دیا تھا۔

بالآخر میں نے کبیر کے گھر جانے قصد کیا۔ اس کا گھر کالج سے زیادہ دور نہ تھا۔ کبیر کے والد نظر حیات کی نیو پنڈی صدر کے علاقے میں عالی شان کوٹھی تھی۔ وہ اکثر مجھے لے جایا کرتا تھا۔ میرے پاس موٹر بائیک تھی۔ میں اس پر سوار ہو کر اس کے گھر حیات لاج کی طرف روانہ ہو گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد میں لیاقت باغ سے گزرا اور صدر کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ چیز اور صنوبر کے درختوں کی چھاؤں میں گھری قطار اندر قطار عالی شان بنگلے اور کوٹھیاں تھیں۔ میں نے حیات لاج کے قریب اپنی بائیک روک دی۔

گیٹ پر ایک باوردی گن مین کھڑا تھا۔ وہ مجھے کبیر کے دوست کی حیثیت سے پہچانتا تھا۔ اس نے خوش خلقی سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

”کیسے ہو تم؟ ٹھیک ہوتا؟“

”جی صاحب!..... دعا ہے آپ کی۔“ وہ ایک پہاڑی شخص تھا۔

”کبیر احمد ہو گا اندر؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں..... آئیے..... چھوٹے صاحب اندر ہی ہیں۔“ اس نے مہذبانہ انداز میں مسکرا کر کہا اور بڑے سے آہنی گیٹ کا بٹلی دروازہ کھول دیا۔

میں نے اندر قدم رکھا تو پودوں اور پھولوں کی خوشگوار مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یہاں بنگلوں کا رنگ زیادہ تر سفید ہی ہوتا ہے۔ میں پختہ روش پر کھڑا تھا۔ روش کے دونوں جانب سرسبز لان تھا جہاں خوشنما پھول رنگ بہار کھیر رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ گارڈینا (موگرا) کی باڑ نے پوری کوٹھی کا احاطہ کر رکھا تھا۔ اسی طرح روش کے دونوں طرف بھی آبپاری کی گئی تھی۔ خوشنما پھول کھلے ہوئے تھے۔ پورٹیکو میں نئے ماڈل کی ڈبل کینبن انز کولر جپ کھڑی تھی۔ یہ پہاڑی علاقوں میں چلنے والی ایک لاجواب فیملی پک اپ گاڑی تھی۔ یہ کبیر احمد کا شوق تھا۔ ایک ٹویوٹا کرولا بھی تھی جو اس وقت نظر نہیں آ رہی تھی۔ پورٹیکو کے اوپر خوب صورت ٹیرس تھی۔ وہاں فیس رینگ سے جھانکتے ہوئے گملوں میں گیندے کے پھول نظر آ رہے تھے جبکہ دائیں بائیں لان میں سفید سے کے خوبصورت مخروطی انداز میں تراشیدہ پیڑ سبک خرام ہواؤں میں جھوم رہے تھے۔ سامنے روش کے انتہام پر کوٹھی کا مرکزی دروازہ تھا جو ساگوان کی لکڑی کا تھا۔ جسے ایک خاص وسیع و عریض اور سینٹ کی پختہ محراب کے اندر نصب کیا گیا تھا۔ دائیں بائیں بیگونیا، کوسی کے خوشنما پھولوں کے گلے بھی نظر آ رہے تھے مگر ان کے پتے بھی اتنے

”مجرم کون تھے؟ کس نے یہ حملہ کیا تھا اور کیوں؟“ دوسرے ہی لمحے میں نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔ نگینہ پر قاتلانہ حملے کی اندھنہ خبر نے مجھے یہ بھلا دیا تھا کہ میرا اس کے لئے اس قدر پریشانی ہوگا کہ میرا کوئی شک نہ رہتا تھا۔

”پتہ نہیں! ہم خود پریشان ہیں۔ آخر ہمارا کون دشمن بنا بیٹھا ہے؟ مجرم تو ہمیشہ کی طرح فرار ہو رہا ہے۔ اس نے قدرے مضطربانہ لہجے میں بتایا۔ اور میں اس کے ”ہمارا“ کے صیغہ کا پرچونک سا گیا۔

”ہمارا سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا وہ پراسرار دشمن.....؟“ میں نے یونہی دانستہ اپنا جملہ اور جھوٹا تو کبیر پر سوچ انداز میں سر ہلا کر صراحت سے بیان کرنے لگا۔

”ہاں..... وہ جو کوئی بھی ہے، ہمارا مشترکہ دشمن ہے۔ اس سے پہلے وہ نگینہ کے باپ شاہ میر پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ اور ایک بار ان کی کوشی پر فائرنگ بھی کر چکا ہے۔ یہی نہیں، اس پراسرار حملہ آور میرے ڈیڑی پر بھی دو مرتبہ حملہ کیا اور بالکل اسی طرح ہماری کوشی پر بھی اندھا دھند فائرنگ کر چکا ہے۔ اتنا بتا کر وہ ایک ٹائیے کے لئے رکا اور بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔

”سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ آخر کیا کھن چکر ہے؟“

”تم لوگوں نے اس نامعلوم حملہ آور کے خلاف پولیس میں رپورٹ تو ضرور درج کرائی ہوگی؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”ہاں..... کرائی تو ہے۔ مگر پولیس کا حال تو تمہیں معلوم ہے۔ وہ اندھیرے میں ٹھس ٹاک ٹوٹا مارنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کر پاتی ہے۔“

اس کی گفتگو نے مجھے ایک عجیب سی آنکھیں پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ نگینہ پر قاتلانہ حملے کی خبر نے تو مجھے ایک لمحے کو بالکل سن کر کے رکھ دیا تھا۔ مگر پھر اس کے بال بال پہنچ جانے پر میں نے اختیار اطمینان کی سانس لی لیکن یہ بات میرے لئے بہر حال باعث تشویش ہی تھی کہ آخر ان لوگوں کا اب وہ کون پراسرار دشمن ہو سکتا ہے جو بیک وقت اتنی دیدہ دلیری سے ان دونوں خاندانوں کے کینوں کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا؟ تاہم کبیر نے مزید انکشاف کیا کہ حملہ آور ہمیشہ تین چار کی تعداد میں ہوتے تھے۔ سبھی ایک پوشو بار جیب میں سوار ہو کر آتے تھے یا موٹر سائیکلوں پر۔ اور ان کے چہروں پر ہمیشہ نقاب چڑھے ہوتے تھے۔ نیز کبیر نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ نگینہ اور کبیر کے والد، شاہ میر اور نظر حیات آپس میں بہت پرانے اور گہرے دوست تھے۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ نگینہ کے والد شاہ میر حکمہ جنگلات کے کنٹرولیو آفیسر تھے۔ جبکہ کبیر علی کے ڈیڑی سرکاری ٹھیکے دار تھے اور وہ عمارتی کمزریوں کے ٹھیکے کرتے تھے۔ اس طرح ان دونوں کے سچ دو قی کے علاوہ کاروباری لین دین بھی چلتا رہتا تھا بلکہ دونوں کی دوستی کی بنیاد ہی یہی تھی۔

”یار کبیر! تم نے کبھی اپنے ڈیڑی کو اس بارے میں کریدنے کی کوشش کی ہے کہ آخر ان کی کسی سے کوئی دیرینہ چھٹاں تو نہیں چل رہی؟“ چند ٹائیے کی پڑ سوچ خاموشی کے بعد میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے ایک خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ صوفے پر بیٹھے پہلو بدل کر بولا اور بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ”بلکہ میں نے ہی نہیں، نگینہ نے بھی اپنے پاپا کو اس بارے میں کریدنے کی کوشش کی تھی مگر انہوں نے اس بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن میری طرح نگینہ کو بھی اس بات کا شبہ ہے کہ ہمارے ڈیڑی ہم سے کچھ

”جہانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”مگر یار! آخر تفتیشی آفیسر کے سامنے انہوں نے اپنے شک کا اظہار تو کیا ہی ہوگا؟“ میں نے پوچھا وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔

”پولیس کو بھی اہل اور ڈیڑی نے یہی مشترکہ بیان دیتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کی کسی کے ساتھ دشمنی میں ہے اور نہ ہی ماضی میں کبھی کسی سے ان کا کوئی اتنا ٹھنکنا تھا۔ رہا ہے کہ کوئی یوں ان کی جان کا ری بن بیٹھے۔“

”عجیب ہی چکر لگتا ہے۔ کوئی بلاوجہ آخر کیوں اتنا انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوا کہ پہلے اس نے نگینہ پر ہمارے ڈیڑی پر قاتلانہ حملہ کیا، اس کے بعد اب اس پراسرار حملہ آور کی دشمنی اس قدر سنگین صورت اختیار کر چکی ہے کہ اب وہ ان کی اولادوں کو بھی نشانہ بنانے پر تیار ہوا ہے۔“

”ہاں..... میرے ڈیڑی کو تو اب میری طرف سے بھی ٹھکر ستانے لگی ہے۔ انہیں خدشہ ہے کہ نگینہ کی طرح اب نامعلوم حملہ آور مجھے بھی ٹارگٹ بنائیں گے۔“ کبیر احمد نے مرتقل سے لہجے میں بتایا۔ میں نے اس کے لرزیدہ لہجے میں پنہاں خوف کو صاف محسوس کیا تھا۔

”یار کبیر! یہ تو واقعی بہت تشویش ناک بات ہے۔ تم لوگوں کو اس سنگین مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنا ہوگا اور جلد سے جلد نامعلوم دشمنوں کا کھوج بھی لگانا ہوگا۔“

میرے لہجے میں تشویش تھی۔ مجھے سب سے زیادہ فکر نگینہ کی تھی۔ بھلے خاموش سی مگر وہ میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ اسے خدا خواستہ کچھ ہو جاتا تو میں تا عمر قیودق صحرا کا مسافر بن کر رہ جاتا۔

”یار! تمہارے والدین کوئی معمولی حیثیت تو نہیں رکھتے۔ انہیں پولیس ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسران سے مدد لینا چاہئے۔“ میں نے کہا۔

”ایس بی وجاہت قریشی، ڈیڑی کے قریبی دوستوں میں سے ایک ہیں۔ اس کے علاوہ ڈیڑی اور گل شاہ میر (نگینہ کے والد) نے کھنڈر سے بھی رابطہ کیا ہے۔ مگر بات پھر وہیں پر آ کر رہتی ہے کہ ڈیڑی برائے گل شاہ میر آخر کسی پر اپنے شک کا اظہار تو کریں تاکہ پولیس انتظامیہ بھی کچھ ہاتھ پاؤں ہلا سکے۔“

”خوش نامعلوم اور پراسرار دشمنوں کا کھوج لگانا ناممکن حد تک مشکل ہی نظر آتا ہے۔“

اس دوران ادھیر عمر ملازمہ ایک ٹرے میں کولڈ ڈرنک کے چار گلاس رکھ کر جا چکی تھی۔

چند ٹائیے کبیر اپنے گلاس کے شراب کی سطح پر تیرتی ہوئی برف کی ڈلیوں کو پڑ خیال نظروں سے گھورتا ہوا میرے ہی اس خاموشی کو توڑا اور بولا۔

”تم لوگوں نے اپنی طرف سے کوئی احتیاطی تدابیر کر رکھی ہیں؟“

”ہاں.....“ اس نے ایک گھونٹ لیا۔ ”ڈیڑی نے اپنے طور پر مسلح گارڈز تو رکھ لئے ہیں۔“ ابھی اسے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اس کے گرتے کے سائیڈ پاکنٹ میں رکھے موبائل کی بیل گنگنائی۔

”بیل.....“ اس نے موبائل جب سے نکال کر کہا۔

”اے نگینہ!..... تم کیسی ہو؟..... کہاں سے بول رہی ہو؟“

نگینہ کے نام پر میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا اور میں نے اپنی بے چین نظریں کبیر کے چہرے پر لیز کر دیں۔

”ہاں..... میں نے نادر کو پروگرام کے کینسل ہونے کی اطلاع کر دی تھی۔ بلکہ وہ بے چارہ خود بھی ریت معلوم کرنے یہاں آ گیا ہے۔ میرے پاس ہی بیٹھا ہے۔ ہاں ہاں، میں نے اسے ساری بات بتا

میں اندر داخل ہو گئے۔  
اندرا کا ماحول سینٹرلی ایئر کنڈیشننگ کی وجہ سے خاصا سرد ہو رہا تھا۔  
دیز اور تعین قائلین پر چلتے ہوئے ہم سبز رنگ کے صوفوں کی طرف بڑھے تو شاہ میر صاحب نے  
میں ان پر بیٹھنے کو کہا اور خود اپنی بیٹی کو مطلع کرنے دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔  
یہاں بھی دیواروں پر حوط شدہ شکاری جانوروں کے سر لگے نظر آرہے تھے۔  
ایک کونے میں تیندوے کا بھس بھرا اصلی کھال کا چنگھاڑتا ہوا مجسمہ دکھائی دیا اور پھر دوسرے میں آئی  
بیکس کا بھی بالکل ایسا ہی حوط شدہ وجود ایستادہ تھا۔  
میں اور کبیر خاموشی سے صوفوں پر براجمان ہو گئے۔

میرادل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ کبیر بھی مضطربانہ انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ پھر ذرا ہی دیر بعد جس  
دروازے سے شاہ میر صاحب غائب ہوئے تھے، وہاں سے نگینہ نمودار ہوئی۔ میں چونکہ مذکورہ دروازے  
کے رخ پر ہی بیٹھا ہوا تھا اس لئے سب سے پہلے ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے  
ہونٹوں پر بڑی دلش سی مسکراہٹ ابھری۔ ہمیشہ کی طرح وہ گلاب کی مانند نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے  
اینداز میں کوئی خوف یا کسی قسم کی پریشانی کا ذرا بھی شباب نہ تھا۔ میں اسے دیکھ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔  
اس نے ہلکے تارخی کلر میں چکن کا بیش قیمت سوٹ زیب تن کر رکھا تھا جس میں اس کی گلاب سی  
نعت کا گل بدن مزید نکھر اور ستھرا ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بدستور میری طرف دل موہ لینے والی  
مسکراہٹ سے نکتے ہوئے فوراً مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کا نرم و گداز اور پھول سا نازک ہاتھ  
غلام کر جیسے میرے وجود میں برقی لہر دوڑ گئی۔

”ہائے نادرا! کیسے ہو؟“ وہ مجھ سے مترنم لہجے میں بولی۔  
”آئی ایم فائن۔“ میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ پھر وہ کبیر سے ملی اور اس کے ذرا  
نریب صوفے پر براجمان ہو گئی۔

”نادرا! میں معذرت خواہ ہوں کہ ہمارا پروگرام میری وجہ سے کینسل ہو گیا۔“ وہ خجالت آمیز لہجے میں  
دلی تو میں نے اس کی بات سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کی خیریت پوچھی۔

”نگینہ! مجھے بہت دکھ ہوا یہ سن کر کہ تم پر قاتلانہ حملہ ہوا۔“  
میری بات پر وہ بے خوف انداز میں ذرا ہنسی، پھر بولی۔

”مگر مجھے سب سے زیادہ افسوس ملکہ کو ہمارا کیر کے ملتوی ہونے پر ہوا۔ بلکہ میں تو چاہ رہی تھی کہ  
چلے چلتے مگر پپانے اجازت نہ دے کر سارے ایڈونچر کا سوا ستیاناس کر ڈالا۔“

”اوہو..... نگینہ! ہماری جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں ایڈونچر کی سوجھ رہی ہے۔ آخر تم سنجیدگی سے  
اس مسئلے کو سچ کیوں نہیں کرتی ہو؟“ کبیر نے جھلا کر اس سے کہا تو نگینہ نے لاابالی پن سے کہا۔

”موت ایک دن آتی ہے تو اس سے کیوں ڈرا جائے؟ خواہ مخواہ کسی انجانے خوف میں مبتلا ہو کر اپنا  
خون جلائے گا کیا فائدہ؟“

”بے شک نگینہ! موت کا ایک وقت معین ہے۔ لیکن جان بوجھ کر اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا  
بھی تو دانش مندی نہیں ہوتی۔ آپ کو بہر حال محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“ میں نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔

”نادرا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے نگینہ!“ کبیر نے میری بات کی فوراً تائید کرتے ہوئے کہا۔  
”اوہو.....“ مجھی یہ تم دونوں نے کیا بڑے بوڑھوں کی طرح مجھے نصیحت کرنا شروع کر دی ہے۔

دی ہے۔ وہ تمہاری طرف سے پریشان ہو رہا تھا۔ لو، بات کرو گی نادرا سے؟“  
وہ مجھے موبائل دینے کی نیت سے نگینہ سے بولا۔ میرادل یکبارگی ایک گداز خیال سے دھڑکا۔  
”کیا؟..... اچھا، پھر ایسا کرو تم مت آؤ۔ ہم دونوں خود ہی آ جاتے ہیں۔ چند بلاک چھوڑ کر  
تمہارا گھر ہے..... اوکے، خدا حافظ!“ یہ کہہ کر اس نے موبائل آف کیا اور دوبارہ جیب میں رکھ  
ہوئے اٹھ کر مجھ سے بولا۔

”چلو نادرا! نگینہ کے ہاں چلتے ہیں۔“  
نگینہ کی مزاج پر سی کا موع، یہ تقاضائے اخلاق بھی تھا اور کچھ دل نادان کا اشتیاق بھی۔ اس لئے  
فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر ہم دونوں باہر پورٹیکو میں آ گئے۔ کبیر اسی لباس میں تھا۔ وہ چابیوں کا گچھا لہراتے ہوئے  
کیمن انٹرکلوئر ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوا اور میری طرف کے دروازے کا لاک کھول کر اسے  
دیا۔ میں بھی اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک دو بار ہارن دے کر گن مین کو کم  
کھولنے کے لئے باخبر کیا اور پھر گیٹ کھلتے ہی وہ ڈبل کیمن انٹرکلوئر پک اپ کو تیزی سے ریورس میں  
ہوا باہر سڑک پر آ گیا۔

نگینہ سے دوبارہ ملنے کے مسرت آگئی تصور نے مجھے نہال کر دیا تھا لیکن اس بار سرخوشی کے  
پُرکف احساس میں ایک بے چینی بھی پنہاں تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں نگینہ کے اس بزدل  
کی بونیاں نوچ لوں جس نے میری محبوب ہستی نگینہ کو جان سے مارنے کی جرأت کی تھی۔ دس منٹ  
اندرا اندر ہم نگینہ کی پُر شکوہ کوٹھی پر پہنچ چکے تھے۔

اس کوٹھی کی شان بھی کبیر احمد کی کوٹھی سے کم نہ تھی۔ ہم جب نگینہ کی کوٹھی کے بڑے سے گیٹ  
قریب پہنچے تو میں نے گیٹ سے ایک سفید رنگ کی لینڈ کروزر کو باہر نکلتے دیکھا تھا جس کی چھت پر  
ہوڑا اور خصوصاً مونو گرام سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی اعلیٰ پولیس افسر کی گاڑی ہے۔ اس میں چند باوا  
پولیس والے بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سفید سوٹ میں ملبوس ایک شخص کو بھی ڈرائیور کے برابر میں براہ  
دیکھا تھا۔ بعد میں کبیر نے مجھے بتایا تھا کہ یہ ایس پی وجاہت قریشی تھے۔

بہر طور جب ہماری گاڑی اندر داخل ہوئی تو میں نے دو مسلح باڈی گارڈز کی معیت میں ایک  
قامت مگر خاصی ٹھنسی ہوئی جسامت والے پختہ عمر شخص کو کوٹھی کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھتے  
دیکھا۔ اس نے گرے کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہماری گاڑی کی آواز پر وہ چونک کر رکا اور  
طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔

”یہ نگینہ کے ڈیڈی انکل میر صاحب ہیں۔“ کبیر نے ہولے سے مجھے بتایا۔ پھر کبیر نے  
گاڑی کار پورچ کے قریب روک دی اور ہم اتر کر سیدھے نگینہ کے ڈیڈی کی طرف بڑھے۔ ان کے  
شیوہ چہرے پر حد درجہ سنجیدگی طاری تھی۔

”السلام علیکم انکل!“ کبیر نے ادب سے انہیں سلام کیا۔ کبیر کو دیکھ کر شاہ میر کے چہرے پر شائبہ  
مسکراہٹ ابھری۔

”یہ میرے دوست ہیں نادرا..... نادرا علی خان۔“ کبیر نے ان سے میرا تعارف کروایا تو میں  
بھی مسکرا کر ان سے مصافحہ کیا۔

”آؤ..... اندر ہی آ جاؤ۔“ وہ دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولے اور ہم دونوں ان کے

کیر کی جھلاہٹ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بیزاری کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی گہری متانت کے ساتھ اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیر! نگینہ اور تمہارے ڈیڈی پر دو نامعلوم حملہ آور دو دوسرے قاتلانہ حملہ کر چکے ہیں۔ اب ان لوگوں کے ناپاک عزائم اس قدر خطرناک بیج پر آ پہنچے ہیں کہ ان بزدلوں نے نگینہ پر بھی قاتلانہ حملہ کر لیا۔ اور خدا خواستہ تم پر بھی یہ آفت نازل ہو سکتی ہے۔ لیکن میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کو محض پولیس پر بھروسہ کرتے ہوئے یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھے رہنا چاہئے۔“

”جیسے رائٹ۔“ نگینہ فوراً چمک کر بولی۔ اس کے گل رنگ چہرے سے ایک ایسی جوش ظاہر ہونے لگا۔ پھر وہ میری تائید میں کیر سے مزید بولی۔ ”نادر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے کیر! تم خود سوچو، ہم ان بے جا حملوں میں کتنی بار بال بال بیچے..... ہمیں کم از کم اپنے طور پر بھی تو کچھ ہاتھ پاؤں ملنا ہوں گے۔“

”مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟..... جبکہ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارا دشمن کون ہے جو سات پر دوں کا چھاپا بیٹھا ہے۔“ کیر نے اس بار قدرے نظر آمیز لہجے میں کہا تو میں مستحکم انداز میں بولا۔

”دیکھو کیر! تم لوگوں کے مشترکہ دشمن کا کھوج تم دونوں کو اپنے گھر کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتا۔“

”چاہتا ہوں تم دونوں کی طرح اپنے بڑوں کو کریدنے کی کوشش کرو۔ معاف کرنا، شاید تم دونوں کو میری بری لگے لیکن موجودہ سنگین حالات میں یہ اشد ضروری ہے کہ تم دونوں اپنے بڑوں کا ماضی کریدنے کی کوشش کرو..... مگر اپنے اپنے طور پر۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارے نامعلوم دشمنوں کا سراغ اسی طرح لگ سکتا ہے۔“

میری بات پر چند ثانیے کے لئے ماحول پر خاموشی چھا گئی۔ کیر کا چہرہ تو بے تاثر ہی رہا البتہ نگینہ بڑی لہری دلچسپی کے ساتھ میری باتوں پر غور کرتی محسوس ہو رہی تھی۔

”مجھے تمہاری بات سے پورا اتفاق ہے۔“ چند ثانیے کی پُر خیال خاموشی کے بعد بالآخر نگینہ نے میری طرف دیکھ کر محسوس لہجے میں کہا اور مزید بولی۔ ”اٹ از فیکٹ..... کہ دشمن کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہونی ہے اور اس وجہ سے یقیناً ہمارے بڑے بہ خوبی واقف ہوں گے۔“

میں نے اس کی بات کے اختتام پر فوراً ایک پُر مغز لفظہ دیا۔ ”اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وجہ کا تمہارے ذہن میں گہرا کرنا چاہئے ہیں۔“

”نہیں، ایسی کوئی بات قطعاً نہیں ہو سکتی۔“ کیر نے پورے وثوق کے ساتھ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہمارے ڈیڈی اپنے دشمن سے واقف ہوں اور اتنے جان لیوا قاتلانہ حملوں کے باوجود وہ پولیس کو اپنے دشمن کا نام بتانے سے بھی گریز کریں.....؟“

”کیا خبر..... ان کی کوئی مصلحت آڑے آ رہی ہو؟“ میں نے جرح کی۔

”باوجود اس کے میرا جواب نفی میں ہو گا..... کیونکہ اب تو ہمارے بڑوں کے علاوہ وہ نامعلوم دشمن میں بھی اپنا نشانہ بنانے لگے ہیں..... اور کوئی باپ یہ نہیں چاہے گا کہ اپنی مصلحت کے آگے اپنی اولاد و قربان کر دے۔“

میں نے محسوس کیا کہ کیر کے لہجے میں قدرے تلخی سی اتر آئی تھی۔ میں نے ذرا خفیف ہو کر ہولے سے کہا۔ ”سوری یار کیر! میرا مقصد تم دونوں کو اپنے بڑوں سے متعلق شے میں مبتلا کرنا نہیں تھا۔“ اتنا کہہ کر میں خاموش ہوا۔ مگر لگتا تھا کیر کا دل بکھر رہا تھا۔ وہ بدستور اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے

بڑانے والے انداز میں بولا۔

پلیز! فارگٹ اٹ۔“ نگینہ نے کھنڈرے پن سے کہا۔ ”اچھا یہ بتاؤ، کیا پو گئے تم دونوں؟“

”سردست تو ہم تمہاری باتیں سن کر اپنا ہی خون پی رہے ہیں۔“ کیر نے زچ ہو کر کہا تو نگینہ بے اختیار کھنک دار ہنسنے لگی۔ اس کے موتیوں کی لڑی جیسے سفید دانتوں کی جھلک مجھے بڑی بھلی محو ہوئی تھی۔ پھر اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ میں نے منع کرنا چاہا مگر اس نے ملازمہ کو بلا کر کولڈ ڈرا لانے کا کہہ ہی ڈالا۔

”نگینہ! ایک بات بتاؤ؟“ میں نے ہولے سے کھنک کر کہا۔ وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ ”کیا تم اس حملے کی تھوڑی تفصیل بتانا پسند کرو گی؟“

اس نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری مگر قدرے خوشگوار چہرے کے تاثرات کے ساتھ ہمکاری بھری ”شکر ہے..... کسی نے تو مجھ سے اس انداز میں تفصیل پوچھی۔“ پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بتا دی۔

”میں کل سہ پہر ہلکی پھلکی شاپنگ کے لئے صدر بازار گئی تھی۔ کار میں خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ ہلکی پھلکی شاپنگ میں تنہا ہی کرنے جاتی ہو۔ واپسی میں اپنی ایک سہیلی عروسہ سے مل کر ایوب پھل پھاڑنے سے گزرنے لگی تو ایک پرانے ماڈل کی ٹویٹا کرولا کار نے عقب سے میری کار پر فائرنگ کر ڈالی۔ میرے گاڑی کے سارے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ مگر شکر رہا کہ کسی گولی نے میرا مزاج نہ پوچھا۔ میں پہلے تو اچانک حملے پر ہلکائی گئی لیکن پھر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے حواس پر قابو پایا اور کاری کا خطرناک حد تک بڑھاتی ہوئی کانی دور نکال گئی۔“

اتنا بتا کر وہ خاموش ہو گئی۔ میں چند ثانیے پُر سوچ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر توفانی لہجے میں بولا۔

”یہ تم نے بہت بہادری کا کام کیا کہ بروقت کار دوڑا لے گئیں۔ خیر!“ میں نے لمحہ بھر توقف کے اصل بات کی طرف آتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔ ”کیا تم نے ان نامعلوم حملہ آوروں کے چہرے دیکھنے کی کوشش کی تھی؟ یا وہ تعداد میں کتنے تھے؟“

میرے استفسار پر وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر قدرے گونگو سے لہجے میں بولی۔

”میرے عقب میں چونکہ کچھ خاص ٹریفک نہ تھی اس لئے جب ان حملہ آوروں کی کار عقب سے میرے ذرا قریب آئی تھی تو اچانک غیر ارادی طور پر میری نگاہ اپنی گاڑی کے بیک ویو مرر پر پڑی۔ بس ایک سرسری سی نظر میں مجھے اگلی سیٹوں پر دو افراد بیٹھے دکھائی دے گئے تھے۔ پھر اس کے اگلے لمحے میری کار پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں نے بریک لگانے کے بجائے فوراً ایکسیلیٹر دبایا۔ میری گاڑی کا عقبی شیشہ چکنا چور ہو گیا تھا۔“

”حملہ آوروں نے کتنی دور تک تمہارا پیچھا کیا تھا؟“ میں نے پوچھا تو کیر احمد بیزار ہو کر درمیان جھلا کر مجھ سے بولا۔

”ارے یار!..... تم نے کیا پولیس والوں کی طرح تفتیش شروع کر دی ہے۔ پولیس یہ سارا سوالات پہلے ہی نگینہ سے کر چکی ہو گی۔“

”نہیں کیر!..... نادر کو پوچھنے دو۔“ نگینہ نے گہری متانت کے ساتھ کیر کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتی ہوں..... پولیس محض ضابطے کی کارروائی نمٹا کر اور ہمیشہ کی طرح غفلت سلی دیتے ہو چل دیتی ہے۔“

”اوہو..... بھئی تو پھر یہ نادر میاں کیا کر سکتے ہیں بھلا؟ پولیس تو اب تک کچھ نہیں کر پائی ہے۔“



بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا لیکن میری بروقت ہدایات پر اس کا عمل کرنا غیر ارادی ہی تھا۔ اس لئے اس کے بدحواس ہونے کے باوجود ہم دونوں ہی گولیوں کی اس خونخواری پوچھاڑ سے محفوظ رہے تھے۔

گاڑی کے شیشے ٹوٹنے کے علاوہ کئی گولیاں گاڑی کی گاڑی میں بھی پیوست ہوئی تھیں۔ بہر طور کبیر نے جیسے ہی میری ہدایات کے مطابق اسٹیلیر پر اپنے پاؤں کا سارا زور صرف کر دیا، ہماری گاڑی کا انجن زور سے غرایا اور تاروں کی چڑچاہٹ کے ابھرے ہی وہ آندھی طوفان کی طرح دوڑنے لگی۔

ہم دونوں اب سیدھے ہو کر بیٹھ چکے تھے۔ کبیر کے چہرے پر ارتعاش تھا۔ خود میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو چکی تھی۔ ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ نامعلوم حملہ آوروں کی گرین ہائی روف ہمارے، تعاقب میں تھی۔ وہ ہماری گاڑی پر اب وقفے وقفے سے فائرنگ کر رہے تھے۔

سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا ورنہ ایوب پارک اور نیو پنڈی کے صدر جیسے علاقوں میں اس سے ٹریفک کا میل رواں ہوتا ہے۔ کبیر احمد خاصی تیز رفتاری سے گاڑی دوڑائے لئے جا رہا تھا۔ اس کا رخ اب اپنے گھر کی بجائے دوسری طرف ہو گیا تھا۔

یہ سڑک دونوں طرف سے صورت اور چیز کے درختوں میں گھری ہوئی تھی جو آرمی میوزیم کے سامنے سے گزرتی تھی۔ اچانک عقب سے ایک فائرنگ کے نتیجے میں ہماری گاڑی کا عقبی شیشہ ایک زوردار چھانکے کی آواز سے ٹوٹا تو غیر ارادی طور پر ہم دونوں نے اپنے سروں کو ذرا نیچے جھکا لیا۔ نتیجتاً کبیر کے اسٹیرنگ پر جھپٹے ہوئے دونوں ہاتھ بہک گئے۔ گاڑی چونکہ خاصی اسپید میں تھی اس لئے وہ بری طرح دوڑنے لگی۔ یہ بہت جان لیوا حد تک خطرناک صورت حال تھی۔

”بریک مت لگانا کبیر!“ میں حلق کے بل چیخا۔ ”گاڑی کو آہستہ آہستہ کنٹرول کرنے کی.....“ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ بھاری بھر کم ڈبل کیبن انٹرکولر کسی شتر بے مہار کی طرح ڈھلتی ہوئی کبیر کے قابو سے باہر ہو گئی اور دائیں جانب ایستادہ درختوں کے جھنڈ کی طرف لپکی اور کبیر نے وہی غلطی کر ڈالی جس کا مجھے ذرہ تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کا پاؤں بریک پڈل پر پڑا۔ گاڑی کا تار زور سے چڑچاہنے اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ الٹ گئی۔ یوں لگا جیسے پوری دنیا گھوم گئی ہو۔ زبردست جھٹکوں کے ساتھ بھیاں تک دھماکے مجھے اپنی ڈھلتی ہوئی ساعتوں میں سنائی دیئے۔ اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا.....!

\*\*\*

بے ہوشی سے ہوش مندی کی طرف لے جانے والی حس کے بیدار ہوتے ہی مجھے سب سے پہلے ایک نمیں زدہ سی اذیت کا احساس ہوا اور تکلیف کے باعث میرے منہ سے بے اختیار کراہ آمیز سسکاری نکل گئی۔ اگرچہ ابھی میرے حواس خمسہ پوری طرح بیدار نہیں ہوئے تھے۔ لیکن جتنے بیدار ہو سکے تھے اسی سے میں نے اپنے ارد گرد لوگوں کا شور سامحوس کیا تھا۔ میرا نیم بے ہوش ذہن اندھیروں کے بھنور سے نکلنے کی از خود مسلسل جدوجہد کر رہا تھا لیکن باوجود اس کے میں نے شاید ابھی تک آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ پھر یوں لگا جیسے کوئی بے حس و حرکت وجود کو کھینچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسی لمحے دوبارہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔ ایک بار پھر دنیا و مافیہا سے رابطہ ٹوٹنے کے دوران میری نیم بیدار ساعتوں نے ایسویٹس کے سائرن کی آواز سنی تھی۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو اس مرتبہ بیک وقت میری پانچوں حیات نے بیدار ہو کر میرے تاریک ذہن کو مکمل شعور عطا کیا تھا۔

”بہر حال میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ چکا ہوں۔ تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ہمارے بڑوں سے ماضی ضرور کوئی ایسی لغزش یا جرم سرزد ہوا ہے..... اسی لئے وہ نہ صرف اپنے دشمن سے بھی واقف ہیں اس کا نام لینے سے اس لئے کترار ہے ہیں کہ..... کہیں.....“

”اوکے، اوکے..... لیو دس ٹاپک۔“ میں بدمزگی کی فضا کو بدلنے کی غرض سے اس کی بات کا سنجیدہ لہجے میں بولا۔ مجھے دکھ ہو رہا تھا کہ کبیر نے میری بات کا غلط مطلب اخذ کیا تھا۔ اگرچہ اس کی بھی غلط نہ تھی۔ میں ان دونوں کو جو سمجھانا چاہ رہا تھا وہ اشاروں کنایوں میں سمجھا چکا تھا۔ لیکن کبیر سوچنے کا انداز منفی تھا۔

”کبیر.....!“ اچانک گنیمت نے ذرا سخت لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر سرد انداز میں کہا۔ ”تم مجھ جانتی ہو رہے ہو..... تار جو بات سمجھانا چاہ رہا ہے، وہ تلخ ضرور ہے لیکن اس میں ہمارا فائدہ ہے پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”تار! تم بالکل درست خطوط پر سوچ رہے ہو۔ میں اب اپنے پاپا کو کسی نہ کسی طرح کریدنے کی کوشش کروں گی۔“

”تو گویا اب ہم اپنے والدین کی ٹوہ لینے کی کوشش کریں..... لا حول ولا.....“ کبیر کا بدستور خراب تھا۔ میں گفتگو کو ختم کرنے کی نیت سے اٹھا تو کبیر نے بھی میری تقلید کی۔ گنیمت سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس کی دل نشیں آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر اپنے لئے ایک مجیدوں بھری چمکا محسوس کی تھی۔

میں اور کبیر واپس گاڑی میں آ بیٹھے۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ مجھ سے کچھ خفا خفا سا لگ رہا تھا۔ میں نے بھی اس سے کوئی بات کرنا ضرور نہ سمجھا۔ لیکن مجھے دکھ کے ساتھ عجیب سی حیرت بھی ہو رہی تھی کہ آخر کبیر کو میری یہ بات بہ الفاظ دیگر اس قدر بری کیوں لگی تھی؟ حالانکہ میں نے تو ایک حقیقت آمیز بات کہی تھی کہ گنیمت اور کبیر کو اپنے پاپا ڈیڑی سے اس بارے میں کھل کر گفتگو کرنی چاہئے تھی کہ ان کے بڑوں کی ماضی میں کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں رہی تھی؟ گنیمت نے البتہ کھلے دل سے میری اس تجویز کی تائید کی تھی۔ کیونکہ میں نے ان باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ان نامعلوم حملہ آوروں کا ذاتی طور پر کھوج لگانے کی نہ صرف اپنے میں خواہش رکھتی تھی بلکہ عزم بھی کر رکھا تھا۔

کبیر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا بدستور خاموشی کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا۔ ذرا دور جا کر اس نے موڑ کاٹا تو مجھے سڑک کے دائیں کنارے پر ایک گرین کلر کی ہائی روف گھڑی نظر آئی۔ ہماری ڈبل انٹرکولر نے جیسے ہی موڑ کاٹا اور اس کے قریب سے گزرنے لگی تو اچانک میری پچھلی حس نے خطر۔ الارم بجایا۔ ہائی روف کا سلائڈنگ ڈور کھلا ہوا تھا۔ جہاں میری نظر ڈرائیور کے علاوہ دو نقاب پوشا پڑی۔ پھر ان کے ہاتھوں میں سیاہ رائفلوں کی مہیب جھلک دکھائی دی۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور اگلے ہی لمحے میں حلق کے بل چیخا۔

”کبیر.....! نیچے جھک جاؤ۔“

اس کی بھی غالباً ان پر نظر پڑ چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے فضا میں گولیوں کی سمع خراش ترترزاہٹ آئی مگر میں اور میرے بروقت ہوشیار کرنے پر کبیر احمد بھی اپنا سر نیچے جھکا چکا تھا۔ گولیوں کی بھیا ترترزاہٹ کے ساتھ ہی گاڑی کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے کی آواز ابھری تھی۔

”اسٹیلیر دبا دو..... فوراً.....“ میں نے نیچے سر کرتے ہوئے کبیر سے چلا کر کہا۔ وہ بری

میں نے خود کو ایک صاف ستھرے اور آرام دہ بیڈ پر پڑے پایا تھا۔ میرے نکتوں سے اودیوار مخصوص کی نوکرائی تو فوری اور اک ہوا کہ میں کسی ہسپتال کے کمرے میں تھا۔ لیکن اس بار میں اپنے دل میں کچھ خاص تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ البتہ کراہ کا سبب جسمانی اٹھن ہی تھا۔ میرے دائیں جانب ایک ڈرپ اسٹینڈ نظر آ رہا تھا اور تب اچانک ہی میری نیم وا آنکھوں نے ایک گرنگ چہرہ دیکھا۔

مجھے اپنے حلق میں کانٹوں کی جھین کا احساس ہوا۔  
”پپ..... پانی.....!“

میرے لرزیدہ ہونٹوں سے نکلا تھا۔ پھر اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے میرا ذہن دوبارہ لامتناہی تاری کے گرداب میں ڈوبنے لگا ہو۔ میری نیم وا آنکھوں کے سامنے نگینہ کا چہرہ جیسے ایک لمحے کے لئے ہی نمودار ہوا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ پھر نظر آئی تو میں نے جسم و جان کی ساری توانائی صرف کرتے ہوئے ذہن کو ظلمت کی دلدل میں پھنسنے سے بچایا۔ نگینہ نے مجھے ایک ہاتھ ذرا سہارا دیا تو میری رگ جاں تک چم تو انائیوں کا سمندر موجزن ہو گیا۔

اس نے پانی کا گلاس میرے متحرک لبوں سے لگا دیا تھا۔ پیاس کی شدت سے سو کے حلق میں پانی کی تراوٹ اترتے ہی میں نے پوری طرح اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اٹھنے کی ایک غیر ارادہ کوشش کی تو مجھے اپنے دائیں بازو کی کس میں جھین کا احساس ہوا۔  
”پلیز نادر!..... آرام سے لیٹے رہو۔ تمہیں ڈرپ لگی ہوئی ہے۔“ نگینہ کی مدھر آواز ابھری۔  
”جھین ہوش تو آیا۔“

جسمانی اور شعوری طور پر بیدار ہوتے ہی مجھے وہ سب یاد آنے لگا جس کے باعث میں یہاں ڈاکٹر کے ہسپتال کے بیڈ پر تھا۔  
”کبیر..... کیسا ہے؟ وہ کہاں ہے؟“ میں نے نگینہ کے خود پر قدرے جھکے چہرے کی طرف دیکھ کر متوجہ ہو کر قرار دیا۔

”وہ بھی ٹھیک ہے۔ تم دونوں اتنے بڑے حادثے میں موت سے بال بال بچے ہو۔“ نگینہ نے ایک طمانیت بھری سانس لے کر کہا۔ ”تمہاری طرح اسے بھی معمولی چوٹیں آئی ہیں۔“  
میں نے بے اختیار ایک گہری سانس لے کر ذرا دیر کے لئے اپنی آنکھیں موند لیں۔ یہ معجزہ ہی کہ ہم دونوں نہ صرف زندہ تھے بلکہ زخم بھی معمولی آئے تھے۔ میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی، باقی وہ صحیح سلامت تھا۔

”نگینہ!..... پلیز نرس کو بلا کر یہ ڈرپ اتار دو۔ میں اب خود کو بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“  
”جی لہجہ میں اس سے کہا تو وہ بولی۔“

”نظرہ..... میں ڈاکٹر صاحب کو بلا کر لاتی ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔  
میں اور کبیر جن نگینہ حالات کا شکار ہوئے تھے، وہ دوہری نوعیت کے تھے۔ ہمارے تعاقب نامعلوم حملہ آور تھے۔ پھر ہماری گاڑی بے قابو ہو کر الٹ گئی تھی۔ مگر مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ ہمارے حملہ آور محتاقین ہمیں اس حالت میں چھوڑ کر کیوں لوٹ گئے تھے؟ کیا انہیں یقین تھا کہ اس حادثے میں کبیر اور میں جانبر نہیں ہو سکتے تھے یا پھر کوئی اور وجہ تھی؟  
بہر طور ذرا دیر بعد نگینہ کے ہمراہ ایک سفید گاؤن میں ڈاکٹر نمودار ہوا۔ اس کے ہمراہ ایک نرس

ہاتھوں میں کلپ بورڈ اور بی پی اپریٹس وغیرہ اٹھائے اندر داخل ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب خامے پختہ عمر تھے۔ انہوں نے سیاہ رنگ کے موٹے فریم کی عینک چھار کھی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”نادر صاحب! کیا محسوس کر رہے ہیں آپ؟“

میں نے اپنی ثقاہت کو خاطر میں لائے بغیر ہلاکت سے مسکرا کر کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر میرا دوست..... کبیر کیسا ہے؟“

وہ جواب اسی طرح اپنے بشرے پر مسکراہٹ سجائے بولے۔ ”وہ بھی تمہاری طرح بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرو میاں! تم دونوں نہ صرف معجزانہ طور پر زندہ بچے ہو بلکہ اس قدر جان لیوا حادثے میں تم دونوں کو معمولی فریچر بھی نہیں ہوا ہے۔ بہر حال میری طرف سے نئی زندگی کی مبارک باد قبول کرو۔“  
”بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب!“ میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! کیا اب میں فارغ ہوں؟“

”بالکل.....“ وہ بولے۔ ”میں ذرا آخری ایک معائنہ کر لوں، اس کے بعد ایک نسخہ لکھ کر دے دیتا ہوں۔ باقاعدگی سے، پانچ روز تک استعمال کرتے رہنا۔“

اسٹینڈ پر جھومتی ہوئی ڈرپ بھی نصف سے زیادہ ختم ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے نرس کو اسے اتارنے کا کہا۔ تھوڑی دیر بعد میں بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے اٹھ بیٹھا تو دروازے پر ایک شخص کو نمودار ہوتے دیکھ کر میں ذرا سا چونک گیا۔ وہ شاہ صاحب تھے، نگینہ کے چہرے پر ہلا کی تشویش تھی۔ میں نے فوراً بولے سر کے اشارے سے انہیں سلام کیا۔

”جیتے رہو بیٹا! کیسے ہوا؟“ انہوں نے جبراً مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔

”کافی بہتر ہوں۔“ میں نے مختصر اُکھا۔

”اوکے!“ اتنا کہہ کر وہ قریب کھڑے ڈاکٹر سے مخاطب ہوئے۔ ”کیا آپ انہیں اب ڈسچارج کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

”جی ہاں.....“ ڈاکٹر صاحب نے کہا اور نرس کے ساتھ کمرے سے نکلنے چلے گئے۔  
تھوڑی دیر بعد میرا ڈسچارج کارڈ ایک وارڈ بوائے لے کر آیا۔ میں سہارے کے بغیر چل سکتا تھا۔ کبیر کا کمرہ بھی میرے برابر ہی تھا۔ اس کے سر پر اور دائیں بازو پر بینڈیج تھی۔ اس کے ڈیڑی نظر حیات وغیرہ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ چار عدد باوردی پولیس اہلکاران کے ہمراہ تھے۔ اس کے علاوہ شاہ میر اور نظر حیات کے سچ محافظ بھی چوکس انداز میں وہاں موجود تھے۔

ہم سب ہسپتال کی عمارت سے باہر آئے تو کشادہ احاطے میں دو کاریں کھڑی تھیں۔ نگینہ مجھے لئے ایک کار کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں باوردی شو فر مستعد کھڑا تھا جس نے لپک کر ہمارے لئے دروازہ کھولا تھا۔ میں اور نگینہ عقبی سیٹوں پر براجمان ہو گئے جبکہ شاہ میر صاحب ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر تھے۔ ایک پولیس افسر کی نیلی جیب بھی وہاں موجود تھی۔ نظر حیات کے ہمراہ چار پولیس گارڈ اور ایک پولیس آفیسر بھی تھا، جس کے شو لڈر اور سینے پر لگے پھولوں سے وہ ایس پی ریک کا افسر نظر آ رہا تھا۔ ہماری گاڑی میں سب کے براجمان ہوتے ہی تینوں گاڑیاں ہسپتال سے روانہ ہو گئیں۔ ان گاڑیوں کی منزل کبیر کے والد نظر حیات کی رہائش گاہ تھی۔

مجھے اب اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ میں واپس اپنے ہاسل جانا چاہتا تھا مگر مجبور تھا۔ کیونکہ کم از کم ڈیڑھ

مسکراہٹ سے کہا تو میرے ہونٹوں پر بھی ایک جھپکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی مگر میں بولا کچھ نہیں۔ نگینہ کا چہرہ کھلنے لگا۔ پھر پوچھا۔  
”کیا پیش کی آپ؟“

”آں..... نہیں..... ابھی ابھی میں نے عذرا اور شہلا کے ساتھ چائے پی لی تھی۔“ وہ بولی۔ میں نے اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لہراتے دیکھیں۔  
”پھر بھی..... میرے ساتھ تو آپ کو کچھ نہ کچھ لینا ہی پڑے گا۔“ میں نے اس کے چہرے کو پر شوق نظروں سے دیکھتے ہوئے نیم باز مسکراہٹ سے کہا۔ میرے لیے یہ بڑے گراں قدر لمحات تھے۔ محبت کا سرمایہ۔

”اچھا، پھر ایسا کرتے ہیں ذرا دیر بعد کو لڈ ڈرک پی لیتے ہیں۔“ اس نے کہا پھر چند ٹاپے میری طرف سوچتی ہوئی نگاہوں سے تکتے رہنے کے بعد بولی۔

”نادر صاحب.....“

”آں..... نہیں، صاحب نہیں چلے گا..... صرف نادر.....“ میں نے دوستانہ بے تکلفی سے اسے ٹوکا۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔ پھر دوسرے ہی لمحے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔  
”نادر!..... درحقیقت میں آپ کے پاس ایک گزارش لے کر آئی تھی۔“

میں اس کی بات پر ذرا چونکا۔ ”گزارش..... کیا مطلب؟..... بھلا دوستوں میں یہ باتیں زیب دیتی ہیں؟“ میں نے اپنے بے لگام دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔ میرے لہجے میں اپنائیت کا سمندر موجزن تھا۔ اس کے سرخ لیوں پر صرف ایک لمحے کے لئے بڑی معنی خیز مسکراہٹ اُبھری تھی۔

”یہ آپ کا ظرف ہے..... دراصل اس روز مجھے آپ کی باتوں نے کافی متاثر کیا تھا۔ آپ نے ہماری پریشانیوں سے شیر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بڑی غور طلب باتیں کی تھیں جو میرے لئے کافی سودمند ثابت ہوئی تھیں۔“

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا، وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ اس لئے مسکرا کر بولا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے آپ کو متاثر کرنے کے لئے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہاں، بعض دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے میں نے تمہارے اور کبیر احمد کے سامنے ایک تجویز رکھی تھی مگر لگتا ہے..... کبیر احمد مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔“

”اسے ناراض ہونا چاہئے تھا۔“ وہ عجیب اسرار بھرے لہجے میں بولی اور میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ میری استفہامیہ نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے دوبارہ بولی۔

”کبیر کو تمہاری بات اس لئے بری لگی تھی کہ تم نے ہمارے نامعلوم دشمن کا کھوج لگانے سے متعلق جو با مقصد تجویز ہمیں دی تھی، اس سے میں تو سو فیصد متفق تھی۔ لیکن کبیر تمہاری اس تجویز سے بری طرح چڑ گیا تھا۔ اس پر مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی تھی کہ آخر وہ..... وہ یہ بات تسلیم کرنے سے کیوں انکاری تھا کہ ہمارے والدین کی ماضی میں ضرور کسی سے دشمنی رہ چکی تھی اور وہ یہ وجہ بتانے سے دانستہ کترا رہے تھے کہ کیا خبر..... اس میں ہمارے بڑوں کی غلطی بھی شامل رہی ہو..... اس لئے ہمیں اپنے بڑوں کی ٹوہ لینا ہوگی۔ یہ بات بری سہی لیکن اس کے نتائج ہمارے لئے سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔ تمہاری تجویز کے فوراً بعد میں نے اس پر عمل کر ڈالا اور جلد ہی اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہونے لگے۔“ وہ یہاں

دو گھنٹوں سے پہلے میں یہاں سے مل بھی نہیں سکتا تھا۔ ایس بی نے، جن کا نام مظفر حسین تھا اور جو نظم حیات اور شاہ میر کے چند قریبی مشترکہ دوستوں میں سے تھے، ہم دونوں سے نہایت با وقار اور دلچسپ دھیسے لہجے میں حالات گزشتہ کی تفصیل پوچھی۔ درمیان میں وقتاً فوقتاً سوالات بھی کرتے رہے۔ زیادہ تر انہیں مجھ سے ہی مخاطب رہے تھے۔

بالآخر پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے جانے کی اجازت چاہی اور پھر میں واپس اسنے ہاسٹل آ گیا۔ میرا ارادہ چند روز کے لئے گاؤں جانے کا ہوا مگر پھر یہ سوچ کر کہ کہیں ماموں حیدر گل پریشان نہ ہو جائیں، دوسری بات میرے امتحانات بھی سر پر تھے لہذا میں نے یہ غرض آرام کالج سے صرف دو روز کا چھٹی لے لی۔

تیسرے روز میں بالکل بھلا چنگا ہو گیا۔ میرے سر سے پٹی بھی اتر گئی تھی۔ باقی چھوٹے موٹے ڈا بھی بھر گئے تھے۔ پیشانی پر البتہ زخم کا ہلکا سا نشان باقی رہ گیا تھا۔ یہ معمولی قسم کا زخم تھا جو وقت گزر کے ساتھ ساتھ خود ہی بھر جاتا۔ اس عرصے میں نہ کبیر کا فون آیا اور نہ ہی وہ خود کالج آیا۔

چوتھے روز صبح کو جب میں تیار ہو کر کالج جانے لگا تو نگینہ نے موبائل کے ذریعے مجھ سے رابطہ کر کے بتایا کہ وہ آج مجھ سے کالج آ کر ملنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے کالج کینٹین میں بارہ بجے کا وقت دیا۔ پہلا موقع تھا کہ نگینہ نے مجھ سے نہ صرف بذات خود میرے موبائل پر مجھ سے رابطہ کیا تھا بلکہ مجھ سے ملاقات کرنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا تھا۔ میرے دل میں عجیب سی سرستیں پھوٹنے لگیں تاہم مجھ حیرت تھی کہ اسے میرے موبائل کا نمبر کس طرح پتہ چلا تھا؟ ہو سکتا ہے کبیر سے میرا موبائل نمبر لے ہو؟ میں نے سوچا اور نگینہ سے ایک ”تنبہ“ ملاقات کی سرشاری میں شاداں و فرحان کالج پہنچا۔

مجھے بے چینی سے بارہ بجتے کا انتظار تھا۔ تین ٹیکرز بھٹکنے کے بعد میں ٹھیک بارہ بجے دھڑکتے دل کے ساتھ کالج کینٹین پہنچا تو میری بے قرار متلاشی نظروں نے ایک قدرے دور افتادہ گوشے میں نگینہ بیٹھے پایا۔ وہاں دو کرسیوں پر اس کی سہیلیاں بھی موجود تھیں۔ اسے سہیلیوں کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر مجھ کو فٹ سی محسوس ہوئی تھی۔ بہر طور جب میں ان کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ دونوں سہیلیاں آ کالج کی طالبات تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ نگینہ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئیں۔ نگینہ کوشش لہجے میں آواز کہہ کر میں قریبی چیئر پر براجمان ہو گیا۔ اس کا چہرہ ویسے ہی تازہ گلاب کی مانند دک رہا تھا۔  
”کیا آپ نے باہر نکلتا شروع کر دیا مس نگینہ؟“ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔  
جواباً وہ بھی مسکرا کر بولی۔ ”ظاہر ہے، گھر میں آخر کتنے روز بند ہو کر بیٹھا رہا جا سکتا ہے؟“

”ہاں..... یہ تو آپ کی بات درست ہے۔“ میں نے اس کی تائید ضروری سمجھی۔ ”لیکن پھر موجودہ حالات میں آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“ میں نے ساتھ ہی اپنی فکر مندی بھی ظاہر کر دی۔ ”موت تو ایک دن آتی ہے۔ پھر ڈرنا کیسا۔ یوں خوف زدہ ہو کر گھر میں قید ہو کر زندگی گزارنا بھی موت سے بدتر ہے۔ خیر چھوڑو، آپ سنائیں..... اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ اس نے۔ پرواہی سے کہا اور آخر میں میری خیریت پوچھی۔

مجھے اس کا کبھی ”تم“ اور کبھی ”آپ“ کا صیغہ استعمال کرنا عجیب ہی لگتا تھا۔  
”خاصی بہادر ہیں آپ..... ویسے مجھے کیا ہوا تھا؟ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ البتہ کبیر کی خیر نہیں معلوم ہو سکتی مجھے۔ نہ ہی اس نے مجھ سے رابطہ کیا دوبارہ۔“  
”لگتا ہے وہ تم سے چڑ گیا ہے۔“ نگینہ نے میرے چہرے پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے عجیب

پریشان نظر آنے لگا۔ پھر مضرب لہجے میں بولا۔  
”ت..... تم نے..... کیا سنا.....؟“

”میں نے سب سن لیا ہے..... کیا تمہیں بتانا ضروری ہے؟“ میرے سرد لہجے نے اسے جب بری طرح زچ کیا تو وہ میری طرف چند لمحے بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا پھر ایک ایک لفظ چبا کر مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا۔

”گنبد!..... بعض باتوں کو جاننا ہمارے لئے ضروری نہیں ہوتا۔ اس طرح خواہ مخواہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔“ اس کا لہجہ ذرا نرم پڑ گیا تھا۔ مگر میں بدستور خشک لہجے میں بولی۔

”مگر میں جاننا چاہتی تھی کہ اندر ہمارے کون سے نامعلوم دشمنوں کے بارے میں خفیہ ڈسکشن ہو رہی ہے؟“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے گنبد!“ وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ پھر دانت پیس کر بولا۔ ”یہ سارا کیا دھڑاندو کا ہے۔ اس نے ہی تمہارے دماغ میں یہ خناس بھر دیا ہے کہ اپنے بروں کی ٹوہ لگاؤ۔“  
”یہ خناس نہیں، حقیقت ہے۔“ میں نے بھی سخت لہجے میں کہا۔ کیونکہ میں جان چکی تھی کہ اندر ان تینوں کے درمیان ضرور ان نامعلوم حملہ آوروں کے بارے میں خفیہ میٹنگ ہو رہی تھی جو ہمارے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ تاہم میں نے کبیر احمد سے صاف صاف کہہ دیا کہ نادر کی بات سو فیصد درست ثابت ہوئی ہے کہ پاپا اور انکل ہی نہیں بلکہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارے دشمن کون ہو سکتے ہیں؟ مگر ان کا نام لینے سے دانستہ گریز کیا جا رہا ہے۔ اتنا کہہ کر میں باہر چلی آئی۔“

گنبد یہ سب بتا کر خاموش ہوئی تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کبیر کا رویہ غیر فطری اور کچھ معاندانہ تھا۔ کچھ دیر دریائے سوچ بچار میں غوطہ زن رہنے کے بعد میں گنبد سے مخاطب ہوا۔

”گنبد! درحقیقت میں نے تو دوستی کے ناتے اپنا ایک فرض نبھانے کی کوشش کی تھی جو شاید کبیر کو بری لگی۔ میرا خیال ہے کہ مجھ سے ناراضگی بجا ہے۔ مجھے واقعی تم لوگوں کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے تھی۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ بعد میں تمہیں بھی میری بات ناگوار گزرے..... اور میں..... تمہاری دوستی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں جو مجھے بہر حال قطعاً گوارا نہیں۔“ نہ جانے میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ کیسے کہہ ڈالا تھا کہ اچانک گنبد کے چہرے پر ایک گہرا تاثر ابھرا تھا۔ میری بات پر اسے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا، اس کے نرم و گداز لیوں پر ایک گہری مسکراہٹ ابھری اور آنکھوں میں عجب سی چمک نمودار ہوئی۔ پھر وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

”نادر.....!“ اس کے پکارنے میں عیدوں بھری عینیت گہرائی تھی۔

”ہوں.....؟“ میں نے بدستور اس کی دل نشین آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مختصر اُ کہا۔

”کیا تم مجھے کبیر جیسا انسان سمجھتے ہو؟“

میں اس کی بات پر ذرا چونکا پھر ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔

”نہیں..... ایسی بات نہیں۔ دراصل.....“

”مجھے تمہاری دوستی پر ذرا بھی شبہ نہیں ہے نادر.....!“ وہ اچانک میری بات کاٹ کر جیسے دل کی گہرائیوں سے بولی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہو کہ..... نادر! مجھے تمہاری محبت پر ذرا بھی شبہ نہیں۔

”مجھے اگرچہ تمہارے ساتھ دوستی میں زیادہ عرصہ نہیں ہوا..... مگر دوستی تو دوستی ہوتی ہے۔ جو دنوں،

نک بتا کر خاموش ہوئی تو میں ذرا ٹھٹک سا گیا۔

”کیا نتائج برآمد ہوئے..... پھر؟“ میں نے فوراً پوچھا تو وہ گہری سنجیدگی کے ساتھ بتانے لگی۔

”سب سے پہلے تو میں نے اپنے پیاسے ان کے ماضی کے حوالے سے یہی پوچھنے کی کوشش کی کہ ماضی میں ان کی کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں رہی۔ انہوں نے اگرچہ پورے وثوق کے ساتھ انکار کیا تھا مگر میں نے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ ان کے چہرے کے تاثرات ان کے لہجے کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ مجھے یہ بات کھٹک گئی اور میرا تمہاری اس بات پر پختہ یقین ہونے لگا کہ ہمارے نامعلوم دشمنوں کا تعلق ہمارے بروں سے رہ چکا ہے۔ ابھی کل رات ہی کی بات ہے.....“ وہ انکشاف کرنے کے انداز میں آخر میں بولی اور میں بہ غور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ایک ذرا توقف کے بعد دوبارہ کہہ شروع کیا۔

”کل شام پاپا کو انکل نظر حیات صاحب (کبیر کے ڈیڈی) کا فون آیا تھا۔ انہوں نے پاپا کو رات کو بجے اپنے ہاں بلوایا تھا۔ انکل (نظر حیات) نے شاید پاپا سے کوئی ضروری بات کرنا تھی ورنہ اکثر وہی پاپا کے پاس آتے تھے۔ جب وہ ٹھیک نو بجے رات کو ان کے ہاں جانے لگے تو میں نے بھی ان کے ساتھ جانے کی ضد کی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے مگر میرے اصرار پر وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ جب ہم دونوں انکل نظر حیات کے ہاں پہنچے تو اس وقت انکل اور کبیر ان کے منظر تھے۔ البتہ مجھے ان کے ہمراہ دیکھ کر وہ دونوں خاصے جزبہ ہوئے۔ اس کے بعد انکل نظر حیات پاپا کو اوپری منزل کے ایک کمرے میں لے گئے اور میں کبیر کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ کبیر میری خلاف توقع آمد پر ذرا بے چین اور الجھا الجھا سا نظر آنے لگا تھا حالانکہ اس سے پہلے وہ میری آمد پر چمک اٹھا تھا۔ خبر، تھوڑی دیر بعد وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن ہما کے ساتھ چھوڑ کر اوپر چلا گیا۔ مجھے اس کے یوں اچانک اٹھ کر چلے جانے پر اچنبھا ہوا۔ تاہم مجھے شک ہوا کہ وہ بھی اوپر پاپا اور اپنے ڈیڈی انکل نظر حیات کے ساتھ شامل گفتگو ہونے گیا ہے۔ اوپر کس قسم کی خفیہ میٹنگ ہو رہی تھی؟ یہ میں نہیں جانتی تھی۔ درحقیقت میں پاپا کے ساتھ آئی ہی اس لئے تھی کہ میں یہ جاننا چاہتی تھی، آخر انکل پاپا کے ساتھ کون سی ضروری میٹنگ میں مصروف تھے؟ پھر میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی بہانے اوپر گئی تو ایک بند کمرے میں پاپا، انکل نظر حیات اور کبیر کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کمرے کا دروازہ اگرچہ بند تھا مگر ان تینوں کے آپس میں دھیمے لہجے میں باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں جسے میں نے دروازے کے ساتھ لگ کر سننے کی کوشش کی تو اچانک کبیر باہر نکلا اور مجھے دروازے سے کان لگائے کھڑا دیکھ کر پہلے تو بری طرح چونک گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ غصے سے میرا بازو پکڑ کر مجھے نیچے لے آیا اور سخت لہجے میں مجھ سے بولا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟“

اس کا یہ درشت رویہ میرے لئے باعث تعجب تھا مگر مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے اس سے کہا۔ ”میں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی۔“

”بروں کی باتوں پر کان لگانا تم اچھا سمجھتی ہو؟“ وہ بدستور خار کھائے لہجے میں بولا تو میں نے کہا۔

”تم بھی تو اندر موجود تھے۔ کیا میں اپنے پیاسے کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی؟“

”ہم بہت اہم باتیں کر رہے تھے۔ تمہارے مطلب کی کوئی بات نہ تھی۔“ اس نے خشک لہجے میں کہا تو اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

”وہ اہم باتیں میں سن چکی ہوں۔“ میرے انکشاف پر اس کے چہرے سے غصہ کالور ہو گیا اور وہ

سالوں اور صدیوں کی محتاج نہیں ہوتی..... اور کیا یہ ضروری ہے کہ دوستی جیسے جذبات پنپنے کے طویل مدت درکار ہو؟ خلوص تو خلوص ہوتا ہے، جو پہلی ہی نظر اور پہلی ہی ملاقات میں بے لوث اور دوستی کو جنم دے ڈالتا ہے۔“ وہ جیسے عالم بے اختیاری میں کہے جا رہی تھی۔ میں اسے آج بالکل ایک روپ میں دیکھ رہا تھا جو میرے لئے خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔

میرے اندر پٹھانیاں سی چھوٹنے لگیں اور اس کے بے اختیار اور دھیمے لہجے کی چاشنی نے مجھے اس سرشاری میں مبتلا کر ڈالا کہ بے اختیار میرے مرتعش ہونوں سے ابھرا۔

”نگینہ! پھر تم نے مجھے کیسا دوست پایا؟“

”میں نے تمہیں واقعی ایک سچے اور پُر خلوص دوست کے روپ میں دیکھا ہے۔“ اس کا جواب فورا اور بلا جھجک تھا۔

”بس..... اس سے آگے کچھ نہیں.....؟“ میرے اندر کا دیوانہ پن اپنے جوبن کو چھو رہا تھا جذبات کی سرکشی نے مجھے ایک ایسی دلیر بنا دیا۔ کیا محبت ایسی ہی دلیری بخشی ہے؟

وہ بہ غور میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ یقیناً میری آنکھوں میں اسے اُلفت کا ایک ٹھانص مارتا سمجھتا ہو گا۔ تب میں نے بھی اس کی آنکھوں میں مدھ بھری جھیل کو بلکورے لیے محسوس کیا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی تو جیسے میں ایک ایسی سرشاری کی کیفیت سے نکلا اور ذرا کھٹک کر قدر خفیف لہجے میں جھینپ کر بولا۔

”سوری.....! یہ نہیں میں کیا کہہ گیا آپ سے۔“

وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی مگر بولی کچھ نہیں۔ ہم دونوں لمحہ بھر کے لئے انجانے تاثر کی غیر مرئی دُور میں بندھ سے گئے تھے۔ میں نے ویٹر کو آواز دی۔ پھر اسے کولڈ ڈرنک لانے کو کہا۔ نگینہ نے ایک گہری سانس کھینچی اور میز پر رکھے پانی کے جگ کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تو میں جلدی سے ایک کانچ کے گلاس میں پانی انڈیل کر اسے ٹھادیا۔

”بھینکس!“ کہہ کر اس نے گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ چند گھونٹا پینے کے بعد وہ بولی۔ ”نادر! میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے اپنے پیار اور گھر والوں سے بہت محبت ہے۔ گھر کے کسی فرد کو چھینک بھی آ جاتی ہے تو پورے گھر کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ میں خوف زدہ نہیں ہوں لیکن..... لیکن.....“

اچانک اس کے لہجے میں رقت اتر آئی۔ اس کا گلا رندھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی جسے نہ پوچھنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔

”نادر!..... مجھے..... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ وہ رندھے ہوئے سے لہجے میں بڑی کے ساتھ مجھ سے بولی۔ ”مم..... مجھے پورا یقین ہے کہ تم ہی وہ شخص ہو جو میری ہیلپ کر سکتے ہو اس کا لہجہ مرتعش تھا۔ اس کی التجا نے مجھے اندر سے بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے رندھے ہو۔

سے لہجے میں ایک آس تھی، ایک حسرت تھی۔ وہ مجھ سے ملنے ایک امید کے سہارے آئی تھی اور میں کی امید کا ایک فردزاں چراغ بن جانا چاہتا تھا۔ اور یہ جان کر کہ وہ اس وقت ایک مصیبت کا شکار مجھے خود پر، اپنے جذبات پر قابو پانا تھا کہ کہیں میرے دل بے قرار کی تمنا اظہار محبت کی صورت میں نہ آ جائے اور یہ میرے نزدیک ایک انتہائی درجے کی خود غرضی تھی اور محبت کا عیامنہ پن بھی۔ اس کا پورے تین اور امید بھرے انداز میں مجھے یہ کہنا کہ۔ ”مجھے پورا یقین ہے کہ تم ہی وہ شخص

جو میری ہیلپ کر سکتے ہو۔“ میرے لئے اس کا یہ مان کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کے وجدان نے یقیناً میرے پُر خلوص، دوستانہ اور سچے جذبات کو محسوس کیا تھا۔ اس کے اس ایک جملے نے مجھے سرشار کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اب بڑی پُر امید نگاہوں سے میرے چہرے کی طرف یک نگ دیکھے جا رہی تھی۔ چنانچہ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا۔

”نگینہ! میں تم سے اپنے دل کی بات کہوں کہ تم اور کبیر کو پریشان دیکھ کر میں نے یہ پختہ عزم کر لیا تھا کہ میں اس سنگین صورت حال میں تم دونوں کا ساتھ ضرور دوں گا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اس پر اسرار مسئلے کے حل کے سلسلے میں تمہارے اور کبیر کے سامنے ایک تجویز رکھی تھی مگر کبیر کو میری بات شاید درجہ نامور گزری تھی۔ لیکن تم نے جب خود میری اس تجویز پر عمل کیا تو یہ پر اسرار حقیقت واضح ہونے لگی کہ..... میری بات کسی حد تک درست ثابت ہوئی ہے..... تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور ایک اچھے اور خلص دوست کی حیثیت سے مجھ سے جو ہو سکا، وہ میں ضرور کروں گا۔“

میں نے دانستہ کبیر کے تذکرے کو بھی شامل گفتگو رکھا تھا۔ کیونکہ نگینہ اس وقت ایک مصیبت کا شکار تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے میری طرف سے ذرا بھی کسی تعلق خاطر یا جذباتی لگاؤ کا احساس ہو۔ البتہ میری تشفی آمیز اور یقین دلانے والی گفتگو نے اس کا بھجا بھجا چہرہ کنول کی طرح کھلا دیا تھا اور وہ ایک گہری پُر طمانیت سانس خارج کر کے ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔

”نادر.....! تم ایک ذہین شخص ہو..... مجھے پورا یقین ہے کہ تم اپنی غیر معمولی ذہانت کے ذریعے یہ سنگین معاملہ حل کرنے میں ضرور میری مدد کرو گے۔“

”مدد کیسی؟..... دوستی کے ناتے یہ میرا فرض ہے۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”اب پلیز! مدد اور گزارش جیسے الفاظ دوبارہ استعمال نہ کرنا۔“

ویٹر کولڈ ڈرنک کی بوتلیں رکھ کر چاچکا تھا۔ میں نے دھیرے سے کولڈ ڈرنک پینے کو کہا۔

تقدیر اب مجھ پر یوں مہربان ہونے لگی کہ اس مسئلے کے بہانے نگینہ، کبیر سے دور اور میرے بتدریج قریب ہوتی چلی گئی۔ باتوں باتوں میں، میں نے یہ پتہ چلا لیا تھا کہ نگینہ اور کبیر کی دوستی محض اچھے دوستوں کی سی رہی تھی۔ اس کی ایک فطری وجہ ان دونوں کے پیار اور ڈیڈی کا آپس میں پرانے اور گہرے دوست ہونا بھی تھا اور اس دوستی میں کم از کم نگینہ کی طرف سے کبیر کے لئے کوئی جذباتی لگاؤ یا تعلق خاطر نہ تھا۔ یوں میرے ضمیر پر بھی اس بات کا بوجھ نہ رہا تھا کہ میں نے خدا نخواستہ کبیر کی محبت پر شب خون مارا ہو۔ یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات تھی۔ تاہم مجھے اب بھی یہ دعویٰ نہ تھا کہ نگینہ کی مجھ سے دوستی محبت میں بدل گئی تھی۔ میں ابھی خود بھی اس خوش فہمی سے دور ہی تھا۔ ہماری گفتگو کا لب لباب صرف ان پر اسرار حملہ آوروں کے بارے میں ہوتا جو ان دونوں خاندانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ تاہم کبیر کو نگینہ کا مجھ سے بار بار ملنا، بری طرح کھٹکنے لگا تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ مجھے اس بات کا بھی احساس ہونے لگا تھا کہ کبیر نہ صرف مجھ سے روکھا روکھا رہنے لگا تھا بلکہ بسا اوقات تو اس نے مجھے نگینہ کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے پر ٹوکنے کی بھی کوشش کی تھی۔ اس نے ایک روز تو حد ہی کر دی۔

”نادر!..... تمہارا نگینہ کے ساتھ بھینکس بڑھانا کیا معنی رکھتا ہے؟“

اس کے لہجے میں طنزیہ کاٹ کو میں نے محسوس تو بہت کیا اور مجھے غصہ بھی آیا مگر میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے معتدل لہجے میں اس سے پوچھا۔

”یہ بھینکس بڑھانے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”مطلب صاف ہے..... تم اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔ وہ بھی بے وقوفوں کی طرح تم پر بھروسہ کئے ہوئے ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھنا نادر! پہلی بات تو یہ کہ تمہیں ہمارے ذاتی معاملات میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری اور سب سے اہم بات یہ کہ نگینہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ سمجھے تم.....؟“ نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ کبیر کا رویہ میرے ساتھ اب رقیبانہ ہونے لگا تھا۔ اس کے اس انداز گفتگو پر جہاں دکھ ہوا تھا وہاں غصہ بھی آیا۔ تاہم میں نے بدستور کول مانسڈ ڈھوئے دوستانہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”یار کبیر!..... یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کس قسم کی غلط فہمی میں پڑ چکے ہو؟ میں نے تو آج تک نگینہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی ہے۔ اگر نگینہ کو بھی تمہاری طرح تم سے محبت ہے تو خوف ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ اور جہاں تک تمہارے معاملات میں ناگ اڑانے والی بات ہے تو معاملہ کرنا یار! تم اس سلسلے میں بھی بڑی خطرناک غلط فہمی کا شکار ہو۔ نگینہ جیسی تمہاری دوست ہے، ویسی میرا بھی ہے۔ اس نے مجھ سے دوستانہ استدعا کی ہے کہ میں ان پر اسرار دشمنوں کا کھوج لگانے میں اس مدد کروں۔ حیرت ہے، تم بھی تو اس مسئلے سے دوچار ہو۔ پھر مجھ سے تم اس قسم کی جرح کیوں کر رہے ہو؟ میری وضاحت پر اس کے ہونٹوں پر بڑی گہری اور استہزائیہ مسکراہٹ ابھری اور وہ اپنے ہونٹ کرجھ سے بولا۔

”تم مجھے ڈانچ نہیں دے سکتے نادر! کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ نگینہ کی مدد کی آڑ میں تم اس سے کیا چاہتے ہو۔ ایک بات صاف صاف کان کھول کر سن لو نادر! تم نے پہلے ہی نگینہ کو مجھ سے برگشتہ رکھا ہے۔ اب تم اس کے ساتھ یہ چال چل رہے ہو کہ اسے اپنے باپ سے بھی متفرک کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں ایسی اچھی حرکت ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔“ اس کا لب و لہجہ بتدریج جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔

”یار!..... میں نگینہ کو اس کے باپ سے کیوں متفرک کرنا چاہ رہا ہوں..... ذرا اس کی تفصیل بھی دو۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں ہلکی سی ترشی عود کر آئی۔

”اپنے باپ کی ٹوہ میں لگانا..... ان سے برگشتہ کرنا نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟“ وہ گرم لہجے میں بولا۔

”اور ذرا یہ بھی بتا دو کہ مجھے اس کا کیا فائدہ ہو گا؟“ میں بڑے محمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”اگر تم سننا چاہتے ہو تو سن لو.....“ وہ انکشاف کرنے والے انداز میں بولا۔ ”میں نے پہلے دلا سے محسوس کر لیا تھا کہ تم نگینہ میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگے ہو۔ مگر میں دوستی کی خاطر خاموش رہا۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ میں نے اسے سختی سے ٹوکا۔

”میں اسی طرف آ رہا ہوں..... ذرا حوصلے سے سننا۔“ وہ بلاتامل زہریلے لہجے میں بولا۔ ”کیونکہ تم اچھی طرح جانتے تھے کہ نگینہ کے چپا اور میرے ڈیڈی آپس میں بچپن کے گہرے دوست ہیں اور اس ناتے میرے اور نگینہ کے درمیان دوستی کا رشتہ اور بھی مضبوطی اختیار کر گیا ہے۔ تم نے مار آستین بن کر سب سے پہلے نگینہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے مجھ سے بدگمان کیا اور اب نگینہ کو یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ ہمارے والدین سے ماضی میں ضرور کوئی ایسی بجرمانہ غفلت ہوئی ہے جس کے نتیجے میں ہمارا کوئی نادر دشمن پیدا ہو گیا ہے۔ چونکہ تم اچھی طرح سے حقیقت جانتے ہو کہ نگینہ کے چپا مجھے اپنی بیٹی کا رشتہ دینے میں ذرا بھی تامل سے کام نہیں لیں گے اسی لئے تم نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا یہ منصوبہ بنایا کہ نگینہ کے چپا کو اس کی نگاہوں میں بجرم بنانے کی ٹھانی تاکہ کل کلاں تم نگینہ کو اپنی جھوٹی محبت کے دام میں پھانس لو تو نگینہ اپنے چپا کے سامنے سرٹشی پر اتر آئے۔“

”فضول بیانی کر کے خاموش ہوا تو میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں..... مگر میرا طیش میں آنا اس کے ایک کوتاہیت میں بدل سکا تھا اس لئے میں نے اپنے اندر کے ابال پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے قدرے خف لہجے میں کہا۔

”نیر!..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم میرے بارے میں اتنی گری ہوئی سوچ رکھتے ہو۔“

”مجھے ایک سوال کا جواب دو..... کیا تم نگینہ سے محبت نہیں کرتے؟“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“ مجھے اس سے اس سوال کی پہلے ہی سے توقع تھی اس لئے میں نے بلا جمل جواب دیا تھا۔

”مجھے صاف صاف جواب چاہئے۔ اگر تم نگینہ سے محبت کرتے ہو تو مجھے بتانے سے کیوں ڈرتے ہو؟“ اس نے جیسے مجھے جھجھوڑ ڈالا تو میں نے بھی برلا اس سے سوال کر ڈالا۔

”تم یہ بتاؤ، کیا کبھی نگینہ سے تم نے اظہار محبت کیا ہے؟“ میری بات پر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ ”بولو..... تمہارے سوال کا جواب تمہیں مل جائے گا۔“ میں نے اسے اکسایا۔

”نہیں..... مگر ہماری شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔“ اس نے جوابا کہا۔

”تو بس..... پھر بات ہی ختم۔ نگینہ نہ تمہاری ملکیت ہے نہ میری..... اب یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ ہم دونوں میں سے کسے اپنا جیون ساکھی چنتی ہے۔“ میں نے بھی صاف گوئی سے کہا۔

کبیر کے چہرے پر اشتعال کی سرخی ابھر آئی۔ اور پھر وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زہریلے لہجے میں بولا۔

”نادر! تم اپنی حیثیت بچان کر بات کرو..... تمہاری کیا اوقات ہے؟ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں..... اور تمہارا ماضی کیا ہے، میں اس سے بھی واقف ہوں۔ جس طرح تم ہمارے بڑوں کی ٹوہ لگانے کی کوشش کر رہے ہو، اسی طرح میں بھی تمہاری ٹوہ لگا چکا ہوں۔ میں چاہوں تو نگینہ کو تمہاری ساری حقیقت سے آگاہ کر دوں۔ جسے جاننے کے بعد وہ تم پر تھوکتا بھی گوارا نہیں کرے گی۔“

میں اس کی اس بے ہودگی پر پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں کی مضمتیاں سمجھ کر حلق کے بل دباڑا۔

”کبیر!..... زبان سنجال کر بات کرو ورنہ.....“ میں اشتعال کے مارے لرزنے لگا۔ اس نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”ورنہ..... ورنہ کیا؟ میری بات کی کر بہہ چٹائی نے تمہیں آخر کھولا دیا نا..... اس لئے تو سیانے کہتے ہیں کہ دوسروں کی ٹوہ لینا اچھی بات نہیں۔“ وہ استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔ میرے اندر الاؤ سا بھڑکنے لگا تھا۔ کبیر کی باتوں نے میرا اندر ہی طرح جھجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے اندر کی دبی دبی ازلی چنگاری نے ایک ایسی آگ پکڑ لی۔

میں اپنے تاریک ماضی سے غافل نہ تھا بلکہ بذات خود میں اپنے ماضی کے بارے میں جاننے کی ازلی دانش رکھتا تھا۔ تو پھر..... تو پھر کیا کبیر میرے ماضی سے واقف ہو چکا تھا؟ مجھ سے پہلے وہ میرے ماضی کے بارے میں جان چکا تھا؟..... میرے اندر لرزہ خیز خیال ابھرا۔ میرا پورا وجود ایک لاوے کی صورت کھولنے لگا۔ مجھے اپنے حلق میں کانٹے سے جھپٹے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ میں نے لرزتے رموں کے ساتھ کونے میں رکھے فرنیچ سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور ڈھکا کھول کر منہ سے لگالی۔ منڈا پانی بھی میرے سینے کی تپش کو سرد نہ کر سکا تو میں نے ہسٹریائی انداز میں چلا کر بوتل کونے میں



ہینک کروائی، پھر ایک کشمی رنگ کا لارنس ٹراپیکل کا بیش قیمت ٹوپیں سوٹ خریدا اور ایک اعلیٰ درجے کا ریشم اسپرے بھی خریدا۔ یہ سارا اہتمام کرنے اور تیاری کے بعد میں مقررہ دن اور وقت پر گنیز کی رہائش گاہ پر پہنچا تو مجھے سب سے پہلے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔

رہائش گاہ پر پہنچا تو مجھے سب سے پہلے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ رہائش گاہ کو دیکھ کر قطعی طور پر یہ نہیں لگتا تھا کہ یہاں کسی قریب کا انعقاد کیا گیا ہو۔ نہ کوئی سجاوٹ تھی، نہ آرائشی تزئین اور نہ ہی مہمانوں کی آمد و رفت دیکھنے میں آتی تھی۔ کوٹھی پر ایک عجیب سی دیرانی اور براسر سی خاموشی طاری تھی۔ مجھے سخت اچنچا ہوا، ایک لمحے کو میں نے سوچا کہ کہیں میں غلطی سے کسی اور جگہ پر تو نہیں آ گیا۔ مگر کیٹ کے دو طرفہ گول محرابی ستونوں پر جلتے ہوئے گلوب کی روشنی میں نیم پلیٹ پر جلی آجرواں لفظوں والی تحریر میں گنیز کے چپا کا نام شاہ میر صاف پڑھنے میں آ رہا تھا۔ جسے میں نے دو بار ذرا غور سے پڑھا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ کہیں اس قریب کا انعقاد کسی مقامی فائو اسٹار ہوٹل میں نہ کیا گیا ہو۔ احتیاطاً میں کارڈ اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں نے اسے اپنے کوٹ کی جیب سے نکال کر بہ مقام الے کالم کو پڑھا تو اس میں کسی فائو اسٹار ہوٹل کی بجائے قریب کا انعقاد رہائش گاہ ہی درج تھا۔ میں نے کندھے اچکا کر کارڈ دوبارہ جیب میں رکھا اور ابھن آمیز انداز میں سر کو جھٹک کر کالم بیل پر انگلی رکھ بی۔ تھوڑی دیر بعد بنگلی دروازہ کھلا اور کبیر نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ ”آؤ..... آؤ.....“ اس نے بے تاثر لہجے میں کہا اور میں گوگو سے انداز میں اندر داخل ہو گیا۔ کبیر کے بغیر مجھ سے آگے تیز تیز قدموں سے کوٹھی کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے اس کے انداز پر حیرت سی ہوئی۔ میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ تو جیسے دوڑا جا رہا تھا۔ بہر طور میں بھی خاموشی کے ساتھ اس کے عقب میں چلتا ہوا اندر ایک کشادہ کمرے میں پہنچا تو بری طرح ٹھک گیا۔ اندر کمرے میں بھی کوئی سجاوٹ نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی مہمان نظر آ رہے تھے۔ البتہ سامنے صوفوں پر گنیز، اس کے چپا شاہ میر اور کبیر کے ڈیڈی نظر حیات بر اجمان تھے۔ کبیر بھی البتہ میرے ذرا قریب کھڑا ہو گیا۔ وہ سب عام گھریلو لباس میں تھے اور میری طرف عجیب گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ گنیز کے چہرے پر بھی حد درجے سنجیدگی طاری تھی اور اس کی بھی سرنگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ ایک عجیب سی پراسراریت اور تاؤ محسوس کر کے نہ جانے کیوں مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنساناٹھی محسوس ہونے لگی۔

”بیٹھو نادر!“ کبیر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر خشک لہجے میں کہا اور میں غیر ارادی انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ گفٹ پیک ہنوز میرے ہاتھوں میں تھا اور میں حیران پریشان ایک ایک کا چہرہ دیکھتا جا رہا تھا۔

”تھلائے ہو میرے لئے..... نادر صاحب!“ معاہدہ گنیز نے عجیب سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آئی۔ ”لاؤ..... مجھے دو.....“

میں نے میکائی انداز میں تختہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے میرے ہاتھوں سے گفٹ پیک لیا اور انتہائی رکھائی کے ساتھ نیچے دیزر قالین پر پھینک دیا اور پھر اپنے ایک پاؤں سے اسے روند ڈالا۔

میرے سر پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مجھے گنیز کی یہ حرکت انتہائی ناگوار گزری اور میں غصے سے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ..... یہ کیا مذاق ہے..... گنیز.....!“

”بیٹھ جاؤ آرام سے نادر!“ اچانک شاہ میر نے مجھے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا اور میرے

پھینک دی۔ میرے اندر کی ازلی آگ پوری طرح بھڑکنے لگی تھی۔

\*\*\*

دوسرے دن گنیز نے مجھے اپنی برتھ ڈے کی تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ دیا۔ کبیر بھی اس ساتھ تھا۔ وہ دونوں ایک لمبی چوڑی ٹیوٹا کریڈا کار میں آئے تھے اور ان دونوں کے ہمراہ تین عماردار باڈی گارڈز بھی تھے۔ کبیر کو دیکھ کر میری طبیعت کمدری ہونے لگی۔ مگر مجھے ایک بات کی حیرت کہ اس کے چہرے پر گزشتہ روز کی گرما گرمی کا کوئی تاثر ظاہر نہیں تھا۔ یا شاید وہ بڑی مکاری سے گنیز کے سامنے مجھ سے اپنی ناراضگی کو ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

بہر طور میں نے بھی مسکرا کر دونوں کا اقبال کیا۔ پھر گنیز کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے کا لے لیا مگر اسے ٹالنے کی غرض سے یہ بھی کہہ ڈالا کہ میں اس کی سالگرہ میں شریک ہونے کا وعدہ نہیں

”نہیں نادر! وعدہ کرو..... تم ضرور آؤ گے۔“ وہ اصرار کرتے ہوئے بولی۔

”میں کوشش کروں گا۔“ میں نے مختصر کہا۔

”پلیز نادر!..... تم ضرور آنا.....“ ورنہ مجھے بالکل مزہ نہیں آئے گا۔“ وہ اصرار کرنے جاری تھی۔ میں نے دزدیہ نظروں سے کبیر کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ ساٹ تھا۔ البتہ دوسرے ہی لمحے اسے دوستانہ بے تکلفی سے بولا۔

”ارے یار نادر! بے چاری گنیز کتنے مانی سے تمہیں بلا رہی ہے۔ کچھ دوستی کا ہی خیال کرو۔ دے دو..... ورنہ یہ تمہارے انتظار میں بلا وجہ کھلتی رہے گی۔“

میں نے ایک پرمٹاتنگ نگاہ کبیر کے چہرے پر ڈالی۔ اسنے بڑی مکاری سے کینچلی بدلی ہوئی تھی۔ اس کا یہ دوہرا انداز عجیب بھی لگا اور میں ابھن آمیز پریشانی میں بھی مبتلا ہو گیا۔

”اچھا..... پھر میں ضرور آؤں گا۔“ بالآخر میں نے ہار مانتے ہوئے وعدہ کر لیا۔ گنیز کا چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں واپس چلے گئے۔

\*\*\*

سالگرہ کی دعوت رات دس بجے تھی اور ڈنر کا بھی پروگرام کارڈ پر درج تھا۔ مجھے سالگرہ کے اوقات حیرت سی ہوئی۔ کیونکہ عموماً سالگرہ جیسی تقریباً شام چھ بجے ہی ہوا کرتی تھیں۔ بہر طور میں نے بڑے لوگوں کے وطیرے جان کر کندھے اچکا کر اور سب سے پہلے یہ سوچنے بیٹھ گیا کہ گنیز کو اس سالگرہ کا کون سا تحفہ دینا چاہئے۔ میں چاہتا تھا تحفہ ایسا ہو جو مادی قیمت سے زیادہ جذبے کی قیمت بالکل انمول ہو اور جو گنیز کے لئے میرے جذبات کی بھی صحیح طور پر ترجمانی کرتا ہو۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے اچھا تحفہ خریدنے کے لئے صدر مارکیٹ کا رخ کیا اور کافی دھوپ اور تازا کھا جھانگی کے بعد مجھے ایک سرخ گلاب پسند آیا۔

سرخ گلاب کا یہ پھول اگرچہ مصنوعی تھا مگر اس کی خاصیت یہ تھی کہ اس میں گلاب ہی کی سو خوشبو کا اسپرے کیا گیا تھا۔ یہ گلاب ایک چھانچے کے چوکور شیشے کے ڈبے میں بند تھا جس کے نیچے چھوٹا سا بن بن دبانے کی صورت میں گلاب کی سرخ پتیاں روشن ہو جاتی تھیں اور ساتھ ہی ڈبے کا ڈھکنا خود کار طریقے سے کھل کر گلاب کی خوشبو بکھیرنے لگتا۔ ڈھکنا اوپر اٹھتے ہی برتھ ڈے کی مباد کے نغمے کی سریلی میوزیکل آواز بھی ابھرتی تھی۔ مجھے یہ تحفہ بہت بھایا۔ میں نے اس کی دیدہ

اوسان خطا ہونے لگے۔ دل مضطربانہ انداز میں بے تحاشا دھڑکنے لگا۔  
 ”کیا مجھے بے عزت کرنے کے لئے یہاں بلایا گیا تھا؟..... میں پوچھتا ہوں، یہ سب کیا ہے؟“ میں غصے سے پھنکارتے ہوئے شاہ میر سے بولا تو کبیر کے ڈیڈی نظر حیات مجھے گھورتے ہو سرسراتے لہجے میں بولے۔

”پہلے آرام سے بیٹھ جاؤ..... نادر علی خان!..... ولد قادر علی خان.....!“  
 میں اس کے منہ سے پہلی بار اپنی ولدیت کے بارے میں سن کر بری طرح ٹھنکا۔ ”قادر علی خان میرے باپ کا نام قادر علی خان تھا.....؟ مگر انہیں کس طرح معلوم ہوا جبکہ میں نے تو آج تک نانا باپ کا نام سنا تھا اور نہ ہی اسے دیکھا تھا۔“ میں نے دل میں سوچا۔  
 ”کیوں..... ششدر ہو گئے نا..... دیکھ لو، ہم نے نہ صرف تمہیں پہچان لیا بلکہ تمہاری ما سے بھی اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔“ کبیر نے مجھ سے زہریلے لہجے میں کہا۔  
 میرے سینے میں بری طرح ہلچل ہونے لگی۔

”سازش..... کسی سازش.....؟“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنے ہا پر کھڑا ہونا دو بھر محسوس ہونے لگا اور میں صوفے پر گر گیا۔ نہ جانے یہ کیا پراسرار چکر تھا۔ نگینہ کا سر اسر بدلا بدلا اور اچھی سا ہورہا تھا۔

”دشمن ہماری بغل میں تھا اور ہم شہر بھر میں ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے۔“ اس بار نگینہ نے ا زہریلے لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کو تو مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔

”پلیز نگینہ! خدا کے لئے مجھے کچھ بتاؤ تو سہی، یہ سب کیا ہے؟..... در نہ میں..... میں ہاگلا جاؤں گا۔“ میں نے اپنا سر پکڑ کر نگینہ سے التجا کی۔

”نگینہ تمہیں کیا بتائے گی نادر علی خان! ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ تم کون ہو اور کیا ہو.....؟“ اس نظر حیات نے اسرار بھرے لہجے میں مجھ سے کہا اور پوچھا۔ ”تمہاری ماں اس وقت جیل میں عمر قید کی کاٹ رہی ہے نا؟“ میں دھک سے رہ گیا اور تھوک نکل کر ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کیا تم نہیں جانتے کہ وہ عمر قید کی سزا کیوں کاٹ رہی ہے؟“ نظر حیات نے استہزاء سے انداز پوچھا۔ میں نے بے اختیار نفی میں سر ہلا دیا۔

”او..... بڑے بھولے بادشاہ بن رہے ہو..... تمہاری اداکاری کی داد دینے کو جی چاہتا ہوں اس بار شاہ میر نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔

”چلو..... یہ بھی ہم ہی بتائے دیتے ہیں تاکہ تمہارے سر سے اداکاری کا بھوت اتر جائے۔“ کہہ کر شاہ میر اپنی جگہ سے اٹھا اور چند قدم اٹھاتا ہوا میرے ذرا قریب پہنچ کر انتہائی سفاکی سے بولے۔ ”تمہاری ماں نے اپنے شوہر کا قتل کیا تھا..... یعنی تمہارے باپ..... قادر علی خان کا قتل.....“ میں یہ سن کر یکدم سنائے میں آ گیا تھا۔



میری زخمی سماعتوں میں جیسے دشتوں کے سنائے جچ رہے تھے۔ میں ایک ٹک اپنے سامنے کھڑے نگینہ کے باپ شاہ میر کو نکلے جا رہا تھا۔ نگینہ سمیت کبیر اور اس کے ڈیڈی نظر حیات میرے چہرے کے اثرات کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔ گویا یہ بھاپنے کی کوشش میں ہوں کہ ابھی ذرا دیر پہلے شاہ میر کے لرزہ خیز انکشاف سے میں واقعی لاعلم تھا یا یہ لاعلمی میری اداکاری تھی۔  
 مجھے ذرا چکر سا آیا اور میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا کر صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔  
 برائیاں نہ جانے کیوں چڑھ گیا تھا، سینہ لوہار کی دھونکی بنا ہوا تھا۔  
 ”..... انکل..... آ..... آپ کیا..... کہہ رہے ہیں؟“ مجھے علم نہیں ہو سکا کہ یہ جملہ کیونکر میرے لبوں سے ادا ہوا۔

وہ میری حالت پر استہزاء سے مسکراہٹ سے بولا۔  
 ”خوب..... بہت خوب!..... جیسے تم تو کچھ جانتے ہی نہیں۔“ اس نے زہریلی آنکھوں سے ری طرف دیکھا، پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری کبیر احمد اور بعد میں میری بیٹی نگینہ نے دوستی کا مقصد ہی یہی تھا کہ ہماری پشت میں یہ آسانی خنجر پیوست کر سکو۔“

میرے اندر ابھی تک سانس سانس ہو رہی تھی۔ میں نے باری باری سب کے چہروں پر نگاہ ڈالی۔  
 رف نگینہ کے چہرے پر مجھے اُنجھن آمیز تاثرات نظر آئے تھے۔

میں نے سب سے پہلے خود پر قابو پایا اور عجیب سے متحمل لہجے میں شاہ میر کی طرف دیکھ کر بولا۔  
 انکل!..... میں واقعی کچھ نہیں جانتا۔ خدا کے لئے، میری بات پر بھروسہ کریں۔ اگر آپ لوگوں کو یہ طبعی ہے کہ درحقیقت میں ہی آپ لوگوں پر قاتلانہ حملے کروا رہا ہوں تو اس کے پیچھے دشمنی کی کوئی ٹھوس بنیاد ہونا چاہئے۔“

”تمہاری بات بالکل درست ہے۔“ اس بار کبیر احمد کے ڈیڈی نظر حیات نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے دوبارہ مجھ سے بولا۔ ”غلط فہمی ہمیں نہیں، تمہارے ماموں بدر گل اور تمہیں سے اور تم دونوں مل کر ہمارے خلاف دشمنی کا جو جال بن رہے ہو، ہم اس سے بھی اچھی طرح واقف ہیں اور تمہیں یہاں ڈرامائی انداز میں بلانے کا ہمارا مقصد محض یہی تھا کہ ہم تمہیں یہ بتا سکیں۔ ہم تمہاری درپردہ سازش سے واقف ہو چکے ہیں۔ اور ہاں، اگر دوبارہ ہم پر یا ہمارے بچوں پر تم نے تمہارے ماموں حیدر گل نے حملہ کرنے کی کوشش کی تو تم دونوں ماموں بھانجے یا درکھنا..... ہمیں شی بھائی اچھی طرح آتی ہے۔ ناؤ یوگیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔“ اس نے آخر میں تھیک آمیز لہجے میں دھمکا دیا۔

اساںک زلت سے میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ میرا دماغ پہلے ہی جل رہا تھا۔ میں گویا ایک ابال کی

ہے۔ اب میری آپ سے اور انکل نظر حیات سے درخواست ہے کہ اگر آپ لوگوں کو حقیقت کا علم ہے تو اسے آگاہ کر دیں۔“

اس بات پر میں نے گنبد کے چہرے کی طرف دیکھا۔ میری نظروں میں اس کے لئے کسی گلے، کسی نگوں کا شائبہ تک نہ تھا۔ ہاں، ایک لشکر تھا، ایک اتھا تھی۔ مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ گنبد ہی شاید وہ تھی ہو سکتی ہے جو میرے اندر کے پیمان اور تڑپ کو سمجھ سکتی تھی۔ وہ سب شاید میری طرف سے کسی مایک غلط فہمی کا شکار تھے تو میں اس کی وجہ جاننے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جاننے کے لئے بے چین تھا کہ آخر مجھے اپنا دشمن سمجھنے کی کیا وجہ تھی؟ یہ بہت اہم سوال تھا میرے لئے۔

نظر حیات نے ایک طویل ہمارکاری کی اور صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا اور پھر شاہ میر کی طرف دیکھ کر دلا۔ ”میرا خیال ہے، گنبد نبی کی بات صحیح ہے..... بھڑکیا کہتے ہو شاہ میر! نادر کو وہ ساری داستان نادی جائے؟“

میں اب شاہ میر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر گنبد تار تھی۔ چند ٹائیے کی پُرسوج خاموشی کے بعد وہ جواباً اپنے دوست نظر حیات سے بولا۔

”یہ ابھی قبل از وقت ہوگا۔ کیونکہ اسے شاید ہماری بات پر یقین نہ آئے۔ اس کے لئے ابھی اتنا جانتا ہی کافی ہوگا کہ اسے یتیم کرنے والی خود اس کی اپنی ماں تھی۔ اب اسے چاہئے، یہ اپنے ماموں حیدر گل کا گریبان پڑے اور اس سے پوچھے کہ اس نے اپنی بہن شبنم کا جرم اپنے بھانجے سے چھپانے کی کوشش کیوں کی۔ کیا اس لئے کہ وہ عورت اس کی بہن تھی؟“

آخری جملہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں استہزاء کا اثر آئی تھی۔ جس سے میرا دماغ جلنے لگا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا، ماموں بھلا مجھے کس منہ سے اپنی بہن کے اس ناقابل معافی اور بھیانک جرم کا جواب دیتے۔ آج مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ماموں حیدر گل میرے سوالوں کے جواب دینے سے کیوں کتراتے تھے۔ تاہم میں نے شاہ میر کی طرف دیکھ کر اٹل لہجے میں کہا۔

”نہیں انکل!..... ماموں حیدر گل سے تو میں ابھی طرح پوچھوں گا ہی..... مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ کو جو حقیقت معلوم ہے وہ مجھے بتائیں۔ کیونکہ آپ لوگوں کو سب سے پہلے مجھ پر ہی اس بات کا شبہ ہوا تھا کہ گنبد پر گناہ کا تھانہ حملے کروانے والا میں ہی ہوں۔ آپ کی اس غلط فہمی کی ضرورت کوئی ٹھوس وجہ ہوگی۔ رہی بات ماموں کی تو میں اچھی طرح جانتا ہوں، وہ مجھ سے کئی باتیں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے میں نے ان سے کچھ پوچھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

”نہیں تو ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں برخوردار!“ اس بار شاہ میر کی آواز میں خاص انداز کا تھل تھا اور لہجے میں بھی پہلے والی کاٹ نہ تھی۔

”ہم بھی یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ تم سے کتنا بچ بولتے ہیں؟ کیونکہ یہ بچ بڑا کڑوا ہے۔ ہو سکتا ہے تم سے ہمارے منہ سے سن کر آپ سے باہر ہو جاؤ اور یہاں کسی قسم کی بد مزگی ہو۔“ شاہ میر نے پہلی بار غصہ ظہور کر گئے تھے تو نظر حیات بھی مجھ سے ذرا معتدل لہجے میں بولا۔

”ہیں اب اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ ہم شاید تمہاری طرف سے غلط فہمی کا شکار تھے۔ کیونکہ تمہارے چہرے اور لہجے کی سچائی سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں بہر حال حقیقت کا علم نہیں ہے اس لئے ہم بھی اب اپنے رویے کی تم سے معافی چاہتے ہیں لیکن ہمارا اب بھی تمہیں وہی مشورہ ہے کہ اپنے ماموں حیدر گل کو کریدنے کی کوشش کرو پھر ہمارے پاس آنا، ہم تمہیں ساری حقیقت بتا دیں گے۔“

سی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ چنانچہ میں بھی اڑ گیا۔ خود کو سنبھالتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرا نظر حیات کے چہروں پر نظریں گاڑتے ہوئے اٹل لہجے میں بولا۔

”اب میں یہاں سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک کہ مجھے ماموں حیدر گل اور میرے ماما آپ لوگوں کے دلوں میں پروان چڑھتی دشمنی یا غلط فہمی کی تفصیل معلوم نہیں ہو جائے گی۔“

ماحول میں یلکنت پر اسرار سناٹا طاری ہو گیا تھا جسے کبیر احمد کی نفرت آمیز آواز نے پارہ پارہ کر دیا تھا۔ ”نادر!..... بس، اب بہت ڈراما رچا لیا تم نے۔ تمہارے چہرے سے نقاب اتر چکا ہے۔ اب تم ہمارے ساتھ مزید ڈھٹائی آمیز مکاری نہیں کر سکتے..... جاؤ اور اپنے ماموں حیدر گل سے کہہ دینا کہ آئندہ تم لوگوں نے ہمارے خلاف کوئی چال چلنے کی کوشش.....“

میں اس کی بات کاٹ کر یکدم چیخ اٹھا۔ ”پلیز، پلیز، فار گاڈ سیک! میں پاگل ہو جاؤں گا..... مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم لوگ کس دشمنی اور کون سی سازش کی بات کر رہے ہو؟..... میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ اگر تم لوگ میرے مامی کے تو جانتے ہو تو مجھے بتاؤ، میں تم لوگوں کا ممنون رہوں گا۔ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ میری ماں اس سے جیل کی سلاخوں کے پیچھے عمر قید کی سزا کاٹ رہی ہے جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا اور.....“

حد یہ کہ مجھے میری ماں نے خیل کی سیلن زدہ کوٹھڑی کے تنگ فرش پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جنم دیا تھا۔ وہ بھانپا ہے جس نے آج تک مجھے بے چین کر رکھا ہے۔ میں نے تو..... میں نے تو اپنے ماما حیدر گل سے بھی کئی بار دریافت کرنے کی کوشش کی تھی کہ میری ماں جیل کے پیچھے اپنے کس جرم کی بجھت رہی ہے؟ میرا باپ کون اور کہاں ہے؟ لیکن نہ ماں نے بھی مجھے یہ حقیقت بتانے کی کوشش نہ ہی ماموں حیدر گل نے۔ میں نے تو اب ماں سے بھی ملاقات کرنا چھوڑ دی ہے۔ حتیٰ کہ ماموں گل، جنہوں نے مجھے آج تک بڑے ناز و نعم سے پالا پوسا ہے، تنگ آ کر میں نے ان سے بھی پوچھنا چھوڑ دیا ہے۔ اب جبکہ آپ لوگوں کی زبانی مجھے اس حقیقت کا پتہ چلا ہے کہ میری ماں نے میرے باپ قادر خان کا قتل کیا ہے اور وہ اسی جرم کی پاداش میں سزا بجھت رہی ہے تو..... میں، جوڑ کر آپ لوگوں سے التجا کروں گا کہ خدارا، مجھے یہ ساری حقیقت بتائیں کہ میری ماں نے میرے قاتل کس وجہ سے کیا تھا؟“

میں نے اتنا کہا اور خاموش ہو کر ہانپنے لگا۔ میرے اعصاب شل ہو رہے تھے۔ میری رگوں جذباتیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جس نے مجھے جوا لاکھی بنا کر رکھ دیا تھا۔ میرے وجود کے سوالیہ نشانات کے جو نوکیلے آنکڑے پھٹے ہوئے تھے، ان کی جھپٹ سے میرا اندر پھٹتی ہوا جا رہا تھا۔ آگ تھی جو مجھے خاکستر کئے دے رہی تھی۔

میں خاموش ہوا تو ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ اس میں مجھے اپنے سانسوں کی آواز بہت بلند محسوس رہی تھی۔

کبیر احمد نے دانت نکوس کر دوبارہ مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر نظر حیات نے ہاتھ کے اشارے سے بٹے کو روک دیا۔ اس کے ہی نہیں بلکہ شاہ میر کے چہرے پر بھی پہلی مرتبہ پُرسوج خاموشی آنے لگی تھی۔ البتہ گنبد سے نہ رہا گیا اور وہ میرے چہرے پر اپنی گہری نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے اپنے شاہ میر سے بولی۔

”پاپا! میرا خیال ہے کہ نادر واقعی کچھ نہیں جانتا۔ اس نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا تھا، وہ یہ کہ.....“

”ٹھک ہوں۔“

”آؤ، کینٹین میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

”نہیں..... لان بہتر رہے گا۔“

”جیسے تمہاری مرضی.....“

ہم دونوں سرسبز لان کے ایک قدرے الگ تھلگ گوشے میں نرم نرم گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہمارے عقب میں خوشنما پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ میری نظریں گیند کے چہرے پر پڑی ہوئی تھیں۔ میں اس کے ہونے کا منتظر تھا۔ اس کے شفاف اور سترے چہرے پر مجھے ہلکا سا ارتعاش نظر آ رہا تھا۔ نرم و گداز لبوں پر مودوم سی کپکپاہٹ تھی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا تو مجھے اس کی گہری آنکھوں کے گوشوں میں سی جکتی نظر آئی۔ تب اس کے لب متحرک ہوئے۔

”نادر! آئی ایم سوری..... ایکسٹریملی سوری.....“ آواز میں رقت آمیز لرزش تھی۔

”واٹ.....؟“ میں چونکا۔ ”کس بات کی سوری بھی؟“

”ہاں..... کم از کم مجھے تمہیں غلط نہیں سمجھنا چاہئے تھا۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر تڑپی ہوں نادر!..... کہ دوستی میں اول تو کسی غلط فہمی کی گنجائش ہی نہیں ہونی چاہئے۔“ وہ جیسے بے اختیاری میں کہے جا رہی تھی۔ ”اور پھر دوستی تو..... دوستی ہوتی ہے۔ کیونکہ دوستی سہنا بھی تو سکھاتی ہے۔“

میں اب کہیں جا کر اس کا ”مسئلہ“ سمجھا تھا اور بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ عود آئی۔

”اوکے..... کم آن..... گئی! تم تو یکدم سنجیدہ ہو گئیں۔ اگنور کر دو..... رات گئی، بات گئی۔ ویسے بانی داوے، یہ کیا منافقت ہے بھی؟“ میں نے آخر میں موضوع کا سنجیدہ پن ختم کرنے کی کوشش کی۔

”کیسی منافقت.....؟“ وہ کجبراری آنکھیں پھیلا کر بولی اور میرا ان میں ڈوب ڈوب جانے کو دل چاہنے لگا۔

”تو اور کیا.....؟“ میں ٹھک کر بولا۔ ”یہ آخر دوستی سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”دوستی..... یعنی.....“ وہ ذراڑکی تو اس کے چہرے پر سق پھولی تاہم اس نے ہولے سے اپنا مختصر جملہ پورا کیا۔ ”دوستی.....!“

”نہیں، تم کچھ اور کہنا چاہتی تھیں؟“ میں نے معنی خیر انداز میں اصرار کیا۔

”مثلاً.....“ اس کی آنکھوں میں عید بھری چمک ابھری

”مثلاً.....“ یہ کہ جو تمہارے دلشیں اور گداز ہونٹوں پر آتے آتے رہ گیا۔

”تم نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ..... میں دوستی کی جگہ کچھ اور کہنا چاہتی ہوں؟“ اس کی مسکراہٹ جتنی خفیف تھی، اتنی ہی دل دلو لینے والی بھی۔

”بھئی..... میرے دل نے محسوس کیا۔“ میں بولا۔

”آخر بتاؤ تو..... کیا کہنا چاہتی تھی میں؟“ جو اعلیٰ و ارفع لفظ گیند کہتے کہتے رہ گئی تھی، شاید وہ لفظ میرے ہونٹوں سے سننا چاہتی تھی لہذا میں نے محبت پاش نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”محبت..... دوستی..... یعنی محبت!“ میں جیسے اسے درس اُلفت پڑھانے لگا۔

”تھوڑی دیر پہلے ضمیر کی چہمن سے کم لایا ہوا اس کا اُداس چہرہ یہ لفظ سننے کے بعد ایک دم تازہ گلاب کی

میں اس کی بات سے ذرا متذبذبانہ سوچ میں پڑ گیا۔

”پلیز نادر!..... پنا اور انکل کا مشورہ مان لو۔ اس طرح ہمارے دل بھی ایک دوسرے صاف ہو جائیں گے۔“ معاً گیند نے مجھے مخاطب کر کے بڑے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ میں نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تو وہاں مجھے شرمندگی کے آثار محسوس ہوئے۔ مگر کبیر کا منہ ابھی تک پھلا تھا۔ میں نے بالآخر انکل نظر حیات سے کہا۔

”انکل! میرے لئے بہر حال یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ لوگوں نے میری بات پر بھروسہ کیا! آپ لوگوں کی باتوں کا لب لباب یہی نکلتا ہے کہ آپ لوگوں پر قاتلانہ حملے کروانے میں میرے ہاں حیدر گل کا ہی ہاتھ ہے۔ کیا آپ مجھے اتنا بھی نہیں بتا سکتے کہ آخر ماموں اور آپ لوگوں کے درمیان کیا کیا وجہ ہے؟“

میری بات پر نظر حیات نے شاہ میر کی طرف دیکھا۔ وہ شاید اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہو فوراً بولا۔

”یہ بات کہنا ابھی قبل از وقت ہو گا۔ تم پہلے اپنے ماموں حیدر گل سے بات کرو لیکن اس بار خاص خیال رہے کہ ان سے ہمارے حوالے سے کوئی بات مت پوچھنا۔“

”لیکن انکل! مجھے ماموں سے کچھ پوچھنے کے لئے آپ لوگوں کا حوالہ دینا ضروری ہو گا۔“ میں جواز پیش کیا اور مزید بولا۔ ”کیونکہ ماموں نے آج تک میری کسی بات کا جواب نہیں دیا ہے۔“

میری بات پر وہ دونوں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے، پھر نظر حیات بولا۔

”اس میں قیاحت یہ ہے کہ تمہارا ماموں حیدر گل ایک دم محتاط ہو جائے گا۔ ہم اس کا جھوٹا چاہتے ہیں۔ جب اسے یہ معلوم ہو گا کہ تمہارے ہم سے دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے ہیں تو وہ کئی باتوں پہلوئی کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے تم بغیر ہمارے کسی حوالے کے ایک

صرف یہ کریدنے کی کوشش کرو کہ اس کی بہن یعنی تمہاری ماں شینہ نے اسے شوہر کا قتل کیوں کیا؟ آگے وہ خود ہی کھلتا چلا جائے گا۔ اب تم بچے تو نہیں رہے کہ وہ تمہیں ٹالنے کی کوشش کرے۔ تم اب ابا

کڑیل جوان ہو۔ شینہ تمہاری ماں ہے۔ اس کے بارے میں، اس کے ماضی کے بارے میں جاننے تمہیں پورا حق حاصل ہے۔ پس، اس بار تم اس سے دونوک بات کرو۔“ وہ خاموش ہوا اور میں دھیر

دھیرے اپنے سر کو تھمبی جینس دینے لگا۔

میں واپس یونیورسٹی کمپس آیا۔ میں نے اگلے روز ایک دن کے لئے گاؤں جانے کا فیصلہ کیا۔ اب ماموں حیدر گل سے حتمی بات کرنے کا مہم ارادہ کر چکا تھا۔

صبح یونیورسٹی میں مجھے صرف دو لیکچرز اینڈ کرنا تھے۔ پہلا ساڑھے آٹھ بجے اور دوسرا ساڑھے سے تقریباً گیارہ بجے تک تھا۔ باقی لیکچرز اتنے اہم نہ تھے۔ یوں بھی امتحانات قریب تھے۔ کورس تقر

مکمل ہو چکا تھا۔ اکا دکا اینٹشل لیکچر ہوتے تھے۔ میں صبح ساڑھے سات بجے بیدار ہوا۔ غسل و

کرنے کے بعد میں آٹھ بجے کانچ پینچا۔ سینٹرل کینٹین میں ناشتہ کیا اور ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے لیکچر کی طرف بڑھ گیا۔

گیارہ بجے جب میں دوسرے لیکچر سے فارغ ہوا تو گیند کو میں نے ہال میں جھانکتے ہوئے دیکھا میں نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا۔ وہ مسکرائی، میں اس کی طرف بڑھا۔

”کیسی ہو؟“

طرح کھل گیا۔ اس کے نرم و گداز ہونٹوں پر انجانے جذبوں کے شگونے پھوٹنے لگے۔ شہابی گالوں اور شفق مزید گہری ہو گئی۔ اس نے ایک ادائے دل ربانہ کے ساتھ اپنی گھنیری زلفوں کو جھٹکا اور میں اس جانب ذرا جھک کر بولا۔ ”کیوں..... یہی کہنا چاہتی تھیں نا تم؟“

”ہاں۔“ اس نے سر کو خفیف جنبش دیتے ہوئے ہولے سے جواب دیا۔ ”نادر!“ پھر وہ یکدم سنجیدہ لگتی تھی۔

میں مستفسرانہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”کل تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، میں اس کی تم سے معافی چاہتی ہوں..... پلیز، مجھے اپنا بار بار کرنے دو۔“ وہ پھر سنجیدہ موضوع کی طرف آنے لگی تو میں نے اسے دوبارہ ٹوکنا چاہا۔ مگر اس نے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ ”دراصل پے در پے ہم پر ہونے والے گناہ کا تانہ حملوں نے میری بھی عقل ایک لمحے کو ماؤف کر دی تھی پھر پیا اور انکل حیات نے تمہارے حوالے سے تمہاری ماں کے ماضی کے بارے میں جو باتیں مجھے بتائیں، اسے سن کر میں خود ایک لمحے کو پکڑا گئی تھی اور یوں تمہیں بھی مجرم بنی تھی۔ لیکن شکر ہے کہ پیا اور انکل حیات کی طرح میرا دل بھی اب تمہاری طرف سے صاف ہوا۔ لیکن میرے ضمیر پر بوجھ سا بن گیا تھا کہ کم از کم مجھے کبیر احمد کے درغلانے میں نہیں آنا چاہئے تھا۔“

”کبیر احمد.....؟“ میں نے استفسار سے لہجے میں قدرے الجھ کر کہا۔

”ہاں..... یہ ساری کھجڑی کبیر احمد نے ہی تو بنائی تھی۔“ وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ”ہماری دوستی بعد وہ تم سے خار کھانے لگا تھا۔ تمہارے باپ اور ماں کے حوالے سے وہ کھٹک گیا تھا پھر اس نے تمہا بیک گراؤ نہ کھٹکا تو اسے ہمیں اور بالخصوص مجھے تم سے متنفر کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا مگر اس کی یہ سازش بری طرح ناکام ہوئی۔“ اس نے اپنی بات مکمل کی۔

مجھے کبیر احمد کی اس کینہ پروری پر دکھ ہوا تاہم میں کھلے دل سے مسکرا کر بولا۔ ”چلو چھوڑو اب۔ دو! کا بول بالا..... دشمن کا منہ کالا۔ مجھے اب تم یہ بتاؤ کہ تمہارے پاپا انکل شاہ میرا اور ان کے دوستوں کے حوالے سے ماضی کے حوالے سے ایسا کون سا پر اسرار حلق ہے کہ انہیں مجھ پر شک ہوا؟ کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی کہ آخر تمہارے پاپا اور انکل حیات نے میری ماں کے ماضی کے حوالے سے کیا باتیں تمہیں بتائیں؟“

میری بات پر وہ آنکھیں جھکا کر بولی۔ ”نادر! ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو..... پلیز، تم صرف وہ کرو جو پاپا اور انکل حیات نے تم سے کہا ہے..... لیکن پاپا اور انکل کی طرح میرا بھی تم سے وعدہ ہے کہ تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے گا۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگوں کو پہلے حقیقت بتانے میں کون سی مصلحت مانع ہے؟“ میں نے قدرے الجھ کر کہا تو وہ میری طرف دیکھ کر بڑی رساں سے بولی۔

”بے فکر رہو نادر! بڑوں کے فیصلے میں بھی ایک بھید ہوتا ہے۔ جس میں چھوٹوں کی بھلائی کا راز مدھ ہوتا ہے۔ کیا خبر ہمارے پہلے حقیقت کھولنے پر تم بدگمان ہو جاؤ ہم سے؟“

میں پُرسوج خاموشی میں مستغرق ہو گیا۔

پھر میں اسی روز گاؤں روانہ ہو گیا۔



گاؤں پہنچا تو ماموں حیدر گل ”گرین لاج“ میں موجود نہیں تھے۔ (گرین لاج..... ہماری پہاڑی

رہائش گاہ کا نام تھا) البتہ ان کی بیوی صغراں موجود تھیں۔ اس سے مجھے پتہ چلا کہ ماموں حیدر گل چاچا فضل بھی نہ تھے۔ ”نالی“ کی طرف نکل گئے تھے۔ میں اس قدر بھرا ہوا تھا کہ ماموں کا انتظار بھی نہ ہو پا آج سویرے ہی ”نالی“ کی طرف نکل گئے تھے۔ صغراں البتہ قدرے پریشان ہو کر بولی۔

”بہن! خیریت تو ہے نا؟..... تم.....“ الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے اور میں ہونٹ سکیڑ کر لاج سے نکل آیا۔

ہمارا لکڑیوں کا مال، مال روڈ کے آخری سرے پر واقع تھا۔ میں لاج سے نکل کر باہر سبز قطعہ پر آ کر ذرا دور شمال مغرب میں واقع گلیات کی طرف جانے والی سڑک کو گھورنے لگا جس کے دورویہ بلند و بالا صنوبر اور چیز کے درخت ایستادہ تھے۔ وہاں سے شہر آنے جانے والا ٹریفک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں چند ثانیے پر سوچ خاموشی کے ساتھ کھڑا رہا، پھر میں نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ سڑک کے کنارے پہنچ کر گلیات کی طرف سے آتی ہوئی ایک ہالی ایس کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اس میں سوار ہو گیا۔ تقریباً بیس پچیس منٹ بعد میں مال روڈ پر اپنے مطلوبہ اسٹاپ پر پہنچ کر اتر گیا۔ یہاں سے ہمارا مال زیادہ دور نہ تھا۔ تھوڑا ہی پیدل راستہ تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چل پڑا۔

ماموں حیدر گل سے آج دونوں بات کرنے کے جوش میں مجھے اس بات کا بھی خیال نہ رہا تھا کہ میں پہلے ”گرین لاج“ سے فون کر کے پوچھ ہی لیتا کہ آیا وہ وہاں موجود بھی تھے یا نہیں؟

ذرا دور بعد میں مال کے قریب پہنچ گیا۔ سڑک کی طرف کھٹنے والے دفتر ٹائپ کمروں کے دو شیشے دار دروازے بند تھے۔ دیوار پر شتر بھی نصب تھے۔ میں ایک دروازے کو پش کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ کمرہ خالی تھا، دوسری طرف کا حصہ کھلا پڑا تھا۔ میں وہاں آ گیا۔

اب میرے سامنے وسیع و عریض احاطہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف آرامشیں کا بال نما کمرہ تھا۔ باقی سارا میدان بھانت بھانت کی لکڑیوں اور بھاری بھر کم شہتروں سے اٹا پڑا تھا۔ مذکورہ کمرے میں خاموشی تھی۔ درنہنگی سے چلنے والے ووڈ کٹر کی گھٹکھٹائی ہوئی آواز تو ہر وقت ہی گونجتی رہتی تھی۔ غرض مجھے یہاں بھی خاموشی اور سناٹے کا احساس ہوا۔ کوئی ملازم، مزدور بھی نہ تھا۔ البتہ ایک خالی راکٹ ٹرک احاطے کے پرے دیو بیکل پیوٹی گیٹ کے باہر کھڑا نظر آ رہا تھا۔

”جی..... سرجی! آپ.....“ اچانک ایک آواز پر میں چونکا۔ یہ مشتاق سیال تھا۔ ہمارا فیچر۔ بھاری بھر کم اور درمیانے قد کا ٹھک کا مالک۔ وہ چالیس کے پینے میں تھا اور خاصا منسکر المزاج تھا۔

”کیا بات ہے فیچر؟..... کام بند پڑا ہے؟“ میں نے پُرمٹانت لہجے میں پوچھا۔

”بس جی کیا بتاؤں..... مزدوروں نے شتوا بڑھانے کے لئے ہڑتال کر رکھی ہے۔ جتنا بھی دو، ان کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔“ وہ ناگواری سے بولا۔ ”آئیے..... آپ اندر تشریف لائیں۔“ وہ آخر میں مودبانہ لہجے میں بولا۔

”ماموں کدھر ہیں؟“ میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر پوچھا۔

”صاحب آنے والے ہیں۔ آپ آئیے۔“

”گئے کہاں ہیں؟“ میں بدستور سنجیدگی سے بولا۔

”وہ جی..... اعظم خان کے رئیس خانے تک گئے ہیں۔“ وہ جواب بولا۔

”اعظم خان.....؟“ میں نے استفسار سے انداز میں یہ نام دہرایا۔

”آپ اعظم خان کو نہیں جانتے سر جی؟“

اس کے استجاب پر مجھے یاد آ گیا۔ ”یہ وہی تو نہیں، جسے سرکاری مال خانے سے کروڑوں روپوں کی خورد برد پر معطل کر دیا تھا؟“

میری بات پر فیجیر مشتاق سیال کے چہرے پر ایک لمحے کو عجیب سی مسکراہٹ ابھری اور وہ کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”چھوڑیں سر جی! بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں۔“

مجھے اس لمحے نے اور بے محل مقولے پر طنزی محسوس ہوئی جس کا میں اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔

”فیجیر!..... ملک و قوم کی دولت پر غاصبانہ طریقے سے ہاتھ صاف کرنے والوں کو تم بڑے نوک کہتے ہو؟“

وہ میرے طنز کی کاٹ پر ذرا بوکھلا سا گیا۔

”نہیں سر جی! ام..... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ یہ تو بہت پرانی بات ہے..... اب تو اعظم صاحب پر یہ کیس بھی جھوٹا ثابت ہو چکا ہے اور وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر.....“

”مجھے یہ بتاؤ کہ ماموں کی وہاں سے کب تک آمد متوقع ہے؟“ میں نے اس کی بات کاٹ کر پُر متانت لہجے میں پوچھا۔ مجھے اس کا اعظم خان کو ”صاحب“ کہنا بھی برا لگا تھا۔

”کچھ کہہ نہیں سکتا جی میں..... ظاہر ہے، وہ بڑے آدمی سے ملنے.....“ اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ چپ ہو رہا۔ میں اسے گھورنے لگا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے..... ماموں سے اسی وقت موبائل پر رابطہ کرو۔“

”جی سر!..... ابھی کرتا ہوں۔“ وہ فوراً بولا اور جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا۔ ماموں کے نمبر بچ کرنے لگا۔ پھر کان سے لگا لیا۔ ”سر جی! میرا خیال ہے انہوں نے موبائل اپنا آف کر رکھا ہے۔“

”ہوں.....“ میں نے طویل ہمکاری خارج کی، پھر اس سے پوچھا۔ ”انہیں یہاں سے گئے کتنی دیر ہوئی ہے؟“

”میرا خیال ہے جی، بس آپ کے آنے سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی وہ نکل کر گئے ہیں۔“

”بتایا نہیں کہ کب تک واپسی ہوگی؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”کہہ تو رہے تھے کہ گھنٹہ ڈیڑھ لگ ہی جائے گا۔“ وہ لوگوں سے لہجے میں بولا۔

”سمجھ نہیں آتا آخر ماموں نے اپنا موبائل کیوں آف کر رکھا ہے؟“ میں ہولے سے بڑبڑایا۔

”بس جی..... بڑے آدمی سے ملنے گئے ہیں۔ ڈسٹرب ہونا نہیں چاہتے ہوں گے صاحب۔“ وہ اپنی عادت سے مجبور لگتا تھا۔ میں نے اسے گھورا۔ وہ جلدی سے اپنی غلطی محسوس کر کے دوبارہ اپنی بات دہرانے لگا۔ ”مم..... میرا مطلب ہے جی..... چھوٹے آدمی سے ملنے گئے ہیں.....“

”بکواس بند کرو۔“ میں جھلڑ کر بولا۔ ”تم پر اعظم خان جیسا چور اچکا کسی بھوت کی طرح سوار ہو گیا ہے۔ آخر تم کس وجہ سے اس کے لئے بڑا آدمی، بڑا آدمی کی گردان لگائے ہوئے ہو؟“

میرے کھرنے پر وہ شرمندہ سا نظر آنے لگا تھا۔

”وہ سیدھا ادھر ہی آئیں گے نا؟“ میں نے اس کے جھکے ہوئے سر پر نظر ڈال کر پوچھا۔

”جی، سر جی!“

”کمال ہے..... یہاں مزدوروں نے ہڑتال کر رکھی ہے، کام بند پڑا ہے۔ اور ماموں کو کوئی واڈ نہیں۔ سمجھ نہیں آتا آخر وہ اعظم خان کے پاس کیا کرنے گئے ہیں؟“ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو خود لای کے انداز میں بڑبڑانے لگا۔

اچانک مال کے دیو ہیکل چوٹی گیٹ سے ایک سنگل ڈور پھیرا اندر داخل ہوئی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔

میں نے قدرے چونک کر جیب کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر ایک نیل جیسا فریہ اندام غص سوار تھا۔ اس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھ رکھا تھا۔ جب کی وڈ اسکرین کے عقب میں اندر عقبی

بات پر مجھے چار عدد مسلح سواروں کی جھلک دکھائی دے گئی۔

”ارے..... ملک صاحب بھی تشریف لے آئے۔ بڑے آدمی ہیں جی۔“ فیجیر کے منہ سے بے اختیار مجھے چڑا دینے والا لفظ کسی تکیہ کلام کی طرح برآمد ہوا تھا۔

جیب میں ہمارے قریب آ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ گول مثول سا فیجیر یکے ہوئے شلیم کی طرح

ہٹکا ہوا جیب پر جا گرا۔ مجھے اس کا یہ خوش آمدانہ رویہ ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ وہ نیل جیسا شخص

پنچ آنز تو اس سے پہلے ہی اس کے اسلحہ بدست چاروں محافظ کار پر داذ کد کڑے مار کر نیچے اتر چکے تھے۔

”آئیے، آئیے ملک صاحب!..... زہے نصیب..... اندر تشریف لائیں۔“ فیجیر مشتاق سیال

دبا اس کے قدموں پر کسی کتے کی طرح لوٹتے ہوئے خوشامداند انداز میں بولا۔

نیل جیسے خاکستری رنگت والے نیم نیم شخص نے چشمہ اتار کر بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھا۔

اس کی میری جانب گھورتی نظروں کا مطلب فوری بھانپتے ہوئے باجھیں پھیلا کر اس سے بولا۔

”ملک صاحب! یہ اپنے چھوٹے صاحب ہیں..... نادر علی خان۔“

”ہوں.....“ اس نے ایک گھیر اور پراسرار ہمکاری خارج کی، پھر وہیں کھڑے کھڑے فیجیر سے

مرکھرائی آواز میں بولا۔ ”کدھر گئے ہیں..... آپڑیں حیدر گل صاحب؟“

”وہ جی..... صاحب، اعظم خان صاحب سے ملنے گئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ

میں تو میں آپ کو بٹھا دوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ ملنا بھی ضروری ہے۔ انتظار کر رہی لیتے ہیں۔“ وہ پرنخوت لہجے میں اطراف پر نظر

لتے ہوئے بولا اور پھر فیجیر کے ساتھ چلتا ہوا آفس کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے اس کرخت صورت

میں سے ملنے کی کوشش نہیں کی مگر جب وہ میرے قریب سے گزرنے لگا تو عین میرے سامنے رک گیا۔

میں نے بعد میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بے تاثر لہجے میں بولا۔

”تم..... حیدر گل کے بھانجے ہونا؟“

میں نے اس سے مصافحہ کیا اور محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس نے اپنے کاٹھوں پر

رہے، بغیر گردن کے سر کو گینڈے کی طرح یہ مشکل موڑ کر اپنے چاروں مسلح محافظوں کی طرف دیکھا۔

راز ایسا ہی تھا جیسے وہ اپنے چاروں غمیث صورت کارندوں سے کہہ رہا ہو، پچھان لیا اسے؟

میں نے دیکھا، ان چاروں نے بیک وقت میرے چہرے پر اپنی پراسرار نظریں مرکوز کرتے ہوئے

لے سے اپنے سر ہلا دیے۔ مجھے ان کا یہ پراسرار انداز جانے کیوں بہت ہی عجیب لگا تھا۔ پھر وہ آگے

ہٹ گئے تھے۔ فیجیر مشتاق ان کو لے کر ماموں حیدر گل کے شاہانہ آفس میں داخل ہو گیا تھا۔ میں خاموش

لے ساتھ چلتا ہوا ماموں کے کمرے میں جانے کی بجائے دوسرے کمرے میں آ کر ایک کرسی پر براجمان



ہو گیا۔ یہ نیجر کا کمرہ تھا۔ دونوں کمرے آپس میں متصل تھے۔ درمیان میں چھ بائی چار کی چوکنڈ کھڑکی تھی۔ یہاں اس بیل جیسے شخص نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”اوائے کا کے! اندر آ جا..... ہم تو تیرے ماموں کے پرانے یار بلی ہیں..... آ شاباشے۔“ اس کا انداز بے تکلف تھا۔ مگر کچھ میں عجیب سا اکھڑ پن تھا۔ اس کی بات نہ ماننا غیر اظہار ہی ہوتا۔ چنانچہ میں طوعاً و کرہاً اپنی جگہ سے اٹھا اور گھوم کر ماموں والے کمرے میں آ گیا۔ نیجر نے مجھے ماموں کی بھاری بھر کم ریوالوگ جیئر پر بیٹھنے کو کہا۔ یوں بھی میں جب آتا، ماموں کی غیر موجودگی میں جیئر پر بیٹھا کرتا تھا اس لئے میں وہیں براجمان ہو گیا۔

”کمال ہے..... آپ ماموں کے اتنے پرانے دوست ہیں لیکن میں آج پہلی بار آپ کو دیکھ رہا ہوں؟“ میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے ہمکلام ہونا ضروری سمجھا۔

”وہ جی..... یہ..... اپنے ملک سردار خان صاحب ہیں، بڑے آدمی ہیں جی۔ ان کی اد ذرا کم ہی آؤک جاؤک ہوتی ہے نا۔“ نیجر نے فوراً اپنی پانچھیں کانوں کی لوڈوں تک پھیلا کے لقمہ ضروری سمجھا اور میں نے اس کی اس مداخلت بے جا پر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا تو اس نے یکدم گھبرا کر اپنی گردن کھوے کی طرح شانوں میں دبکالی۔ مگر باز وہ پھر بھی نہ آیا۔ منمنا کر ہولے بولا۔ ”بڑے آدمی ہیں جی.....“

”یہ نیجر بڑا دلچسپ آدمی ہے۔“ ملک سردار خان نامی وہ شخص غیر تاثرانہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”بس ذرا بڑبولا ہے اور اس کی یہ عادت مجھے پسند ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے منگھڑ گرتے کی سائیڈ پاکٹ سے بنینس اینڈ ہیجر کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ پیکٹ سے ذرا ابھار کر میرا طرف کیا۔

”شکریہ، میں سگریٹ نہیں پیتا۔“ میں نے معذرت خواہانہ مسکراہٹ سے کہا۔ اس نے خاموشی اپنے لئے سگریٹ نکال کر اپنے بدایت سیاہ ہونٹوں میں دالبا اور بیش قیمت لائٹر سے اسے سلگانے کے لیے نیجر سے بولا۔

”کیا بات ہے مشتاق میاں! آج مزدوروں کی چہل پہل نظر نہیں آرہی؟“

”وہ جی..... ملک صاحب! مزدوروں نے ہڑتال جو کر رکھی ہے۔“

”او..... اچھا..... کر لینے دو یہ شوق بھی پورا۔ پیٹ کی آگ بڑھے گی تو خود ہی آئے والی بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ کیوں جی، نادر میاں.....؟“ اس نے تفصیک آمیز انداز میں بے محل تبصرہ اور آخر میں مجھ سے تائید چاہی لیکن میں خاموش رہا۔

”مگر یہ ہڑتالی ہیں کدھر؟ نظر تو نہیں آرہے۔ نہ اندر..... نہ باہر۔“ میری طرف سے جواب پا کر اس نے دوبارہ نیجر سے پوچھا۔

”وہ لوگ جی..... اپنے بیوی بچوں کو لینے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی آکر جمع لگائیں گے۔ نیجر نے برا سامنہ بنا کر جواب دیا۔

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک باہر سے بہت سے لوگوں کے چیخنے چلا آنے اور شور مچانے کی آوازیں ابھریں..... دھواں دھار لہروں اور شور شرابے نے مجھے بے اختیار ریوالوگ جیئر سے اٹھنے پر مجبور کر دیا مگر ملک سردار سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہنے ہوئے بولا۔

”بیٹھے رہو کا کے! انہیں اہمیت دو گے تو یہ اور منہ کو آئیں گے۔ ان لوگوں کا کام ہی مالکان کو بلیک میل کرنا ہوتا ہے۔“

اس کے لہجے میں ان معصوم اور غریب محنت کشوں کے لئے تفصیک آمیز تھارت کو محسوس کر کے میں نے چپتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ملک سردار علی خان! سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں کا کا نہیں ہوں، میرا نام نادر علی خان ہے۔ دوسرا یہ کہ اس مال کا مالک میں خود ہوں اور یہاں کے مزدوروں کے مسائل سے واقف ہونا میرا اولین فرض ہے۔ لہذا آپ یہاں آرام سے بیٹھ کر اپنے دوست حیدر گل کا انتظار کریں اور بس۔“ یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکلنے لگا تو مجھے نیجر مشتاق سیال کے ہولے سے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

”بڑے آدمی ہیں جی۔“

”محنت کشوں کے پسینے کا حساب دو..... حساب دو۔“

”غریب مزدوروں کے خون پسینے پر تجوریاں بھرنے والو! ہمارا حساب دو۔“

”چپتی دھوپ میں ہاتھوں سے کمانی کرنے والے غریب محنت کشوں کو روٹی کے نام پر بلیک میل کرنے والو! اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمروں سے باہر نکلو، ہمارا احساس کرو، احساس کرو۔“

دیران سے ایک مکان میں  
ایک بیوہ بیٹی روتی ہے  
اس کا بچہ یہ پوچھ بیٹھا ہے  
عید بنگلوں میں کیوں ہوتی ہے  
میرے کانوں میں پڑنے والے ان درد انگیز نعروں نے میرا جگر چھلنی کر کے رکھ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں فطری طور پر ایک حساس طبع انسان تھا۔ میں گیٹ کے باہر آیا تو یکدم جیسے مجمع کو سانپ سوگھ گیا۔ ان محنت کشوں کی تعداد بیس پچیس سے کم نہ تھی۔ ان کا اوپری بدن بدن، نیچے بوسیدہ مکلی چیکٹ ٹلواریں تھیں۔ پسینے اور گرد میں اٹے ہوئے موقوف جسموں والے ان مزدوروں کے مفلوک الحال چہروں سے عسرت اور تنگ دہی پسینے کی صورت ٹپک رہی تھی۔ ان لوگوں کے ہمراہ ان کے بیوی بچے بھی تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے یکدم خاموش ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ مجھے حیدر گل کے بھانجے کی حیثیت سے جانتے تھے۔ سب سے آگے میری عمر کا نوجوان تھا جو شاید ان کا لیڈر تھا۔ خاصا تومند تھا۔ میرا دیکھا نالا تھا۔ مردان شاہ نام تھا اس کا۔

میں نے ایک طائرانہ نظر ان سب پر ڈالی پھر مردان شاہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے؟ تم لوگوں نے اتنا شور کیوں مچا رکھا ہے؟“

مردان شاہ میری طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

”چھوٹے صاحب! ہمیں بڑے صاحب سے بات کرنی ہے۔“

بڑے صاحب سے اس کی مراد ماموں حیدر گل ہی تھے۔ تاہم میں نے کہا۔

”وہ یہاں موجود نہیں ہیں..... تم لوگوں کا جو مسئلہ ہے، مجھے بتاؤ۔“

”چھوٹے صاحب! ہم صرف مالک سے ہی بات کریں گے۔“ وہ اٹل لہجے میں جواباً بولا۔

”تم مجھے نہیں جانتے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں، آپ مالک کے بھانجے ہیں جی..... تمہیں.....“

”مزدوروں کی کمائی سے کروڑوں کمانے والو! ہمارے ایک ایک روپے کا حساب دو۔“  
میں نے ہاتھ بلند کر کے انہیں خاموشی اختیار کرنے کو کہا تو ان کے مزدور لیڈر مردان شاہ نے بھی  
تجھ کے اشارے سے مجمع کو خاموش رہنے کی تلقین کی۔

اس دوران منیجر مشتاق بھی وہاں آ گیا۔ پھر میرے قریب آ کر عادت سے مجبور ہو کر بڑبڑایا۔  
”چھوٹے لوگ ہیں..... جی۔“

میں نے گردن موڑ کر کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ وہ جلدی سے گھبرا کر بولا۔ ”مم.....  
مطلب ہے..... سب بڑے لوگ ہیں جی۔“ پھر میری بدستور اپنی جانب گھورتی ہوئی نظروں کی  
بندھ لاتے ہوئے میری مرضی کے مطابق جملہ بتانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے منمننا کر دوبارہ بولا۔  
”نکٹے ہیں جی۔“

اس کی پھر بھی تسلی نہیں ہوئی تو اس بار مسمیٰ سی صورت بنا کر باریک آواز میں بولا۔ ”ابھی جے ہی  
ن جی!“

”منیجر!.....“ میں زور سے دہاڑا۔ ”تمہاری دماغی حالت درست نہیں۔ تم اندر جاؤ۔“  
وہ ایسی صورت بنا کر واپس جانے کے لئے پلٹنے لگا جیسے اسے قبض کی شکایت ہو گئی ہو۔ مجھے اس کی  
ت پر ہنسی تو آئی مگر یہ موقع نہ تھا۔

میں نے ایک طائرانہ نظر دوبارہ مجمع پر ڈالی، پھر مردان شاہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اب مجھے یہ بتاؤ  
ماموں حیدر گل پر تم لوگوں کے مطالبے کا کیا اثر ہوا ہے؟“

”وہ تو جی ہم سے بات کرنا ہی گوارا نہیں کر رہے ہیں۔“ وہ تلخی سے بولا۔ ”ہم چھ روز تک ادھر ہی  
کے پیاسے دھڑا مارے گرمی اور دھوپ میں بیٹھے رہتے ہیں۔ آج مجبور ہو کر ہم اپنے بیوی بچے بھی  
آئے ہیں۔ مالک ہم سے یہی کہتا ہے کہ پہلے کام شروع کرو، مذاکرات بعد میں ہوں گے۔ یہ تو ہم  
بوں کوٹالے والی بات ہوئی نا جی!“

میں اس کی بات پر کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ بات واضح تھی۔ اگر مردان کے کہنے کے مطابق واقعی  
ماموں حیدر گل نے ان کے ساتھ نا انصافی کی تھی اور تنخواہ کے محض دو سو روپے بڑھا کر ان کی روز کی  
روٹی کے جوان کا بہر حال حق تھا، پچھتر روپے دینا بند کر دیئے تھے تو اس طرح ماموں نے ان کا  
ماتن مارا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔

مجھے مال سے ہونے والی ماہانہ آمدنی کا اندازہ تھا، جو ایک لاکھ اسی ہزار سے دو لاکھ دس ہزار کے  
ان تھی۔ خرچ اخراجات اور مزدوروں کی تنخواہ کی مد میں کٹ کٹا کر یہ آمدنی ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے  
قریب بنتی تھی۔ یہ سارا حساب کتاب کرتے ہی میں مردان شاہ سے ذرا بلند آواز میں بولا تاکہ دیگر  
رہنما میرے فیصلے سے آگاہ ہو جائیں۔

”ٹھیک ہے..... تم لوگ اپنے بیوی بچوں کو گھر چھوڑ آؤ اور آج سے کام شروع کر دو۔ میں تم  
ساکے روز کے نصف پچھتر روپے بحال کرتا ہوں بلکہ اسے بڑھا کر پورے سو روپے کرتا ہوں اور  
دس بھی مزید تین سو روپے کا اضافہ کرتا ہوں۔ اس طرح وہ ڈھائی ہزار روپے ہو جائے گی۔ کیا  
میرا یہ فیصلہ قبول ہے؟“

میرے فیصلے پر جیسے ان لوگوں کے بد حال چہروں پر زندگی کی رونق دوڑ گئی اور انہوں نے خوشی کے  
”چھوٹے مالک زندہ باد“ کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ مردان شاہ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر

میں نے اچانک اس کی بات کاٹی۔

”بس اتنا ہی جانتے ہو مجھے.....؟“

اس پر وہ ایک ذرا چونکی نظروں سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

”اس مال کا اصل مالک میں ہوں۔“

”جی ہاں چھوٹے صاحب! یہ تو ہم جانتے ہیں۔ مگر آپ تو ہر وقت ادھر نہیں ہوتے۔ ہم صرف مالک  
سے ہی بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”مالک تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں جو مذاکرات کروں گا، وہ حتمی ہوں گے۔  
میں نے اس بار ٹھوس لہجے میں کہا تو مردان شاہ چند ثانیے کی پرسوج خاموشی کے بعد بولا۔  
”دیکھئے چھوٹے مالک.....“

”میرا نام صرف نادر علی خان ہے۔ مالک والی ذات کوئی اور ہے۔“ میں نے دوبارہ اس کی بات  
کاٹ کر اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی۔

”جی..... نادر علی صاحب! بات یہ ہے کہ ہماری ہڑتال کو آج ساتواں روز ہے مگر بڑے صاحب  
(ماموں حیدر گل) نے ہم سے باہر نکل کر بات تک کرنا گوارا نہیں کیا ہے۔“

اس نے بتایا اور مجھے حیرت کا جھکا لگا۔ گویا سات روز سے کام بند تھا۔ میں نے دل میں سوچا، پھر  
غریب مزدور تو روز کمانے اور روز کھانے والے لوگ تھے۔

”تم لوگوں کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ وہ بتاؤ مجھے۔“

وہ بتانے لگا۔ ”دن بہ دن بڑھتی ہوئی مہنگائی کے تناسب سے ہماری تنخواہیں بہت کم ہیں۔ ہم نے  
مالک سے تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے ہماری تنخواہیں تو بڑھا دیں لیکن روز کی مزدوری کو ”معا  
مزدوری“ کا نام دے کر بند کر دیا۔ آپ خود انصاف کریں کہ ہم صبح چھ بجے یہاں بغیر ناشتہ کئے آئے  
ہیں۔ بھاری شہیر اٹھاتے ہیں، ٹرکوں پر لادتے ہیں، بجلی اکثر جالی رہتی ہے تو ہم ان ہاتھوں سے خود آٹا  
مٹین چلاتے ہیں۔ رات نو بجے تک۔ کیا ہمیں یہاں دو وقت کی روٹی بھی نہ ملے؟ وہ اگر گھر کھانے  
جائیں تو مالک اسے وقت کا زیاں سمجھتا ہے۔ آپ ہی بتائیں، ہم کیا کریں؟“

یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں میرے سامنے پھیلا دیں۔ اس کی دیکھا دیکھی تمام  
مزدوروں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر میرے سامنے کر دیئے۔

میں نے ان کی ہتھیلیوں کو دیکھا تو احساس دروں کی ایک ٹیس سی اٹھی۔ ان بے چاروں کی ہتھیلیاں  
سرخ اور پھٹی پھٹی سی ہو رہی تھیں۔ چھالے پرانے ہو کر سیاہ پھوڑوں کی صورت نظر آ رہے تھے۔

”تم لوگوں کی اس وقت ماہانہ تنخواہ کتنی ہے؟“ میں نے ایک ہمکاری لے کر مردان شاہ سے پوچھا  
وہ بولا۔

”پہلے دو ہزار تھی۔ پھر صرف دو سو روپے بڑھا کر ہماری روز کی دو وقت کی روٹی اور چائے کا  
مزدوری میں ملنے والے پچھتر روپے ہی کی کس بند کر دیئے گئے۔ اس طرح تو ہمیں اُلٹا نقصان ہو گیا۔ پھر  
ہمارا حق غصب کرنے والی بات ہو گئی۔“

اس نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ اچانک مجمع میں ایک مزدور سے نہ رہا گیا اور اس نے اپنے لہجہ  
کے منہ سے نا انصافی کی کھانسنے پر جوش سے مغلوب ہو کر بہ آواز نعرہ لگا دیا۔

”ہمارے پسینے کا حساب دو..... حساب دو۔“

کے جمع کو خاموش کروایا۔ میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر اب بھی عدم اطمینان کی سی کیفیت طاری تھی۔  
”صاحب جی! ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمارے دکھوں اور ہماری پریشانیوں کا احاطہ کیا۔ لیکن کیا یہ فیصلہ بڑے مالک قبول کریں گے؟“

مجھے اس کی بے اطمینانی کی وجہ معلوم ہو گئی۔ لہذا میں ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ ازراہ تعفنی ان بولا۔ ”اس مال کا اصل مالک میں ہوں..... اور میرے ماموں کو میری بات ماننا پڑے گی۔ تم لوگ بے فکر ہو کر آج سے کام شروع کر دو۔“

یہ کہہ کر میں واپس آفس کی طرف لوٹ گیا۔ وہ لوگ خوشی سے میرے حق میں نعرے بلند ہوئے لوٹ گئے۔ منیجر گھبرائے ہوئے آلو کی طرح آفس کے باہر ہی کھڑا تھا۔  
اس نے شاید وہاں کھڑے ہو کر میرے فیصلے کی روداد، مذاکرات سمیت سن لی تھی۔ وہ ڈرتے ڈرتے مجھ سے مخاطب ہوا۔

”سس..... سر جی!..... یہ..... یہ آپ نے کیا کر دیا؟“  
”تم اپنی اوقات میں رہو منیجر! سمجھے..... میں نے اسے گھور کر جھڑکا اور ماموں کے کمرے میں جانے کی بجائے دوسرے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔“

ملک سردار خان ماموں والے کمرے میں ہی بیٹھا تھا اور شیشے کے چوکٹے سے بہ مشکل اپنی گردن موڑے میری طرف عجیب نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔  
ذرا دیر بعد تمام مزدوروں نے آکر کام شروع کر دیا۔ ان لوگوں کے آنے کے پندرہ بیس منٹ ہی ماموں حیدر گل بھی لوٹ آئے۔ ان کی سفید رنگ کی پونٹھوہاری جپ گیسٹ سے اندر داخل ہوئی۔

کے ہمراہ ایک آدمی بھی تھا۔ وہ نیچے اترے اور دائیں بائیں مزدوروں کو کام میں لگن دیکھ کر چونک اٹھا پھر عجیب انداز میں اپنا سر جھٹک کر اپنے کمرے کی جانب بڑھے۔ میں بھی کرسی سے اٹھ کر باہر آیا۔  
دیکھ کر اس کے قدم جیسے یکدم زمین میں گڑ گئے۔

میں نے اخلاقاً مکر بے تاثر لہجے میں انہیں سلام کیا۔  
”ارے نادر بیٹا! تم یہاں کیسے؟“

”کیوں ماموں؟..... کیا میں یہاں نہیں آ سکتا؟“ میں نے غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔  
”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ جواباً وہ بھی سنجیدہ بلکہ خشک لہجے میں بولے۔ ”بہر حال..... اندازاً یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ملک سردار خان نے کھڑے ہو کر ماموں سے معافہ کیا۔

کے بعد وہ اپنی بھاری بھر کم چیز پر براجمان ہو گئے۔ میں بھی ملک سردار خان کے برابر والی کرسی گیا۔ منیجر پاس ہی آن کھڑا ہوا۔ وہ بڑی بے تابی سے ماموں کے بولنے، بہ الفاظ دیگر ان کے کچھ کا منتظر تھا اور وہاں بھی بیٹھی۔

”منیجر! کیا ان مزدوروں کے کس بل نکل گئے؟“ ماموں حیدر گل کے لہجے میں طنز کی گہری کالہ جو مجھے حد درجے ناگوار گزری۔ مگر میں نے ابھی دخل اندازی مناسب نہیں سمجھی تھی۔  
”وہ جی..... کس بل تو ہمارے نکل گئے۔“ وہ جیسے پھٹ پڑا۔

”کام کی بات کرو۔“ ماموں نے چپھتے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔  
”سر جی! آپ کے بھانجے صاحب، نادر میاں نے مزدوروں کے سارے مطالبے مان لئے ہیں۔ ان کی بھتا مزدوری کے علاوہ ماہانہ تنخواہیں بھی بڑھادی ہیں۔ اس کے لہجے میں میرے لئے شکایت

”ایں..... یہ کیا.....؟“ ماموں یکدم جیسے بدک گئے اور میری طرف دیکھ کر مستفسر ہوئے۔  
”یہ منیجر کیا کہہ رہا ہے نادر بیٹے! کیا تم نے.....؟“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے ماموں!“ میں نے مستحکم لہجے میں ماموں کی طرف دیکھ کر کہا۔  
”نادر بیٹے! یہ تم نے کیا بے وقوفی کر ڈالی؟ تمہیں معلوم ہے کہ ان لوگوں کے دماغ خراب ہو جائیں گے اور آئے روز اسی طرح ہلک میل کر کے اپنے مطالبے منواتے رہیں گے۔“

میرے بولنے سے پہلے ہی منیجر بول پڑا۔ ”سر جی! میں نے تو سمجھانے کی کوشش کی تھی نادر میاں کو کہ اس طرح یہ ہر روز ہمارے منہ کو آنے لگیں گے۔ آخر چھوٹے لوگ جو ہوئے۔“ وہ اپنے تکیہ کلام کے ریلے دل کی جھڑاس نکالنے پر حلا بیٹھا تھا۔

”تم اپنی چونچ ذرا دیر کے لئے بند رکھو۔“ ماموں حیدر گل نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ پھر میری رِف دیکھ کر بولے۔ ”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“

”جواب تو آج تک مجھے بھی میری باتوں کا نہیں ملا ہے ماموں!“ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اپنے کاٹ دار لہجے میں دیرینہ پیش سموتے ہوئے ماموں سے کہا۔  
”یہ آج تم کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہے ہو؟“ ماموں نے قدرے سخت لہجے میں مجھ سے کہا تو

میں ان سے مرعوب ہوئے بغیر ملک سردار خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔  
”ماموں! پہلے آپ ان سے فارغ ہو لیں، پھر بات ہوگی۔“

میری بات پر ماموں نے ایک نظر ملک سردار خان کی طرف دیکھا پھر بہ غور میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سرد لہجے میں بولے۔  
”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی نادر!..... گھر جاؤ۔ وہیں تم سے بات ہوگی۔“

”نہیں ماموں! مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں اسی لئے پنڈی سے صبح سویرے ہی اوٹن چلا آیا تھا۔ مگر آپ گھر سے جا چکے تھے۔ یہاں آکر میں گھٹنے بھر سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”سارے بھی چپھتے ہوئے لہجے میں کہا۔  
”ہاں ٹھیک ہے..... اسی لئے تو کہہ رہا ہوں، تم گھر جاؤ..... میں..... میں.....“

”ماموں! آپ پہلے ملک صاحب کو فارغ کر دیں۔“ میں نے ان کی بات کاٹی تو ان کے چہرے پر لواری کے تاثرات ظاہر ہونے لگے۔ پھر ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ملک سردار خان نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ماموں سے کہا۔  
”حیدر!..... میں چلتا ہوں۔ تم کسی وقت آکر مجھ سے مل لینا۔“ یہ کہہ کر وہ ماموں کا جواب سنے

پر باہر نکلتا چلا گیا۔  
”نادر!..... یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تمہیں چھوٹے بڑے کا بھی خیال نہیں رہا ہے۔ شہر کی پڑھائی نے مارا اتنا ہی دماغ خراب کر دیا ہے؟“ وہ درشتی سے بولے۔

”ماموں! شہر کی پڑھائی نے اب میرا دماغ درست کیا ہے۔“ میں نے بھی ترکی بہ ترکی کہا۔ ”مجھے

جانی لگئی۔ ماموں نے خاموشی کے ساتھ چایاں مجھے تھما دیں۔ میں جانے لگا تو عقب سے ان کی بھینکی ہوئی آواز نکلائی۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

میں ایک بل کے لئے رکا اور گردن موڑ کر عقب میں ماموں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اسے سوال کا جواب لینے۔“

یہ کہہ کر میں تیزی سے نکل گیا۔

میں جیب میں آکر بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ صنوبر اور چیز کے لائے لائے بیڑوں سے گھری بل کھاتی سڑک پر میں جیب خطرناک رفتار کے ساتھ دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے اسٹیرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ نظر دہراؤ اسکرین کے پار چینی سڑک پر مرکوز تھی اور دل و دماغ میں زنائے دار ہواؤں کی شاہیں شائیں ہو رہی تھیں۔

میرے اس سوال پر کہ میری ماں نے میرے باپ کا خون کیوں کیا تھا؟ ماموں حیدر گل کا جواب دینے کی بجائے آپے سے باہر ہوتا میرے اس شبے کو یقینی بنا رہا تھا کہ شاہ میر اور نظر حیات نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، وہ غلط نہ تھا۔ چنانچہ اب مجھے اس بات کا پورا یقین ہو چکا تھا کہ ماموں حیدر گل بھی میرے سوالوں کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکتے۔ یقیناً وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے ہوں گے کہ میری ماں یعنی اپنی بہن کے اس بھیا تک اور ناقابل معافی جرم کا میرے سامنے اقرار کریں۔ یہی وجہ تھی کہ اب میں جیل جا کر خود اپنی ماں سے ان سوالوں کا جواب لینا چاہتا تھا۔

نصف گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد میں نے جیل کی عمارت کے سامنے جیب روکی اور اندر داخل ہو گیا۔ یہاں لیڈیز عملہ بھی نظر آتا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی کی وومن جیل تھی، جس کے ساتھ Juvenile Crime کی جیل بھی منسلک تھی۔

جیل سپرنٹنڈنٹ اظہر اقبال مجھے ماموں حیدر گل کے بھانجے اور قیدی عورت کے بیٹے کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اس نے فوراً میری ماں سے ملاقات کا بندوبست کروا دیا۔

دو پولیس والے مجھے ایک تنگ و تاریک اور سیلین زدہ سی بیرک کے سلاخ دار دروازے کے سامنے پھوڑ کر چلے گئے۔ سامنے وہ عورت کھڑی تھی جو میری ماں تھی۔

وہ اب تک انیس سال کی سزا کاٹ چکی تھی۔ اس کی عمر چالیس کے پینے میں تھی۔ میری محدود معلومات کے مطابق اسے اکیس سال کی عمر میں جیل ہوئی تھی اور اس چہار دیواری کے اندر اس عورت نے مجھے ننگے فرش پر اڑیاں رگڑ رگڑ کر جنم دیا تھا۔ میں کئی سال بعد اس سے ملنے آیا تھا۔ اس وقت وہ ایک بھرپور جوان عورت تھی۔ اگرچہ اب بھی اس کی صحت میں کچھ خاص فرق نہیں نظر آتا تھا۔ تاہم عمر رفتہ کے روز و شب، جیل جیسی ٹھن اور پُر مصائب فضا میں بتانے کے بعد اس کے سرخ و سپید چہرے کی پہلے الی رونق ماندی پڑنے لگی تھی۔ بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے تار بھی جھلکنے لگے تھے۔ لیکن اس کی بڑی سی کشادہ آنکھوں میں آج بھی وہی ایک عجیب سی خوں ناک چمک محسوس کر رہا تھا، جو میں اپنے بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ اس کی مجھ پر نگاہ پڑی اور پھر جیسے اس کا پڑمردہ چہرہ کھل اٹھا۔ متاثرے جذبات کی ایک مخصوص سرخی اس کے چہرے پر اُٹھ آئی اور وہ بے اختیار سلاخوں کے قریب آگئی۔

”نادر!..... میرے بچے! میرے جگر کے ٹکڑے!..... تُو آگیا؟“

یہ کہتے ہوئے اس نے سلاخوں کے پیچھے سے اپنا ایک کپکپاتا ہوا ہاتھ میرے سر پر پھیرنے کے لئے

بل گرج کر بولے۔

”نادر!.....“

”آہستہ بولیں ماموں! کہیں ہمارے خاندان کی یہ لرزہ خیز کھٹا کھٹوں تک نہ جا پہنچے۔“ میں بدستور تسکینی سے کہا۔ ماموں کے چہرے پر غصے کا ارتعاش لرزاں تھا۔

پھر وہ اپنے ہونٹ جھنجھک کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے قریب آکر میرا بازو پکڑا۔

”آؤ میرے ساتھ..... گھر چل کر تم سے بات کرتا ہوں۔“

میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور ان کے ساتھ گھر چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

\*\*\*

”ہاں..... بولو، کیا کہنا چاہتے تھے تم مجھ سے؟“ گرین لاج پہنچنے کے بعد ماموں حیدر گل میرے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے کہا۔

”ماموں!..... میرے باپ کو تمہاری بہن نے کیوں قتل کیا تھا؟“

میرا خیال تھا کہ میرے اس سنسنی خیز انکشاف پر انہیں حیرت و پریشانی کا زبردست جھٹکا لگے گا! ان کے چہرے پر ہلکی سی چونکنے کی علامت بھی ظاہر نہ ہوئی۔ البتہ میرے منہ سے ماں کی بجائے ”کی بہن“ کے الفاظ پر ماموں نے مجھ سے کہا۔

”وہ میری بہن ہی نہیں، تمہاری ماں بھی ہے۔ کیا تم اتنے ہی بے حس ہو چکے ہو کہ اپنی مظلوم ماں بھی نہیں کہہ سکتے؟“

”مظلوم..... ہونہ.....!“ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔ ”ماموں! مظلوم میرا باپ قادر خان تھا، جسے اس ناگن.....“

”نادر!.....!“ ماموں پھٹ پڑے اور مارے طیش کے مجھے تھپڑ مارنے کے لئے انہوں نے ہاتھ اٹھا دیا۔ مگر وہ اٹھا کا اشارہ کیا۔ میرے اندر بھی غم و غصے کی ایک شدید لہر اٹھی تھی۔

”ماموں!..... کیا میرا بچ اتنا ہی کڑوا ہے کہ آج آپ کا ہاتھ بھی مجھ پر اٹھنے لگا؟ لیکن آپ کس کے منہ پر یہ تھپڑ ماریں گے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ سچ کو جھٹا دیا جاتا ہے، وہ اتنا ہی شدت ساتھ اُبھرتا ہے۔“ میں فرط جوش سے پھٹ پڑا۔

”مجھے آج معلوم ہوا ہے کہ آپ نے بچپن سے لے کر اب تک مجھے میرے سوالوں کے جواب کیوں محروم رکھا..... میں پوچھتا ہوں ماموں! کہ تمہاری بہن نے میرے باپ قادر خان کا کیا کیا تھا؟“

”نادر!..... تم اس وقت میری نظروں سے دور ہو جاؤ..... ایسا نہ ہو، میرا ہاتھ واقعی اٹھ چلا ماموں نے سرخ چہرے کے ساتھ مجھ سے کہا۔ ان کا لہجہ غصے کی شدت کے باعث لرزے لگا تھا۔

میں نے ایک گہری ہکاری بھری اور چند لمبے ماموں کے چہرے کو تکتا رہا۔ اگرچہ مجھے پہلے ہی اس بات کا پورا یقین تھا کہ ماموں میرے اس سوال کا جواب کبھی نہیں دے پائیں گے کیونکہ آج تک ہی ہوتا چلا آیا تھا۔ وہ مجھے نالے چلے آئے تھے مگر میں نے بھی تمہید کر لیا تھا کہ اب اس خونی راز سے اٹھا کر رہوں گا۔ کیونکہ اب معاملہ میرے باپ کے قتل کا تھا اور قاتل بھی کون..... یعنی میری اپنی ماں!

”ماموں! مجھے گاڑی کی چابی دو۔“ چند ثانیوں کی اعصاب شکن خاموشی کے بعد میں نے جیسا

”ماموں.....!“

میرے پکارنے پر وہ رکے مگر میری طرف گردن موڑے بغیر خاموشی سے کھڑے میرے بولنے کے منتظر رہے۔

”میری پڑھائی جاری ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ لیکن جہاں تک مال کے معاملات کا تعلق ہے، انہیں حل کرنے کا مجھے بھی حق پہنچتا ہے۔“ میں نے کہا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید بولا۔

”اور..... میں نے مزدوروں کے حق میں جو فیصلہ کیا ہے، وہ کاروبار کے مفاد میں جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے درمیان مزید کسی قسم کی ناچاقی اور بد مزگی سے پہلے میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ میرے فیصلے کو حتیٰ سمجھا جائے۔“

میری دو ٹوک بات پر ماموں حیدر گل میری طرف گھومے۔ پھر چند قدم چلتے ہوئے میرے قریب آئے۔ چند لمحوں میں آنکھوں میں جھانکنے کی سعی کرتے رہے۔ پھر پُر سوچ انداز میں سر کو دھیرے دھیرے جھنجھٹ دیتے ہوئے بولے۔

”ٹھیک ہے۔“

ان کے جانے کے بعد میں اسی دن واپس پنڈی روانہ ہو گیا۔ میرے اور نگینہ کے درمیان جذباتی تعلق خاطر پینے کے بعد سے کبیر نے میرے روم سے اپنا مختصر سا پوریا بستر سمیٹ لیا تھا۔ اس نے اب اپنے کسی اور دوست کے روم میں شرارتی رہائش اختیار کر لی تھی۔ مجھے بہر حال اس پر مطلق اعتراض نہ تھا۔ میں جب کانج کیمپس پہنچا تو شام کے سائے جھک آئے تھے۔

میں تھکا تھکا سا اپنے بیڈ پر دراز ہو گیا۔

میں نے اب ماں اور ماموں حیدر گل سے مایوس ہو کر یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اپنے ماضی کے بارے میں نگینہ کے پیا شاہ میر صاحب سے مکمل تفصیل جاننے کی کوشش کروں گا۔ ماں اور ماموں حیدر گل کی پراسرار خاموشی انہیں میری نظروں میں مجرم بنا رہی تھی۔ اگرچہ مجھے اس بات کا تو پورا یقین ہو چکا تھا کہ میری ماں ہی نے میرے باپ کا قتل کیا تھا اور وہ اپنے اسی بھیا تک جرم کی سزا اب عمر قید کی صورت جیل میں بھگت رہی تھی۔ مگر میں اب یہ جانتا چاہتا تھا کہ آخر میری ماں نے میرے باپ کا خون کیوں کیا تھا؟ وہ کیا عوامل تھے کہ جس نے میری ماں کو اپنے ہی شوہر کے قتل پر اکسایا تھا۔

یہ وہ اہم سوال تھے جو میرے اندر اب لاوے کی طرح کھولنے لگے تھے۔ میں بہر حال ماموں حیدر گل اور ماں سے یہ کہ یہ حقیقت اُگلوانے میں ناکام رہا تھا۔ مگر میری یہ ”ناکامی“ اس بات کا واضح اور ٹھوس ثبوت تھی کہ میرے باپ قادر خان کے قتل میں میری ماں کے ساتھ میرا ماموں حیدر گل بھی ضرور برابر کا شریک رہا ہوگا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے نگینہ کے پیا شاہ میر اور ان کے دوست انکل نظر حیات کے حوالے سے بھی ایک کرید کی لگ گئی تھی کہ آخر ان دونوں نے کبیر احمد کے ورغلانے پر یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ ان لوگوں پر گناہ قاتلانہ مسلے کروانے میں ماموں حیدر گل اور میں ہی ملوث تھا؟ اگرچہ میری طرف سے ان کے دل اور ذہن صاف ہو چکے تھے مگر میرے لئے سوچنے کی بات یہ تھی کہ آخر کس حوالے سے شاہ میر اور نظر حیات نے یہ سمجھا تھا کہ یہ گناہ دشمنی ہمارے سوا ان کے ساتھ اور کوئی نہیں کر سکتا؟ دوسرے ان کی باتوں سے ہی یہ بھی صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لوگ میری ماں کے ماضی سے بہ خوبی واقف تھے۔ لیکن کیوں؟ ان کا میری ماں کے ماضی سے ایسا کون سا پراسرار تعلق تھا؟

باہر نکالا تو میں ایک نفرت انگیز نگاہ اس کے چہرے پر ڈال کر ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ماں کے چہرے پر ایسا ایسا تاریکی اتارنی چلی گئی۔ وہ ہکا بکا سی رہ گئی۔ آنکھوں میں درد کی رقی سی ابھر آئی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا پھر دانت کچپکا کر لفظوں کو چبا چبا کر اس سے مخاطب ہوا۔

”جس طرح میں تیرے جگر کا ٹکڑا تھا! اسی طرح میں اپنے باپ قادر خان کا بھی لخت جگر تھا۔ پھر..... پھر تُو نے اسے قتل کر کے، مجھے باپ کے سائے سے کیوں محروم کر دیا؟..... میں تجھ سے یہ سوال پوچھنے آیا ہوں ماں!..... مجھے جواب دے۔ ابھی..... اور اسی وقت۔“

میں جیسے پھٹ پڑا۔ ماں سنائے میں آ گئی۔ اس کا رنگ گہرا ہو گیا اور چہرے پر سیاہی کے لہجے زردی بھی نمودار ہو گئی۔ وہ ایک سراسیمگی کی کیفیت میں مجھے ہکتی رہی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں گویا کاسمندر موجزن تھا۔ چند لمحوں اسی طرح گزرے۔ پھر اس کے لرزیدہ ہونٹوں سے نکلا۔

”ی..... ی..... یہ..... یہ..... تو کیا..... کہہ رہا ہے بیٹا؟“

”مجھے بیٹا مت کہہ۔ صرف میرے سوال کا جواب دے..... کہ تُو نے میرے باپ کا خون کیا کیا تھا؟“

میں نے انتہائی سرد مہری سے اس کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو گھور کر کہا مگر وہ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے ایک ٹک مجھے تنکے لگی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے صاف عیاں تھا کہ شدید تذبذب کا شکار ہے۔ مگر اس کے ہونٹ لرز رہے تھے جیسے ان کے سانس سے الفاظ اس کے لرزیدہ لبوں دم توڑ رہے ہوں۔ تب پھر اس نے اپنی آنکھیں موند کر ایک گہری سانس لی اور یاس زدہ لہجے میں بولی۔

”میں..... تمہارے اس سوال کا جواب ابھی نہیں دے سکتی۔“

”کیوں؟..... کیا میرے سامنے اپنے بھیا تک جرم کا اقرار کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی؟ میرے لہجے میں طنز کی بڑی زہریلی کاٹ تھی۔ ”ماں! تُو نے اور ماموں حیدر گل نے کیا سمجھ رکھا تھا مجھے کبھی اس کر یہ حقیقت کا پتہ نہیں چل سکتا؟“

”نار!“ ماں غضب ناک آواز میں چلا اٹھی۔

”کیوں ماں!..... میرا سچ اتنا ہی کڑوا لگا نہیں؟“ میں نے دوبارہ کاٹ دار لہجے میں کہا۔

”تم..... تم..... میری نظروں سے دور ہو جاؤ..... جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے۔“

چلائی اور میرے اندر اس کے خلاف ایک نفرت انگیز لہر ابھر گئی۔

لہذا میں اسی لہجے میں بولا۔ ”تمہارے پاس اور کہنے کے لئے رہا بھی کیا ہے۔ مگر یاد رکھنا ماں! اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم اور ماموں حیدر گل میرے سوالوں کے جواب دینے سے کیوں کتر رہے لیکن مجھے بہت جلد اصل حقیقت کا علم ہونے والا ہے۔“ میں یہ کہہ کر غصے سے پاؤں پٹخ کر ماں کو حوٹو دپریشان چھوڑے، وہاں سے چلا آیا۔

میں واپس گرین لاج میں آیا۔ ماموں اندر موجود تھے۔ وہ شاید گاڑی کے انتظار میں ابھی وہیں تھے انہوں نے مجھ سے جیپ کی چابیاں مانگیں۔ میں نے انہیں چابیاں تھمتاے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”ماموں! ایک بات کا خیال رکھئے گا۔ میں نے مال کے مزدوروں کے لئے جو فیصلہ کیا ہے، وہ طرح برقرار رہنا چاہئے۔“

وہ میری طرف دیکھ کر سرد مہری سے بولے۔ ”مال کے معاملات میں خود بہتر طریقے سے حل جانتا ہوں۔ تم صرف اور صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔“ یہ کہہ کر وہ جانے لگے تو میں نے انہیں پکارا۔

چنانچہ اب مجھے نگینہ کے پیا اور انکل نظر حیات سے ہی اصل حقیقت کا پتہ چل سکتا تھا۔ اور اب وہ اس پر اسرار راز سے پردہ اٹھا سکتے تھے۔

میں نے یونیورسٹی کمپس پہنچتے ہی نگینہ سے موبائل پر رابطہ کر کے اسے بتا دیا کہ میں ماموں حیدرؒ سے اس بار بھی حقیقت اگلوانے میں ناکام رہا ہوں۔ حتیٰ کہ میں پہلی بار خود جیل جا کر ماں سے بھی ملا۔ مگر اس کی پر اسرار خاموشی کو بھی میں نہیں توڑ سکا ہوں۔

”اس کا مطلب ہے..... اب ہمیں ہی اس حقیقت سے پردہ اٹھانا پڑے گا۔“ میری بات نے بعد نگینہ پر خیال لہجے میں بولی۔

”ہاں نگینہ! یہ میری زندگی کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ پلیز نگینہ! اب تم لوگ ہی میری مدد کریا ہو۔“ میں نے متبجیانہ لہجے میں کہا۔

”نادرا! تمہاری جذباتی طبیعت کو دیکھ کر مجھے جانے کیوں خوف آتا ہے کہ..... کہیں.....“

کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ مگر میں اس کی ادھوری بات کا مطلب فوری سمجھتے ہوئے بولا۔

”تم بے فکر رہو۔ میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں۔ لیکن جب تک اس راز سے پر نہیں اٹھے گا، میں بے چین ضرور رہوں گا۔ کیا یہ اچھا نہیں کہ حقیقت بتا کر، چاہے وہ کتنی ہی کڑی ہو، مجھے ایک ڈگر پر تو لا کھڑا کر سکتی ہے۔“

”ہاں..... میں پہلے پپا سے بات کرتی ہوں..... پھر تمہیں فون کر کے اپنے ہاں بلا لیا گی۔“ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا پھر بولی۔ ”اور ہاں، تم ذرا کبیر احمد سے محتاط رہنا۔ اور اس کے منہ لگنے کی کوشش ہرگز مت کرنا۔“

میں اس کی تنبیہ پر قدرے چونکا۔ ”کیوں؟..... کیا اس نے تم سے میرے بارے میں کچھ کہا تھا؟ وہ چند ٹائیپے پُرسوج خاموشی کے بعد بولی۔“ ہاں..... وہ مجھ سے ملا تھا اور زبردستی اپنی محبت

جتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میرے صاف جواب دینے پر وہ آگ بگولا ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں نکالتے ہوئے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں نادرا کو بھی دیکھ لوں گا۔“

اس کی بات پر میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ مارے طیش کے میرا رواں رواں کانپنے لگا۔

”پلیز نادرا! میری بات یاد رکھنا۔ تم اس سے بھڑنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ میں تم سے یہ بات چھپانا چاہتی تھی لیکن تمہارے اسرار پر میں نے تمہیں بتا دی ہے۔“ وہ میری گلیہر خاموشی سے میری جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے محبت آمیز فکر مند ہی بولی۔

میں نے اپنے ابا لال پر قابو پایا اور اپنے لہجے کو متحمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ازراہ تشفی نگینہ بولا۔ ”تم فکر مت کرو۔ میں اپنی طرف سے اس حاسد کو موقع نہیں دوں گا۔“ اس کے بعد میں نے موبائل

آف کر دیا۔ اگلے روز میں یونیورسٹی پہنچا تو وہاں میں نے اپنے کلاس فیلوز کے درمیان کچھ عجیب سا ماحول محسوس کیا۔ میرے کلاس فیلوز مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اکرم نامی اپنے ایک کلاس میٹ سے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ ”ارے بھئی، کیا بات ہے؟ تم لوگ مجھے ایسے گھور رہے ہو جیسے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو؟“

میرے استفسار پر اکرم بولا۔ ”نادرا! کیا کبیر احمد کی یہ بات درست ہے کہ تمہاری ماں جیل میں لگا شہر کے قتل کی سزا جھگت رہی ہے اور تم نے بھی جیل ہی میں جنم لیا تھا؟“

میں اس کی بات سن کر سکتے میں آ گیا اور پتہ نہیں کب تک اسی حالت میں رہا۔ جب سکتہ ٹوٹا تو اکرم جا چکا تھا۔

اب میری کیفیت بدل گئی، مجھے کبیر جیسے کینہ پرور اور حاسد پر طیش تو بہت آیا مگر نگینہ کی التجا میرے دماغ میں گردش کرنے لگی۔ اس لئے میں ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے لیکچر ہال کی طرف بڑھ گیا۔ میرا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ لیکچر میں میرا زرا دل نہ لگا۔

اکرم کے علاوہ چند دوسرے کلاس فیلوز نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا تو میں پوچھنے والے اپنے دوست پر ہی چڑھ دوڑا۔

وہ بے چارہ گھبرا کر مجھ سے دور بھاگ گیا۔ میں اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے لائبریری کی طرف بڑھا تو کوریڈور میں ہی مجھے کبیر احمد نظر آ گیا۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ سامنے سے آ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور ہونٹوں پر اس کے بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔

”یہ قاتل ماں کا بیٹا ہے۔ بے چارے نے جیل میں جنم لیا تھا۔ واہ، کیا دردناک اسٹوری ہے اس کی.....“

میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے تعجبک آمیز استہزاء سے ایک زہریلا جملہ اگلا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ایک ایسی میرے دماغ میں نگینہ کی التجا کی جگہ لاوا کھولنے لگا۔ میں طوفانی گولے کی طرح پٹا اور کبیر کو عقب سے کالر کے ذریعے پکڑ لیا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو تم؟..... اب میرے سامنے بولو.....“ میں غضب ناک انداز میں اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ اس نے نفرت سے میرا ہاتھ جھٹک کر اپنی فیس کا کالر چھڑایا اور میرے چہرے پر گھونسا رسید کرنا چاہا مگر میں نے یکدم اپنا چہرہ پیچھے ہٹا لیا۔ وہ اپنی جھونک میں گھوم گیا اور میں نے پوری

توت کے ساتھ اس کی کمر پر اپنی لات رسید کر دی۔ وہ کئی قدم لڑکھڑاتا چلا گیا۔ اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے ”دوٹی“ بھاتے ہوئے مجھے گھور کر غصیلے لہجے میں کہا۔

”نادرا! یہ کیا بدینہ بازی ہے؟“

”تم چپ رہو..... ورنہ.....“ میں نے اسے جلتی سلگتی نظروں سے گھور کر کہا اور تہدید

انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس دوران کبیر احمد نے پلٹ کر دانت پیستے ہوئے مجھ پر جھانگ لگا دی اور میں بھی اسی وقت اس پر جھپٹ پڑا۔ ہم دونوں بیک وقت ایک دوسرے سے ٹکرائے۔

ہم دونوں کے قد و قامت میں انیس بیس کا ہی فرق تھا۔ میں کسرتی جسم کا تو مند پہاڑی نوجوان تھا جبکہ وہ قدرے فربہ مائل تھا۔ میں اسپورٹس بوائے تھا اور وہ کھل پسند مگر باوجود اس کے وہ طاقت کا ایک

چلتا پھرتا پہاڑ تو تھا ہی، مجھ سے ٹکراتے ہی وہ مجھے رگیدتا ہوا لے گیا حتیٰ کہ میرے قدم کوریڈور کے چپنے فرش سے اٹھڑ گئے۔ میرا سر زور سے کپے فرش پر لگا اور میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔

کبیر میرے سینے پر سوار ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے میری گردن دیوچ لی۔

اس کے دوست نیم دائرے کی صورت کھڑے گویا تماشا دیکھ رہے تھے۔ کبیر احمد کا چہرہ مارے غصے کے کیرہ سا ہو رہا تھا۔ مگر میری رگوں میں اس سے کہیں زیادہ وحشتناک کھولن اُتری ہوئی تھی۔ میں نے خزانہ آواز کے ساتھ فرش پر بڑے بڑے پوری توت کے ساتھ لوٹ لگائی اور کبیر احمد کو اپنے سینے سے

نیچے گرانے میں کامیاب ہو گیا۔ گرتے گرتے اس نے زور سے اپنے گھٹنے کی زوردار ضرب میرے پیٹ میں رسید کر دی۔ اذیت کی ایک دردناک لہر میری رگ جال تک میں اترتی چلی گی۔ مگر آتش جنوں خیزی



دوستوں نے مجھے اس ڈر سے یہی مشورہ دیا تھا کہ میں نہ صرف وی سی صاحب سے معافی مانگ لوں بلکہ کبیر احمد سے بھی ”سوری“ کہہ دوں ورنہ نہ صرف میرا نام یونیورسٹی سے خارج کر دیا جائے گا بلکہ بیڈ کیریئر سرٹیفکیٹ بھی میرے ہاتھ میں تھا دیا جائے گا۔

تنگینہ تک جب یہ بات پہنچی تو اسے بہت دکھ ہوا اور وہ پریشان بھی ہو گئی۔ پھر اس نے اندر ہی اندر نہ جانے کس طرح کبیر احمد کے والد نظر حیات سے یہ معاملہ رفع دفع کروا دیا اور یوں مجھے شوکار نوٹس دے کر آئندہ کے لئے سختی سے ”وارن“ کر دیا گیا۔ گویا میرے رقیب کبیر احمد کو میرے خلاف ہرزہ سرائی کی کھلی چھوٹ دے دی گئی۔

”نادر! تم نے میری نصیحت بھلا دی نا؟“ تنگینہ نے اس روز مجھ سے شکوہ کیا تھا۔

میں جواباً تلخ لہجے میں بولا۔ ”میں کیا کرتا گئی! کبیر احمد نے مجھے ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔“  
”تم انکو کر دیتے۔ یہی سمجھ کر کہ اس میں سارا قصور تمہارے تلخ ماضی کا ہی ہے۔“ اس نے مثبت انداز فکر کا منطقی فلسفہ مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

”مگر گئی! اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اگر میری ماں ایک قاتلہ ہے اور اس نے مجھے جیل کی تنگ و تاریک کھڑکی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جنم دیا تھا تو میری پیشانی پر یہ کلک زبردستی کیوں تھوپا جا رہا ہے؟“  
میرے کرب انگیز لہجے پر تنگینہ کے لہجے پر بھی گہرے دکھ کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔

”نادر!..... تم ایک با حوصلہ نوجوان ہو۔ ابھی سے ہمت ہار بیٹھو گے تو آگے تم حالات کا کس طرح مقابلہ کرو گے؟“ اس نے مجھے دوسرے انداز سے سمجھانے کی کوشش کی اور مزید پر زور لہجے میں بولی۔ ”تم ایک اسپورٹس مین ہو۔ ایک اچھے کھلاڑی۔ تمہارے اندر بھر پور اسپرٹ ہونا چاہئے اور..... اور پھر میں بھی تو تمہیں ایک با ہمت اور با حوصلہ انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے مایوس کرو گے نادر؟“

میں نے ایک نظر تنگینہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی گفتگو مجھے ایک عجیب طرح کا حوصلہ بخش رہی تھی۔

”تنگینہ! میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔“ میں نے بلا توقف فوراً جواب دیا ”لیکن گئی! میرا اپنے تلخ ماضی سے فراہم بھی ممکن نہیں۔ وہ کوڑے کی طرح بھی میری پیٹھ پر اور کبھی سینے پر پڑتا ہے۔ مگر میں بھی حوصلے سے اس کی ضرئیں سہے جا رہا ہوں۔“

”شاباش نادر!..... میں تمہیں ایسا ہی دیکھنا چاہتی تھی۔“ تنگینہ یکدم کھل کر بولی۔ ”حالات کا سوچ سمجھ کر مقابلہ کرو۔ جذباتیت اور جوش سے کام بگڑتے ہیں۔ کبیر احمد جیسے سازشی نے تمہاری اس طبیعت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور تمہارا نام یونیورسٹی سے خارج کر دیا تھا۔ مگر شکر ہے کہ ایزو نو، انکل نظر حیات میرے پیار کے پرانے دوست ہیں، معاملہ رفع دفع ہو گیا۔“

”انکل نظر حیات تو مجھ سے ضرور ناراض ہوئے ہوں گے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔  
”نہیں، میری ساری تفصیل بتانے پر الٹا انہوں نے اپنے بیٹے کو ہی سرزنش کی تھی۔“ وہ جواباً بولی۔  
”اس کا مطلب ہے انکل حیات فراخ دل انسان ہیں؟“ میں متاثر کن لہجے میں بولا۔ ”ورنہ میں تو یہی سمجھا تھا کہ وہ بھی مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔“

”ہاں..... انہیں احساس ہو گیا تھا کہ قصور ان کے بیٹے کبیر احمد کا ہی ہے۔“  
”تنگینہ!“ اچانک میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

کے سامنے یہ تکلیف میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے ہی اس کی ناک پر گھونسا مار دیا۔ اس کی ناک سے بھل بھل خون جاری ہو گیا۔ میرے ایک ہی طاقت ور گھونٹنے نے اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے کر کے رکھ دیئے اور میں اس کے بے سدھ وجود کو حقارت سے ٹھوکر مار کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے دوستوں میں سے کسی کو میرے آگے آنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی۔ البتہ وہاں دیگر لڑکوں کا ہجوم ضرور اکٹھا ہو گیا۔

اس اثناء میں کبیر احمد اپنی خود آلود ناک کو سہلانا ہوا کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا اور پھر اس سے پہلے کہ ہم دونوں پھر ایک دوسرے سے جا بھڑتے، دوسرے لڑکوں نے بیچ بچاؤ کرالیا۔ کبیر احمد خون آلود چہرے سے مجھے گھورتے ہوئے نفرت انگیز لہجے میں بولا۔

”میں..... میں..... تمہیں یونیورسٹی سے نکلوا کر رہوں گا۔ دیکھنا تم.....“  
یہ دھمکی دینے کے بعد وہ ہانپتا ہانپتا اپنے چند دوستوں کے ساتھ اسی حالت میں وائس چانسلر صاحب کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جبکہ میں اپنے ہاسٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اپنے روم میں پہنچا ہی تھا کہ وی سی کے دفتر سے بلاوا آ گیا۔ ناچار میں دوبارہ یونیورسٹی پہنچا اور سیدھا وائس چانسلر کے کمرے میں جا گھسا۔ وہ مجھے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔

”نادر!..... تم کب سے یہ بد معاشی کرنے لگے ہو؟ مجھے اگر یونیورسٹی کی بدنامی زور نہ ہوتا تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دیتا۔“ وہ غصے سے بری طرح کھول رہے تھے۔ میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو وہ دھاڑ کر بولے۔ ”اسی وقت کبیر احمد سے معافی مانگو..... اور اب اپنے گارجن کے بغیر یونیورسٹی مت آنا۔“

”سر!..... آپ نے مجھے صفائی کا موقع دیئے بغیر کس طرح یکطرفہ فیصلہ کر لیا؟“ مجھے بھی غصہ آ گیا تھا۔

وہ مجھے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔ ”تم میرا حکم نہیں مانو گے؟“ ان کے خار کھائے لہجے میں چھپی تہدید کو محسوس کرنے کے باوجود میں نے نہایت سنجیدگی سے انہیں مخاطب کر کے کہا۔

”آئی ایم سوری سر! میں آپ کا حکم نہیں مان سکتا۔ البتہ میں اپنے گارجن کو لے آؤں گا۔“  
”ہوں.....“ انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے اندر ہی اندر ایک گہری ہنکاری بھری۔ ”شاید تمہیں

اب اپنے سر پرست کو بھی لانے کی ضرورت نہ پڑے۔“ وہ دانت بھینچ کر بولے۔ ”ناؤ یو کیٹ لاسٹ۔ اوکے!“ وی سی کے اس یکطرفہ فیصلہ پر مجھے طیش آ گیا۔

”سر! میں پھر بھی یہی درخواست کروں گا کہ..... آپ.....“  
”آئی سے..... گیٹ آؤٹ..... اینڈ ٹی آف۔“ وہ میری بات کاٹ کر چلائے۔ اور پھر مٹا

ایک حقارت بھری نظر ان پر ڈالتا ہوا اپنے ہاسٹل آ گیا۔ میں وی سی کے جانبدارانہ رویے پر بری طرح جل بھن رہا تھا۔ مجھے دکھ تھا کہ انہوں نے مجھے صفائی کا ذرا بھی موقع نہ دیا تھا۔ کیوں..... اس لئے کہ وہ شاید جانتے تھے کہ میں کون تھا؟ جبکہ کبیر احمد ایک با اثر شخص کا بیٹا تھا۔ یہ درست تھا کہ میں نے کبیر احمد کو زخمی کیا تھا مگر سب سے پہلے اس نے ابتداء کی تھی اور مجھے نہ صرف اشتعال دلایا تھا بلکہ مجھ سے پہلے حملے کی ابتداء بھی اس نے ہی کی تھی۔ اب یہ کبیر احمد کی مکاری تھی کہ وہ اس وقت اپنا خون آلود چہرہ لئے وی سی کے کمرے میں پہنچا تھا اور یوں وہ مظلوم کہلایا تھا۔ میں اپنے کیرئیر سے اب مایوس سا ہونے لگا تھا۔ وائس چانسلر کے ارادے مجھے ٹھیک نظر نہیں آ رہے تھے۔ میرے چند قریبی خیر خواہ

دیکھ کر قدرے ٹھکر سے پوچھا اور اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

”نادر! نگینہ کو کڈنیپ کر لیا گیا۔“

اس نے جیسے دھماکہ کیا اور میں ایک لمحے کے لئے اپنی جگہ پر سُن ہو کر رہ گیا۔

”یہ..... لک..... کیسے ہوا؟..... کب ہوا؟“ بالآخر میں نے اپنے حواس پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”وہ جب تم سے ملنے کے بعد واپس اپنے گھر لوٹ رہی تھی..... میرا خیال ہے، اس وقت یہ واقعہ ہوا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”ل..... لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا کہ اسے اغواء کیا گیا ہے؟ ہو سکتا ہے، وہ اپنی کسی سہیلی.....“

”اس کے زخمی باڈی گارڈ نے بتایا تھا۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولا اور بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ میں اس وقت بری طرح پریشان تھا ورنہ کبیر احمد کے چہرے کے عجیب تاثرات مجھ سے چھپے نہیں رہ سکتے تھے۔“

”کیا بتایا باڈی گارڈ نے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”میں نے کچھ سنا تھا۔ ایک ہائی روف میں سوار تھے۔ انہوں نے ان کی کار پر فائرنگ کر ڈالی۔“ وہ صراحت سے بتانے لگا اور میرا دل سینے میں بے تحاشا دھڑا دھڑا ہوتا تھا۔

”ایک باڈی گارڈ تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا جبکہ دوسرا زخمی ہوا ہے۔ نامعلوم حملہ آوروں نے ان کی کار کا ٹائر بھی برست کر ڈالا تھا۔ پھر وہ نگینہ کو زبردستی اپنی ہائی روف میں بٹھا کر آٹا فاناٹو فو پکڑ ہو گئے۔“

”اوہ..... یہ تو بہت برا ہوا..... بہت ہی برا ہوا.....“ میں دانت بھیج کر اپنے ہاتھ کی پھیلی ہانکا مارتے ہوئے غصے اور پریشانی سے بڑبڑایا۔ ”پولیس کو افغانم کر دیا گیا؟“ اچانک میں نے پوچھا۔

”ظاہر ہے، زخمی گارڈ کی حالت قدرے بہتر ہے۔ پولیس نے اس کا بیان قلم بند کر لیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ اس کی نظریں ہنوز ایک ننگ میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ میرے چہرے کے تاثرات سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر میں اس وقت خود بری طرح پریشان تھا۔ نگینہ میرا

سب کچھ تھی۔ میرا دل، میری جان، میری پہلی اور آخری محبت۔

”تم..... اب کہاں جا رہے ہو؟“ میں نے اچانک کسی خیال کے تحت کبیر احمد سے پوچھا۔

”انگل شاہ میرے ہاں۔“

”چلو، میں بھی چلتا ہوں۔“ میں نے فوراً کہا۔

اس کے بعد میں اس کی کار میں بیٹھ کر نگینہ کے بیٹا شاہ میر کے ہاں روانہ ہو گیا۔ نگینہ کے اغواء سے متعلق یہ اندوہناک خبر مجھ پر بجلی بن کر گری تھی۔ مجھے ایک بل کے لئے بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ میں بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟ میں سوچنے لگا۔

ظاہر ہے، ان اغواء کنندگان کا تعلق انہی نامعلوم دشمنوں سے ہو سکتا تھا جو انگل شاہ میر اور انگل نظر حیات کے مشترکہ دشمن تھے اور ان پر کئی بار نام کام قاتلانہ حملے بھی کر چکے تھے۔

یوں تو انہوں نے اشاروں کنایوں میں مجھ پر یہ باور کرا دیا تھا کہ یہ پراسرار دشمن حیدر گل کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر انہوں نے کھل کر بھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ

”ہاں..... کہو۔“ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

”میں تمہارے پیار سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اب وہ ہی مجھے میرے ماضی کے متعلق.....“

جلد ادھورا چھوڑ کر میں نے ایک دم کسی خیال کے تحت پوچھا۔ ”تم نے اپنے پیار اور انکل حیات سے بات کا ذکر کیا تھا کہ میں ماموں حیدر گل اور ماں سے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ اگلوٹانے میں ناکام رہا ہوں؟“

”ہاں.....“ وہ پُرسوج لہجے میں مختصر آہولی۔

”پھر کیا کہا انہوں نے؟..... میرا مطلب ہے اب تو وہی مجھے یہ سب بتا سکتے ہیں۔“

وہ میری بات پر کسی گہری سوچ میں غلٹاں ہو گئی۔ پھر ایک گہری سانس خارج کر کے بولی۔

”میں پیار سے بات کروں گی۔ پھر وہ تمہیں بلانے کے لئے جو وقت مجھے دیں گے، میں فون پر تمہیں آگاہ کر دوں گی۔“ اس کی بات سن کر میں چپ ہو رہا۔

ہم دونوں اس وقت حسب معمول یونیورسٹی کے لان میں بیٹھے تھے۔ اچانک میں نے کبیر احمد کو دیکھا، وہ تنہا تھا اور ہماری طرف ہی آ رہا تھا۔ نگینہ بھی اس پر نظر پڑ چکی تھی۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر نہ جانے کیوں میری کپٹیاں سلگ اٹھیں مگر میں جل سے بیٹھا رہا۔ تاہم میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر اب اس نے کوئی بکواس کی تو اسے اچھی طرح سبق سکھاؤں گا۔“

”ہیلو نگینہ.....!“ وہ قریب آ کر سرکراتے ہوئے نگینہ سے مخاطب ہوا۔ نگینہ نے بھی جواباً ہلکے سے مسکرا کر سر کی اثباتی جنبش سے اسے ہیلو کہا۔

پھر وہ میری طرف دیکھ کر قدرے شرمندگی سے بولا۔ ”نادر! آئی ایم سوری یار..... میں نے واقف

تمہارے ساتھ اس روز زیادتی کر ڈالی تھی۔“

مجھے اس کے لہجے پر خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ وہ شرمسار نظر آ رہا تھا۔ میرا جواب دینا اب ضروری بن گیا لہذا میں بھی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”کوئی بات نہیں..... آؤ بیٹھو یار!“

وہ ہم دونوں کے قریب سرسبز گھاس پر بیٹھ گیا۔ کتابیں اس نے اپنی گود میں رکھ لیں۔

”چلو، اب دونوں ٹیک بیٹھ کر۔“ نگینہ ہم دونوں سے مسکرا کر بولی۔

میں نے کبیر کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے بھی گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ہم دونوں کی صلح کی خوشی میں نگینہ نے اپنی طرف سے کولڈ ڈرنک پلایا۔ اس کے بعد کبیر ہم سے رخصت ہوا تو نگینہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اسے اس کی کار تک چھوڑنے آیا تھا۔

میں یونیورسٹی آؤرز سے فارغ ہونے کے بعد اپنے ہاسٹل آیا۔ بیس میں لٹچ کیا پھر اپنے روم میں آ گیا۔ کبیر احمد کے رویے نے مجھے متاثر کیا تھا۔ اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے میرا دل صاف کر دیا تھا۔ میرے دل میں اب اس کے لئے کوئی ناراضگی نہ تھی۔ تاہم میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس نے نگینہ کی خاطر مجھے سوری کیا تھا؟ یا پھر اسے از خود اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا؟

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ انٹر لاک تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو ذرا سا چونک گیا۔ میرے سامنے کبیر احمد کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار دیکھ کر میرا دل جانے کیوں کسی انجانے خدشے سے دھڑکا تھا۔

”خیریت تو ہے..... تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ آؤ..... اندر.....“ میں نے اس کی طرف

میں اس خاتون کو پہچان ہی نہیں پایا تھا مگر بغور دیکھنے پر میں اس قدر بری طرح چونکا تھا کہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا اور میں ایک ٹک اسے دیکھتا ہی چلا گیا تھا۔ اس وقت تک ماموں حیدر کی سیت اس عورت کی بھی مجھ پر نگاہ پڑی تھی۔ پھر وہ متاثر ہو کر اسکا ہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتے ہی یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نادر!..... تم آگئے.....؟“ وہ عورت یہ کہتے ہوئے میری طرف بڑھتی چلی آئی۔ ہاں..... میری ماں تھی۔ مگر اسے جیل کی سلاخوں سے باہر دیکھ کر میرے ذہن کو ایک تکلیف دہ جھٹکا لگا تھا۔ ہاں موجود سب لوگ گردن موڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ماموں حیدر گل بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان میرے قریب آئی اور محبت بھرے انداز میں اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد میری پیشانی پر دم کی اور میرا ہاتھ پکڑے صوفے کی طرف بڑھی۔

میں میکا کی انداز میں ماں کے شانہ بہ شانہ چلتا ہوا آگے بڑھا۔ ماموں حیدر گل نے بھی مجھ سے حائفہ مصافحہ کرنے کے بعد وہاں موجود چیدہ چیدہ افراد سے تعارف کروا دیا۔ قہری پس سوٹ میں ملبوس اس بارعب شخصیت کے علاوہ سب کو میں جانتا تھا اس لئے ماموں نے بھی صرف اس کا مجھ سے خاص طور پر تعارف کروانا ضروری سمجھا اور اس کی طرف احتراماً اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بولے۔

”نادر بیٹا! ان سے ملو۔ آپ اعظم خان صاحب ہیں سیاست کی سدا بہار شخصیت!“ میں اس وقت ان کی وہاں غیر متوقع موجودگی پر دم بہ خود سا ہو کر رہ گیا تھا۔ تاہم میں نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ ان کے بھاری بھر کم چہرے پر چندی چندی سی آنکھیں نہایت پر اسرار سا تاثر پیش کر رہی تھیں۔ اس کے بال بھی چھوٹے یعنی ”میجر کٹ“ کے تھے۔ بالوں کا یہ اسٹائل آفیسر طبقے میں بہت رائج تھا۔ یہ سو بھر کٹ کے قریب قریب کٹنگ تھی۔ یونیورسٹی کے بیشتر لڑکوں نے بھی لمبے بال اور لائی لائی تھیں چھوڑ کر یہی ”میجر کٹ“ اپنا رکھی تھی۔ میں اب ماموں اور ماں کے درمیان صوفے پر بیٹھ گیا اور سخت شش و پنج میں مبتلا تھا۔ یہاں کی اچانک بدلی ہوئی صورت حال پر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ٹگینہ کے متعلق کیسے بات کروں؟ اور پھر مجھے اس کے پیا شاہ میر اور اگل نظر حیات کی نصیحت بھی یاد تھی کہ میں نے کسی صورت میں بھی ان کا ماموں حیدر گل اور ماں کے سامنے ذکر نہیں کرنا تھا۔ میں بظاہر خاموش بیٹھا تھا مگر اندر ہی اندر میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

”نادر میاں! کیا تمہیں اپنی ماں کے جیل سے رہائی پانے کی خوشی نہیں ہوئی؟“ معاً سامنے اعظم خان کے قریب بیٹھے ملک سردار خان نے عجیب سے لہجے میں بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے یہ اندازہ کیسے لگا لیا؟“ میں نے ان سے ہی انسا سوال کر ڈالا تھا۔

اس کی کھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ ابھری اور بولا۔ ”تم اپنی ماں کو دیکھ کر بجائے خوش ہونے کے کچھ پریشان سے نظر آ رہے ہو۔“

پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اعظم خان کے گلن شیو چہرے پر غیر تاثرانہ مسکراہٹ ابھری اور وہ مجھ پر اپنی چندی چندی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کھڑکی پر آواز میں بولا۔

”شاید..... میڈم شینہ (ماں) کی غیر متوقع رہائی پر نادر میاں سے خوشی سنبھالے نہیں جا رہی۔ یکدم خوشی بھی تو انسان کو پریشان کر کے رکھ دیتی ہے۔“

”شاید آپ نے درست فرمایا خان صاحب!“

میں ان کا سگا بھانجا تھا۔ یہ خیال آتے ہی مجھے اپنے وجود میں ایک جانی پہچانی تپش کا احساس ہونے لگا۔ ”کبیر!..... کار روکو۔“ اچانک میں نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

اسے ذرا حیرت ہوئی۔ مگر میرے چہرے پر چھائی ہوئی پرتش سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے کار روک دی۔ میں کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ پھر ایک رکشے میں بیٹھا اور سیدھا ونگن اسپتال پہنچا۔

میں اب جلد از جلد ”گرین لاج“ پہنچنا چاہتا تھا۔

\*\*\*

سہ پہر کے وقت میں گرین لاج پہنچا تو ذرا ٹھنک سا گیا۔ مجھے وہاں غیر معمولی گہما گہمی کا احساس تھا۔ گونجی کے وسیع و عریض احاطے میں چار پانچ دیکیں پک رہی تھیں۔ نوکر چاکر ادھر ادھر دوڑتے آئے۔ تین چار گاڑیاں بھی کھڑی نظر آئیں۔ ان میں ایک تو ہماری سفید پوشو باری جیب تھی جبکہ دوسرا ایک گرے کمر کی لینڈ کروزر اور ایک سنگل ڈور بجیر تھی۔ ایک کار بھی تھی۔ سنگل ڈور بجیر کو میں تو پہچان گیا۔ یہ ماموں حیدر گل کے دوست ملک سردار خان کی تھی۔ مجھے وہاں ٹال کے مزدور بھی ہاتھوں میں پیشیں تھیں نظر آئے۔ گویا ایک بھر پور دعوت کا سماں تھا۔

کوشی کو باہر سے سبایا گیا تھا۔ رنگین بلب اور تفتے روشن تھے۔ جھنڈیاں بھی لہراتی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے یہ سب دیکھ کر اچنبھا سا ہوا۔ جب میں اندر پہنچا تو فضل چاچا کی مجھ پر نظر پڑی۔ ان کے چہرے کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی دوڑتے ہوئے میری طرف آئے۔

”نادر بیٹا! تم آگئے..... بہت ٹھیک وقت پر آئے۔“ وہ خوشی سے بھولے نہیں سارے تھے۔

میں نے پوچھا۔ ”چاچا! یہ سب کیا ہے؟“

میری بات پر وہ اپنے خوشی کے بے اندازہ احساس کو دباتے ہوئے بولے۔

”بس بیٹا! ہم سے کچھ نہ پوچھو۔ اندر جاؤ اور تم بھی اس خوشی میں شریک ہو جاؤ۔“

مجھے تعجب ہوا اور میں اندر کی طرف بڑھ گیا۔

فضل چاچا کی بیوی صغراں سے میری مذہبھڑ ہوئی مگر اس نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا اور ایک بڑے کمرے کی طرف اشارہ کر کے خاموشی سے چلی گئی۔

میں اپنے دل و دماغ میں عجیب و غریب احساسات لئے مذکورہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ میں اسے دھکیل کر اندر داخل ہوا اور بری طرح چونک گیا۔

نیم دائرے میں بچھے صوفوں پر مجھے پانچ افراد براجمان نظر آئے۔ ماموں حیدر گل، میجر مشتاق، ملک سردار خان کے علاوہ چوتھا ایک بازعب شخص میرے لئے ابھی تھا۔ اس نے لائسنس پور کا بیش قیمت سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے پٹے میں تھی۔ وہ جوڑے شانوں اور دراز قد و قامت کا مالک تھا۔ رنگت پہاڑی لوگوں کی طرح سرخ و سپید تھی مگر چہرے پر عجیب قسم کی کڑکھلی چھائی ہوئی تھی۔ ان میں جو پانچواں شخص تھا بلکہ ”تھی“ وہ ایک پڑوقار عورت تھی۔ وہ بہ مشکل چالیس کی عمر کے قریب تھی۔ اس نے بڑے سلیقے اور نفاست کے ساتھ ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں کا جوڑا بنا رکھا تھا۔ آنکھوں پر نظر کا بیش قیمت فریم والا چشمہ تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں پڑمردگی اس بات کی غماز تھی کہ اس نے عمر کا بیشتر حصہ بڑے کڑے حالات میں پتایا تھا۔ بادی النظر میں وہ بڑی دیکھ خاتون نظر آ رہی تھی۔ وہ صوفے پر ماموں حیدر گل کے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں

حالانکہ وہ اور ماموں میری خاموشی کی وجہ جانتے تھے اور میرا دیرینہ مسئلہ بھی..... کیونکہ اکثر میری دل حیدر گل سے گر باگری ہوتی رہتی تھی۔ حتیٰ کہ نیل جا کر میں نے اپنے ماضی کے بارے میں جاننے لئے ماں کو بھی کریدنے کی کوشش کی تھی اور اس بات کا بھی ماں سے جواب مانگا تھا کہ اس نے آخر سے باپ قادر علی خان کو کیوں قتل کیا تھا؟

”ہاں صاحب! نادر آخر میرا بیٹا ہے۔ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ بھلا اسے کیسے خوش نہیں ہوگی؟“ نے ایک ممتا بھرے فخر کے ساتھ مجھے اپنے سے لگاتے ہوئے کہا۔ اس پر خیر مشتاق میاں جو شاید کافی دیر سے بولنے کو بے چینی سے منتظر تھا، اعظم خان کی خوشامد ماموں اور ماں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”سب اپنے خان صاحب کی مہربانی ہے کہ میڈم (میری ماں) اپنی مدت سے چند برس پہلے رہائی پا چکی ہیں۔ آخر بڑے آدمی جو ہوئے۔“ اس نے عادتاً تکیہ کلام اگل کر جیسے خود کو پُر سکون کیا۔ ”ہاں، اس میں کوئی شک نہیں کہ خان صاحب کی کوششوں سے آج میری بہن شبینہ نے اپنا دم سے پہلے رہائی پا کر گرین لاج کی روٹیں بڑھا دیں اور اب آپا شبینہ کے آنے سے میں اپنے اندر ایک عجیب سا حوصلہ بھی محسوس کر رہا ہوں۔“ ماموں حیدر گل نے سرور ہو کر کہا۔

”ارے نہیں بھئی، اس میں میری کوششوں کا کیا دخل ہے؟“ اعظم خان نے خالصتاً ایک گماں سیاستدان کی طرح کسر نفسی سے کام لیا۔ ”میڈم شبینہ کا چال چلن اچھا ہونے کی وجہ سے ان کی سزا کو تخفیف کی گئی تھی۔“

”پھر.....“ خان صاحب! آپ بھی کم شخصیت تو نہیں ہیں۔ میں نے ابھی نادر بیٹے سے آپ تعارف کرواتے ہوئے آپ کے بارے میں ایک جملہ کہا تھا یعنی سیاست کی ”سدا بہار“ شخصیت۔ اس مطلب تھا کہ آپ جیسی قدرت اور شخصیت کے تو ہر آنے جانے والی حکومتوں سے بڑے گہرے روابط رہیں۔“ ماموں حیدر گل نے خوشامدانہ توصیف سے کہا۔

”بڑے آدمی جو ہوئے جی۔“ خیر مشتاق کو پھر اپنے مخصوص تکیہ کلام کا دورہ پڑا۔ وہاں موجود ہر گماں اعظم خان کے گن گار رہا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں صرف اسی قدر معلوم تھا کہ یہ کوئی سیکرٹری کی سا بیورو کریٹ آفیسر تھا۔ میں جب پچھلے دنوں ماموں حیدر گل سے دو ٹوک گفتگو کرنے کے لئے ٹال پھنپاتا تھا تو اس وقت ماموں اسی شخص سے ملنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔

یوں ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں خود کو نزو ہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ تھوڑی دیر پہلے پر تکلف ڈنکا اہتمام کیا گیا۔ ناچار میں نے بھی ان سب کے ساتھ کھانا زہر مار کیا۔

میرے دل و دماغ میں اس وقت شدید طوفان گردش کر رہے تھے۔ نگینہ کا فریاد کرتا چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس کی مدد کو پکارتی ہوئی کرب ناگ جیچیں جیسے میری سماعتوں کو چھلکے دے رہی تھیں۔ یہ میرا جگر ہی جانتا تھا کہ ان لوگوں کے درمیان اپنی بے چینی اور اپنے ذہنی کرب میں کس طرح دباؤ ہے۔ سب لوگ خوش کیوں میں مگن تھے مگر میرے اندر ایک ناقابل بیان کا آگ سلگ رہی تھی۔

”نادر بیٹے! تم کچھ کھا نہیں رہے۔ کیا بات ہے؟..... چپ چپ سے کیوں ہو؟“ ماں نے بالآخر ممتا بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میرے ذہن نے ایک فوری لائحہ عمل کی تیاری کرتے ہوئے ان میں گھلنے ملنے کا فیصلہ کیا تو میں فوراً اس کی تائید کر ڈالی۔ میں نے محسوس کیا، میری بات پر بالخصوص ماموں اور ماں کے چہروں پر طمہ بھری مسکراہٹ ابھری تھی۔ اب شاید میں اٹکل شاہ میرا اور نظر حیات کی ہدایات کے مطابق پختہ بلبل درست ڈگر پر آ رہا تھا۔

”خان صاحب! نادر آخر میرا بیٹا ہے۔ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ بھلا اسے کیسے خوش نہیں ہوگی؟“ نے ایک ممتا بھرے فخر کے ساتھ مجھے اپنے سے لگاتے ہوئے کہا۔ اس پر خیر مشتاق میاں جو شاید کافی دیر سے بولنے کو بے چینی سے منتظر تھا، اعظم خان کی خوشامد ماموں اور ماں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”سب اپنے خان صاحب کی مہربانی ہے کہ میڈم (میری ماں) اپنی مدت سے چند برس پہلے رہائی پا چکی ہیں۔ آخر بڑے آدمی جو ہوئے۔“ اس نے عادتاً تکیہ کلام اگل کر جیسے خود کو پُر سکون کیا۔ ”ہاں، اس میں کوئی شک نہیں کہ خان صاحب کی کوششوں سے آج میری بہن شبینہ نے اپنا دم سے پہلے رہائی پا کر گرین لاج کی روٹیں بڑھا دیں اور اب آپا شبینہ کے آنے سے میں اپنے اندر ایک عجیب سا حوصلہ بھی محسوس کر رہا ہوں۔“ ماموں حیدر گل نے سرور ہو کر کہا۔

”ارے نہیں بھئی، اس میں میری کوششوں کا کیا دخل ہے؟“ اعظم خان نے خالصتاً ایک گماں سیاستدان کی طرح کسر نفسی سے کام لیا۔ ”میڈم شبینہ کا چال چلن اچھا ہونے کی وجہ سے ان کی سزا کو تخفیف کی گئی تھی۔“

”پھر.....“ خان صاحب! آپ بھی کم شخصیت تو نہیں ہیں۔ میں نے ابھی نادر بیٹے سے آپ تعارف کرواتے ہوئے آپ کے بارے میں ایک جملہ کہا تھا یعنی سیاست کی ”سدا بہار“ شخصیت۔ اس مطلب تھا کہ آپ جیسی قدرت اور شخصیت کے تو ہر آنے جانے والی حکومتوں سے بڑے گہرے روابط رہیں۔“ ماموں حیدر گل نے خوشامدانہ توصیف سے کہا۔

”بڑے آدمی جو ہوئے جی۔“ خیر مشتاق کو پھر اپنے مخصوص تکیہ کلام کا دورہ پڑا۔ وہاں موجود ہر گماں اعظم خان کے گن گار رہا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں صرف اسی قدر معلوم تھا کہ یہ کوئی سیکرٹری کی سا بیورو کریٹ آفیسر تھا۔ میں جب پچھلے دنوں ماموں حیدر گل سے دو ٹوک گفتگو کرنے کے لئے ٹال پھنپاتا تھا تو اس وقت ماموں اسی شخص سے ملنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔

یوں ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں خود کو نزو ہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ تھوڑی دیر پہلے پر تکلف ڈنکا اہتمام کیا گیا۔

ناچار میں نے بھی ان سب کے ساتھ کھانا زہر مار کیا۔

میرے دل و دماغ میں اس وقت شدید طوفان گردش کر رہے تھے۔ نگینہ کا فریاد کرتا چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس کی مدد کو پکارتی ہوئی کرب ناگ جیچیں جیسے میری سماعتوں کو چھلکے دے رہی تھیں۔ یہ میرا جگر ہی جانتا تھا کہ ان لوگوں کے درمیان اپنی بے چینی اور اپنے ذہنی کرب میں کس طرح دباؤ ہے۔ سب لوگ خوش کیوں میں مگن تھے مگر میرے اندر ایک ناقابل بیان کا آگ سلگ رہی تھی۔

”نادر بیٹے! تم کچھ کھا نہیں رہے۔ کیا بات ہے؟..... چپ چپ سے کیوں ہو؟“ ماں نے بالآخر ممتا بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

”ہاں، میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ اب آگے سنو.....“ ملک سردار خان کی گھمبیر آواز ابھری۔ ”میں نے تمہارے کہنے پر نظر حیات کے بیٹے کبیر احمد کی گاڑی پر حملہ کیا تھا تو اس وقت کا کے نادر کو میں نے اپنے برابر میں بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ تو شکر ہوا کہ وہ حملے سے بچ گیا۔ کیونکہ میں نے اس سے پہلے کا کے رو نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو اس دن اتفاق سے ٹال آیا تھا تو میں اسے دیکھ کر بری طرح چونکا۔ خیر.....“ وہ اتنا کہ چند ثانیے کے لئے رکا۔ میرا دل سینے میں رک رک کر دھڑکنے لگا۔

”اس کے بعد سے میں نے کا کے نادر کی باقاعدہ نوہ لینا شروع کی تو مجھ پر اس حقیقت کا بھی شاف ہوا کہ کا کا نادر، شاہ میر کی بیٹی نگینہ کے بھی بہت قریب آچکا ہے۔ دونوں کے درمیان لگتا ہے، بچ چکا ہے۔“

وہ اتنا کہ چپ ہوا تو اندر جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ خود ادھر میری حالت جیسے قطب شمالی کے زاروں کی سی ہو رہی تھی۔

”یہ..... بہت برا ہوا..... بھائی حیدر گل! بہت برا ہوا یہ.....“ معاً اس سنائے میں ماں کی راتی آواز ابھری۔ اس کے لہجے میں زبردست جلتی تھی۔

ماموں جواباً کچھ نہیں بولے تھے۔ البتہ ملک سردار خان نے ازراہ تسفی ماں سے کہا۔ ”میڈم! پریشان نے کی ضرورت نہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تم دونوں کو اب کا کا نادر سے ہوشیار و محتاط رہنے ضرورت ہے۔“

اس کی اس بات پر ماموں حیدر گل نے سفاک لہجے میں ملک سردار خان سے کہا۔

”چھا ہوا..... تم نے یہ بات ہمیں بتا دی۔ بہر حال، اب تم اس لڑکی کو فوراً قتل کر کے اس کی لاشوں کو بچھ دو۔ بس، یہی ہمارا آخری فیصلہ ہے۔“

میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ لڑکی سے مراد یقیناً نگینہ ہی تھی۔ میرے اندر ایک نا جوار بھانا اٹھنے لگا۔ ماموں حیدر گل اور ماں آتش انتقام میں اس قدر بے رحم اور سفاک بھی ہو سکتے تھے اس کی امید نہ تھی اور پھر یہ لوگ، میری نگینہ کو قتل کرنے کا گھناؤنا ارادہ کر چکے تھے۔ میں یہ کیسے اشد کر سکتا تھا؟ ایک بار تو جی میں آئی کہ اسی وقت اندر داخل ہو کر ان کے مکروہ چہرے کو بوج ڈالوں۔ ارواں رواں غیظ و غضب کے مارے تھر تھرانے لگا تھا۔ میں نے اتنی مشکلوں سے اپنی اس اہلیتی کھولتی بات پر قابو پایا تھا، یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔ میں نے بہ مشکل خود کو کسی جنونی اقدام سے باز رکھا اور بس کن لینے کی کوشش کی۔ لیکن اچانک ہی ملک سردار خان نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ ایک دم محتاط ہو گیا۔

ان لوگوں کی گفتگو سے میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ نگینہ کو ماموں حیدر گل اور ماں نے ملک سردار خان کے ذریعے اغواء کروایا تھا اور اب یہ لوگ میری نگینہ، میرے دل، میری محبت کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارنے کا سفاکانہ فیصلہ کر چکے تھے۔

لیکن میرے ہوتے ہوئے بھلا کون نگینہ کا بال بھی بیکا کر سکتا تھا؟ اب مجھے شاہ میر اور نظر حیات کی توں پر سو فیصدی یقین ہو چکا تھا کہ ان کا شک ماموں حیدر گل پر بے بنیاد نہیں تھا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ماموں حیدر گل اور ماں ان سے کون سی دشمنی کا بدلہ چکانا چاہتے تھے؟ وہ اہم بات یا مگی، جس کے منوانے کے لئے ماں اور ماموں نگینہ کے باپ شاہ میر اور اکل نظر حیات پر ہر طرح سے دباؤ ڈال رہے تھے؟

رہا تھا کہ میرا بروقت یہاں گرین لاج آنا، خالی از علت نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ ماں کا خیال سے اچھا ہونا اور پھر نگینہ کا اغواء..... ان سب لوگوں کا یہاں جشن منانا..... کسی پراسرار کہانی کی ابتدا معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے رست و اج میں وقت دیکھا، رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے آہستگی سے اپنے کے دروازے کی جھری سے جھانکا۔ ڈرائنگ روم کی لائٹ آف ہو چکی تھی۔ صرف بزرگ کا زرا بلب روشن تھا۔ میں یہ آہستگی دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ تب مجھے اچانک ڈرائنگ روم ملحقہ ایک کمرے کے دروازے کی جھری سے روشنی آتی نظر آئی۔ میں دبے پاؤں مذکورہ کمرے کی طرف بڑھا۔ میرا دل سینے میں بے طرح دھڑک رہا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ اندر سے دھیمے دھیمے باتیں کر آوازیں آرہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی کہ اندر ماموں حیدر گل، ملک سردار خان اور ماں درمیان کوئی اہم گفتگو ہو رہی ہے۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر آوازوں کے غیر ”آہنگ“ کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ میں بے چین سا ہو گیا۔ ادھر ادھر دیکھا، پھر اچانک مجھے کمر خیال آیا۔ یہ کھڑکی مذکورہ کمرے کی مشرقی دیوار کی طرف تھی۔ اس کے قریب پہنچنے کے لئے مجھے ڈرا روم سے باہر نکل کر ایک مختصر کوریڈر میں آنا پڑتا۔

میں یہ سرعت دہاں پہنچا۔ میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ اگرچہ اس کی چوٹی چوٹ فینسی آہنی گرل نصب تھی مگر میں یہاں کھڑے ہو کر خاموشی سے اندر ہونے والی گفتگو بہ آسانی سنا رہا تھا میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی کی دوسری جانب پردہ جھول رہا اندر اس کھڑکی کے قریب ہی صوفے دھڑے تھے۔ اس لئے اب مجھے صوفی آہنگ کے ساتھ گفتگو کا بھی صاف سمجھ میں آ رہا تھا۔

”ملک صاحب! اس لڑکی کو فوراً قتل کر کے اس کی لاش دشمنوں کو بچھ دو۔“ مجھے ماں کی غضب آواز سنائی دی۔ اس کے مستقیمانہ لہجے میں زخمی ناگن کی سی پھنکار تھی۔ میں ”لڑکی“ کے ذکر پر برکی چونکا تھا۔

”ہاں..... آپا شینہ درست کہتی ہے سردار خان!“ یہ ماموں حیدر گل کی آواز تھی۔ ”ہمارے ڈٹنے پے درپے درپے قاتلانہ حملوں کے باوجود ہماری بات نہی مانی ہے۔ اب ان کو ایک عدد لاش کا تختہ دے دینا چاہئے۔“

”تم دونوں کو شاید ابھی تک ایک اہم بات کا علم نہیں ہوا ہے۔“ لمبے بھر کی اسرار بھری خاموشی بعد معاً ملک سردار خان کی بھاری آواز ابھری۔ میں دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پائے ہوا تھا۔

”کون سی بات؟“ مجھے بیک وقت ماں اور ماموں حیدر گل کی قدرے چونکتی ہوئی آواز سنائی۔ ملک سردار خان ہولے سے کھٹکھٹانے کے بعد دونوں سے مخاطب ہوا۔

”اپنا کا کا نادر، نظر حیات کے بیٹے کبیر احمد کا دوست ہے۔“ اس نے بتایا اور میری رگوں میں پاؤں کی گردش تیز ہو گئی۔

”کیا.....؟“ میں نے ماموں اور ماں کی چونکتی ہوئی آوازیں سنیں۔

”مگر تمہیں کیسے پتہ چلا ملک سردار خان؟“ ماموں حیدر گل نے غیر یقینی لہجے میں اس

پوچھا تھا۔

تقریباً گھنٹے پون کی تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد اچانک جیب میں شاید کوئی خرابی پیدا ہونے لگی اور جھٹکے کھائی ہوئی رگ گئی۔

جیب رکستے ہی ماحول میں ایسا ایک ہی ہولناک سناٹا طاری ہو گیا۔ ملک سردار خان نے دو تین بار جیب ٹارٹ کرنے کی کوشش کی، پھر دروازہ کھول کر وہ شاید باہر اترتا تھا۔ میری ٹھٹکی ہوئی سماعتیں اس کی بات پر گوش برآواز تھیں۔

پھر مجھے جیب کا بونٹ اٹھنے کا کھٹکا سنائی دیا۔ وہ شاید کوئی خرابی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذرا دیر نہ ہو کہ وہ انجن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا، اس کے بعد بونٹ کے بند ہونے کی آواز ابھری۔ میں دم اڑھے سیٹ کے نیچے دبکا ہوا تھا۔

وہ دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اسٹیرنگ سیٹ پر براجمان ہوا اور ایک بار پھر جیب ٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر بے سود۔ جیب کا انجن ہر سیلف کے بعد کسی غنودہ جانور کی طرح لے لے سے غرا کر خاموش ہو جاتا۔

”اس کم بخت کو بھی ادھر ہی خراب ہونا تھا۔“

اچانک مجھے اس کی جھلکی ہوئی آواز سنائی دی۔ خود میں بھی ذرا پریشان سا ہو گیا تھا۔ میرا اضطراب سننے لگا تو مجھے بے چینی نے آلیا۔ جیب کا ایسے نازک موقع پر خراب ہونا خود میرے لئے بھی بہتر نہ تھا۔ مجھے گنیز کی طرف سے بری طرح تشویش لاحق تھی۔

اچانک میں بری طرح چونکا۔ میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں میں ملک سردار خان کی آواز ابھری۔ وہ شاید بائبل پر اپنے کسی آدمی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

”غورے! میری گاڑی خراب ہو چکی ہے۔ میں شہر سے تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر مضائقہ میں ہوں۔ تم شکر خان کو کورولا دے کر بھیجو۔ کیا کہا؟“ شکر خان نہیں ہے؟..... کہاں مر گیا۔ ام زادہ عین وقت پر؟“

وہ غصے سے غرا کر بولا۔

”اے معلوم نہیں ہے کہ ایک یرغالی ہمارے قبضے میں ہے؟..... کیا..... گاؤں سے بلاوا آ گیا؟“ بوی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی..... ہوں، تم اب اس لڑکی کے پاس اکیلے ہو؟“

پھر لمحہ بھر سوئے کے بعد وہ بولا۔

”غورے! تو ایسا کر، گاڑی تو کھڑی ہے نا ڈیرے پر؟..... شکر خان لے گیا..... کمینہ، دودا! وہ دانت پیس کر جھلاہٹ آمیز انداز میں غرایا۔

میں یک ٹک سیٹ کے نیچے سٹرا سٹائیہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ میرے اندر بری طرح کی پکڑ دھکڑ مچی تھی۔ اس کی آواز بھر سنائی دی۔

”اچھا غورے! میری ایک بات غور سے سن۔“ اس کے اسرار بھرے لہجے پر میرے کان بھی کھڑے ہو گئے۔

”اس لڑکی کا گلہ دبوچ کر جان سے مار ڈالو اور لاش دشمنوں تک پہنچا دو۔ سمجھے؟“ ملک سردار خان نے ان سفاک الفاظ نے مجھے ایک تائیے کو سن کر رکھ دیا۔ میری جان سے عزیز، ہستی گنیز کو موت کے لٹا اتار دینے کا بیٹام دیا جا چکا تھا اور میں سیٹ کے نیچے دبکا جیسے اس کی موت کا منتظر تھا۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا..... میرے روم روم میں آگ سی بھڑک اٹھی اور پھر میں جنوں خیز انداز

میں نے کمرے میں کھڑ پٹر کی آواز سنی اور پھر بہ سرعت وہاں سے ہٹ گیا۔ لیکن میں اپنے کمرے کی بجائے گرین لاج سے باہر نکل کر تاریکی میں آ گیا۔ دور نیچے وادی میں تاریک سناٹا تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے گھنیرے بادلوں کے عقب میں چاند چھپ چکا تھا۔

میں نے سب سے پہلے گرد و پیش کا جائزہ لیا، پھر سامنے وسیع احاطے میں کھڑی ملک سردار خان سنگل ڈور بجیر کی طرف دیکھ کر، وہاں آس پاس کوئی ذی نفس موجود نہ پا کر میں بہ سرعت آگے بڑھ کر قریب پہنچ کر بیک ڈور کو کھولنے کی کوشش کی، وہ لاک تھا۔ مجھے ذرا مایوسی ہوئی۔ مگر پھر دوسرے لمحوں میں اگلے دروازے کی طرف آیا۔ میں نے بے آہستگی اسے ذرا کھینچا تو وہ کھل گیا۔ میں پھرئیے داخل ہوا۔ دروازہ آہستگی سے بند کیا۔ اس وقت میں نے شیشے کی کھڑکی سے پارکوشی کی طرف دیکھ کر لوگ اس طرف ہی آ رہے تھے۔ میں فوراً سیٹوں کے درمیان جھکا اور عقبی سیٹوں کی طرف رینگا۔ پھر ایک سیٹ کے نیچے سٹرا سٹ سے گرکھس گیا۔

وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے جیب کے قریب پہنچے۔ میں سانس روکے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد دروازہ کھلے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دیں۔ اگلے ہی لمحے جیب کا طاقتور انجن رات کے بھرے سناٹے میں گھر گھرا کر جاگ اٹھا۔ جیب کے فرش پر مجھے ہلکی سی تھر تھراہٹ کا احساس دوسرے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

\*\*\*

میں عقب سیٹ کے نیچے دبکا اس سوچ میں غلطان تھا کہ مجھے اب فوری طور پر اگلا قدم کیا چاہئے؟

گنیز کی زندگی شدید خطرے میں تھی اور ملک سردار خان اس وقت گنیز کے لئے موت کا فرشتہ ہوا تھا۔ وہ تنہا تھا۔

پہلا خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ اسے ادھر ہی قابو کرنے کی کوشش کروں۔ بے شک ملہا اور اس کی جیب میں پتول وغیرہ ہو سکتا تھا۔ لہذا ممکن تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر گنیز کو قتل کرنے کا ارادہ طور پر بدل دیتا۔ لیکن مجھے شاہ میر اور نظر حیات کی سختی سے دی ہوئی وہ ہدایات یاد تھیں کہ اگر ملہا حقیقت جاننا چاہی تو مجھے کسی بھی صورت میں یہ ظاہر نہیں کرنا تھا کہ میں ماموں اور ماں کی خونیں سازشوں واقف ہو چکا ہوں۔ چنانچہ مجھے اپنی صوابدید اور اپنے زور بازو سے اس نازک ترین صورت حال سے بچنا تھا کہ ملک سردار خان، اعظم خان اور ماموں حیدر گل سمیت ماں کے اصل چہرے میرے سامنے نقاب ہو جائیں۔

چنانچہ میں دم سادھے وقت اور موقع کا انتظار کرنے لگا۔

جیب بڑے ہموار انداز میں اور خاصی رفتار کیساتھ دوڑی چلی جا رہی تھی۔ رات اور ویرانی کے ملک سردار خان جیب کو اچھی خاصی اسپید سے دوڑا رہا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس مردود کی منزل تھی جہاں اس نے ماموں اور ماں کے ایماء پر گنیز کو اغواء کر کے یرغمال بنا رکھا تھا اور اب یہ خبیث اسے موت کے گھاٹ اتارنے کا سفاک ارادہ رکھتا تھا۔

میں نے بھی اپنے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر اس نے میری گنیز کو ذرا بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے اب رہ رہ کر اس بات پر بھی چھتاوا ہو رہا تھا کہ کاش ملہا اپنا اڑتا لیس بور کا ”میگارڈ“ ہی ساتھ رکھ لیتا۔

میں سیٹ کے نیچے سے نکلا اور زخمی شیر کی طرح ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ملک سردار خان کے سے اُبھرا۔ اسے بھی شاید اپنے عقب میں گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے جیسے ہی چونکا گردن موڑنا چاہی، میں نے چپے کی طرح اس کی گردن اپنے دائیں بازو کے شکبے میں مضبوطی سے اور وحشت انگیز لہجے میں بھر کر غرایا۔

”ذلیل انسان! اسی وقت اپنے کتے غفورے کو فون کر کے اپنا یہ سنگدلانہ حکم واپس لے لے تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ مگر میں نے اس کی گردن گرد اپنے بازو کا آہنی حلقہ مزید تنگ کر لیا۔ حتیٰ کہ اس کے حلق سے خرنائی ہوئی بے ربط آوازیں ہونے لگیں۔ تب پھر اس نے ایک لمبائی موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی قمیض کی سائڈ پاکٹ سے ہانکنا چاہا تو میں نے اس کی گردن چھوڑ کر پھرتی سے پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور اس کے سے لگا کر دوبارہ اپنے الفاظ دہرائے۔ اس نے گردن موڑ کر پہلے غیر قیمتی نظروں سے میری طرف پھر اور کچھ کہنا چاہا مگر میں نے پستول کا آہنی دستہ اس کی کینٹھ پر دے مارا۔ اس کے حلق سے تل ڈکراہٹ نکلی اور وہ بری طرح خوف زدہ نظر آنے لگا۔

”وقت ضائع مت کر کتے! ابھی فون کر..... جلدی، ورنہ تیری کھوپڑی میں روشندان گا۔“ میری قطعیت آمیز سفاکانہ تہدید پر اس نے اپنے لرزیدہ ہاتھوں سے موبائل نکالا اور نمبر شیخ اُگلا۔ اس نے ایسا دو تین بار کیا پھر نمناکی آواز میں بولا۔

”مم..... میرے موبائل کی..... بب..... بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہے۔ شش..... شاید اس کا یہ کہنا تھا کہ میرے سکتے وجود میں ان گنت آتش فشاں پھٹنے لگے۔ میرے جی میں تو اُگلا اسی وقت اس رذیل کا قصہ پاک کر دوں مگر میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ جیب خراب ہو چکا موبائل کی بیٹری نے کام چھوڑ دیا تھا۔ میری جان سے عزیز ہستی گنبدہ کو موت کا حکم صادر کیا جا چکا تھا۔ میں تصور میں اپنی پہلی اور آخری محبت گنبدہ کی نرم و نازک گردن کی طرف بڑھتے ہوئے دو خوفناک دیکھ رہا تھا۔ بے بسی کے انتہائی جاں گسل احساس تلے میرا پورا وجود لرزنے لگا۔ میں کسی تماشائی کا گنبدہ کی موت کا انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہذا میں نے اپنی اُلتی کھولتی حالت جنوں پر قابو پایا اور پھر سردار کو جیب کے اندر ہی محبوس کر کے دروازوں کو لاک کیا، پھر ہونٹ اٹھا کر جلدی جلدی خرابی کرنے لگا۔ مجھے اپنی جیب کا تجربہ تھا۔ فوراً ہی میں نے خرابی تلاش کی۔ فیول ٹینک سے کار بورڈ پیٹرول پمپناپنے والی نکلی نکلی گئی تھی۔ میں نے اسے جلدی سے درست کیا اور پھر بے سرعت ملک سردار کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”جلدی چلاؤ گاڑی۔ جلدی..... ایک لمحے کی بھی دیر نہیں ہونی چاہئے۔“ میں حلق کے بل ناک آواز میں چلا یا اور اس نے فوراً جیب اشارت کی۔ رات کے تاریک، چیختے ہوئے سانے میں غرا کر اشارت ہوا تھا۔ پھر اس نے فوراً کیئر بدلا اور ایک طوفانی جھلکے سے جیب آگے بڑھا دی۔

”کتنی دور ہے وہ جگہ؟“ میں نے اپنی جنونی کیفیت پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

میں اُڑ کر منزل تک پہنچ جاؤں کہ اپنی جان سے عزیز ہستی گنبدہ کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جاؤں۔ اندیشناک لمحوں کا ایک ایک پل متوقع دوسووں کی بھاری سل کی طرح اس سے میرے دل و جگر کو پیتا گزر رہا تھا۔

سڑک دور دور تک ویران اور قدرے بل کھاتی ہوئی تھی۔ میری چھلنی ساعتوں میں گنبدہ کی ہراساں اور گھٹی گھٹی پچیں اُبھر رہی تھیں۔

”آں..... نادر! ام..... مجھے..... بب..... بجالو۔ یہ..... دو خوفناک ہاتھ..... میری گردن دوپٹے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ نادر!..... تم کہاں ہو؟..... تمہاری گنبدہ ہمیشہ کے لئے تم سے پھڑنے والی ہے۔ مجھے مرنے سے بجالو..... آہ..... کیا ہماری محبت کی بس اتنی تھوڑی عمر تھی؟ آہ..... ابھی تو ہمارے ارمانوں کے گلاب بھی پوری طرح نہیں کھلے تھے۔ ان پر شوق آنکھوں نے تو ابھی جشن بہاراں کے نظارے دیکھنے تھے۔ ان پیاسے لبوں کو تو ابھی آبِ نیراں چکھنا تھا۔ کیا..... کیا یہ سب اتنی جلد..... قصر فنا کی وحشت ناک گہرائیوں میں گم ہو جائے گا؟“

وحشت ناک سناٹوں سے اُبھرنے والی گنبدہ کی یہ یاس زدہ صدائیں مجھے بے حال کئے دے رہی تھیں۔

جیب دور دراز بہت ہیولوں کی طرح ایستادہ چیز اور صنوبر کے درختوں کے درمیان بل کھاتی، ویران سڑک پر طوفانی رفتار سے دوڑے جا رہی تھی۔

”جلدی..... اور تیز..... اور تیز..... رفتار بڑھاؤ۔“ میں شدید مضطرب ہو کر چلا یا۔ وہ میرے جنوں خیز لہجے پر بری طرح خوف زدہ ہو رہا تھا۔ جیب ایک گھنے جنگل میں داخل ہو چکی تھی۔ ذرا دور اریب قریب ڈھلوان چھتوں والے چونی مکانوں کے پر اسرار ہولے نظر آنے لگے۔ جیب کی سڑک سے اب نیم پختہ راستے پر اتر کر ہلکولے کھاتی دوڑ رہی تھی۔ پھر چند ہی منٹوں میں سامنے ایک قدرے وسیع اراضی پر مجھے وہ چونی کا منظر نظر آ گیا۔ آسمان پر دسکے طباق چاند نے بادلوں کی اوٹ سے روشن نمودن کی تھی۔ جیب کا کچ کے قریب پہنچ کر ایک جھلکے سے رکی۔

میں نے ملک سردار خان کو باہر دھکا دیا اور خود بھی نیچے اتر آیا۔ وہ پاگلوں کی طرح کانچ کی طرف ”غفورے!“..... ”غفورے!“..... کہتا ہوا دوڑا چلا گیا اور میں اس کے عقب میں۔

کانچ پر وحشت ناک سناٹا طاری تھا۔ جیسے وقت کو موت آگئی ہو۔ میرا دل اب سینے میں رک رک کر دھڑکنے لگا تھا۔

ملک سردار جیسے ہی کانچ کے دروازے پر پہنچا اچانک دروازہ کھلا اور ایک شخص نمودار ہوا۔

”غفورے!..... غفورے!..... وہ لڑکی زندہ ہے نا؟“

ملک سردار خان نے بدحواسی کے عالم میں اس شخص سے پوچھا جو بلاشبہ غفورہ ہی تھا۔ وہ پہلے تو ملک سردار کو یوں اچانک ہی دیکھ کر چونکا تھا۔ پھر اس کی مجھ پر نگاہ پڑی تھی۔ میں نے پستوں والا ہاتھ دانستہ اپنی پشت پر کئے رکھا تھا۔ میری نظریں غفورے پر جمی ہوئی تھیں۔ اور میں وحشتانہ انداز میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے کچھ کہنے کا منتظر تھا۔

کاش..... یہ کہہ دے کہ..... اس نے ملک سردار کا حکم ماننے میں دیر کر دی ہے۔ کاش، یہ کہہ

دے کہ اس نے اپنے سفاک ہاتھوں سے نگینہ کا گلا نہیں دبوچا ہے۔  
میرے اندر امید و یاس کی گردان ہو رہی تھی۔ ملک صاحب!..... آپ نے ہی تو حکم  
تھا کہ اس لڑکی کا گلا دبوچ کر مار ڈالو۔ میں نے اسے ختم کر ڈالا ہے۔“  
اس نے اتنا کہا اور میرے آس پاس جیسے خون کی آبتاریں پھوٹ پڑیں۔ میرے دل و دماغ  
خوفناک آنکھیاں جلنے لگیں اور پھر عجیب میکانیکی انداز میں میرا پستول والا ہاتھ اٹھا۔ ٹھیک اسی وقت  
سردار خان نے گھبرا کر اپنی گردن گھماتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی پیشانی کا نشانہ  
کرٹر گیر دبا دیا۔  
رات کے بے رحم سناٹے میں میرے پستول نے خوفناک دھماکے سے ایک شعلہ اُگلا جو ملک  
خان کی پیشانی میں بیوست ہو گیا۔ وہ آواز نکالے بغیر کئے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہوتا چلا گیا



غفور نے خوف اور حیرت کے باعث پھیلی ہوئی آنکھوں سے یہ سب وقوع پذیر ہوتے دیکھا  
اور پھر دوسرے ہی لمحے ”صورت حال“ کی خطرناکی کو بھانپتے ہوئے آنا فانا غائب ہو گیا۔  
میں نے ایک نظر ملک سردار خان کے بدنیت چہرے کو دیکھا جس کی پیشانی سے بہنے والا خون زمین  
پر پہنچ گیا تھا۔ پھر تیزی سے غفور کے عقب میں لپکا۔ وحشت اور غیظ کے سبب مجھے یہ بھی دھیان  
نہیں رہا تھا کہ اس طرح دیوانہ وار کالنج کے اندر داخل ہونا خود میری اپنی موت کا سبب بن سکتا تھا۔ میں  
اس جگہ اُٹھتا تھا جبکہ میرا دشمن غفور اسی کالنج کا باسی تھا۔ وہ میری وحشت سے فائدہ اٹھا کر مجھے اپنا نشانہ  
بنا سکتا تھا۔ مگر مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ میں دیوانہ وار اندر داخل ہوتا چلا گیا۔ لیکن میری جھپٹنی ساعتوں میں تو  
بس نگینہ کی کھٹی کھٹی چٹیں گونج رہی تھیں اور غفور کے وہ بے رحم الفاظ..... کہ اس نے نگینہ کا گلا  
دبوچ کر اسے مار ڈالا تھا، کسی آتشیں گولے کی مانند میرے دل و دماغ میں گردش کر رہے تھے  
میں زخمی شیر کی طرح کالنج کے اندر داخل ہوا..... میری آنکھوں کے سامنے سرخ چادری تن گئی  
تھی۔ میں نے شعلہ بار آنکھوں سے دائیں بائیں دیکھا مگر غفور کہیں نظر نہ آیا۔ میرے دائیں جانب مختصر  
کی راہداری تھی اور اس کے بعد کسی کچھے کا دروازہ تھا۔ میں طوفانی گولے کی طرح اسی سمت بڑھا اور  
دروازے کو ایک لات رسید کر ڈالی۔ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھٹک چلا گیا۔ میں ملک سردار خان سے  
چھینا ہوا پستول ہاتھ میں پکڑے اندر داخل ہوا تو اچانک میرے سر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ بے  
اعتیار میرے حلق سے کرناک چیخ بلند ہوئی اور میری آنکھوں کے سارے مناظر دھندلانے لگے۔ مگر یہ  
سب ایک لمحے کے لئے ہوا تھا۔ میرے اندر کی آتش غیظ نے اس قیامت کی اذیت کو نگل لیا تھا اور  
دوسرے ہی لمحے میں پلٹا تو غفور ایک لمبا ساموٹا ڈنڈا اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے اگلے وار کے لئے  
بہ قول رہا تھا۔ میں نے خود کو اس کے اگلے حملے سے بچانے کی کوشش کی مگر اس بار ڈنڈا میرے سر پر  
پڑنے کی بجائے میرے پستول والے ہاتھ پر پڑا اور پستول میرے ہاتھ سے جھوٹ گیا۔ اس نے مجھ پر  
میرا وار کرنے کے لئے ڈنڈا اٹھایا مگر اب میں اسے موقع دینے والا نہیں تھا۔ میں نے بجلی کی سرعت کے  
ساتھ اپنی دائیں ٹانگ اس کے پیٹ میں رسید کر دی۔ اُسے اس کی توقع نہیں رہی ہوگی۔ دوسرے یہ بھی  
کہ میری لات میں غیر معمولی قوت تھی اس لئے میں نے غفور کے کوئی قدم پیچھے لڑکھڑانے پر مجبور کر دیا۔  
وہ گرتے گرتے بچا۔ میرے لئے اتنا موقع کافی تھا۔ میں انگارا آنکھوں سے اسے گھورتا ہوا جھپٹا، اس نے  
ایک مرتبہ پھر ڈنڈا لہرایا۔ میں رکوع میں جھکا اور اپنا سر اس کے سینے سے ٹکرا دیا اور اسی طرح تیزی سے  
اس رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ اس دوران میں یقیناً اس کے حوال بھی قدرے بحال ہو چکے تھے۔ لہذا  
دیوار سے پشت لگاتے ہی اس نے پھرتی کے ساتھ اپنے گھٹنے کی ضرب میرے چہرے پر رسید کر دی۔  
میری آنکھوں میں پانی اُتر آیا۔ شکر تھا کہ ناک سے خون نہیں خارج ہوا تھا۔ تاہم اسے ایک موقع مل گیا۔





اپنا دباؤ بڑھاتی جا رہی تھی۔ مجھے تو اب سانس لینے میں بھی دقت ہونے لگی تھی۔ میری آنکھیں اٹلنے پر قریب ہو گئیں۔ وہ اپنے توانا بدن کی پوری قوت صرف کر رہا تھا اور میں بے سدھ اس کے وجود کے دبا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے لگ رہا تھا، جیسے اب مجھے جنونی کبیر کے خونی شکنجے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ لیکن میں ایسی بے بسی کی موت بھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے بے دم ہوتے وجود کی قوت کو یہ مشکل سمیٹا اور پھر یکدم ایک ذرا پہلو کے بل لوٹ لگانے کی کوشش کی مگر کبیر احمد کسی پہاڑ کی طرح مضبوطی سے میرے سینے پر بجا رہا۔ تب میں نے اپنی دونوں ٹانگیں سکڑ کر اپنے وجود کو کمان کیا۔ اس کی گردن میری دونوں ٹانگوں کے شکنجے میں پھنس گئی۔ میں اسے ”لیگ لاک“ کر چکا تھا۔ ایک کامیابی ملتے ہی فطری طور پر میرے اندر کا اسپرٹس مین بیدار ہوا اور پھر جوں ہی میں نے اپنی دونوں ٹانگوں کو جھکا دیا، کبیر احمد کے حلق سے خرخراتی غراہٹیں خارج ہونے لگیں اور میری گردن پر اس ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ حتیٰ کہ اسے میری گردن چھوڑتے ہی بنی۔ میں نے ایک بار پھر دونوں ٹانگوں کو زوردار جھکا دیا اور ساتھ ہی دائیں جانب لوٹ لگائی تو کبیر احمد کا وجود میرے اوپر اکھڑ گیا۔ مگر پہلو کے بل فرش پر گرے ہی اس نے اپنے گھٹنے کی زوردار ضرب میری ناف کے قدرہ نیچے جسے پر رسید کر دی۔ میرے حلق سے گراہ خارج ہو گئی اور وہ گرفت کمزور پڑتے ہی پھٹنے کی طرح ٹپ کر میری ٹانگوں کے شکنجے سے اپنی گردن چھڑا گیا۔ پھر وہ دوبارہ فرش پر قریب ہی گرے اپنے پتوں کی طرف لپکا۔ میں نے بھی زخمی ہونے کے باوجود نہایت پھرتی کے ساتھ اپنے پتوں کی طرف پاؤں قدمی کی اور جھک کر اسے اٹھا لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ کبیر احمد مجھ پر گولی چلاتا، میں نے اپنے پستول نال کا رخ اس کی طرف کر دیا اور بلاتا خیر گھوڑا دیا مگر اس میں سے سوائے ٹرچ کی آواز کے کچھ برآمد نہ ہو سکا۔

موت سے پہلے یقینی موت کا تصور بہت جاں گسل ہوتا ہے، جس کا اندازہ اس وقت صرف میں ہی دیکھ سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں تشویش آمیز پریشانی سمٹ آئی۔ جبکہ کبیر احمد شعلہ بار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ وہ میری بے بسی دیکھتے ہوئے بڑی تہر آلود مسکراہٹ سے غرا کر بولا۔

”بس..... نادر علی! تمہارا کھیل ختم ہوا۔ تم نے میری معصوم بہن کو بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ تمہیں اب کتنے کی موت ماروں گا۔“

”کبیر!..... میری بات کا یقین کرو۔ میں نے تمہاری بہن کو مارا ہے اور نہ ہی اسے میں نے مارا۔“

”کبیر!.....“

”کبیر! اگر میں نے تمہاری بہن کو مارا ہے تو وہ بھی ادھر ہی کہیں ہوتی۔ تم بے شک اس کا بیج کی تلاشی لے سکتے ہو۔ کیا تم نے باہر کی لاش نہیں دیکھی؟ وہ ملک سردار خان کی لاش تھی، جس نے میری ماں اور ماموں حیدر گل کے اعزاء تمہاری بہن کو اغواء کیا تھا اور یہاں.....“

”میں نے کہا تھا..... اپنی بجواس بند کرو۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔“ وہ دھاڑ کر بولا۔ ”میں نے ہاں کسی کی لاش بڑی ہوئی نہیں دیکھی ہے۔ سمجھتے تم؟“

میں اس کی بات پر بری طرح ٹھکا۔

”تم نے..... اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کے اشارے پر یہ سب کیا تھا۔ ان دونوں انتقام مارے بہن بھائیوں نے تمہیں ہمارے خلاف اڑدھا بنا ڈالا ہے اور تم نگینہ کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا چکے ہو تاکہ رختہ رختہ اس کے ذریعے تم ہمارے گرد بھی اپنی کردہ سازش کا جال بن سکو۔“

میں اس کی باتیں سن کر ہکا بکا سا کھڑا بے اختیار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

”چلو اندر.....“ معا اس نے مجھے اپنے کمرے میں چلنے کا حکم دیا۔

میں نے بے اختیار قدرے طمانیت کی سانس لی۔ شاید وہ مجھے فوری طور پر موت سے ہمکنار کرنے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ میرے لئے یہی کافی تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کی اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے مجھے کمرے میں دھکیلنے کے بعد باہر سے دروازہ لاک کر دیا۔

میں ذرا دیر تک دروازے سے چپکا باہر کی سن گن لیتا رہا۔ مجھے دروازے کے دوسری طرف اب گہری خاموشی محسوس ہوئی۔ مجھے اچھنچا ہونے لگا کہ آخر کبیر احمد کا مجھے یہاں قید کرنا کیا معنی رکھتا تھا؟ تب پھر اچانک ایک لرزہ خیز خیال بجلی کی طرح میرے شل ہوتے ہوئے دل و دماغ میں کودا۔

”کہیں وہ بد بخت مجھے یہاں بند کر کے پولیس کو تو مطلع کرنے نہیں چلا گیا؟“

یہ روح فرسا خیال آتے ہی میری تشویش میں کئی گنا اضافہ ہونے لگا۔ میں نے بہر حال اپنی زندگی کا پہلا قتل کیا تھا مگر مجھے حیرت تھی کہ بقول کبیر احمد کے ملک سردار خان کی لاش اس نے نہیں دیکھی تھی۔ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا تھا؟

میں نے فکرمندی سے سوچا۔ میں نے خود ملک سردار خان کی پیشانی پر حالت اشتعال میں گولی داغی تھی۔ وہ میرے سامنے تورا کر گرا تھا اور موقع پر ہی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ پھر اس کی لاش کہاں گئی؟ یہ وہ سوال تھا جو بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

اچانک پھر میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

”کہیں..... کبیر احمد نے مجھ سے جھوٹ تو نہیں بولا تھا؟“

”مگر کیوں؟..... اُسے یہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟“

میں نے خود ہی اپنے سوال کو رد کرتے ہوئے سوچا۔ میں شدید الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ بالآخر میں نے ان سارے سوالات کو ذہن سے جھکا کر وہاں سے نکلنے کی راہ تلاش کرنے لگا۔

سردست تو مجھے اپنے مفکر کی راہ سبائی نہیں دے رہی تھی۔ کمرے میں فقط ایک کھڑکی تھی جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ چھت کے قریب ایک چوکور روشن دان تھا۔ مضبوط لکڑی سے بنا دروازہ باہر سے بند تھا۔ سامنے بیڈ پر صدف کی لاش پڑی تھی اور ماحول پر عجیب سا پرسرا سناٹا طاری تھا۔

میں نے دروازے کے ساتھ مقدور بھر زور آزمائی کی مگر وہ کس سے کس نہ ہوا۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد میں نے کسی آہنی شے کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، جس کی مدد سے میں دروازے کے انزلاک کو توڑنے کی کوشش کرتا۔ مگر مجھے ایسی کوئی شے بھی نظر نہ آ سکی۔

ناچار میں تھک ہار کر بیٹھ گیا۔

مجھے اگرچہ اس بات کا پورا یقین تھا کہ وہ بد بخت کبیر پولیس کو اطلاع دینے ہی گیا تھا۔ وہ یقیناً اپنے تئیں مجھے رنجے ہاتھوں گرفتار کروانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن چونکہ مجھے نسلی تھی کہ اس کی بہن صدف حیات کا قتل میں نے نہیں کیا تھا اس لئے مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ مگر پریشانی مجھے ملک سردار خان کے قتل پر ہو رہی تھی جسے میں نے نگینہ کو ہلاک کرنے کے حکم پر شدید اشتعال کی حالت میں مار ڈالا تھا۔ اگرچہ وہ ایسی ہی موت کے قابل تھا مگر یہاں تو معاملہ ہی اور نکلا تھا۔ پھر اب یہ قول کبیر احمد کے ملک سردار خان کی لاش اسے باہر کہیں نظر نہ آئی تھی۔ یہ میرے لئے اچنبھے کا باعث تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر کبیر احمد

”وہ جی، ان تینوں کے حکم پر میں نے پہلے صدف کو اور پھر گنیز کو اغوا کیا تھا۔“  
 ”کن تینوں کے حکم پر؟..... نام لو۔“

”یہ نادر علی، اس کی سزایافتہ ماں شبینہ اور اس کے ماموں حیدر گل کے کہنے پر۔“ اس کے  
 غنجد جھوٹ پر میری آنکھوں میں حیرت کے سمندر موجزن ہو گئے۔

”یہ..... یہ جھوٹ بول رہا ہے کمینہ۔“ اس کے بے درپے سفید جھوٹ پر میں پھٹ پڑا۔ ”میں.....  
 میں تو اسے جانتا تک نہیں۔“

”واہ جی واہ!..... نادر میاں! آپ نے ہی تو میرے ساتھ مل کر گنیز بی بی کو اغوا کیا تھا۔ اور پھر  
 اس کے بعد صدف کو۔“

”بکواس بند کر کمینے انسان! میں تیرا خون پی جاؤں گا۔“ میں اس کی مسلسل بکواس پر مارے طیش کے  
 سرخ ہو کر دھاڑا اور چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر اس کی گردن دیوچ لوں کہ کبیر فوراً اپنے پستول کا رخ میری  
 جانب کرتے ہوئے قلعے کے بل گر جا۔

”خبردار نادر!..... اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ تمہارا پول کھل چکا ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی  
 کہ تم نے ہم سے برسوں پرانی دشمنی خوب نبھائی۔ مجھے تو اس دن سے ہی تم پر شبہ ہو گیا تھا جب تم  
 ہمارے ہاں آئے تھے اور نکلیں کے پیا شاہ میر اور میرے ڈیڈی (نظر حیات) کو تم نے اپنی لچھے دار باتوں  
 سے متاثر کیا تھا۔

وہ جانے کون کون سے جنموں کے زہرا گل رہا تھا۔ جبکہ اس کی رقیبانہ سازشوں کے ایک ایک تار و  
 پود سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مردود یہ نیا جال بھر پھینک کر مجھے گنیز کی نگاہوں میں پھر مشتبہ کرنا  
 چاہتا تھا۔

میری گھورتی ہوئی خوں ناک نظریں کبیر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ بار  
 بار دزدیدہ نظروں سے قریب کھڑی گنیز کو بھی دیکھے جا رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ گنیز کی پیہم اور اسرار بھری  
 خاموشی اسے بری طرح کھل رہی ہے۔

میں نے گنیز کے کم صم چہرے کی طرف دیکھا اور دل کی گہرائیوں سے اسے مخاطب کر کے بولا۔  
 ”گنیز! یہ سازشی انسان اس سے پہلے بھی ہمارے بیچ دراڑ ڈالنے کی ایک مذموم اور ناکام کوشش کر چکا  
 ہے۔ مجھے اس کے لہجے سے ہی سازش کی بو آتی ہے۔ میں اپنی صفائی میں محض اتنا ہی کہوں گا کہ میرے  
 دل میں کسی بھی دشمنی کا کوئی انتقامی جذبہ نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہیں اغوا کرنے جیسے ناپاک فعل کا تصور  
 کر سکتا ہوں۔ صدف کو میں نے قتل نہیں کیا بلکہ میں تو تمہارے دشمنوں کو تلاش کرنے کی کوششوں میں تھا  
 جس میں مجھے بھرپور کامیابی حاصل ہوئی ہے۔“

”ہمارے دشمن کون ہیں؟“ معا گنیز نے مجھ پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

”میری ماں شبینہ اور ماموں حیدر گل۔“ میں نے کہا اور گنیز کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر  
 گیا۔ اس لمحے میں نے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی طمانیت کو پھیلنے کے محسوس کیا جیسے وہ کچھ  
 بھانپتا اور افادہ کرنا چاہ رہی ہو اور اس میں خاطر خواہ کامیاب بھی رہی ہو۔

”گنیز! اس فریبی اور دغا باز کی باتوں میں مت آؤ۔ یہ خود کو اپنی ماں اور ماموں سے الگ کر کے  
 تمہاری نظروں کے سامنے اپنے بھیاں بک جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ کبیر نے پھر میرے  
 خلاف زہرا گلنے ہوئے گنیز کو مجھ سے متفرق کرنے کی کوشش کی تو گنیز نے اسے ٹوکتے ہوئے گہری مگر پُر غور

نے بیچ کہا تھا تو یہ بات بھی میرے حق میں ایک طرح سے بہتر ہی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں سردست کار  
 کے شکنجے سے بچ سکتا تھا۔ کبیر احمد کو گئے، گھسنے سے زائد کا وقت ہو چکا تھا۔

اچانک میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں میں کسی گاڑی کے انجن کی گڑگڑاہٹ ابھری۔ میں بری طرح چٹا  
 گیا۔ شاید کبیر پولیس والوں کو یہاں لے آیا تھا۔

یہ گویا میرے لئے ایک اور نئی مصیبت کا آغاز تھا۔ پولیس والوں کے ہاتھوں بننے والی اپنی درگم  
 مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ میں نے دروازے کی باریک جھری سے باہر جھانکنے کی کوشش کی مگر سوائے تاری  
 کے مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں سیدھا کھڑا ہو کر گویا تن بہ تقدیر ہو گیا۔ میں اب کمرے میں بند دروازے  
 چند قدم کے فاصلے پر کھڑا اسے یوں ٹھٹکی ہوئی نظروں سے گھورنے لگا جیسے ابھی کوئی ہولناک عنصر  
 دروازے کو توڑتا ہوا اندر داخل ہونے والا تھا۔

اچانک دروازے کے بالکل قریب مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرا دل جیسے رک رک  
 کر دھڑکنے لگا۔ کچھ دیر بعد دوسری طرف سے انٹرلاک میں ہلکی سی سرسراہٹ ابھری اور اگلے ہی!  
 دروازہ کھل گیا۔ سامنے نگاہ پڑتے ہی میں جیسے سن ہو کر رہ گیا.....!

\*\*\*

پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر بالکل یقین نہ آیا کہ میں جو منظر دیکھ رہا تھا وہ حقیقی تھا یا خوب.....؟  
 میرے سامنے کبیر کھڑا تھا۔ اس نے ایک بد معاش ٹائپ کے ننھے ننھے گنگن پوائنٹ پر لے رکھا  
 جو میرے لئے سراسر اجنبی تھا۔ لیکن میرے چونکنے کی اصل وجہ کچھ اور تھی۔ ان کے ہمراہ انتہائی مضطرب  
 الحال انداز میں میری وہ عزیز ترین اور جان جاناں گل بداماں ہستی کھڑی تھی جس کی خاطر میں قتل چلے  
 جرم کا مرتکب ہوا تھا۔ ہاں، وہ گنیز ہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے پریشانی کے علاوہ اب مجھن آمیز تاثرات  
 مترشح تھے۔

”دیکھ لو گنیز! اپنی آنکھوں سے اس سنبولے کا اصل روپ۔“ معا کبیر نے میری طرف گھورتے ہوئے  
 نفرت سے ہونٹ سیکیڑ کر گنیز سے کہا۔

”وہ دیکھو..... سامنے میری معصوم بہن صدف کی لاش پڑی ہے، جسے اس ظالم اور سفاک انسان  
 نے بے دردی سے گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور اب یہ تمہیں بھی اسی طرح اغوا کرنے کے بعد ہلاک کرنے کا  
 ناپاک ارادہ رکھتا تھا کہ میں بروقت پہنچ گیا۔“

”یہ کیا بکواس کئے جا رہے ہو تم کبیر؟“ اس کی لغو بیانی پر میں آپے سے باہر ہو گیا اور چلا کر بولا۔  
 گنیز نے ایک نگاہ بند پر صدف کی بے سدھ پڑی لاش پر ڈالی مگر وہ خاموش رہی۔ کبیر شاید گنیز کی  
 طرف سے میرے لئے نفرت انگیز رد عمل کی توقع کئے ہوئے تھا مگر اسے گونگوسی خاموشی میں پا کر اس  
 نے دوسرا حربہ آزمایا۔ اس نے اپنے ساتھ آئے گئے بد معاش کی کینٹی پر اپنے پستول کی ٹال چھوئے  
 ہوئے غرا کر کہا۔

”تم بتاؤ، اصل حقیقت کیا تھی؟ ورنہ تمہارے سر میں گولی اتار دوں گا۔“  
 گنجا بد معاش گھکھکاتے ہوئے بولا۔ ”مم..... میرا کوئی قصور نہیں ہے جی۔ مم..... میں تو حکم کا

غلام تھا۔“  
 ”کس کے حکم کے غلام تھے؟ بولو جلدی..... ورنہ.....“ کبیر نے دوبارہ پھنکارتے ہوئے اس  
 سے کہا۔ میں حیران پریشان کھڑا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

پتول تانے ہوئے خوف ناک غراہٹ کے ساتھ کہا۔  
”کبیر! اگر تار ہمارا واقعی دشمن ہوتا تو یہ کبھی بھی اپنی ماں اور ماموں کا نام اپنی زبان پر نہیں لاتا۔  
اس کی بات پر کبیر کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ البتہ نگینہ کی بات سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی کہ اس نے ہونے بغیر، ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ یہ غور حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کبیر سے میری حمایت ایک ایسی بات کہہ ڈالی تھی کہ وہ اپنی غلطی جھانکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

پھر میں نے بھی نگینہ کو حالات گزشتہ کے بارے میں مختصراً آگاہ کیا کہ کس طرح میں اس کی ماں میں پاگل ہو رہا تھا اور چونکہ مجھے پہلے ہی اپنی ماں اور ماموں حیدر گل پر شبہ تھا اسی لئے میں اس کی لینے لگا اور یوں میں نے ان کی باتیں سن لیں۔ پھر ملک سردار خان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک تو مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ یہاں ان کے ایک غمخورے نانی ساتھی نے صدف کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک ڈالا تھا۔ یہ سب بتاتے ہوئے میں ملک سردار خان کے قتل کا ذکر دانستہ گول کر گیا تھا۔

”دیکھو..... میرے سامنے آگے دو..... اور خود کو ایک بڑے جنجال میں پھنسنے سے بچالو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا جرم بہت معمولی نوعیت کا ہو گا۔ لیکن اگر تم نے حقیقت چھپانے کی کوشش کی تو پھر یاد رکھو، پولیس خود ہی تم سے اچھی طرح حقیقت اُگلوا لے گی۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح سمجھتے ہو۔“

میری بات پر اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ میری عقابانی نظروں نے اس ناپس کے گلی کوچوں والے بدمعاش کی ”کننگری“ بھانپ لی تھی جو پولیس کے دباک دیکے سے بہ خوبی واقف ہوتے ہیں۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے کبیر کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ خاصا پریشان اور مضطرب سا نظر آ رہا تھا۔

”وہ بی..... یہ سچ ہے کہ نگینہ بی بی کو کبیر نے میری مدد سے ہی اغوا کیا تھا۔“ بالآخر اس نے ٹھوس لہجے میں حقیقت اُگل بی دی۔ کبیر جیسے پھٹ پڑا۔

”یہ..... یہ جھوٹ بول رہا ہے..... نگینہ! نادر نے بڑی چالاکی سے اسے پولیس سے خوف زدہ کر کے اپنی مرضی کا بیان اُگلوانے پر مجبور کیا ہے۔“ وہ گنجے بدمعاش کو خونی نظروں سے گھورتے ہوئے غرا کر اس سے بولا۔

”میں تیرا خون پی جاؤں گا..... تُو نے میرے خلاف جھوٹ بولنے کی جرأت کیسے کی؟“  
”کبیر! اس طرح تو تم بھی اسے دھمکی دے کر ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو۔“ نگینہ نے ناگوار نظروں سے کبیر کی طرف دیکھتے ہوئے استہزاءیہ لہجے میں کہا مگر گنجی بدمعاش کبیر کے رویے سے چنداں خوف زدہ نہ ہوئے بغیر جوش سے بولا۔

”جس پرانے ریٹ ہاؤس میں تم نے نگینہ بی بی کو ریغمال بنا کر رکھا تھا، وہ تمہاری ملکیت ہے..... لیکے دار عزیز اللہ خان اس بات کا گواہ ہے۔“

اب تو کبیر احمد کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مگر وہ پھر بھی تمللا کر خود کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے لالہ ”وہ سرکاری ریٹ ہاؤس ہے۔ اس پر کوئی بھی اپنی ملکیت نہیں جتا سکتا۔“

میں نے صاف محسوس کیا کہ اس کا لہجہ شکست خوردہ ہونے لگا تھا۔ اس پر گنجے بدمعاش نے میری طرف دیکھ کر جوش بھرے لہجے میں کہا۔

”یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بعض پرانے ریٹ ہاؤس حکومت نے نلام بھی کر دیئے ہیں۔ اس نے لالہ صاحبی وہ خریدا ہے۔ نادر صاحب! میں آپ کو ابھی ٹھیکے دار عزیز اللہ کا پتہ یا اس کا موبائل فون نمبر

سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”کبیر! اگر تار ہمارا واقعی دشمن ہوتا تو یہ کبھی بھی اپنی ماں اور ماموں کا نام اپنی زبان پر نہیں لاتا۔ اس کی بات پر کبیر کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ البتہ نگینہ کی بات سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی کہ اس نے ہونے بغیر، ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ یہ غور حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کبیر سے میری حمایت ایک ایسی بات کہہ ڈالی تھی کہ وہ اپنی غلطی جھانکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

پھر میں نے بھی نگینہ کو حالات گزشتہ کے بارے میں مختصراً آگاہ کیا کہ کس طرح میں اس کی ماں میں پاگل ہو رہا تھا اور چونکہ مجھے پہلے ہی اپنی ماں اور ماموں حیدر گل پر شبہ تھا اسی لئے میں اس کی لینے لگا اور یوں میں نے ان کی باتیں سن لیں۔ پھر ملک سردار خان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک تو مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ یہاں ان کے ایک غمخورے نانی ساتھی نے صدف کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک ڈالا تھا۔ یہ سب بتاتے ہوئے میں ملک سردار خان کے قتل کا ذکر دانستہ گول کر گیا تھا۔

یہ سب سن کر نگینہ کے چہرے پر ہلکی سی جوش آمیز تنہا ہٹ ابھری تھی پھر اس نے کبیر سے ایک ایسی بات کہہ ڈالی۔

”کبیر! تم ایک بات یہ بتاؤ، تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں ایک ایسی گناہم جگہ پر مقید ہوں جہاں تم مجھے آزاد کرانے پہنچتے تھے؟“

اب تو کبیر کا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے اپنے چہرے کے تاثرات پر پاتے ہوئے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔

”مم..... میں نے اس کے ساتھی کا تعاقب کیا تھا۔“  
”کون سے ساتھی کا تعاقب کیا تھا؟“ نگینہ نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”یہ جو میرے ساتھ کھڑا ہے۔“ کبیر نے گنجے بدمعاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ کبیر نے مجھے نگینہ کی نگاہوں میں مجرم ثابت کرنے کی ایک اور ناکام سازش کی تھی چنانچہ میں کبیر کی سازش کا تار و پود بھانپتے ہوئے نگینہ سے بولا۔

”نگینہ! حقیقت یہ ہے کہ کبیر نے ہی تمہیں اغوا کیا تھا تا کہ بعد میں تمہیں وہ خود ہی بازیاب کر مجھے تمہاری نگاہوں کے سامنے کرا سکے۔ البتہ میں یہ بات پورے یقین اور ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ کبیر کی بہن صدف حیات کو غمخورے نانی شخص نے ہی گلا دبوچ کر ہلاک کیا ہے اور جو تعلق میری ماں اور ماموں حیدر گل سے تھا۔ وہ فرار ہو چکا ہے لیکن میں عدالت میں اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہوں۔“

نگینہ میری طرف سے مطمئن ہو چکی تھی۔ میری طرح وہ بھی اتنا سمجھ گئی تھی کہ اسے اغوا کرنے کا کبیر ہی ہوسکتا تھا۔ میں نے اس گفتگو کے دوران بالکل غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے کبیر کی طرف سرکنا شروع کر دیا تھا۔ میں اب کبیر کی اس سازش کو پوری طرح بے نقاب کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

چنانچہ ایک موقع ملنے ہی میں نے بجلی کی سرعت کے ساتھ کبیر پر چھلانگ لگاتے ہوئے اس پتول والے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ وہ اس اچانک حملے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ نتیجتاً وہ اپنا توازن قائم نہ رکھا اور زمین بوس ہو گیا۔ پتول اس کے ہاتھ سے چھوٹا جسے زمین پر گرنے سے پہلے میں نے اچک بلایا۔ ”خبردار! تم دونوں اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا..... ورنہ گولی مار دوں گا۔“ میں نے ان دونوں

دیتا ہوں۔ آپ اس سے خود ہی پوچھ لیں۔“

اس کی بات پر میں نے اور نگینہ نے بیک وقت کبیر کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جو دھواں دھواں رہا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اب اس کے اندر مزید اپنی ”ہٹ“ پر قائم رہنے کی سکت نہیں رہی! لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔

”اب کیا کہتے ہو کبیر؟“ میں نے لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد طنزیہ لہجے میں اسے مخاطب کر کے نگینہ بھی اب جلتی سکتی نگاہوں سے اس کے چہرے کی طرف گھورے جارہی تھی۔

پھر دوسرے ہی لمحے کبیر نے فوراً کپنگلی بدلی اور تادم ہو کر نگینہ سے بولا۔ ”نگینہ! تم..... معاف کر دو۔ تم..... مگر یہ بھی سچ ہے کہ میں نے..... میں نے یہ سب اپنی تم سے ایک طرف مجھ سرکشی میں کیا تھا۔ تم خود میری دلی کیفیت کا اندازہ کرو نگینہ!..... اس شخص نے دوستی کی آڑ میں، پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے اور تمہیں مجھ سے چھین کر لے گیا ہے۔“

اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ میں اس کی مکاری پر تمللا اٹھا مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی نگینہ تلخ لہجے میں اس سے کہا۔

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ نادر نے مجھے تم سے چھین لیا ہے۔ محبت کسی کی ملکیت نہیں ہوتی۔ اور میری تم سے دوستی تھی۔ اس لئے کہ ہمارے والدین بھی ایک دوسرے کے پرانے جاننے والے دوستوں میں سے تھے لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس دوستی میں دل کا معاملہ بھی شامل ہو۔“

”تم کچھ بھی کہو نگینہ! مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔“ اس بار وہ عجیب سے لہجے بولا تھا۔ نگینہ اسے جلتی نظروں سے گھورنے لگی۔ پھر نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

”کیا تم محبت میں زبردستی کے قائل ہو؟“

”ہاں..... کوئی اگر اس طرح میری محبت کو مجھ سے چھین لے گا تو مجھے بھی اپنی محبت چھینا ہے۔“ ایسا ایک کبیر کے لہجے میں جارحانہ خود دہرائی ہوئی آواز آئی۔ نگینہ کی آنکھوں میں ایک لمحے کو دبا دبا کا تاثر ابھرا تھا۔ تاہم میں نے کبیر کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

”کبیر! اگر تم نے نگینہ کو ذرا سا بھی گزند پہنچانے کی کوشش کی تو یہ تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔“ میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا سپوئلے!..... اچھی طرح سے دیکھ لوں گا۔“ کبیر نے جلا بھرے لہجے میں میری طرف گھورتے ہوئے کہا اور پھر بیڈ کی طرف بڑھ گیا جہاں اس کی بہن حیات کی لاش پڑی تھی۔ اس نے اسے اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ میں اور نگینہ دم کھڑے رہ گئے۔

”میں اسے ابھی پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“ اس کے جاتے ہی میں دانت پیس کر بڑبڑایا۔ ”نہیں نادر! تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔“ معاً نگینہ نے پُر متانت لہجے میں مجھ سے کہا اور میں چٹا اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ پھر جیسے کچھ سمجھتے ہوئے میں نے تھری سانس لے کر چپ سا دھ لی۔

وہ شاید نہیں چاہتی تھی کہ اس کے چپا اور کبیر کے ڈیڈی کے درمیان پرانی دوستی میں کسی قسم کی پڑے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ نظر حیات پر اس کی بیٹی صدف حیات کے قتل کی صورت میں قیامت بھی ٹوٹ پڑی تھی۔ مجھے بد معاش نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے جانے کی اجازت طلب کی۔ اس کا کوئی فائدہ نہ تھا، تاہم میں نے اسے سرزنش کر کے جانے دیا۔

”چلو نگینہ! میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ دوں۔“ انکل شاہ میر تمہاری وجہ سے بہت پریشان“

ہوں گے۔“ میں نے دھیرے سے نگینہ کو مخاطب کر کے کہا۔

پھر اس کے بعد ہم دونوں جپ میں سوار ہوئے اور پنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔

پوچھنے ہم شاہ میر کی کونھی پہنچے تھے۔ نگینہ کو میرے ساتھ زندہ سلامت دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ نگینہ نے ان سے اصل بات چھپاتے ہوئے محض اتنا ہی بتایا تھا کہ اسے چند اوباش غنڈے پکڑ کر لے گئے تھے مگر نادر نے مجھے بروقت ان کی قید سے چھڑا لیا تھا۔ نگینہ کی مرضی یہی تھی اس لئے میں بھی خاموش رہا۔ البتہ نگینہ نے جب انہیں نظر حیات کی بیٹی صدف حیات کے بہیمانہ قتل کے بارے میں بتایا تو وہ بی بی طرح چونکے اور پھر میں نے انہیں یہ سنگین اور سفاک حقیقت گوش گزار کی کہ صدف حیات کے قتل میں میری ماں اور ماموں حیدر گل کا ساتھ ہے تو وہ مزید پریشان ہو گئے۔ اب ان کی آنکھوں سے انجانے فوف کی جھلک بھی نمایاں ہونے لگی۔ انہوں نے جلدی سے اپنی بیٹی نگینہ کو گلے لگاتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں کہا۔

”خدا کا شکر ہے بیٹی! کہ تم ان دونوں سفاک بہن بھائیوں کے خونی ہاتھوں سے بچ گئیں۔ اب مجھے ان کے خلاف کوئی عملی کارروائی کرنا ہی پڑے گی۔ ٹھہرو، پہلے میں اپنے دوست نظر حیات کو فون کر لوں۔“ بھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک قریب دھڑے فیسٹی ٹیلی فون اسٹینڈ پر رکھے فون سیٹ کی کھنٹی بج گئی..... انکل شاہ میر نے چونک کر ریسیور اٹھایا۔ میں اور نگینہ دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے چہرے کو نئے نگے۔

”ہیلو..... ہاں، نظر حیات!..... اوہ، یہ بہت برا ہوا..... مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے۔“ دہری طرف نظر حیات ہی تھے جن سے نگینہ کے بپا مخاطب تھے۔

”صدف میری بھی بیٹی تھی حیات! مجھے بہت ملال ہے، تم حوصلہ رکھو۔ وہ دونوں قاتل بہن بھائی مانوں کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکیں گے۔ میں فوراً پہنچ رہا ہوں۔“ انہوں نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ پھر بہ بکلت ہم دونوں سے بولے۔

”آؤ..... نظر حیات کی طرف چلتے ہیں۔“

ذرا ہی دیر میں ہم تینوں نظر حیات کے سامنے موجود تھے۔ ان کا چہرہ شدید غم کی عکاسی کر رہا تھا۔ انکھوں میں آنسوؤں کی جھللا ہٹ کے ساتھ ایک غیظ آلود جوش کی تپش بھی جھلک رہی تھی۔ ان کی بیگم احوال اور اندر کرے میں تھیں اور عزیز رشتے دار عورتوں نے انہیں سنبھالا دے رکھا تھا۔ جبکہ کبیر بھی اس وقت اپنے چہرے پر سوگوار کی طاری کئے باپ کے قریب ہی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ شاید اب تک اس بات کا اندازہ لگا چکا تھا کہ نگینہ نے اپنے انواء وغیرہ کے سلسلے کو اپنا ذاتی معاملہ قرار دے کر خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

انکل شاہ میر نے اپنے دوست نظر حیات کو ساری بات سنا ڈالی تھی اور ان کو یہ بھی بتایا کہ نادر یعنی ان کی ماں اور ماموں کے خلاف گواہی دینے کے لئے تیار ہوں۔ ایس بی وجاہت قریبی کو بھی فون کر کے بلالیا گیا تھا اور میں نے انہیں تمام واقعات سے آگاہ کرنے کے بعد غمخواری کے متعلق بھی بتا دیا تھا کہ میں نے میری ماں اور ماموں حیدر گل کے کہنے پر یہ سفاک قدم اٹھایا تھا۔ ایس بی وجاہت قریبی نے اس وقت پولیس پارٹی کو ماں اور ماموں حیدر گل کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیئے تھے اور غمخواری سے تلاش کا بھی سختی سے حکم دے دیا گیا تھا۔

صدف حیات کی تجھیز و تدفین کے بعد رات گئے میں، انکل شاہ میر اور نگینہ واپس کوٹھی آ گئے۔ اس

دوران میں ہمیں یہ اطلاع دی جا چکی تھی کہ ایس پی وجاہت قریشی کے حکم کے مطابق ماں اور ماموں جمل کو صدف حیات کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور اب ان دونوں بہن بھائیوں سے غمور کے سلسلے میں پوچھ گچھ جاری تھی۔

کوشی پہنچنے کے بعد انکل شاہ میر نے مجھے رات وہیں گزارنے کو کہا مگر میرا اب ”گرین لاج“ پر ضروری تھا۔ تاہم رخصت ہونے سے پہلے میں نے ان سے کہا۔

”انکل! کیا اب بھی مجھے آپ لوگ اس حقیقت سے آگاہ نہیں کریں گے کہ آخر میری ماں، مام، حیدر گل کی آپ لوگوں سے دشمنی کی اصل وجہ کیا ہے؟..... ان حالات میں میرا یہ سب جانا اور ضروری ہو گیا ہے۔“

میری بات پر انکل شاہ میر نے ایک گہرا اور پُر سوچ ہنکارا بھرا اور پھر دھیرے سے اپنے سر کو اٹار میں جنبش دی۔ میری دھڑکتی ہوئی نظریں ان کے لمبییر تاثرات کے حامل چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ گویا چونکہ یہ ساری حقیقت معلوم تھی اس لئے وہ خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ماحول میں ایک ایسی اعصاب شکن سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ انکل شاہ میر بالآخر آج مجھے ان سوالوں کے جوابات دینے کے لئے تیار ہو گئے تھے جن سے میری ماں اور ماموں حیدر گل آج تک پہلو تکی کر آئے تھے۔

”نادر بیٹے!.....“ بالآخر انہوں نے کہنا شروع کیا اور میں سر تا پا سماعت بن گیا۔ ”چاہتے تو یہی تھے کہ یہ پہلے اور کر یہہ حقیقت تمہیں اپنی ماں اور ماموں کی زبان سے معلوم ہوتی لیکن ان کا اس سلسلے میں بدستور خاموشی سے تم خود اس بات کا یہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ کیوں خاموش ہیں؟“ انہوں نے چند لمحوں کے لئے توقف کیا اور میری بے چینی بخندہ بے لطف فزوں تر ہونے لگی۔ ان کا لے کے لئے متوقف ہونا بھی مجھے بری طرح کھل رہا تھا۔

”ہمیں یہ حقیقت تمہیں بتانے میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ لیکن اب شاید صدف حیات والے اندوہنا واقعے کے بعد تمہیں ہماری باتوں پر شبہ نہ رہے..... بہر حال سنو۔ یہ آج سے پورے پچیس سال کی بات ہے۔ نظر حیات اور میں تمہارے باپ قادر خان کے پرانے اور گہرے دوستوں میں سے۔ قادر خان کی دوستی پر ہمیں آج بھی فخر ہے۔ وہ ایک دوست نواز اور غیور شخص تھا۔ تمہاری ماں یعنی خان کی بیوی شبنم، نظر حیات کی طرف ملتفت ہونے لگی لیکن نظر حیات چونکہ ایک شریف انسان تھا لئے وہ دامن بچاتا رہا۔ تمہاری ماں یہی سمجھی کہ نظر حیات، قادر خان سے ڈرتا ہے۔ پھر تمہاری ماں اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کر ڈالا لیکن قادر خان نے جب اس کی وجہ پوچھنا چاہی تو تمہاری ماں بتائے بغیر اپنی بات پر اڑی رہی۔ لہذا قادر خان نے اسے بری طرح سرزنش کی۔ تب پھر ایک تمہاری ماں نے اس بے چارے کا دل کر ڈالا اور پھر وہ سیدھی نظر حیات کے پاس اس کے سر پر ریٹ ہاؤس جا پہنچی جہاں وہ تنہا رہتا تھا کیونکہ اس وقت وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس وقت نظر حیات کے ہمراہ میں بھی تھا۔ ان دنوں میں محکمہ جنگلات میں کیم وارڈن (فاریسٹ آفیسر) تھا اور نظر حیات گورنمنٹ کانسٹرکٹر۔ جبکہ تمہارا باپ قادر خان ایک بڑے لکڑی کے ٹال کا مالک تھا۔

”بہر طور..... جب تمہاری ماں نے نظر حیات کو یہ بتایا کہ اب اسے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس نے اپنے شوہر قادر خان کا دل کر ڈالا ہے تو بے چارہ نظر حیات یکدم گھبرا گیا اور تمہاری قاتل ماں سے شادی کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ تمہاری ماں نے اسے بھی قتل کر دیا۔“

میں نے ان کی طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ لیکن میں اب سب سے بڑا کام یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے باپ کی جاگیر، کاروبار کو سنبھالوں تاکہ بعد میں میری ماں اور ماموں پر اپنا حق نہ جاسکے۔ میں انہیں بے دخل کر دوں گا۔“

”ہاں، یہ کام تو تمہیں سب سے پہلے کرنا ہو گا۔“ انکل شاہ میر نے فوراً میری تائید کی، اس کے بعد وہ ایس پی کوٹ گیا۔



تمہارے بڑے صاحب اور بی بی جی بے گناہ ہوئے تو عدالت دونوں کو باعزت بری کر دے گی۔  
”لیکن..... صاحب جی! ہم نے تو سنا ہے کہ آپ نے بی بی جی اور بڑے صاحب کے لئے  
تک کوئی وکیل تک نہیں کیا ہے؟“

”مردان شاہ! میں نے اسے ذرا سخت نظروں سے دیکھ کر کہا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لپے  
تلخی عود کر آتی تھی۔ وہ بے چارہ میرے اس طرح پکارنے پر گھبرا سا گیا۔ ”تم..... اور کچھ کہنا چاہا  
ہو؟“ میں نے اسے رخصت کرنے کی غرض سے پوچھا۔  
”نن..... نہیں..... صاحب جی!“

”ٹھیک ہے..... تم جا سکتے ہو۔“  
وہ واپس جانے کے لئے مڑا مگر پھر ایک لمحے کو رک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”صاحب  
میری بات بری لگی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔“

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکراتے ہوئے سر ہلا  
وہ چلا گیا۔

ماں اور ماموں حیدر گل کو قراقرظ سزا دلوانے کے لئے نظر حیات نے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا  
اس نے شہر کے بہترین وکیل کو بھی ”ہار“ کر لیا تھا۔ عدالت میں مقدمہ پیش کیا جا چکا تھا۔ جہاں مجھے  
اور ماموں کے خلاف گواہی کے لئے پیش کیا جانے والا تھا اور اس سلسلے میں نظر حیات اور انکل شاہ  
نے مجھ سے رابطہ بھی کیا تھا بلکہ اس سلسلے میں ایک روز وہ دونوں خود ہی مجھ سے ملنے گرین لاج آئے  
تھے۔ ان کے ہمراہ نگینہ بھی تھی۔ وہ صبح کا وقت تھا۔ دور برف پوش پہاڑوں سے سورج پوری طرح  
چکا تھا اور نیچے وادی کے جنگل میں پرندوں کی گونجی چکاریں بلند ہونے لگی تھیں۔

وہ لوگ کار میں آئے تھے۔ اس روز اتوار تھا۔ میں بھی لاج میں ہی موجود تھا۔ آنے سے قبل نگینہ  
مجھے فون کر کے آمد کی اطلاع دے دی تھی۔

میں نے فضل چاچا اور ان کی بیوی سیکندہ کو ”مہمانوں“ کی آمد کے بارے میں بتایا، وہ کاملاً  
مصروف ہو گئے۔ بالآخر وہ لوگ پہنچ گئے۔

فضل چاچا انکل شاہ میر اور نظر حیات کو پہچانتے تھے۔ ان کے چہرے پر پہلے حیرانی اور پھر بعد  
ناگواری کے تاثرات ابھرے تھے۔ تاہم ان کا استقبال میں نے کیا تھا۔

”نادر بیٹے! کل تمہاری گواہی حیثیت سے عدالت میں پیشی ہے۔ ہم نے سوچا تمہیں مطلع کر دو،  
رسمی علیک سلیک کے بعد نظر حیات نے میری طرف دیکھ کر کہا تو میں نے بلا توقف جواب دیا۔

”آپ بے فکر رہیں..... میں حاضر ہو جاؤں گا۔“  
”شباباش بیٹے! ہمیں پوری امید تھی کہ تم حق کی خاطر ہمارا ساتھ دو گے۔“ اس بار انکل شاہ میر

مجھ سے کہا۔ نگینہ ان کے قریب ہی خاموش بیٹھی تھی۔ ”نادر بیٹے! ہمیں کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے  
تمہیں تمہاری ہی ماں اور ماموں کے خلاف گواہی دینی پڑ رہی ہے۔ لیکن میری معصوم بیٹی صدف کے

کا معاملہ نہ ہوتا تو شاید.....“ انکل نظر حیات کچھ کہتے کہتے رک گئے، پھر فوراً ہی بولے۔ ”اگر تمہارا  
دل پر کسی قسم کا بوجھ محسوس ہو تو کوئی بات نہیں، ہم تم پر زبردستی اپنی مرضی مسلط نہیں کرنا چاہتے۔“

”نہیں انکل!“ میں فوراً قطعیت سے بولا۔ ”اگر میں نے گواہی نہ دی تو اس صورت میں میرے  
پر بوجھ ضرور پڑے گا۔ اور یہ ایک بے گناہ اور معصوم بچی کا قتل ہے۔ اگر آپ مجھ سے نہیں بھی کہتے

نہیں کہ ہاتھوں مجبور ہو کر خود اس کی گواہی دینے عدالت پہنچ جاتا اس لئے آپ اپنے دل پر کسی قسم کا  
بوجھ نہ لیں۔“  
”بیٹا! تم نے واقعی میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔“ میرے لپے کی سنجیدگی اور قطعیت نے انکل نظر  
حیات کو بہت متاثر کیا تھا۔

”انکل! پیشی کب ہے؟“ میں نے اچانک پوچھا۔  
”کل گیارہ بجے۔“ اس بار نگینہ کے چپا انکل شاہ میر بولے۔

”ٹھیک ہے..... میں صبح ساڑھے دس بجے عدالت پہنچ جاؤں گا۔“ میں نے ٹھوس لپے میں کہا۔  
”بہت شکریہ بیٹا! اب ہم چلیں گے۔“ انکل نظر حیات نے کہا اور اٹھنے لگے تو میں نے انہیں روکنا

پاپا لیکن وہ لوگ خاصی جگت میں نظر آ رہے تھے۔ مجھے فضل چاچا پر غصہ آ رہا تھا کہ انہوں نے ابھی تک  
ہاتھوں کے لئے چائے وغیرہ سرو نہیں کی تھی۔

”بیٹھیں انکل! کچھ کھانپ کر تو جائیں..... آخر کو پہلی بار آئے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے فضل چاچا کو  
آواز دینا چاہی تو انہوں نے مجھے روک دیا۔

”نہیں بیٹا! اپنا ہی گھر ہے، کیس جیتنے کے بعد ہم باقاعدہ کھانا کھانے آئیں گے۔ سمجھو، ہماری دعوت  
تم پر اُدھار رہی۔“

اس کے بعد میں انہیں چھوڑنے باہر نک آیا۔ کن انکھیوں سے نگینہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف  
ی دیکھ رہی تھی۔ اس لمحے جانے کیوں مجھے وہ کچھ مضطرب سی نظر آئی۔

ان کے جانے کے بعد میں غصے سے بھرا ہوا اندر آیا اور سامنے فضل چاچا کو کھڑے پایا تو میرا غصہ دو  
اقتہ ہو گیا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی سخت ناگوار لپے میں بولا۔

”بابا! میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنی اوقات بھول جاؤ۔“ میرے  
سخت جملوں پر انہوں نے بڑی کرب انگیز نظروں سے میری طرف دیکھا تھا مگر کچھ بولے نہیں۔ مجھے ان

کی دھڑکنی پر مزید غصہ آ گیا۔  
”کیا تمہیں اتنی بھی تیز نہیں رہی ہے کہ کوئی مہمان آتا ہے تو اسے چائے پانی کو پوچھا جاتا ہے؟“

”وہ مہمان نہیں، ہمارے دشمن تھے۔“ فضل چاچا نے ساٹ لپے میں کہا۔  
”فضل چاچا!“ میں نے بھنا کر کہا۔ ”تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے مہمانوں کو دشمن کہنے کی؟“

”نادر بیٹا! اپنے دشمنوں کو پہچاننے کی کوشش کرو۔“ وہ بڑے دکھ بھرے لپے میں بولا۔ ”اور یہ کیا، تم  
نے بڑے صاحب اور بی بی جی کے خلاف کل عدالت میں ان کے کہنے پر گواہی دینے کا بھی فیصلہ کر لیا

ہے؟“ ان کی بات نے جیسے جلتی برتیل کا کام کیا۔  
”میں انہیں قہر آلود نظروں سے گھور کر دہشتی سے بولا۔ ”فضل چاچا! تمہیں ہماری باتیں سننے کی جرأت

کیسے ہوئی؟..... اور تم کون ہوتے ہو، میرے معاملے میں ٹانگ اڑانے والے، میری مرضی.....  
میں کچھ بھی کروں۔“

”نادر بیٹے! تم کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو۔ خدا کے لئے اپنوں کو اور دشمنوں کو پہچانو۔ میں نے  
اس گھر کا ٹنگ کھایا ہے۔ میں اسے تباہ و برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔“ ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یہ حقیقت تھی کہ فضل چاچا ہمارے بہت پرانے خدمت گار تھے۔ انہوں نے ایک روز مجھے بتایا تھا کہ  
جب وہ میری عمر کے تھے اور اپنے بیمار بوڑھے والدین کا واحد سہارا تھے تو میرا باپ قادر خان ان کی مدد



سکراہٹ ابھری اور وہ متاسفانہ لہجے میں بولے۔

”جی تو غلطی ہوئی تھی تمہارے ماموں سے کہ انہوں نے تمہاری ماں کے اصرار کے باوجود تمہیں اب اصل حقیقت سے آگاہ نہیں کیا تھا اور بالآخر بی بی جی (ماں شینہ) کا یہ خیال درست ثابت ہوا کہ ان کے دشمنوں نے تم سے بڑی مکاری کے ساتھ راہ و رسم استوار کی اور آخر کار تمہارے دل و دماغ میں بی بی جی اور ماموں حیدر گل کے خلاف زہراٹھیلنے میں کامیاب ہو گئے۔“

”بی بی جی اور ماموں حیدر گل کی بات ایسی تھی جس نے ایک لمحے کو مجھے ذرا چونکے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے مجھے بھی جوش آ گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے فضل چاچا سے انکل ماہ میر اور نظر حیات سے سنی ہوئی وہ ساری کریہہ حقیقت گوش گزار کر دی کہ کس طرح میری ماں نے بے باک بے گناہ خون کیا تھا۔

میری بات سن کر ان کا چہرہ یکدم سرخ ہو گیا۔ آنکھوں سے شدید کرب کے ساتھ غیظ کی چنگاریاں نکلنے لگیں مگر پھر دوسرے ہی لمحے تحمل لہجے میں مجھ سے بولے۔

”تم ایک بڑے لکھنو جوان ہو۔ کیا تمہیں یہ زیب دیتا ہے کہ تم اپنی پاک دامن ماں پر لگائے گئے ان دونوں مردود شیطانوں کے ان گھٹیا الزامات کو سچ مان لو؟ کیا..... کیا تمہاری رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو نے اتنی بھی غیرت نہ کی کہ تم اصل حقیقت کا کھوج لگانے کی جستجو کرتے۔“

”فضل چاچا! کیا تم نہیں جانتے کہ میرے دل و دماغ میں تو بچپن سے ہی یہ سوال گردش کرنے لگے تھے کہ آخر میری ماں جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنے کس جرم کی سزا بھگت رہی ہے؟ مگر مجھے کسی نے کچھ نانے کی کوشش نہیں کی بلکہ میں نے تو تم سے بھی اس سلسلے میں پوچھنا چاہا تھا لیکن تم بھی مجھے کچھ بتانے سے قاصر ہی رہے تھے۔“ میں نے انہیں یاد دلایا۔

”تمہیں یہ بتانے کی بہت سی وجوہات تھیں۔“ فضل چاچا نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ”اگرچہ تمہاری اس یہی چاہتی تھی اور اکثر اپنے بھائی حیدر گل سے اصرار بھی کرتی رہتی تھی کہ تمہیں ماضی کی اس خوں رنگ داستان سے ضرور آگاہ کر دیا جائے تاکہ تمہاری رگوں میں دوڑتے ہوئے غیرت مند باپ کا لہو جوش اڑے اور کھولتے ہوئے لاوے کی طرح دشمنوں پر آگ اور خون کی بارش کر دو۔ لیکن تمہارے ماموں حیدر گل نے اپنی بہن کی یہ بات نہ مانی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمہارا ماموں حیدر گل نہیں چاہتا تھا کہ ماضی کی اس خونی داستان کے چھینے تمہاری زندگی اور تمہارے مستقبل پر پڑیں۔ وہ خود دشمنوں سے اپنی بہن اور اس کے شوہر (قادر خان) کا انتقام لینا چاہتا تھا اور وہ یہ سب دردوں خانہ کر رہا تھا۔ مجھے اس کا ضرور اعتراف تھا لیکن نادر بیٹا! یہ بھی حقیقت ہے کہ تمہارا ماموں حیدر گل تم سے بہت محبت کرتا ہے، تمہیں بچائے اپنے سر لے لیا اور ان کی خاموشی کی بھی یہی وجہ تھی کہ وہ تمہیں اس لئے اصل حقیقت سے آگاہ نہیں کرنا چاہتے تھے تاکہ تم ایک آزاد اور خوشگوار زندگی گزارو۔“

”اصل حقیقت کیا ہے بابا! اب تم بتاؤ۔“ میں نے سناتے ذہن کے ساتھ پوچھا۔

”ہاں..... اب شاید مجھے اپنی بی بی جی اور بڑے صاحب کی نافرمانی کرنا ہی پڑے گی۔ کیونکہ تم نے عزالت میں ان کے خلاف گواہی دینے کے لئے پیش ہونے والے ہو۔“

”فضل چاچا نے عجیب اسرار بھرے لہجے میں کہا اور پھر لمحے بھر کے توقف کے بعد ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

کیا کرتا تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فضل چاچا نے ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی گویا ”گرین لائٹ“ کے ٹیکنوں کی خدمت گزاری کے لئے وقف کر دی تھی۔ میں نے بہ غور فضل چاچا کے چہرے کی دیکھا اور جی سے بولا۔

”فضل چاچا! تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے بڑے صاحب اور بی بی جی نے کون سا گناہ ناجرم کیا ہے؟“

”یہ دشمنوں کی سازش ہے.....“

وہ بولے ہی تھے کہ میں نے درمیان میں استہزائیہ قہقہہ بلند کیا، پھر انہیں ساری بات بتا دی کہ

طرح ہم نے ماموں حیدر گل کی وہ بات سن لی تھی جب وہ اپنے خاص دوست ملک سردار خان کی ریغالی لڑکی (صدف حیات) کو قتل کرنے کی ہدایات دے رہے تھے اور بعد میں، میں یہی سمجھا تھا کہ ریغالی لڑکی نہیں لگینہ نہ ہو..... اس لئے جب میں ملک سردار خان کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچا

غفور نامی ایک کارندہ اس لڑکی (صدف) کا گلا دبوچ کر اسے ختم کر چکا تھا۔

میری بات پر فضل چاچا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”کیوں فضل چاچا! اب کیا کہتے ہو اپنے بڑے صاحب اور بی بی جی کے کالے کرتوتوں کے بارے میں؟..... کیا میں یہ کانوں سی اور آنکھوں دیکھی حقیقت جھٹا سکتا ہوں؟..... کبھی نہیں۔“

میں نے ان کے گنگ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ وہ چند لمحے ساک

سامت کھڑے مجھے دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر کی اترنے لگی تھی۔ پھر وہ ہمارے

میں بولے۔

”ہاں..... اگر یہ سچ ہے تو بڑے صاحب جی اور بی بی جی کو یہ ہرگز نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لگتا ہے کہ

بیٹا! میں بھی بڑے صاحب (ماموں حیدر گل) کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ انہوں نے یقیناً اتنا بولا۔

رحمانہ قدیم بی بی جی (ماں شینہ) کے کہنے پر ہی مجبوراً اٹھایا ہو گا۔“

”فضل چاچا! اب کچھ بھی ہو، وہ دونوں مجرم ہیں اور انہیں ان کے کئے کی سزا ضرور ملنی چاہئے۔“

”نادر بیٹا!..... ایک بات بتاؤ۔ کیا تم نے بھی یہ سوچا تھا کہ تمہاری ماں نے اپنی ساری جوانی اسے

کی سلاخوں کے پیچھے کس جرم میں گزار دی؟“ انہوں نے اچانک عجیب لہجے میں پوچھا۔

”کیوں بابا! کیا تم نہیں جانتے؟..... آخر کو تم ہمارے پرانے نمک خوار ہو۔“ میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”ہاں..... میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہاری ماں نے ایک ناکردہ جرم میں اپنی ساری

جیل میں گزار دی..... اور تم جانتے ہو یہ کس کی سازش تھی؟ تمہاری ماں کو کس نے بے گناہ عمر

سزا میں جھونک دیا تھا۔ تو سنو، وہ یہی دو شیطان نظر حیات اور شاہ میر تھے۔“

فضل چاچا کا خیال تھا کہ میں اس بات پر چونک پڑوں گا۔ مگر مجھے تو اصل حقیقت کا علم تھا اس

میں بدستور ساٹ نظروں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

”مجھے اگرچہ اس راز سے پردہ اٹھانے کی سختی سے ممانعت کی گئی تھی لیکن شاید ہم سے یہیں غلطی

کہ تمہیں اس راز سے لاعلم رکھا گیا۔“ ان کی آواز اب مرتش ہو رہی تھی۔

”میں سب جانتا ہوں بابا! اور یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے تم لوگوں نے آج تک اس

راز سے کیوں لاعلم رکھا، تاکہ میں ماں اور ماموں حیدر گل کے کالے کارناموں کی اصل حقیقت

سکوں۔“ میں نے جی سے کہا تو فضل چاچا قدرے چونک کر میرا چہرہ دیکھنے لگے۔ پھر ان کے چہرے

نیک اور شوہر پرست عورت تھی۔ مگر وہ یہ داغ آج تک نہیں بھولی ہے اور اس لرزہ خیز داستان کو مجبوراً زبان پر لانے کا میرا مقصد بھی یہی تھا کہ ہمیں اصل حقیقت کا علم ہو جائے تاکہ جو زہر ان دونوں شیطانوں نے نظر حیات اور شاہ میر نے تمہارے وجود میں اتارا ہے، اسے تم کاٹ سکو۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ میرے اندر زبردست شکست و ریخت کا دھنساؤ تھا۔ فضل چاچا کی بات میں جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ وہ ہمارے خاندان کا پرانا نمک خوار اور مدت گزار تھا۔ یہ سب سن کر میری عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے یہ مشکل اپنے اندر کے اہل پر قابو پاتے ہوئے ایک آخری سوال فضل چاچا سے کیا۔

"بابا! کیا ان ساری باتوں کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا ہمارے پاس؟..... کیا قانون اتنا ہی اندھا ناکر اس نے ایک بے گناہ عورت کی جوانی کے پچیس سال جیل کی کال کوٹھڑی میں دھکیل دیئے جو پہلے ان اپنے شوہر کے بیہانہ قتل کے غم میں ادھ موٹی ہو رہی تھی۔

"نادر بیٹا! قانون اندھا ہوتا ہے۔" فضل چاچا نے جی سے کہا۔ "وہ صرف شوہاد اور گواہوں کی سنتا ہے، مظلوم کی نہیں..... اور یہ شوہاد اور گواہ حاصل کرنا نظر حیات اور شاہ میر جیسے دولت مند اور اثر و رسوخ والے شیطانوں کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ بے چارے حیدر گل نے حقائق سامنے لانے کے لئے اپنی سی جدوجہد کی تھی لیکن نظر حیات اور شاہ میر جیسے درندوں کے سامنے اس بے چارے کی بھلا کیا حیثیت تھی؟ مگر پھر بھی حیدر گل نے کسی طرح تمہارے باپ قادر خان کی لاش کو قبر سے نکال کر اس کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کروایا تھا جس سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ قادر خان کی موت پیٹ میں لگنے والے جاتو سے نہیں بلکہ زہر خورانی کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ آؤ بیٹا! میں تمہیں وہ اصل رپورٹ دکھاؤں۔" یہ کہہ کر انہوں نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا کہا اور میں گم صم سا ان کے عقب میں ہو لیا۔

وہ مجھے ماموں حیدر گل کے کمرے میں لے کر آ گئے۔ پھر انہوں نے اپنی قمیض کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا، ایک قد آدم اپنی الماری کو کھولا۔ اس کے اندر ایک چوکور سیف نصب تھا۔ انہوں نے اسے کھولا اور ایک کوئٹہ کا نغذ میرے حوالے کر دیا۔

یہ میڈیکل ایگزامینر کی دستخط شدہ پوسٹ مارٹم رپورٹ تھی۔ جس میں آج سے پچیس سال پرانی تاریخ بھی درج تھی۔ اس میں یہی لکھا تھا کہ قادر خان کی موت کی اصل وجہ وہ زہر تھا جو اسے کھانے میں لاکر دیا گیا تھا اور کیونکہ خوراک میں لے زہر کی وجہ سے فوراً ہی میرے باپ کی موت واقع ہو چکی تھی اس لئے کچھ عرصہ بعد دوبارہ لاش کو قبر سے نکالنے کے بعد بھی خوراک کے ذرات نظام انہضام کے معطل ہونے کی وجہ سے جوں کے توں موجود تھے۔

"بابا! پھر ماموں حیدر گل نے یہ اصل رپورٹ عدالت کے سامنے کیوں نہیں پیش کی؟" میں نے اُلجھ کر فضل چاچا سے پوچھا۔

"حیدر گل نے ایسا ہی کیا تھا۔" وہ بولے۔ "لیکن اس اصل رپورٹ کو جعلی قرار دے کر جھٹلا دیا گیا۔ اس کے اگلے ہی روز جس میڈیکل ایگزامینر نے یہ رپورٹ دی تھی، اسے بھی خرید لیا گیا جس نے عدالت میں حیدر گل کے خلاف یہ بیان دیا تھا کہ اس کے جعلی دستخط سے یہ رپورٹ جاری کی گئی ہے۔ حیدر گل کو بھی عدالت کے ساتھ دھوکا دہی کے جرم میں تین سال قید کی سزا بھگتنا پڑی۔"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ میرا ذہن بری طرح سائیں سائیں کر رہا تھا۔ صورت حال کی یوں جانک کا کیا کلپ نے میرے دماغ کو بھی الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔

"نادر بیٹے! یہ آج سے پچیس سال پہلے کی بات ہے، تمہارا باپ قادر خان اور تمہاری ماں شوہر خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان دنوں تمہارا ماموں حیدر گل جنگل کا چوکیدار تھا اور قادر خان ایک چھوٹے سے ٹال کا مالک۔ انہی دنوں ان دونوں بد خصلت شیطانوں، نظر حیات اور شاہ میر نے قادر خان ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کئے۔ نظر حیات سرکاری ٹھیکے دار تھا۔ وہ جنگلاتی لکڑیوں کے ٹھیکے لیا کر اور شاہ میر گیم وارڈن (فارسٹ آفیسر) تھا۔ یہ دونوں بد خصلت غیر قانونی طور پر درختوں کی کٹائی اسے چور دروازے سے فروخت کرنے کے جرم میں ملوث تھے۔ حیدر گل کو ان کی غیر قانونی سرگرمی کے بارے میں علم تھا اور وہ اشاروں کنایوں میں اپنے بہنوئی قادر خان کو بھی ان دونوں شیطانوں دور رہنے کی نصیحت کرتا رہتا تھا مگر قادر خان ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا۔ ایک روز نظر حیات اور شاہ میر پورے سو درختوں کی غیر قانونی کٹائی کا ارادہ کیا مگر اسے فروخت کرنے کے سلسلے میں انہوں نے قادر خان سے اس کا ذکر کیا۔ قادر خان چونکہ ایک شریف اور ایماندار شخص تھا، اسے ان جنگلوں اور مرغزاروں سے بہت پیار تھا۔ اس نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ ان دونوں کو بھی سرزنش کی کہ وہ اس خوبصورت وادی کو اتنے بیش قیمت درختوں سے محروم نہ کریں۔ مگر وہ دونوں نہ مانے۔ یہ بات قادر خان بھی جانتا کہ وہ دونوں اپنی اس حرکت سے باز نہیں آئیں گے۔ لہذا اس دن سے اس نے ان کے اس "مظہر" غیر قانونی اقدام سے باخبر رہنے کے لئے ٹوہ لینا شروع کر دی اور بالآخر عین وقت پر اس نے جنگلات کے حکام بلا کو خبر کر دی۔ نظر حیات اور شاہ میر کے خلاف اکٹواری ہو گئی مگر انہوں نے کچھ دلا کر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ لیکن انہوں نے قادر خان کو سزا دینے کی ٹھان لی۔ یوں بھی قادر خان ہوتے ہوئے وہ اپنی بھرمانہ سرگرمیاں انجام نہیں دے پا رہے تھے۔ ان دونوں مکاروں نے تمہارے باپ قادر خان سے معافی مانگی تاکہ اس سے پھر دوستی استوار ہو سکے۔ قادر خان بھی بے چارہ سادہ انسان تھا۔ وہ ان کی چال میں آ گیا۔

پھر ایک روز ان دونوں نے قادر خان اور شہینہ کو اپنے سرکاری ریست ہاؤس میں دعوت پر بلانے میں اسے زہر ملا کر دے دیا۔ پھر دونوں شیطانوں نے شہینہ کی عزت لوٹنے کی بھی کوشش کی۔ آفرین ہے شہینہ پر کہ اس نے اپنی عزت پر آج تک نہ آنے دی۔ وہ ایک بہادر پہاڑی عورت تھی۔ جانے کس طرح اس کے ہاتھ ایک پھل کانٹے والی چھری لگ گئی۔ اس نے نظر حیات کے گھونپے کوشش کی مگر ان دونوں شیطانوں نے شہینہ کی کٹائی والا ہاتھ مروڑ کر اس کے ہاتھ سے وہ چھری بے ہوشی سے قادر خان کے پیٹ میں گھونپ دی۔ شہینہ اس صدمے کے باعث وہیں بے ہوش ہو گئی اور یوں میں نظر حیات اور شاہ میر نے بڑی چالاکی کے ساتھ شہینہ کو اس کے شوہر قادر خان کے قتل کے جرم پوئیس کے ہاتھوں گرفتار کروا دیا اور پولیس کو شاہ میر نے شہینہ کے خلاف شرمناک بیان دیئے ہوئے گواہی دی کہ شہینہ درحقیقت نظر حیات کی طرف ملوث تھی اور اسی کی خاطر اس نے اپنے شوہر قادر خان کو قتل کیا۔ شہینہ بے چاری ایسا شرمناک اور بھیماک الزام سن کر سکتے میں آ گئی اور بعد میں عدالت اسے فرار واپسی سزا سناتے ہوئے پھانسی کی سزا دی جو بعد ازاں عمر قید میں بدل گئی۔"

فضل چاچا اتنا کہہ کر خاموش ہوئے تو ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ وہ پھر لڑیہ لہجے میں بولے۔

"نادر بیٹا! یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں نے کس طرح اپنے سینے پر پتھر رکھ کر یہ خونی داستان سنائی ہے۔ مگر آج مجبور ہو کر مجھ کی کمین کی زبان پر یہ راز آ گیا لیکن میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر

شاید ذہنی غلبان سے گزر رہا تھا اور بری طرح اعصاب زدہ ہو رہا تھا۔  
میں وہیں مسہری پر ہی دراز ہو گیا اور خود کو پرسکون کرنے کے لئے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اور یوں کئی  
منوں تک خالی الذہنی کے عالم میں مسہری پر لیٹا رہا۔

منوں تک کھانے پر فضل چاچا نے مجھے گھایا۔ مگر مجھے بھوک بالکل نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اب میں  
دوپہر کے پھر اس کڑے فیصلے کے بل صراط سے گزر رہا تھا کہ مجھے اگلے دن کورٹ میں اپنی ماں اور ماموں  
پر عمل کے خلاف گواہی دینی چاہئے یا نہیں؟  
بالآخر میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

میں کورٹ میں اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف گواہی دینے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ ہاں، کچھ  
سہمی، ان دونوں نے بہر حال معصوم اور بے گناہ صدف کے قتل کے جرم کا ارتکاب کیا تھا اور مجھے ایک  
بے دار اور اچھے شہری ہونے کے ناتے اپنا فرض ضرور نبھانا چاہئے تھا۔ لیکن میں ایسا کیوں کرنا چاہ رہا  
تھا؟ آخر مجھے فضل چاچا کی اس بات پر کیوں نہیں یقین آ رہا تھا کہ میری ماں نے مجرم کی حیثیت  
نہیں بلکہ ایک بے گناہ اور مظلوم کی حیثیت سے اپنے ناکردہ جرم کے پچیس سال جیل کی کال کھڑی  
کر دے دیے تھے۔ کیا اس میں میری خود غرضی شامل نہ تھی؟..... کیونکہ میں شاہ میر کی اکلوتی بیٹی تھیں  
میں نے موت کرنا تھا۔ کیا..... کیا گنہگار کی محبت نے میرا خون اس قدر سفید کر دیا تھا کہ میں اپنی ماں اور  
میں کا دشمن بن گیا تھا اور..... اور کیا یہی سبب تھا کہ میں چاچا فضل کی بات ماننے پر تذبذب کا شکار  
ہو گیا؟ یہ سوچ سوچ کر میرے دماغ کی رگیں پھٹنے کے قریب ہونے لگیں۔ میں نے بہ مشکل اپنی تباہ حال  
لیفیات پر قابو پاتے ہوئے خود کو تسلی دینا چاہی۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ میرے باپ قادر خان کا اصل قاتل  
کون تھا؟

فضل چاچا نے آہستگی کے ساتھ میرے ہاتھ سے وہ کوئٹہ کاغذ لے کر دوبارہ سیف میں رکھا  
الماری کو بند کر کے وہ خاموش کھڑے ہو گئے۔ مجھے اپنی ٹانگوں سے جان لگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔  
میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟..... میں یہ دقت تمام اپنے وجود کی شان سے  
عمارت کو کھینچنے ہوئے مسہری کے قریب لایا اور یکدم گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔

سوچوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ ایک شوریدہ سر طوفان تھا جو میرے اندر اٹھ رہا تھا۔  
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کہانی کو جھٹلاؤں؟..... اس کہانی کو جو شاہ میر اور نظر حیات نے مجھے  
تھی یا پھر فضل چاچا کی کہانی کو جو اس نے پوسٹ مارٹم کی اصل رپورٹ کے ساتھ میرے گوش گزار کی تھی  
مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں ایک بار پھر فضا میں طلق ہو گیا ہوں۔ جھوٹ اور سچ کے دو جھوٹے  
پاٹوں والی جگہ میں پس رہا ہوں۔ کون سچا تھا؟ کون جھوٹا تھا؟..... لیکن چاچا فضل جھوٹ نہیں بول سکتے  
تھے۔ پھر مجھے ان کی بات ماننے میں تاہل کیوں تھا؟ انکل شاہ میر نے جو خوبی داستان سنائی تھی، کیا وہ  
جھوٹی تھی؟ مگر انہوں نے تو مجھ سے خود کہا تھا کہ پہلے میں یہ داستان اپنی ماں شبنم سے یا ماموں حیدر  
کی زبانی سنوں۔ اگر وہ جھوٹے ہوتے تو پھر کیوں وہ مجھ سے اتنے یقین کے ساتھ ایسا کہتے؟ اگر  
حیات اور شاہ میر کو میری ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف ورغلا نا مقصود ہوتا تو وہ اس روز ہی ایسا  
سکتے تھے جب ان لوگوں کو مجھ پر شک ہوا تھا کہ میں درون خانہ ان سے انتقام لینے کی کوشش کر رہا تھا۔  
انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔

”کیا سوچنے لگے نادر بیٹا.....؟“ مجھے سوچوں میں غلطیاں پا کر اچانک فضل چاچا نے مجھے مخاطب  
کر کے پوچھا۔  
”بابا! اگر یہ بات ہوتی تو پھر شاہ میر اور نظر حیات نے مجھے پہلے یہ سب کیوں نہ بتا دیا؟“ میں نے  
قدرے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا تو ان کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ عود کر آئی اور پھر وہ اسی لہجے  
میں بولے۔

”وہ دونوں بہت شاطر اور مکار انسان ہیں بیٹا! وہ پہلے اپنی بات میں اس طرح وزن پیدا کرنا چاہتے  
تھے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے بعد میں تمہاری باتوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی ہو کہ تمہیں واقعی  
تک تمہاری ماں اور ماموں حیدر گل نے ماضی کے اس تلخ راز سے لاعلم رکھا ہے اور تمہارے اصرار کے  
باوجود جب کچھ بھی نہیں بتایا تو ان دونوں نے اپنا اعتبار قائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے تمہیں سب  
سے پہلے یہ خونی راز تمہاری ماں اور ماموں حیدر گل سے ہی پوچھنے پر زور دیا۔ انہوں نے شاید اس بات  
اندازہ لگا لیا تھا کہ تمہاری ماں اور ماموں حیدر گل کسی مناسب وقت کے انتظار سے قتل تمہارے علم میں  
خونی راز نہیں لاسکتے تھے۔“

بابا اتنا کہہ کر خاموش ہوئے تو میں نے اپنا سر تھام لیا۔ فضل چاچا نے آہستگی کے ساتھ میرے شانہ  
پر اپنا ہاتھ دھرا اور آرزو ہی آواز میں بولے۔

”نادر بیٹا! کیا تمہیں ابھی تک میری باتوں پر یقین نہیں آیا؟..... کیا تم نے وہ پوسٹ مارٹم کی اصل  
رپورٹ نہیں دیکھی؟“

”بابا! میری سمجھ میں اس وقت کچھ نہیں آ رہا۔ خدا کے لئے مجھے ابھی تہا چھوڑ دو..... تہا چھوڑ  
مجھے۔“ میں گہرے دکھ اور کرب کے احساس سے مغلوب ہو کر بولا۔ فضل چاچا خاموشی سے سر جھکا  
کمرے سے باہر نکل گئے۔ میرا دماغ اس قدر جھنجھکا گیا تھا کہ میں کوئی ایک فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

”بابا! ایک بات بتاؤ، ماں کی بے گناہی اپنی جگہ لیکن کیا انہوں نے ایک معصوم لڑکی کی جان لے کر  
ایک جرم کا ارتکاب نہیں کیا؟ جس کا میں خود چشم دید گواہ ہوں۔“ ان کے کرسی پر بیٹھنے ہی میں نے یہ  
اور ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، پھر وہ ہلے سے بولے۔  
”بیٹا! تم یہ بھی تو سوچو کہ نظر حیات اور شاہ میر نے تمہارے باپ کا قتل بھی تو کیا تھا۔ اور جی نہیں،

لیکن کیوں.....؟“ اچانک میرے ذہن میں ایک دھماکہ ہوا۔  
”انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا؟..... ضرور اس جرم کے پیچھے کوئی انتقامی جذبہ ہی کارفرما تھا۔ نیز یہ  
ماں کیا واقعی اپنے ناکردہ جرم کا بدلہ نظر حیات اور شاہ میر سے لینا چاہتی تھی؟“  
یہ وہ عوامل تھے جو مجھے ایک لمحے کے لئے یہ سوچنے پر مجبور کئے ہوئے تھے کہ فضل چاچا کی بات غلط  
میں ہو سکتی۔ لیکن باوجود اس کے میں اپنے فیصلے سے شرف نہیں ہوا تھا۔  
فضل چاچا جب دودھ کا گلاس میرے لئے لے کر کمرے میں آئے تو انہوں نے بہ غور میرے چہرے  
کی طرف دیکھا اور بولے۔

”بیٹا! تم نے آخر کیا فیصلہ کیا؟“  
میں نے خاموشی سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر دودھ کا گلاس ان کے ہاتھ سے لے کر بیڈ  
پر لیٹ گیا۔

”بابا! ایک بات بتاؤ، ماں کی بے گناہی اپنی جگہ لیکن کیا انہوں نے ایک معصوم لڑکی کی جان لے کر  
ایک جرم کا ارتکاب نہیں کیا؟ جس کا میں خود چشم دید گواہ ہوں۔“ ان کے کرسی پر بیٹھنے ہی میں نے یہ  
اور ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، پھر وہ ہلے سے بولے۔  
”بیٹا! تم یہ بھی تو سوچو کہ نظر حیات اور شاہ میر نے تمہارے باپ کا قتل بھی تو کیا تھا۔ اور جی نہیں،

لیکن مجھے یاد تھا کہ ماموں اس سلسلے میں اپنی بہن کی بات نہیں مانا کرتے تھے۔ ماں مجھے درس انتقام دینا چاہتی تھی لیکن ماموں حیدر گل مجھے پڑھنے لکھنے کی طرف متوجہ کئے ہوئے تھے۔ اب مجھے رنر رنر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے اندر کی الجھنیں سلجھنے لگی تھیں۔ وہ گرہیں جو مجھے اندر سے اب تک بے چین کئے ہوئے تھیں، اب وہ دھیرے دھیرے کھلنے لگی تھیں۔ مجھے میرے سارے سوالوں کے جوابات سننے سے ملنے لگے تھے اور جن کی چابی اور حقانیت کی گواہی پہلی بار میرا دل بھی دے رہا تھا۔

”نادر بیٹا! سانچ کو آج نہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ جب تمہیں اصل حقیقت کی چابی کا ضرور علم ہو گا۔ لیکن میں ڈرتا ہوں بیٹا! کہیں ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے۔“

فضل چاچا نے عجیب سے لرزیدہ لہجے میں کہا اور آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی جانے کیا بات تھی کہ ایک اکیلی میرا پورا وجود جیسے ہلکا چھلکا ہو گیا۔ میرے دل و دماغ سے گرد آلود خیالات کی کثافت جیسے اب خود بہ خود دھلنے لگی تھی۔ کوئی ان جانا سا بوجھ تھا جو میرے سینے سے سرکتا ہو محسوس ہو رہا تھا۔

میرا دل اور ذہن جو کچھ دیر پہلے زبردست تضادات کا شکار تھے، اب جیسے دونوں یکجا ہونے لگے تھے اور شاید یہی سبب تھا کہ میں خود کو ایک اکیلی ہلکا چھلکا محسوس کرنے لگا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے اگلے دن کورٹ میں حاضر ہونے کا ارادہ ملتوی نہیں کیا تھا۔

\*\*\*

دوسری صبح میں جلدی جاگ گیا تھا۔ ہلکا چھلکا ناشتہ وغیرہ کر کے فارغ ہوا اور پونے گیارہ بجے میں کورٹ پہنچ گیا۔

بمقامے میں ہی مجھے شاہ میر، نظر حیات اور ان کا بیٹا کبیر احمد وکیل کے ہمراہ نظر آ گئے۔

\*\*\*

مقدمے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ مجھے استفسار کی جانب سے بہ طور گواہ پیش کیا گیا تھا۔ استفسار نے بڑے حلق اٹھانے کے بعد پوچھا۔

”نادر علی خان! تم نے دو سحے کی رات کو کیا سنا اور کیا دیکھا تھا؟“

میں نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پایا اور جج صاحب کی طرف دیکھ کر لہجے کو متحمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”جج صاحب! سامنے طریموں کے کٹھرے میں کھڑی یہ عورت میری ماں ہے۔ شاید یہ بات آپ سب کو معلوم ہو اور معزز عدالت کے ریکارڈ میں بھی موجود ہو۔ لہذا میں کوئی گواہی دینے سے قبل معزز عدالت سے یہ سوال کروں گا کہ آج سے پچیس سال پہلے جب میری ماں کو اس کے شوہر کے قتل کے الزام میں سزائے موت سنائی گئی اور جو بعد میں عمر قید میں بدل دی گئی تھی، کیا وہ فیصلہ انصاف پر مبنی تھا؟“

میرے سوال پر جیسے بھری عدالت کو سانس سونگھ گیا۔ کمرہ عدالت میں بیٹھے شاہ میر اور نظر حیات سمیت وکیل استفسار کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا۔ کیونکہ میرا یہ سوال ان کے لئے ہی نہیں، بلکہ میری ماں، ماموں حیدر گل اور وکیل صفائی کے لئے بھی سراسر غیر متوقع تھا۔

آج سے پچیس سال پہلے کے اس کیس کا مقتولہ صدف حیات کے قتل سے کیا تعلق ہے؟“ وکیل استفسار دانت پیس کر مجھ سے بولا۔

”تعلق ہے وکیل صاحب.....!“ میں نے پُر زور لہجے میں کہا۔

انہوں نے یہ جرم بڑے شرمناک الزام کے ساتھ تمہاری ماں کے سر قھوپ دیا جس کی وجہ سے اس چاری کو دو ہرے کرب اور سزا سے گزرتا پڑا۔ جبکہ تمہارے باپ کے وہ دونوں قاتل اب تک زندہ ہیں۔ تم ایک الم نصیب عورت کے کرب کا کس طرح اندازہ لگا سکتے ہو، جس نے بے گناہ ہوتے ہوئے دوہری سزا بھگتی۔ اسے جوانی میں بیوہ کر دیا گیا۔ پھر عمر قید کی سزا بھی بھگتنا پڑی۔ اور اس کی زندگی دکھوں اور آلام کے سپرد کرنے والے شاہانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔“

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئے پھر مجھ پر ایک جوش بھری نظر ڈالتے ہوئے پُر پیش لہجے میں بولے۔

”نادر! تم مجھے ایک بات بتاؤ، اگر تمہیں اس بات کا یقین واثق ہو جائے کہ نظر حیات اور شاہ میر نے تمہارے باپ کا قتل کیا اور بعد میں ایک گھناؤنی سازش کے ذریعے تمہاری ماں کو بھی ساری عمر لئے بے گناہ داخل زندان کر ڈالا اور تم اپنے دشمنوں کے خلاف کوئی قانونی کارروائی بھی نہ کر سکو کیا تمہارے پاس ان کے خلاف کوئی محسوس ثبوت بھی نہ ہو تو پھر تم ایسے میں کیا کرو گے؟“

ان کی اس مدلل گفتگو پر میں ایک لمحے کو خاموش ہو کر رہ گیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ فضل چاچا بات نے میرے سینے میں ایک الاؤ بھڑکا دیا تھا جس کی حدت میرے چہرے سے مترشح ہونے لگی۔ جس کی شدت بھانپ کر فضل چاچا فرط غیظ سے دوبارہ بولے۔

”میں جانتا ہوں بیٹا! کہ تمہاری رگوں میں ایک غیرت مند باپ کا خون ہی نہیں بلکہ ایک بہادر کے دودھ کا مان اور فخر بھی گردش کر رہا ہے اور انتقام کی جو آگ تمہاری بہادر اور باہمت ماں کے سوزاں میں بھڑک رہی ہے، اس سے زیادہ تم اس کی پیش اور جلن محسوس کرو گے۔“

”بس بابا! بس..... خدا کے لئے بس کرو۔“ میں اچانک شعلوں کی طرح بھڑکتے لہجے میں رپ بولا۔ ”اگر یہ سچ ثابت ہوا تو یقین کرو بابا! مجھے اپنے غیرت مند باپ کے خون ناحق کی قسم، میں اپنی نصیب ماں کے دودھ کا قرض ضرور چکاؤں گا اور میری زندگی کا مقصد ہی دشمنوں کا جینا محال کرنے سوا کچھ نہ ہوگا۔“

”یہی تمہارا ماموں حیدر گل نہیں چاہتا تھا۔“

اچانک فضل چاچا نے اسرار بھرے لہجے میں کہا۔ ان کے بشرے پر اب ایک گہری طمانیت تھی۔ میں قدرے چونک کر مستفسرانہ نظروں سے ان کا چہرہ نکلنے لگا، وہ بولے۔

”ہاں نادر بیٹا! تمہاری ماں کا قرض ایک غیرت مند بھائی کے ناتے حیدر گل نے ہی اپنے ذمہ لیا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں اس انتقام کی اندھی آگ میں جھونک دے۔ اس لئے کہ وہ حقیقی اولادوں کی طرح چاہتا ہے۔ وہ خود سارا بوجھ اپنے کانڈھے پر رکھے تمہیں اس آگ اور خون جنگ سے دور رکھنا چاہتا تھا تا کہ تم اپنی امنگوں بھری زندگی میں گن رہو اور اپنا روشن مستقبل بناؤ۔“

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئے پھر ایک گہری ہکاری لے کر مزید بولے۔ ”شاید ان کی خاموشی کی وجہ بھی یہی ہو۔“ وہ اتنا کہہ کر چپ ہوئے تو اچانک میرے ذہن کے پردے پر بچپن سے لے کر اب تک وہ تشنہ سوالات ابھرنے لگے جو میں ماموں حیدر گل سے ماں کے اور اس کے دردناک ماضی بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ ٹال دیا کرتے تھے اور میرا دھیان اپنی پڑھائی اور اپنا مستقبل بنانے پر زور دیا کرتے تھے۔ حالانکہ جب میں ان کے ساتھ ماں سے ملنے نیل جایا کرتا تھا تو ماماں ماں کو بھی ان سے یہ کہتے سنا تھا۔

”گل! تمہیں میرے سینے کی آتش انتقام سے میرے نادر کو ضرور آگاہ کرنا چاہئے۔“

”تو پھر تم معزز عدالت کو بتاؤ کہ مقتولہ صدف حیات کے قتل کے اصل محرکات کیا تھے؟“

”ان محرکات پر بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ قادر علی خان مرڈر کیس پر بھی کچھ بات کی جائے میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنجیدگی سے کہا اور وہ تھلا کر رہ گیا۔

”یور آؤ!..... میرا خیال ہے کہ گواہ نادر علی خان کا دماغ چل گیا ہے اور وہ اپنی ماں کو ملوہ والے کٹہرے میں دیکھ کر جذباتی ہو گیا ہے..... اور..... انصاف کے تقاضوں کی وجہیاں نکھیر ہوئے جانبداری برت رہا ہے۔“

”نچ صاحب نے وکیل استغاثہ کو میرے جواب دینے کا پابند کیا تو وکیل استغاثہ نے اپنی پیشانی نمودار ہوتی سینے کی ننھی ننھی سی بوندوں کو رو مال سے پونچھے ہوئے باریک سی آواز میں کہا۔

میرے موکل نظر حیات کی بیٹی مقتولہ صدف حیات کے قتل کا سبب پرانی دشمنی ہے۔“

”میرے فاضل دوست اس پرانی دشمنی کی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟“ وکیل صفائی نے بظاہر کے ساتھ کہا۔ وہ شاید وکیل استغاثہ کے گول مول سے جواب کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ اس کے ہا پر وہ ناگوار نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر نچ صاحب سے قدرے جھنجھلا کر بولا۔

”می لاؤ!..... وکیل صفائی، معزز عدالت کو اصل بحث سے ہٹا کر قیمتی وقت برباد کرنا چاہ رہے ہیں۔ ہرگز نہیں می لاؤ!“ وکیل صفائی نے کہا۔ ”بہی وہ اہم سوال ہے جس کا جواب دینے سے اس استغاثہ دانستہ کترانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ کیونکہ آگے چل کر وہ اس کا ذکر ضرور کریں گے۔

کیس کا یہی ایک بنیادی سوال ہے جس کے جواب سے معزز عدالت کو بہت کچھ اخذ کرنے میں آد مد ملے گی۔ کیونکہ میں اپنی باری پر عدالت کے سامنے ایک اہم گواہ پیش کرنے والا ہوں..... یقین ہے اس کی گواہی کے بعد بہت کچھ واضح ہو جائے گا۔“

وکیل صفائی کی اس اسرار بھری بات پر میں نے دیکھا کہ وکیل استغاثہ کچھ پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔

”استغاثہ بلا وجہ عدالت کا وقت برباد نہ کرے..... اس سوال کا جواب دے جو ان سے پوچھا ہے۔“ معانج صاحب نے استغاثہ کو سرزنش کرتے ہوئے جواب دینے کا پابند کیا تو مجبوراً استغاثہ مختصر آجتا بڑا کہ اس کے موکل نظر حیات کو ملوہ شبینہ، یعنی میری ماں پر اپنی بیٹی صدف حیات کے قتل یقین کی حد تک شبہ کی وجہ یہی ہے کہ آج سے پچیس برس قبل بقول ملوہ کے نظر حیات اور شاہ میر اس کے شوہر قادر علی خان (میرے بپ) کا قتل کرنے کے بعد یہ جرم اس کے سر ٹھوپ کر عمر قید کی دلوائی تھی۔ اور یوں اب وہ (میری ماں) اپنے بھائی حیدر گل (ماموں) کے ساتھ ان سے انتقام

رہی ہے۔ وکیل کے جواب پر میں نے ماں کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی تو وہاں شعلوں کی تپش ایک مٹا ہوا پھوار میں بدل گئی۔ جب کہ شاہ میر اور نظر حیات کے چہرے مسخ ہو چکے تھے۔

ادھر وکیل صفائی نے اجازت لے کر اپنے گواہ کو بلا لیا۔ اس اہم گواہ کو دیکھ کر فریقین بری طرح چونک گئے۔ خود مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا کہ میری ماں اور ماموں حیدر گل کے حق میں اہم گواہی دینے والی وہ شخصیت نگینہ بنت شاہ میر تھی۔ اٹھانے کے بعد نگینہ نے جو بیان دیا اس نے کیس کا پانسہ ہی پلٹ دیا۔

”نچ صاحب!..... نادر علی خان کو ایک گہری سازش کے ذریعے اس کی مالہ کے خلاف دغا دیا اس سے متفر کیا گیا۔ اس عورت کے دکھ کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے نچ صاحب! کہ اس بے چاری کو

جوانی میں نہ صرف بیوہ کر دیا گیا بلکہ ایک جموئے الزام میں الٹا اسے اپنی زندگی کے پچیس سال جیل کی کال کوفری میں گزارنے پڑے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آج سے پچیس سال پہلے اس عورت کے شوہر کا بھانسل اور بعد میں اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کرنے والے دو شیطان ہیں۔ ایک نظر حیات اور دوسرا شاہ میر جو بد قسمتی سے میرا باپ ہے۔

”نچ صاحب! میں نے کل رات اتفاق سے اپنے پیا شاہ میر اور ان کے دوست نظر حیات کی گفتگوں کی تھی جس سے مجھ پر ساری حقیقت آشکارا ہو گئی کہ انہوں نے اس عورت پر کیسا ظلم ڈھایا تھا۔ وہ صدف حیات کے خون کا بدلہ لینے کے لئے بے تاب تھے مگر اس بات سے بھی پریشان تھے کہ ان کے پچیس سال پرانے جرم کی فلعی نہ مکمل جائے۔ نادر کی اپنی ماں کے خلاف گواہی دینے کے فیصلے نے انہیں شیر کر دیا تھا اور وہ اپنی دانست میں یہ منصوبہ بنائے بیٹھے تھے کہ صدف کے قتل کے جرم میں ان بہن بھائیوں کو چابی ہو جائے گی اور نادر کو وہ خود راستے سے ہٹا دیں گے۔“

عدالت میں گہرا سناٹا طاری تھا۔ میری نظریں نگینہ کے چہرے پر انک کر رہ گئی تھیں۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ نگینہ نے اپنے باپ شاہ میر اور اس کے دوست نظر حیات کے مکروہ چہرے بے نقاب کر دیئے تھے اور اس نے میری ماں پر ہی نہیں بلکہ مجھ پر بھی احسان عظیم کیا تھا۔ میں اب تذبذب کی زنجیروں سے آزاد ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے پورے وجود میں کچھ ایسا ارتعاش محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹنے اور لاوا اگلنے سے پہلے بری طرح لرزیدہ ہوتا ہو..... میری آنکھوں کے سامنے اب سرخ اندھیروں کے طوفان بلاخیز کی چادر سی تن گئی تھی اور میں شاہ میر اور نظر حیات کے مکروہ چہروں کو خاکستر کرنے کے لئے بے قرار ہو گیا۔ میری ماں کی نگاہیں میرے چہرے سے میرے اندر برپا ہونے والے طوفانوں کا خوب اندازہ کر رہی تھیں اور میں نے اس کے لب ترساں پر ایک خنجر آمیز مسکراہٹ رقصاں ہوتے دیکھی۔

ایسے میں وکیل استغاثہ نے لاکھ کوششیں کیں کہ عدالت صدف حیات کے کیس پر بحث کرے مگر اب چونکہ بالکل غیر متوقع طور پر صدف حیات مرڈر کیس پچیس سال پہلے والے قادر علی خان مرڈر کیس میں بدل چکا تھا اس لئے عدالت نے نگینہ کی گواہی کے نتیجے میں فوری طور پر پچیس سال پہلے والے قادر علی خان مرڈر کیس کی فائل کھولنے کے احکامات جاری کر دیئے اور ساتھ ہی شاہ میر اور نظر حیات کو نظر بند کرنے کے علاوہ نئے سرے سے قادر علی خان مروجہ کیس کی تفتیش کسی دوسرے پولیس آفیسر، آئی او کو سونپ دی۔

عدالت کے درخواست ہوتے ہی میں کٹہرے سے نکلا اور سیدھا ماں اور ماموں کی طرف لپکا۔ میں بے اختیار ماں سے جا کر لپٹ گیا اور اس کے مہربان اور مٹا بھرے سینے پر سر رکھ کر زار و قطار رو دیا۔

”میرے لعل!..... اپنے آنسو اچھی طرح بہالے۔ کیونکہ اس کے بعد تجھے فلواد میں ڈھلانا ہے۔“ میری مجبور اور چھٹی سی ساعتوں میں ماں کی پرجوش آواز ابھری اور یہ آواز جذبات سے سراسر عاری تھی۔

”ماں!..... مجھے معاف کر دے..... مجھے معاف کر دے ماں! کہ میں ناچھی میں اپنے دشمنوں کے بہکاوے میں آ گیا۔“ میں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ اس کے بعد میں ماموں حیدر گل کے کاندھے پر رکھ کر رو دیا۔ وہ ہولے ہولے میرا کاندھا تھپتھپانے لگے۔

”ٹیک! ٹیک! ایزی مسٹر نادر علی خان!..... حوصلہ رکھو..... تمہاری حاضر دماغی کے باعث مقدمے کی نوعیت ہی تبدیل ہو گئی ہے۔“

یہ وکیل صفائی تھا۔ اتنے میں پولیس میری ماں اور ماموں کو کمرۂ عدالت سے باہر کھڑی موبائل طرف لے گئی۔ اسی اثناء میں اعظم خان بھی میرے قریب آ گیا۔ اس کے چہرے پر گہری طمانیت، مسرت کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے بھی میرے لئے توضیحی کلمات ادا کئے تو معاذ وکیل صفائی جن کا مجھے بعد میں ایڈووکیٹ حامد ہمدانی معلوم ہوا تھا، بولے۔

”ارے بھئی..... اصل تعریف کی حق دار تو وہ بہادر لڑکی تھیں۔ مگر وہ اچانک کہاں چلی گئی؟ ان کی بات پر میری بے قرار تلاشی نظروں نے تھکینہ کو دیکھنا چاہا لیکن وہ تھکینہ نظر نہ آئی۔ میں پریشان بے چین سا ہو گیا اور بے اختیار دیوانوں کی طرح تھکینہ!..... تھکینہ! پکارتا ہوا اسے ہر سمت ڈھونڈنے لگا۔ مگر وہ مجھے کہیں بھی نظر نہ آئی۔ ایڈووکیٹ حامد ہمدانی نے مجھے اپنا وزینگ کارڈ دیتے ہوئے مجھ راہیے میں رہنے کی تلقین کی پھر قریب کھڑے اعظم خان سے گفتگو کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہو گئے۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ اعظم خان نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

”نادر میاں!..... حوصلہ رکھو۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ میرے ساتھ۔“

”انکل! میری جیب کھڑی ہے۔“ میں نے بولے۔

”او کم آن یار!..... وہ کہیں نہیں جائے گی۔ تم چابیاں دو مجھے۔“ وہ بے تکلفی سے بولے اور:

”نادر خان!..... ہم تمہارے ماموں حیدر گل کے بہت پرانے دوست ہیں۔ اس لئے انہوں نے مجھ سے آج تک کچھ نہیں چھپایا۔ حتیٰ کہ تمہارے سلسلے میں بھی وہ اکثر مجھے بتاتے رہتے تھے۔ وہ بے چارہ تمہاری مظلومی کی وجہ سے بہت پریشان رہتا ہے۔ چلو، شکر ہے آج تمہارا دل بھی اپنی ماں اور ماموں کی طرف سے صاف ہو گیا۔ بہر حال!“ وہ اتنا کہہ کر ذرا تھکے، پھر پُر خیال لہجے میں مجھ سے دوبارہ گویا ہوئے۔

”نادر میاں! شاہ میر اور نظر حیات بہت زہریلے سانپ ہیں۔ شکر ہے کہ تم ان کے زہر سے بچ گئے۔ لیکن آج کے بعد وہ کھل کر تم تینوں کے خلاف میدان میں پھن کاڑھے اتر آئیں گے۔ تمہیں اب ان سے حد درجہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”جی انکل!..... میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے بولے۔

”ہمیں ایڈووکیٹ حامد ہمدانی صاحب کے ساتھ بھی ایک نشست رکھنی ہوگی۔“ وہ بولے۔ ”اور میرا جہیں یہاں لانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ تم ہمارے ساتھ راہیے میں رہ سکو۔“

”انکل! وہ..... کیا اب..... ماں اور ماموں کی صدف حیات مرڈ کیس سے بریت ممکن ہو سکے گی؟“ میں نے کسی خیال کے تحت اچانک ان سے پوچھا۔ وہ میری بات پر ایک گہری اور پُر سوچ ہنکاری کرتے ہوئے پہلو بدل کر بولے۔

”ہاں..... تمہارے باپ کے مرڈ کیس کے اب نئے سرے سے کھلنے اور تفتیش کرنے پر ہو سکتا ہے۔ صرف تمہاری ماں اور حیدر گل بری ہو جائیں بلکہ شاہ میر اور نظر حیات کو بھی سزا ہو جائے۔“

میں چپ رہا۔ اس دوران ملازمین درمیان میں رکھی ایک شیشے کی ٹاپ والی میز پر ایشیائے خورد و نوش بیکٹ اور چائے کے کپ پر اکٹھا کیا اور پھر جانے کی اجازت چاہی۔ پھر میں اپنی جیب میں وہاں سے ”کین لائٹ“ کی طرف روانہ ہوا۔

”وران ڈرائیونگ میں نے موبائل پر تھکینہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ شاید اس کے موبائل کی بیٹری ڈاؤن تھی یا پھر اس نے موبائل آف کر رکھا تھا۔“

مگر کیوں؟..... میں نے اُبھن آمیز حیرت سے سوچا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ کیا تھکینہ نے

دنا۔ اس کے بعد وہ مجھے لئے کھٹی کے وسطیٰ محرابی دروازے سے اندر شاہانہ کمرے میں لے آئے۔

یہاں کی سجاوٹ قابلِ دید تھی۔ کیا کچھ نہ تھا یہاں۔ علاقے کی مناسبت سے یہاں کے لوگ شکار کے بہت رسیا تھے۔ خال خال بنگلے اور کونھیاں ہی ایسی ملیں گی جہاں بھس بھرے درندوں کے اصل ”استادہ“ جھمتے، کھالیں اور سرکروں کے گوشوں اور دیواروں میں نظر نہ آئیں۔ یہاں بھی آرائش کے لئے اسی طرح کے جھمتے استعمال کئے گئے تھے۔

ہم دبیر قائلین پر چلتے ہوئے آئے سانسے دو صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ اسی وقت ایک تیس، پینتیس سالہ رنگ سی خاتون نمودار ہوئیں۔ انہوں نے ہلکی جامنی رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ ساڑھی کے بارڈر اور فال پر سنہرے تاروں سے کڑھائی کی ہوئی تھی اور یہ تار خالص سونے کے تھے۔ اس کا قریباً آدھا سراپا بیس قیمت جیولری سے لدا ہوا تھا۔ وہ درمیانے قد کی ایک فربہی مائل عورت تھی۔ سورت تو واجبی کی تھی مگر رنگت میدے جیسی صاف اور شفاف۔

وہ شاید ان کی بیگم تھیں۔ میں احتیاطاً کھڑا ہوا اور دھیرے سے انہیں آداب کہا۔ وہ میرے سلام کا جواب اپنے سر کے ہولے سے اشارے سے دے کر اعظم خان کے قریب بیٹھ گئیں۔

اعظم خان نے ان سے میرا مختصر آعارف کروایا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”نادر خان! ہم تمہارے ماموں حیدر گل کے بہت پرانے دوست ہیں۔ اس لئے انہوں نے مجھ سے آج تک کچھ نہیں چھپایا۔ حتیٰ کہ تمہارے سلسلے میں بھی وہ اکثر مجھے بتاتے رہتے تھے۔ وہ بے چارہ تمہاری مظلومی کی وجہ سے بہت پریشان رہتا ہے۔ چلو، شکر ہے آج تمہارا دل بھی اپنی ماں اور ماموں کی طرف سے صاف ہو گیا۔ بہر حال!“ وہ اتنا کہہ کر ذرا تھکے، پھر پُر خیال لہجے میں مجھ سے دوبارہ گویا ہوئے۔

”نادر میاں! شاہ میر اور نظر حیات بہت زہریلے سانپ ہیں۔ شکر ہے کہ تم ان کے زہر سے بچ گئے۔ لیکن آج کے بعد وہ کھل کر تم تینوں کے خلاف میدان میں پھن کاڑھے اتر آئیں گے۔ تمہیں اب ان سے حد درجہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”جی انکل!..... میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے بولے۔

”ہمیں ایڈووکیٹ حامد ہمدانی صاحب کے ساتھ بھی ایک نشست رکھنی ہوگی۔“ وہ بولے۔ ”اور میرا جہیں یہاں لانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ تم ہمارے ساتھ راہیے میں رہ سکو۔“

”انکل! وہ..... کیا اب..... ماں اور ماموں کی صدف حیات مرڈ کیس سے بریت ممکن ہو سکے گی؟“ میں نے کسی خیال کے تحت اچانک ان سے پوچھا۔ وہ میری بات پر ایک گہری اور پُر سوچ ہنکاری کرتے ہوئے پہلو بدل کر بولے۔

”ہاں..... تمہارے باپ کے مرڈ کیس کے اب نئے سرے سے کھلنے اور تفتیش کرنے پر ہو سکتا ہے۔ صرف تمہاری ماں اور حیدر گل بری ہو جائیں بلکہ شاہ میر اور نظر حیات کو بھی سزا ہو جائے۔“

میں چپ رہا۔ اس دوران ملازمین درمیان میں رکھی ایک شیشے کی ٹاپ والی میز پر ایشیائے خورد و نوش بیکٹ اور چائے کے کپ پر اکٹھا کیا اور پھر جانے کی اجازت چاہی۔ پھر میں اپنی جیب میں وہاں سے ”کین لائٹ“ کی طرف روانہ ہوا۔

”وران ڈرائیونگ میں نے موبائل پر تھکینہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ شاید اس کے موبائل کی بیٹری ڈاؤن تھی یا پھر اس نے موبائل آف کر رکھا تھا۔“

مگر کیوں؟..... میں نے اُبھن آمیز حیرت سے سوچا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ کیا تھکینہ نے

دنا۔ اس کے بعد وہ مجھے لئے کھٹی کے وسطیٰ محرابی دروازے سے اندر شاہانہ کمرے میں لے آئے۔

ایسا دانستہ کیا تھا؟..... وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی؟ مگر کیوں؟..... اس ”کیر“ جواب میرے پاس نہ تھا۔ عدالت نے اس کے پٹا شاہ میر اور نظر حیات کو مقدمے کی جیروی تک کر کے احکامات جاری کر رکھے تھے۔ یوں بھی میرا اب اپنے دشمنوں کے پاس جانے کا کوئی ہوتا تھا کہ میں کم گنہگار ہی خیر خیریت معلوم کر لیتا۔ مجھے یہ بات رہ رہ کر پریشان کر رہی تھی کہ اپنے چپا اور کبیر کے ڈیڈی نظر حیات کے خلاف گواہی دینے کے بعد کن جاں مسل حالات سے تھی۔ گنہگار نے سچ کی خاطر اور اپنے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر بہت بڑا قدم اٹھایا تھا۔

کیا اس میں ہماری محبت کا بھی دخل تھا؟ نیز اب شاہ میر کا اپنی بیٹی سے کیا برتاؤ ہو سکتا تھا والے واقعے کے بعد یقیناً دونوں باپ بیٹی کے درمیان ضرور ایک نفرت کی خلیج حاصل ہو چکی ہوگی۔ گنہگار..... وہ کیسی تھی؟ اپنے باپ کے کالے کرتوتوں سے واقف ہونے کے بعد وہ اب کون سے دو چار تھی، مجھے اس کا یہ خوبی اندازہ تھا۔ اچانک میں نے گنہگار سے ٹیلی فون پر رابطہ کرنے کا سوچا شاہ میر کی رہائش گاہ کے نمبر سچ کرنے کے بعد میں نے دھڑکتے دل سے موبائل اپنے کان سے رکھا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر تھا۔ دوسری طرف ٹیل جا رہی تھی۔ ہرنبل پر میرا دل یکبارگی زہر دھڑکتا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ فون گنہگار سے اٹھائی۔

”ہیلو.....!“ معا ایک بھاری آواز ابھری۔ جسے سن کر میری رگوں میں ایک لمحے کے لیے غیظ کی سننا نہیں ابھری تھیں۔ یہ شاہ میر کی آواز تھی۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا کہ بغیر موبائل آف کر دیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ میرے موبائل کی رنگ بج اٹھی۔ مگر ڈپلے پر نمبر دیکھا اور چونک اٹھا۔ سی ایل آئی پر گنہگار کے گھر کا نمبر آ رہا تھا۔ ”کیا میرے موبائل کا نمبر سی ایل آئی پر دیکھنے کے بعد گنہگار نے مجھ سے رابطہ کرنا چاہا تھا؟“ سوچا اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ موبائل کان سے لگا کر ”ہیلو“ کہا۔

”نادر علی خان! تمہاری ذہانت کی داد دینے پر مجبور ہوں میں۔“ معا شاہ میر کی پھنکاری ہوئی ابھری اور میرے پورے وجود میں عجیب سی سنسنی دوڑ گئی۔ ”تم نے میری ہی چال مجھ پر اٹا دی میری بیٹی گنہگار کو بھی ہم سے متفر کر ڈالا۔“

”شاہ میر! تم نے ابھی میری چالیں دیکھی ہی کہاں ہیں؟ حقیقت جاننے کے بعد دیکھنا.....“

اب تمہارا اور تمہاری شیطانی جوڑی نظر حیات کا کیا حشر کرتا ہوں۔“

”تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے..... سنو لے!“

”مجھے سنو لیا نہیں، اب اڑ دھا کہو۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”تم نے دیکھ لیا شاہ میر سانچ کو آج نہیں۔ تم مجھے میری مظلوم ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف ورغلانے کی مذموم کوشش رہے تھے مگر دیکھ لو، کاتب تقدیر نے ایک ایک سچ کھول کر رکھ دیا۔ تمہاری اکھوتی بیٹی، تمہارے مانو کالے کارنا سے آگاہ ہو چکی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے بھری عدالت میں تمہارے اور نظر جیسے شیطان مردود کے مکروہ چہروں کو کبھی بے نقاب کر ڈالا۔“

”گنہگار میری اولاد ہے۔ اس نے جو کچھ کیا تمہاری محبت کے جوش میں کیا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ کا نثر جب اس کے دل و دماغ سے اتر جائے گا تو وہ سب کچھ بھول جائے گی۔“

”کسی خوش فہمی میں مت رہنا شاہ میر!“ میں نے دانت بھینچ کر زہریلے طعنے سے کہا۔ ”ہماری ہمت نہیں، ایک جذبہ ہے۔ ایک سچا جذبہ..... اس حقیقت کو تسلیم کر ہی لو اب شاہ میر! کہ تمہاری اہلی







کرخوں ناک لہجے میں کہا اور ان تینوں نے خوف زدہ انداز میں فوراً ہی اپنے اپنے نقاب اتار دیے۔  
میں نے بغور تینوں کے چہروں کو دیکھا اور ہونٹ سمجھنے لگے۔ وہ تینوں میرے لئے قطعی اجنبی تھے۔  
”تمہارے کھڑے اتنے خوب صورت تو نہیں ہیں کہ انہیں نقاب سے چھپایا جاتا۔“ میں نے  
مصنوی مایوسی سے کہا۔ ”چلو، اب یہ بھی بتا دو کہ تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے؟“..... نظر حیات  
شاہ میر نے؟“..... یا پھر دونوں نے؟“

وہ پھر متردّد نظر آنے لگے۔ میں نے ایک بار پھر فاسٹ ایکشن کے مقولے پر عمل کرنا چاہا اور پھر  
سے ان کی دوسری ٹانگ کا نشانہ لینے لگا تو وہ تینوں ہی بیک وقت ہاتھ کے کپکپاتے ہوئے اشارے  
چلا کر بولے۔

”نن..... نہیں..... مگ..... گولی مت چلاتا..... مت چلاتا گولی۔“  
میرے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ تیر گئی۔ میں نے فلی اسٹاکل میں پستول کی نال کو پھونک مارا  
”صرف تم میرے سوالوں کا جواب دیتے جاؤ۔ ہاں، اب بولو..... رکنا مت۔“ میں نے گرو  
پوش سے دانت پیں کر کہا۔

”ب..... بات دراصل یہ ہے کہ..... م..... مجھے گینگ..... بہت اچھی لگتی ہے۔  
ل..... لیکن وہ مجھے بالکل گھاس نہیں ڈالتی۔ آج دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر م..... میں  
اٹھانے کے لئے یہاں آیا تھا۔“ وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

میرے حلق سے ایک سنسناتا ہوا ہنکارا خارج ہوا اور اس کے سفید جھوٹ نے میری نس نس میں  
اتار دی۔ وہ اس وقت بھی مکاری دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے دشمن جتنے خطرناک تھے، اس  
زیادہ مکار تھے۔ اور ”مکاری“ سے بڑھ کر کوئی خطرناک ہتھیار نہیں ہو سکتا۔  
”ڈز..... ڈز.....“ کے بعد دیگرے میں نے دو بار ٹریگر دیا تھا۔

دونوں گولیاں ایک ایک کر کے اس کے بازوؤں میں پیوست ہو گئیں اور وہ دہری تہری تکلیف  
باعث فرش پر پڑا بری طرح کراہنے لگا۔ میں نے اس کی طرف سے توجہ ہٹا دی۔ مطلب یہ کہ اب  
اس سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔

”تم دونوں نے اپنے گرو کا حشر دیکھ لیا..... اور یقیناً میرا سوال بھی سن لیا ہو گا۔ تم صحیح جواب  
دے یا پھر.....“

میں باقی دو نقاب پوشوں سے مخاطب ہو کر غرایا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں وحشتیں کروٹیں  
تھیں۔ وہ پہلے ہی اپنے سامنے ایک ایسے چھلاوے کو دیکھے ہوئے تھے جس نے نہ جانے کس طرف  
صفت انداز میں بازی ہی پلٹ دی تھی۔

”کیا میں اپنا سوال دہراؤں؟“ کوئی جواب نہ پا کر میں حلق کے بل دھاڑا اور پستول کو خطرناک  
انداز میں حرکت دی۔

”نن..... نہیں..... ہم..... ابھی بتاتے ہیں۔“ انہوں نے خوف سے گھٹکیا تے ہوئے بیک  
جواب دیا۔ ”ہمیں نظر حیات اور اس کے بیٹے کبیر نے یہاں بھیجا تھا۔“

”صرف نظر حیات اینڈ سن نے..... یا اس کی کنبی..... یعنی شاہ میر بھی اس سازش  
شریک تھا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

”حکم تمہیں کب اور کہاں دیا گیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔  
”میں نے جنگل پر..... آج ہی، لگ بھگ کوئی ایک گھنٹہ پہلے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم تینوں کون ہو؟“..... کیا اس کے پالتو کتے یا کرائے کے ٹٹو؟“  
”ہمارا کوئی تصور نہیں ہے جی..... ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ آپ حکم کرو تو ہم آپ کا حکم مان لیں  
میں۔“ ان میں سے ایک نے تکلیف کی شدت اور خوف کی زیادتی کے باعث لرزتے ہوئے لہجے میں  
جواب دیا۔

”تو گویا تم تینوں کو کرائے پر حاصل کیا گیا ہے؟“..... میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم تینوں نظر حیات اینڈ  
شاہ میر کنبی کے مشترک طور پر پالتو کتے ہو؟“  
”اویں جی۔ اب آپ ہماری جان چھڈو۔ پہلے ہی اتنے زخمی ہو گئے ہیں۔ اب تو ہمیں کرایہ بھی  
نہیں ملے گا۔“ پہلے والا مایوسی سے منہ پھلا کر بولا۔

میں نے ایک لمحہ سوچا، پھر انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے لڑھکتے پھڑکتے اپنے  
نیرے ساتھی کو سنایا جو شاید تکلیف کے باعث نیم بے ہوش ہو چکا تھا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔  
لیکن بے ہوش تھی۔ ذرا دیر بعد فضل چاچا نے آکر انہیں سنبھال لیا تھا۔ اس وقت تک میں ان تینوں  
کرائے کے بد معاش ٹائپ ٹوڈ کو روانہ کر چکا تھا۔ فضل چاچا کو میں نے مختصر آسارے واقعے سے آگاہ  
کر دیا۔

میں نے اسی وقت نظر حیات کا فون نمبر ملایا۔ میری خوش قسمتی کہ فون خود اس نے وصول کیا۔ اس کے  
فون ”ہیلو“ کہنے سے ہی میں اس کی آواز پہچان چکا تھا لہذا ایک ایک لفظ چبا کر گویا انگارے اُگلنے  
ہوئے اس سے بولا۔

”نظر حیات! ہر گزرتے لمحے کے ساتھ تمہاری ٹاپاک اور شرم ناک زندگی کا دائرہ حیات تنگ ہوتا جا  
رہا ہے۔ یہ دائرہ عقرب پھندا بن کر تمہاری گردن دبوچنے والا ہے۔“

”دوسری طرف چند ٹانے کے لئے سناٹا چھا گیا۔ پھر نظر حیات کی درشت آواز ابھری۔  
”کون ہو تم.....؟“ صاف محسوس ہوتا تھا، تجاہل عارفانہ سے کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ آواز سے

خفیف کپکپاہٹ واضح طور پر ظاہر ہو رہی تھی۔  
”تمہارے لئے یہ بات بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے نظر حیات! کہ تم مجھے اب تک پہچان نہیں  
پائے ہو۔ کیا میرے لہجے کی نفرت آگس تپش اور آواز میں آتش انتقام کی تہمتا بہت کہیں محسوس نہیں ہو  
رہی؟ کیا..... کیا تمہیں میرے لہجے کی آگ سے ایک ایسے آشفستہ سر انسان کی دیرینہ تڑپ کا اندازہ  
نہیں ہو رہا جو اپنے باپ کے قاتلوں اور اپنی ماں کو بے گناہ عمر قید کی سزا دلوانے والوں کو عبرت ناک  
موت سے ہمتا کر کے لئے بے چین و مضطرب ہے؟“

میرے آتشیں لہجے سے شعلے پھوٹ رہے تھے۔ میرا پورا وجود جلن کا شکار تھا۔ کپٹیاں سلگ رہی تھیں  
اور کون میں ابو جیسے لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔  
”او..... آئی سی..... تو گویا ہمارے لئے ایک آتش فشاں تیار ہو چکا ہے۔“ اس بار دوسری  
جانب سے نظر حیات کی تحقیر آمیز زہریلی آواز ابھری۔

”میرے سینے میں پورا آتش فشاں جزیرہ آباد ہے کتے!..... بہت جلد ٹو اور تیرا یار عار شاہ میر  
اپنا بھیمانک انجام کو پہنچنے والے ہیں۔“ میں دانت سمجھ کر غرایا۔

”اپنی بکواس بند کرو..... اور یہ بتاؤ تم نے گنیز کو کیوں پرغمال بنا رکھا ہے؟“ نظر حیات نے کمر آواز میں پوچھا۔

”تمہارے کرائے کے تینوں ٹو میرے پاس آئے تھے اور منہ کی کھا کر لوٹ چکے ہیں۔ کسی اور بھیجو۔ یا پھر خود آ جاؤ۔“ میں نے بھنا کر کہا تو دوسری طرف نظر حیات کو ایک بھیا تک خاموشی نے چم نکل لیا۔

”کیوں..... سانپ سونگھ گیا اس خوش کن اطلاع پر؟“ میں دل ہی دل میں اس کی بے بسی کا خاموشی پر پھنکارا تو نظر حیات نے شاید جھل ہو کر رابطہ ہی منقطع کر ڈالا۔

میں نے بھی ریسور کر ڈیل پر شیخ دیا اور چند ٹائیے اپنے اندر کے ابال پر قابو پاتا رہا۔ اسی کوشش کے دوران مجھے گنیز کا خیال آیا اور میرے اعصاب فکر مندی کے باعث چٹختے لگے۔ اس کی گمشدگی میرے لئے پریشانی کا سبب تھی۔ لمحائی غور کے بعد میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی شاہ میر کا نمبر ملا لیا۔ گھریلو ملازم فون ریسو کیا تھا۔

”شاہ میر سے بات کراؤ۔“ میں نے گھیر آواز میں کہا۔

”آپ کون؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”میں..... نادر علی خان بول رہا ہوں۔“ میں نے اپنا نام بتایا تو مجھے ایک منٹ ہولڈ کرنے کا گیا۔ پھر ذرا ہی دیر بعد شاہ میر کی چٹتی ہوئی آواز اُبھری۔ وہ غراتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھا۔

”تم..... تم..... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا نادر!“

”یہ میرا تم پر ادھار ہے..... اور میں اسے بہت جلد اتارنے کے لئے بے چین ہوں۔“ میں نے بھی اسی لہجے میں ترکی بہ ترکی جواب دیا تو وہ بری طرح بھنا گیا اور دانت پیس کر بولا۔

”تم نے میری بیٹی گنیز کو اغواء کرنے کی جرأت کیسے کی؟“

”یہی سوال پوچھنے کے لئے میں نے فون کیا تھا..... کیا واقعی گنیز.....؟“

اس نے میری بات کاٹ دی اور بولا۔ ”انجان بننے کی کوشش فضول ہے..... بہت جلد پولیس تک پہنچنے والی ہے۔ وہ خود ہی میری بیٹی کو برآمد کر لے گی۔“ یہ کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔

میں نے اپنے ہونٹ بھیج لائے۔ اس کے بعد میں اپنا مگرار دیوالور اور چند فاضل راؤ ٹر ساتھ لے کر گرین لاج سے نکل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں آندھی طوفان کی طرح جیپ دوڑاتا ہوا راولپنڈی کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔

گنیز کی پراسرار گمشدگی میرے لئے پریشانی کا سبب تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اس میں بھی نظر حیات اور شاہ میر کی کوئی چال ہو۔ یہ تو طے تھا کہ گنیز کے منظر سے ہٹنے میں ان کا مفاد پوشیدہ تھا۔ کیونکہ صدف مرزا کیس اب حیرت ناک طور پر قادر علی خان مرڈر کیس میں تبدیل ہو چکا تھا اور یہ انہونی شخص گنیز کی کوئی کے باعث ممکن ہو سکتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ”انٹی ہو گیس سب مذہبیریں“ کے مہمداق میرے دلوں خود اپنے ہی بجھائے ہوئے جال میں پھنس گئے تھے۔

عدالت نے اگرچہ فوری طور پر نظر حیات اور شاہ میر کو نظر بند کرنے کے احکام جاری کر دیے مگر ان ایلیس صفت بھیڑیوں کی خونخوار اور مکارانہ چالوں سے ابھی طرح واقف تھا۔ انہوں نے پہلا کام کیا ہو گا کہ گنیز کو غائب کر کے اس کا الزام میرے سر تھوپ دیا جائے۔ مگر گنیز کو بازا بپ کروانے کی خاطر تین بد معاشوں کی جارحانہ آمد میرے اس مفروضے کی سراسر نفی کر رہی تھی۔ یعنی اگر گنیز کی پراسرار

اپنا ایک گمشدگی میں شاہ میر وغیرہ کا ہاتھ تھا تو وہ اس طرح اپنے کرائے کے بد معاشوں کی خدمات نہ لیتے بلکہ براہ راست پولیس کو میرے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کرتے۔ لہذا میرے ذہن میں ایک ہی بات آتی تھی کہ گنیز کی پراسرار گمشدگی خود گنیز کا اپنا ہی عمل ہو۔ یعنی وہ خود ہی خاموشی کے ساتھ کہیں پوش ہو چکی ہو۔ مگر کہاں؟ یہ جاننے کے لئے جتنا میں بے قرار تھا، شاید اس کا باپ بھی نہ ہو گا۔

میرا خیال تھا کہ اس اُلجھی ہوئی صورت حال پر گھٹکو اور مشاورت کے لئے حامد صمدانی ایڈووکیٹ سے ملنا ضروری تھا۔ لہذا میرا رخ انہی کی طرف تھا۔

میں اپنی جیب آندھی طوفان کی طرح اڑاتا ہوا سیدھا ایڈووکیٹ حامد صمدانی کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ ”غیریت تو ہے؟..... کیسے آتا ہوا؟“ انہوں نے بے غور میرے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ بابا میں نے ساری صورت حال سے انہیں اچھی طرح آگاہ کر دیا جسے سن کر ان کی پیشانی پر بھی تشویش برسر طیش اُبھر آئیں۔ چند ثانیوں کی پُرسوج خاموشی کے بعد وہ بولے۔

”میرا خیال تو یہی ہے کہ گنیز اپنی مرضی سے ہی کسی سہیلی کی طرف چلی گئی ہے۔“

”میں آپ کی رائے سے سو فیصد متفق ہوں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کی تائید کی۔

لیکن..... میں کچھ کہتے کہتے رکا تو وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے کسی فوری خیال کے تحت بولے۔

”کیا تمہیں گنیز کی قریبی سہیلیوں کے بارے میں علم ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کا تو مجھے کوئی خاص علم نہیں۔ پھر بھی میں کوشش کر کے کہہ لیتا ہوں۔“

”تم سے ایک فاش غلطی ہو گئی نادر میاں!“ وہ اچانک بولے تو میں نے چونک کر پوچھا۔

”کیسی غلطی اٹکل؟“

”تم نے جب ان تینوں بد معاشوں پر قابو پا لیا تھا تو انہیں چھوڑنا نہیں تھا بلکہ پولیس کے حوالے کر بنا تھا۔ اس طرح ”قادر علی مرڈر کیس“ اور بھی مضبوط ہو سکتا تھا۔“

”یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی اٹکل!“ میں نے کہا۔ ”مگر اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ تینوں لوگوں کے نہیں بلکہ کرائے پر ”ہاؤس“ کئے گئے تھے جو اپنا بیان بھی بدل سکتے تھے اور لافعلی ظاہر کرنے میں بھی درہنہ لگاتے۔“

”ہاں..... تمہاری یہ بات تو درست ہے۔“ بالآخر انہیں میری بات سے متفق ہونا پڑا۔

”نظر حیات اور شاہ میر نے گنیز کے اغواء کا الزام میرے سر تھوپ کر میرے خلاف پولیس کا رروائی کی دھمکی بھی دی ہے۔“

”پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ محض ضابطے کی کارروائی کرے گی اور خالی ہاتھ لوٹ جائے گی۔ مگر.....“ وہ اتنا کہہ کر ذرا کے پھر فکر مندی سے بولے۔ ”اس سے پہلے کہ گنیز اپنے قاتل باپ اور نظر حیات کے ہتھے چڑھ جائے، تمہارا اس تک پہنچنا ضروری ہے۔ کیونکہ جس طرح اس نے اچانک اٹھ کر اس دن اپنے باپ کے خلاف گواہی دیتے ہوئے ان کے ارادوں اور منصوبوں کو ملامت کر دیا، اسی طرح یہ بازی ہمارے ہاتھوں سے نکل بھی سکتی ہے۔“

میں ان کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ شاہ میر اور نظر حیات آج سے پچیس جن پہلے والے اپنے باپ کے جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے گنیز کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ باپ ہونے کے ناتے اگرچہ شاہ میر اپنی بیٹی گنیز کا منہ بند کرنے کے لئے دوسرا طریقہ اپنا سکتا تھا۔ مگر نظر حیات کے سلسلے میں کچھ نہیں کہا

جاسکتا تھا کہ وہ کمینہ خدا خواستہ عجیبہ کے خلاف کوئی سفاکانہ قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔

میں مزید تھوڑی دیر حامد مصداقی صاحب کے ساتھ تبادلہ خیال کرنے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔

اب گھینہ کو میں نے بہر طور تلاش کرنا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنوں کے ہاتھوں ذہنی اور مرنے جسامتی اذیتوں کا شکار ہو۔

اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں اس وقت چاندنی چوک کو پیچھے چھوڑتے ہوئے پڑا آرٹ گیلری کے سامنے والی سڑک سے گزر رہا تھا۔ موبائل کا بزرگ سننے ہی میں نے اپنی پیٹ کی پل سے بندھے چرمی کیس سے موبائل نکال کر کان سے لگا لیا۔ دوسری جانب سے نیچر مشتاق گوندل کی گھبراہٹ ہوئی متوحش آواز ابھری۔

”سری!..... وہ..... آگ..... آگ..... ٹال کو آگ لگ گئی ہے۔“

میں سنائے میں آگیا۔ ”کیسے آگ لگی؟..... کب؟“ میں نے پوچھا اور جیب سڑک کے کنارے کھڑی کر دی۔

”س..... سری! دن دیہاڑے اچانک کچھ نقاب پوش لمبی سی دین میں آئے تھے۔“ وہ یوں کہنے لگی۔ ”انہوں نے..... اسلحے کے زور پر ہم سب کو باہر نکال دیا۔ پھر اپنے ساتھ لائے ہوئے پٹرول کے گیلن لکڑیوں پر چھڑک کر انہیں دیا سلائی دکھا دی۔ اس کے بعد وہ ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے کر لوٹ گئے۔ بڑے آدمی تھے جی وہ بد معاش۔“ وہ آخر میں اپنا مخصوص تکیہ کلام لگنے کے ساتھ رہ سکا تھا۔

”تم نے فائر بریگیڈ والوں کو اطلاع دی؟“ میں نے دانت بھینچ کر پوچھا۔

”جی ہاں..... وہ تو میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔“

”مردان شاہ کہاں تھا؟“

”وہ اس وقت تو وہیں تھا۔ مگر جب ڈھانا پوش اپنا کام کر چکنے کے بعد فرار ہو گئے، تو وہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ شاید وہ ڈر کر بھاگ گیا تھا۔ بڑا آدمی تھا جی۔“

”یکواس بند کرو۔ میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے موبائل آف کیا اور جیب ایک جھپٹے سے آگے بڑھا دی۔

پنڈی سے مری کا فاصلہ 64 کلومیٹر یعنی 40 میل تھا۔ یہ چالیس میل کا فاصلہ میں نے تیز رفتار ٹان اسٹاپ ڈرائیونگ کرتے ہوئے صرف نصف گھنٹے میں طے کیا تھا۔ کشمیر پوائنٹ سے میں نے جیب مال روڈ کی طرف موڑی اور مری کی خوب صورت ترین عمارت یعنی سنگ مرمر کے بنے G.P.O کے سامنے سے گزر کر مال روڈ پر ڈال دی۔ پھر ”بارغ شہیدان“ سے شارٹ کٹ لیتا ہوا سیدھا اپنے ٹال کے ذرا نزدیک پہنچا تو دور ہی سے آگ اور دھوئیں کے کثیف بادل دکھائی دے گئے۔

وہاں فائر بریگیڈ کا عملہ آگ بجھانے کی سر توڑ کوشش میں سرگرم نظر آیا۔ اس کے علاوہ دیگر لوگوں کا جم غفیر بھی نظر آ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے بریک لگائے۔ جیب کے ٹائر زور سے چرچائے اور ایک جھپٹے سے رک گئی۔ میں جلدی سے نیچے اترا اور اپنے ٹال سے بلند ہوتے بھیا یک شعلوں اور کثیف دھوئیں کو دیکھنے لگا۔

اپنے ٹال کو جلتا دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ میرے دشمنوں نے مجھے مالی طور پر ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ کیونکہ ٹال میں بیش قیمت لکڑی ہماری مقدار میں موجود تھی، جو سب جل کر راکھ

رہی تھی۔ لکڑی جس قدر بیش قیمت ہوتی ہے، آگ بھی اسی قدر جلد پکڑتی ہے۔ اور جب تک آگ

ابھی طرح نکل نہ لے، بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ آگ بڑے بڑے ہتھیروں کو تیزی سے نکل رہی تھی۔ فائر بریگیڈ کا عملہ آگ بجھانے کی مقدور بھر

دشمنوں میں لگا ہوا تھا۔ میں جیسے کہنے کے عالم میں کھڑا تھا۔ پھر ٹال کے حیران پریشان مزدور مجھے دیکھ کر میری طرف لپکے۔ میں نیچر مشتاق گوندل بھی تھا۔ اس کا چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔ بلکہ میں نے اس کی آنکھوں میں نمی بھی

سوس کی تھی۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ ”مردان شاہ کدھر ہے؟“ میں نے بہ آواز بلند پوچھا تو کوئی بھی اس کے بارے میں نہ بتا سکا۔ میں نے ہونٹ بیچنے لگے۔

میں نے مزدوروں کو وہیں موجود رہنے کی تاکید کی اور نیچر مشتاق کو لئے سیدھا تھانے پہنچا۔ میں۔ اچانک۔ اوکی نشست پر ایک موٹا، بھاری توند والا سب انسپکٹر سیالم پھور کو بھنبھوڑنے میں مصروف تھا۔ بڑے پرکھی ایک پلیٹ میں بجلی چھٹی چوڑی ہوئی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میری طبیعت ویسے بھی مکدر ہونے لگی تھی۔

”میں رپورٹ لکھوانے آیا ہوں۔“ اس کی مستفسرانہ نظروں کے جواب میں، میں نے کہا۔ پھر خود پر قابو پانے میں ناکامی کے بعد بے اختیار بولا۔ ”انسپکٹر صاحب! براہ کرم..... ذرا ہڈیاں چبانا بند کریں و کچھ توجہ ادھر بھی ہو جائے۔“

اس کا ڈیوٹی کے دوران اس کراہت آمیز انداز میں کھانا مجھے ویسے ہی بری طرح کھل گیا تھا۔ تاہم میرے طریقے جملوں کی کاٹ نے اس خراٹ سے سب انسپکٹر کی چولیس ضرور ہلا کر رکھ دی تھیں۔ کیونکہ ”سری“ ہی لئے اس کے ”سپر..... سپر“ چلتے ہوئے منہ کو بریک لگ گئے تھے۔

”کیا بات ہے.....؟“ انداز لٹھ مار تھا۔

”رپورٹ لکھوانی تھی میں نے..... میرے ٹال کو کسی نے آگ لگا دی ہے۔“ میں نے کہا۔

”باہر برآمدے میں ہی محرر موجود ہے۔ جا کر پہلے این سی کٹاؤ دو۔“ وہ بے پرواہی سے بولا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے بچے چھپے پھور کو ایک بار پھر بھنبھوڑنے میں مصروف ہو گیا۔ میں غصے سے بل کھانے لگا۔ ”بڑے آدمی ہیں جی.....“ میرے ساتھ کھڑے نیچر مشتاق گوندل نے ہولے سے بڑبڑا کر کہا۔ وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔

”میں جانتا ہوں کہ میرے ٹال کو کون لوگوں نے آگ لگائی ہے۔ اس لئے میں سیدھا آپ ہی کے پاس آیا تھا تاکہ آپ مظلوموں کے خلاف فوری کارروائی کریں۔“ میں نے تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے مگر قدرے بلند آواز میں کہا تو وہ بھی بھنائے ہوئے لہجے میں بولا

”اچھا..... اچھا، سمجھ گیا..... زیادہ اونچا بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھنبھو۔“ وہ نہ بھی کہتا تو میں خود بیٹھنے والا تھا۔

اس نے کھنٹی بجا کر اردلی کو ہیڈ محرر کو اندر بھیجنے کا حکم دیا۔ پھر یہ غور میرے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد میرے ساتھ بیٹھے نیچر مشتاق کی طرف دیکھا اور پھر میرا نام پوچھا۔

”نادر علی خان۔“

”یہ کون ہے؟“

جو باپ قادر علی خان کی نشانی تھا، جس نے یقیناً بہت محنت و مشقت کر کے اس کاروبار کو فروغ دیا تھا۔  
ان کے بعد ہاموں حیدر گل نے اسے سنبھالا تھا۔ ان کے جیل جانے کے بعد اس کی باگ ڈور میرے  
ہاں میں آگئی تھی مگر..... افسوس! اپنے دشمن کی زد سے میں اپنے اس اہم ذریعہ معاش کو بھی نہ بچا  
سکا تھا۔

اچانک مجھے مردان شاہ کا خیال آیا۔ وہ میرا ایک پرانا اور وفادار ملازم تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ یوں  
ان وقت پر اچانک کہاں غائب ہو گیا تھا۔ جبکہ اس کے باقی سارے ساتھی مزدور میرے شریک غم بنے  
ہیں موجود تھے۔ وہ بھی بہت غمگین اور مضطرب نظر آ رہے تھے۔ یقیناً مال کی تباہی کو وہ اپنا نقصان سمجھ اور  
نارے تھے۔

”سرجی!..... اب کیا ہوگا؟ یہ بے چارے مزدور تو بے روزگار ہو جائیں گے۔“ میرے قریب  
لڑے نیچر مشتاق نے مسکین چہرے کے ساتھ کہا۔ دیگر مزدوروں کی یاس بھری نظریں میرے چہرے پر  
نا ہوئی تھیں مگر اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ان میں سے ایک مزدور نے نیچر مشتاق سے کہا۔  
”نیچر صاحب! اللہ ہمارے نادریاں کو زندگی دے۔ آپ ہماری فکر نہ کریں، ہم تو مزدور ہیں۔ کہیں  
ہیں سے کما کر گزارا کر لیں گے۔“  
”نیچر!.....!“ میں نے مشتاق کو پکارا۔  
”جی، سرجی!“ وہ ایک دم بولا۔

”ان سارے مزدوروں کا حساب کتاب اسی طرح چلتا رہے گا۔ انہیں تنخواہ کے علاوہ روز کا مزدوری  
نہ ملنا چاہئے۔ مجھ سے چیک بک پر سائن لے لو۔“  
میرے اس فیصلے پر سارے مزدور بے آواز بلند ہوئے۔ ”ہرگز نہیں چھوٹے مالک!..... ہم اتنے خود  
نہیں ہیں جو بغیر کام کئے اپنی جیب بھریں۔ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ ہم ہر دکھ اور مشکل وقت میں آپ  
کے ساتھ ہیں۔“  
ان کی بات سن کر مجھ پر جذبات انگیز رقت طاری ہونے لگی۔ پھر میں نے مردان شاہ کا پوچھا تو سب  
نے لاسی کا اظہار کیا۔

”وہ بڑے مزے سے اپنے گھر بیٹھا ہوگا۔ اور کہاں ہو سکتا ہے وہ۔“ نیچر مشتاق نے کڑوے لہجے  
کا کہا تو ایک جوان مزدور نے اس کی تردید کرتے ہوئے بڑے اعتماد لہجے میں کہا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے نیچر صاحب! شاہ صاحب اتنے خود غرض نہیں ہیں۔ وہ ضرور ان  
حاشیوں کے تعاقب میں گمے ہوں گے۔“ میں اس کی بات پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ خیال میرے  
میں نہیں آیا تھا مگر مجھے اس کی بات غلط محسوس نہیں ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہے..... مردان شاہ تم میں سے کسی کو ملے تو اسے میرے پاس ”گرین لاج“ بھیج دینا۔“  
مانے ان سے کہا۔ پھر نیچر مشتاق سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”مشتاق! تم کل صبح میرے پاس پہنچ جانا۔“

اس نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور میں دوبارہ جیب میں سوار ہو گیا۔ میرا ذہن اس وقت مختلف  
تجربوں اور سوسنوں میں مٹا ہوا تھا۔ عینہ کی پراسرار کشمکش، مال کی تباہی، پھر عینہ کی طرف۔ یہ یہ پریشانی  
نظر حیات اور کبیر کے علاوہ خود اس کا باپ شاہ میر بھی بڑی شد و مد کے ساتھ اس کی تلاش میں جتے  
تھے۔ یہ امر میرے لئے مزید تشویش کا باعث تھا۔ کیونکہ ان دونوں بلکہ بشمول کبیر تینوں کا عینہ کو  
لہانے کا مقصد ٹھیک نہ تھا۔

”یہ میرا نیچر ہے۔ مشتاق گوندل۔“

”تمہیں کس پر شبہ ہے؟“

”مجھے شبہ نہیں، سو فیصد یقین ہے انپکٹر صاحب! کہ یہ بزدلانہ حرکت کن لوگوں کی ہو سکتی ہے۔“  
نے دانت پیس کر کہا۔

”ہاں تو بھئی، ان کے نام بھی ہوں گے..... بتاؤ، کون تھے وہ؟“

میں نے اس کے استفسار پر کہا۔ ”نظر حیات اور شاہ میر۔“

وہ یہ نام سن کر یوں اچھلا جیسے میز کے نیچے سے اسے کسی بچھو نے ڈک مار دیا ہو۔

”ہیں..... یہ کن لوگوں کے نام لے رہے ہو تم؟“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

”کیوں..... کیا انہیں گرفتار کرنے پر پابندی عائد ہے؟“ میرا لہجہ پھر طنز یہ ہونے لگا۔

”ان دونوں کے تو پہلے ہی کورٹ نے نظر بند کرنے کے احکامات جاری کر رکھے ہیں۔“ وہ میر

کیلئے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

صدف مرڈر اور بعد میں قادر علی خان مرڈر کیس کے حوالے سے میری شہرت محکمہ پولیس میں بڑی  
چکی تھی اور چونکہ شہر کے ایک بڑے بیورو کریٹ اعظم خان صاحب کا میری پشت پر ہاتھ تھا اس لئے  
خراٹ انپکٹر نے مجھ سے نہ صرف بات کرنے کی زحمت گوارا کی تھی بلکہ میرے کڑوے کیلئے جھلوسوں کو  
پی گیا تھا۔

بہر طور میں نے اس کے جواب میں طنز یہ حیرت سے کہا۔ ”تو کیا ان دونوں کو اپنی رہائش گاہ  
محدود کر کے آپ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ کوئی جرم نہیں کر سکتے؟“

”خیر..... ایسی بات بھی نہیں۔“ وہ ہنچر ہنچر کرنے کے سے انداز میں بولا۔ ”دیکھئے نادری صاحب

میرا مشورہ مانیں، آپ نامعلوم شرط بندیوں کے خلاف پرچہ کٹوا دیں..... میں آج سے محرموں  
تلاش کا کام شروع کر دیتا ہوں۔ ان کے گرفتار ہوتے ہی آپ کے مطلوبہ مخالفین بھی خود بہ خود دھڑلے  
جائیں گے۔ یہی اصول اور طریقہ کار بہتر رہے گا۔“

اس نے آخر میں سمجھانے والے انداز میں مجھ سے کہا تو میں نے کچھ سوچ کر سر ہلا دیا۔ تاہم بولا

”ٹھیک ہے..... آپ اپنی ضابطے کی کارروائی نمٹانے کی کوشش کریں۔ میں بھی اپنے طور پر کچھ نہ نہ  
ضرور کروں گا۔“

نصف گھنٹے بعد میں تھانے کی عمارت سے نکلا اور اپنی جیب میں آ بیٹھا۔

”سرجی!..... میرا بھی آپ کی طرح سو فیصد یہی خیال ہے کہ یہ کام نظر حیات اور شاہ میر

آدمیوں نے ہی کیا ہوگا۔“ میں نے جیب اشارت کرتے ہوئے آگے بڑھائی تو میرے برابر والی نشست  
پر بیٹھے ہوئے نیچر مشتاق گوندل نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور جیب دوبارہ اپنے مال کی طرف موڑ دی۔

فائر بریگیڈ کا علمہ آگ بجھانے میں ”کامیاب“ ہو چکا تھا۔ کیونکہ سب کچھ جل کر خاکستر ہو چکا

کے بعد آگ کا اندھن جو ختم ہو چکا تھا۔

پورا مال شمشان گھاٹ کا منظر پیش کر رہا تھا..... ہر طرف سلگتے اور دھواں اٹھتے کوکوں کے سوا

کچھ نہ تھا۔

میں نے حسرت و یاس سے یہ سارا منظر دیکھا۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ یہ مال میرا

میں ”گرین لاج“ کی طرف مجھ سفر تھا کہ معا موہاں پر مجھ سے فضل چاچا نے رابطہ کیا۔ وہ پریشان تھے۔ بولے۔

”نادر بیٹا! یہاں گرین لاج میں ابھی تھوڑی دیر پہلے پولیس آئی تھی۔ وہ تمہیں گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ میں اس اطلاع پر چونکے بغیر بولا۔ ”بے فکر رہو بابا! وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ پولیس نے تمہارے تلاش کے سلسلے میں گرین لاج کا ضرور چہرہ چہرہ چھان بارا ہوگا۔“

”بیٹا! انہیں شبہ تو یہی تھا کہ گنیز ادھر ہی ہوگی۔“ فضل چاچا نے کہا۔ ”مگر نادر بیٹا! بات صرف یہی نہیں ہے۔“ وہ آخر میں اسرار بھرے لہجے میں بولے اور اس بار میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔

”کیا مطلب چاچا؟ پھر اور کیا بات تھی؟“ میں نے پوچھا تو وہ پُر تشویش لہجے میں بولے۔

”پولیس باوجود اس کے کہ ہمیں ہر صورت میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ ان کے پاس تمہاری گرفتار باقاعدہ وارنٹ ہے۔ ویسے تم کہاں سے بول رہے ہو بیٹا؟“

انہوں نے آخر میں پوچھا۔ اور جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ میں کچھ ہی دیر میں گرین لاج والا ہوں تو وہ یکدم متوشل لہجے میں بولے۔

”نن!..... نہیں بیٹا! ابھی یہاں مت آنا۔ ت..... تم کہیں دور نکل جاؤ۔ مجھے حالات اچھے نہیں آ رہے۔“

فضل چاچا کے پُر تشویش لہجے پر میں بھی پریشان سا ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پولیس کو ”گرین لاج“ میں گنیز کا سراغ نہیں مل سکا تھا تو پھر وہ مجھے کیوں گرفتار کرنا چاہتی تھی؟

مطلب تھا کہ بات صرف گنیز کو بازیاں کرنے کی حد تک ہی محدود نہ تھی، کوئی ایسی بات ضرور تھی جو سے بھی بڑھ کر اہم تھی اور وہ کیا بات تھی؟..... میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجانے لگی۔ میں۔

یکدم جب کو بریک لگا دیئے۔ ٹائر زور سے چرچرائے اور ویرانے میں جیپ کھڑی ہو گئی۔ میں نے ر واچ میں وقت دیکھا۔ ساڑھے پانچ کا وقت تھا۔ سڑک کے دورویہ چیز اور صندوق کے گھنے درختوں پر

کی کلاہٹ اترنے لگی تھی۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جانے اور انجانے دشمن مجھ سے زیادہ تیزی کے ساتھ میر خلاف کوئی جال بننے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ایسا جال جو مجھے ہر طرح سے گرفت میں لے کر

بس کر ڈالے۔ گنیز کا پراسرار ”غیاب“، ٹال کی تباہی اور اب پولیس کا میری تلاش میں گرین لاج آنا..... معاملہ میری سوچ سے بھی زیادہ گہرا ہونے لگا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں

کدھر جاؤں۔ ”گرین لاج“ کے سوا میرا اور کہیں بھی ٹھکانہ نہ تھا۔ میرے پاس سوچنے کے لئے بہت کم وقت تھا۔

مری کے یہ خواب ناک اور ہرے بھرے جنگل رات ہوتے ہی ہیبت ناک اندھیاروں میں جا جاتے تھے۔ چھ بجے کے بعد ٹریفک تقریباً مہطل ہو جاتی تھی۔ کوئی اکا دکا پرائیویٹ گاڑی بھی دیکھنے میں آ جاتی تو اور بات تھی۔ ورنہ تو اس پاس کا پورا ماحول خوفناک جنگل میں بدل جاتا تھا۔

بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ سر دست میرا ”گرین لاج“ جانا مناسب نہ تھا۔ مگر پھر کہاں جاؤں ابھی میں اس ادھیڑ نین میں مصروف تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی گاڑی کی روشنی دکھائی

دے دیا۔ ایک یوہو سے نظر میں ہٹا کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی سے سر نکال کر عقب میں دیکھا تو اس اگلی روشنی سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی موٹر بائیک تھی جس کی لمحہ بہ لمحہ قریب آتی ہوئی تھی۔

آواز اب واضح سنائی دینے لگی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔

بائیک میرے قریب سے گزری۔ اور پھر یکنگت اس کے پچھلے ٹائر کی چرچاہٹ اُبھری۔ میں چونک گیا اور پچھلی سیٹ پر غور بائیک سوار کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بائیک سوار واپس موٹر گاڑی کی طرف ہی بڑھنے لگا اور پھر جیسے ہی وہ ذرا قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ مردان شاہ تھا۔

میں جلدی سے دروازہ کھول کر جیپ سے اتر آیا۔ وہ بھی مجھے پہچان چکا تھا اور اپنی موٹر سائیکل سے

رک رہا۔ میری طرف لپکا۔ ”سلام صاحب!“ اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔

”ولیکم السلام!“ میں نے مختصر جواب دیا۔ پھر تیزی سے پوچھا۔ ”مردان شاہ! تم..... خیریت تو ہے؟..... کہاں جا رہے تھے اس وقت؟“

”میں آپ ہی کی طرف آ رہا تھا..... گرین لاج۔“ اس نے بھی تیز لہجے میں جواب دیا۔

”کیوں..... خیریت؟“ میں نے ٹھٹکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ پُر جوش ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا مضطرب بھی نظر آ رہا تھا۔ ”مجھے آپ کا پیغام ملا تھا۔“ وہ اپنے

خطرناک جوش کو دباتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اگر مجھے آپ کا پیغام نہیں ملتا، تب بھی میں آپ کے پاس ضرور آتا۔ مگر سر!..... آپ..... آپ یہاں، اس ویرانے میں کیوں کھڑے تھے؟“

”پہلے تم بتاؤ۔ کیا بات ہے؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔ ”سر! گرین لاج چلتے ہیں۔ وہاں میں ساری تفصیل آپ کو بتا دوں گا۔“

”نہیں، میرا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ تم بتاؤ، کوئی خاص بات ہے؟“ میں نے گرین لاج نہ جانے کی وجہی الوقت اسے نہیں بتائی اور اس نے بھی اصرار نہیں کیا۔

”کس..... سر جی! آپ..... آپ کی..... جان کو بہت شدید خطرہ ہے۔“ وہ تیزی سے بولا۔ ”بات کیا ہے آخر؟..... کچھ بتاؤ تو۔“

ابھی مردان شاہ نے کوئی جواب دینے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ اچانک ہمارے عقب سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی نمودار ہوئی۔ وہ کوئی گاڑی تھی جو تیز رفتاری سے اسی طرف آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا، مردان شاہ اس روشنی کو دیکھ کر بری طرح ٹھکا تھا۔ پھر فوراً گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”سر جی! دشمن آ رہے ہیں..... جلدی کریں، نکل چلیں یہاں سے۔“ میں اس کی بات پر بری طرح چونکا۔

”وقت کم ہے سر!..... خدا کے لئے جلدی کریں۔ آ..... آپ کی جان سخت خطرے میں ہے۔“ وہ بارہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے ایک لمحہ سوچا، پھر پھرتی سے اپنی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مردان شاہ تیزی سے اپنی موٹر سائیکل کی طرف بھاگا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی میں نے انہیں اسٹارٹ کیا اور پوری قوت سے

اگرنگ کرکھٹا چلا گیا۔ ٹائر کی تیز چرچاہٹ اُبھری اور جیپ نے یوٹرن لے لیا، اس کے ساتھ میں نے اسٹیل پیر پر اپنے جیکر کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔ جیپ کسی زخمی درندے کی طرح اسی سمت بڑھی جس طرف

سے وہ روشنی نمودار ہوئی تھی۔ میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ مردان شاہ بھی شاید اپنی بائیک پر میرے عقب میں آ رہا تھا۔ اسے میرے سیدھا نکل جانے کی بجائے سامنے سے آنے والی گاڑی کی سمت بڑھنے

پر زور حیرت ہوئی ہوگی۔

پھر فوراً ہی شاید مردان شاہ کو اس بات کا احساس ہوا اور اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے موڑ پر اپنی بانیک اندھیرے جنگل میں موڑ دی۔ سڑک کا یہ موڑ نسبتاً تنگ ثابت ہوا۔ میں نے جیب رفاکار قدرے کم کرتے ہوئے اسٹیرنگ موڑا تو جیب موڑ کاٹنے کے دوران کچے میں اتر گئی۔ میں نے اسٹیرنگ گھما کر جیب کو سڑک پر لانے کی کوشش کی تو وہ بری طرح لہراتے ہوئے میرے قابو سے رہو گئی۔ میں نے پوری قوت سے بریک لگا دیئے۔ جیب کے ٹائر زور سے چرچرائے اور پھر وہ الٹ لگا۔ مجھے ایک لمحے کو پوری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیب دھماکے کے ساتھ لیفٹ سائیڈ پر گر گئی تھی۔ خاصی دور تک چلتی سڑک پر پھسلتی چلی گئی۔ وٹا اسکرین کے ایک چھانکے سے ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی میرے حواس بھی محفل ہونے لگے۔ شکر تھا کہ انہوں نے میرا ابھی تک ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے حفاظتی سیٹ بیلٹ باندھ رکھے تھے۔ اسی لئے اُلٹے پلٹنے سے بچ گیا تھا۔ مگر بہر حال جیب نے مجھے سر میں چوٹیں آئی تھیں۔

جیب خاصی دور تک گھسنے رہنے کے بعد تھم گئی تھی۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دے کر اپنے مختلف تے حواس کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور مقدور بھر پھرتی کے ساتھ سیٹ بیلٹ کھول کر اپنے وجود کو آسمان طرف اٹھے ہوئے دوسرے دروازے کی کھڑکی سے باہر سڑک پر اچھالنے میں بہ مشکل کامیاب ہوا۔ مردان میں نے دیکھا، دشمنوں کی گاڑی بھی سر پر پہنچ کر زوردار چرچاہٹ کے ساتھ رک چکی تھی۔ تاکہ خطرے کے پیش نظر تیزی سے اپنی الٹی ہوئی جیب کی آڑ میں رینگ گیا اور پھرتی کے ساتھ اپنا گردن نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

میرے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور مجھے اپنے چہرے پر خون کی لکیریں سی رنگتی محسوس تھیں۔ پھر اس سے پہلے کہ مجھے دشمنوں پر فائر کرنے کا موقع ملتا، ایک بیک کئی رائفلیں ایک ساتھ رچیں۔ گولیوں کا ریلہا جیب کی طرف آیا اور جیب کو چھلنی کر کے رکھ دیا۔ کسی وقت بھی کوئی بھولی جنگلی دل فیول ٹینک میں بیوست ہو کر دیسی ساختہ بم کی طرح گاڑی کو اڑا سکتی تھی۔ اس لئے میرا ”برننگ ٹنٹ“ سے فوری طور پر دور ہو جانا اشد ضروری تھا۔ دشمنوں کی اندھا دھند فائرنگ سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ مجھے بہر صورت ہلاک کرنے کا عزم کئے ہوئے تھے۔ میرے عقب میں جنگل تھا۔ میں ٹھٹکے سے جیتے کی طرح پلٹا۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے بچتا بچتا، کہنیوں کے بل ریٹنگا تاریک جنگل میں مل گیا۔ میں نے اب اپنا میگارد ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور ایک درخت کی آڑ میں تاریکی کا حصہ بن کر مڑا ہوا گیا۔

بالآخر وہی ہوا۔ دفعۃً کسی گولی نے فیول ٹینک کو لیک کر دیا اور چشم زدن میں ایک ساعت شکن ماکے سے آگ بھڑک اٹھی..... پوری جیب دھڑا دھڑ شعلوں کی لپیٹ میں آگئی تھی۔ میں نے بغور نول کی طرف دیکھا۔ وہ تعداد میں چار تھے۔

انہوں نے اب فائرنگ کا سلسلہ موقوف کر ڈالا تھا۔ میں نے بہ غور ان کا جائزہ لیا۔ ان میں ایک صاف مضبوط اور توئمند شخص بھی تھا جو زیادہ پُر جوش اور سرگرم نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سیاہ رنگت کا۔ کثرت صورت شخص تھا۔ اپنے دیگر تین ساتھیوں کی لیدنگ شاید وہی کر رہا تھا۔ لہذا اس نے ہاتھ اشارے سے فائرنگ بند کرنے کا حکم دیا۔ پھر وہ چاروں گھٹیں تانے جلنے لگتی جیب کے گرد چکر مارتے گئے۔

”فکار نکل گیا ہے۔“ اسی کثرت صورت شخص نے دانت پیس کر اپنے تینوں ساتھیوں سے کہا۔ میں

میرے دونوں ہاتھ تختی سے اسٹیرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ نظریں وٹا اسکرین کے پار سامنے ہوئی گاڑی کی ہیڈ لائٹس پر مرکوز تھیں۔ فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ مردان شاہ نے اپنی بانیک جیب کی آڑ میں لگا رکھی تھی۔ میرا دل سینے میں بے تحاشا دھڑک رہا تھا اور اعصاب تن گئے تھے۔ لیمپس، ایک انٹر کولر ٹرپو کے تھے جس نے ذرا غریب پہنچتے ہی اپنی رفتار ہلکی کر دی تھی۔ وہ چار میرے برابر سے گزر سکتے تھے۔ مگر میری ہلکی ہوئی رفتار کو دیکھ کر اس گاڑی کے ڈرائیور نے بھی اپنی کم کر دی تھی۔ وہ سڑک کے عین درمیان میں تھے۔ یقیناً وہ میری گاڑی کا راستہ روکنا چاہتے تھے۔ ایک ٹیک گھورتی ہوئی سنسناتی نظروں نے ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی میں اس میں سوار مسافر افراد کی دیکھ لی تھی، جن کے تئو مجھے خطرناک ہی نظر آئے تھے۔ ہمارا درمیانی فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہو رہا تھا۔ رک گئے۔ یقیناً وہ گاڑی سے باہر نکل کر مجھ پر فائرنگ کرنا چاہتے ہوں گے۔ اسی لمحے میں نے فیصلہ کیا اور ایک لٹ اپنی جیب کی رفتار بڑھاتے ہوئے اسٹیرنگ کاٹا۔ گاڑی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ یقیناً وہ گاڑی کے برابر سے گزرتی چلی گئی۔ دشمنوں کی جیب کے سوار ہکا بکا اپنے ہتھیار سنبھال گئے۔ میں تو نکل آیا تھا لیکن مجھے اپنے عقب میں آتے ہوئے مردان شاہ کی فکر لاحق ہوئی۔ مگر بیک دیو مر میں دیکھا۔

وہ بڑی جرات اور مہارت کے ساتھ اپنی بانیک کو تیزی سے دوڑاتا ہوا میری دائیں جانب کی جیب کے بالکل متوازی بڑھا چلا آ رہا تھا۔ گویا ہم دونوں دشمنوں کا راستہ کاٹ کر نکل آئے تھے۔ لہذا کے باوجود مجھے مردان شاہ کی طرف سے فکر لاحق تھی۔

اسے راستہ دینے کے لئے میں نے اسے ذرا سی سائیڈ دی اور جیب کو پوری رفتار سے دوڑانے ساتھ ہی میری نظریں عقبی منظر پیش کرنے والے مرر پر بھی متحرک تھیں۔ دشمنوں کی انٹر کولر بھی اب تیز رفتاری کے ساتھ ہمارے تعاقب میں دوڑی آ رہی تھی۔

دفعۃً عقب سے گولیوں کی بھیاں ٹکڑ ٹکڑا ہوتی آئیں۔ بالکل غیر ارادی طور پر میں نے اپنا ہاتھ جھکا لیا۔ جیب کے عقبی شیشے کے ٹوٹنے کی آواز ابھری اور کئی گولیاں ”زنا زٹ“ کی آواز کے ساتھ جیب باڈی میں بیوست ہو گئیں۔ مجھے مردان شاہ کی طرف سے زیادہ تشویش تھی کیونکہ وہ بے چارہ بانیک ہمارے خیال میں اسے سڑک کی بجائے تاریک جنگل میں داخل ہو جانا چاہتے تھے۔ کیونکہ مجھے تھا کہ دشمن اسے نظر انداز کر کے میرے ہی تعاقب میں بدستور لگے رہیں گے۔ لیکن وہ جاں نثار شخص شاید تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مگر یہ اس کی بے وقوفی تھی۔ میں اسے چلا کر متنبہ بھی تو نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایک تو میری جیب کی رفتار بہت تیز تھی، دوسرے مجھے اس پر پوری طرح کنٹرول کرنا پڑا۔ سڑک بے شک کشادہ تھی لیکن مجھے موڑ بھی کاٹنے پڑ رہے تھے۔ پھر وہ بانیک پر تھا اور میں جیب میری حتی الامکان کوشش بھی تھی کہ وہ میری جیب کے آگے ہی رہے۔ اور یہ اس نے عقل مندی کر لی تھی۔ مگر باوجود اس کے، ایک بانیک کا انجن میری جیب کی رفتار کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ کہ وہ اکثر پیچھے رہ جاتا تھا۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ میں رک کر دشمنوں کا مقابلہ کروں لیکن اس کا تقاضا تھا کہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لیا جائے۔ چنانچہ فی الوقت راہ فرار اختیار کرنا ہی زیادہ تھا۔ عقب سے دشمنوں کی فائرنگ کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ ادھر مردان شاہ کے میرے ہوا کر آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے مجھے اپنی جیب کو فائرنگ کی زد سے بچانے کی کوشش کرنے دلائیں بائیں کرنے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی۔

کے لئے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ دفعتاً میں ایک آواز پر چونکا۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بے اختیار میرے حلق سے ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی۔ وہ آواز

شاہ کی موثر بانیک کی تھی۔  
وہ جلدی سے اتر آیا اور بانیک کو چھوڑ کر میری طرف بڑھا۔  
”آ..... آپ ٹھیک تو ہیں نا سر؟“

”ہاں..... میں ٹھیک ہوں..... جلدی کرو، اس مردود کو اپنے ساتھ لے چلتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ دفعتاً میں ایک آواز پر چونکا۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بے اختیار میرے حلق سے ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی۔ وہ آواز

شاہ کی موثر بانیک کی تھی۔  
وہ جلدی سے اتر آیا اور بانیک کو چھوڑ کر میری طرف بڑھا۔  
”آ..... آپ ٹھیک تو ہیں نا سر؟“  
”ہاں..... میں ٹھیک ہوں..... جلدی کرو، اس مردود کو اپنے ساتھ لے چلتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ دفعتاً میں ایک آواز پر چونکا۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بے اختیار میرے حلق سے ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی۔ وہ آواز

شاہ کی موثر بانیک کی تھی۔  
وہ جلدی سے اتر آیا اور بانیک کو چھوڑ کر میری طرف بڑھا۔  
”آ..... آپ ٹھیک تو ہیں نا سر؟“  
”ہاں..... میں ٹھیک ہوں..... جلدی کرو، اس مردود کو اپنے ساتھ لے چلتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ دفعتاً میں ایک آواز پر چونکا۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بے اختیار میرے حلق سے ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی۔ وہ آواز

شاہ کی موثر بانیک کی تھی۔  
وہ جلدی سے اتر آیا اور بانیک کو چھوڑ کر میری طرف بڑھا۔  
”آ..... آپ ٹھیک تو ہیں نا سر؟“  
”ہاں..... میں ٹھیک ہوں..... جلدی کرو، اس مردود کو اپنے ساتھ لے چلتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ دفعتاً میں ایک آواز پر چونکا۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بے اختیار میرے حلق سے ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی۔ وہ آواز

شاہ کی موثر بانیک کی تھی۔  
وہ جلدی سے اتر آیا اور بانیک کو چھوڑ کر میری طرف بڑھا۔  
”آ..... آپ ٹھیک تو ہیں نا سر؟“  
”ہاں..... میں ٹھیک ہوں..... جلدی کرو، اس مردود کو اپنے ساتھ لے چلتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ دفعتاً میں ایک آواز پر چونکا۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بے اختیار میرے حلق سے ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی۔ وہ آواز

شاہ کی موثر بانیک کی تھی۔  
وہ جلدی سے اتر آیا اور بانیک کو چھوڑ کر میری طرف بڑھا۔  
”آ..... آپ ٹھیک تو ہیں نا سر؟“  
”ہاں..... میں ٹھیک ہوں..... جلدی کرو، اس مردود کو اپنے ساتھ لے چلتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ دفعتاً میں ایک آواز پر چونکا۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بے اختیار میرے حلق سے ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی۔ وہ آواز

شاہ کی موثر بانیک کی تھی۔  
وہ جلدی سے اتر آیا اور بانیک کو چھوڑ کر میری طرف بڑھا۔  
”آ..... آپ ٹھیک تو ہیں نا سر؟“  
”ہاں..... میں ٹھیک ہوں..... جلدی کرو، اس مردود کو اپنے ساتھ لے چلتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ دفعتاً میں ایک آواز پر چونکا۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بے اختیار میرے حلق سے ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی۔ وہ آواز

شاہ کی موثر بانیک کی تھی۔  
وہ جلدی سے اتر آیا اور بانیک کو چھوڑ کر میری طرف بڑھا۔  
”آ..... آپ ٹھیک تو ہیں نا سر؟“  
”ہاں..... میں ٹھیک ہوں..... جلدی کرو، اس مردود کو اپنے ساتھ لے چلتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ دفعتاً میں ایک آواز پر چونکا۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بے اختیار میرے حلق سے ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی۔ وہ آواز

چاہتا تو یہاں سے ان پر گولیاں داغ سکتا تھا۔ مگر سروسٹ میرا اس طرح دم سادھے کھڑے رہتا تھا۔ بہتر تھا۔

”اس طرف سے جنگل میں داخل ہو جاؤ..... وہ اُدھر ہی گیا ہو گا۔“ اس نے چلا تے ہوئے غصہ لہجہ میں کہا۔ پھر اس کے تینوں ساتھی جنگل کی طرف تیزی سے بڑھے۔ ان کے پاس ہتھیار تھے۔ میری کنپئیاں سانس سانس کر رہی تھیں۔ میں نے ابھی انہیں چھیڑنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ وہ ابھی سمجھتے تھے کہ میں تاریک جنگل میں بہت آگے نکل چکا تھا۔ جب اس کے تینوں ساتھی اندر تاریک غرق ہو گئے تو میں نے سڑک پر چوس کھڑے کرخت صورت بد معاش کو دیکھا۔ اس کے بعد میں میگارد جیب میں ٹھونسا اور قد آدم جھڑپوں کی آڑ لیتا ہوا دوسری جانب سے ابھر کر یکدم سڑک پر دشمنوں کی انٹرکولر کی آڑ میں آ گیا اور ذرا سر اُبھار کر سامنے دیکھا تو وہ کرخت صورت بد معاش پلٹ کر قریب ہی اپنی گن تانے چوس کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا اور پشت میری سمت۔ مگر اسے چھانے کا ارادہ کیا اور انٹرکولر کی آڑ لیتا ہوا دے پاؤں اس کے عقب میں ابھرا۔ اس دوران میں میگارد نکال کر دوبارہ اپنے ہاتھ میں پکڑ چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے عقب میں آ کر میگارد اس کی گدی سے لگا کر میں سانپ کی طرح پھنکارا۔

”خبردار!..... کوئی حرکت مت کرنا..... ورنہ گولی مار کر بھیجے آزادوں گا۔“  
وہ جیسے یکدم ساکت کھڑا رہ گیا۔

”اپنی گن پھینک دو..... جلدی.....“ میں نے چنگھاڑتے ہوئے دوسرا حکم صادر کیا۔ اپنی گن دور سڑک پر اچھائی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے جھکانی دے کر اپنے دائیں ہاتھ کی کبھی پورانی سے میرے پیٹ میں رسید کر دی..... میں تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ پھر اس نے مجھے ڈانٹنے کی بجائے کا مونیج دیئے بغیر میرے رکوع کے بل جھکے ہوئے چہرے پر گھٹنا رسید کر دیا۔ میں لڑکھڑا کر بچے پیچھے گیا اور یو لور میرے ہاتھ سے نکلتا چلا گیا۔ وہ وحشی درندے کی طرح غراتا ہوا مجھ پر جھپٹا۔ نام نہان چشم زدن میں خود کو سنبھالا اور اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے جھپٹ پڑا۔

ڈیل ڈول اور قد و قامت کے لحاظ سے ہماری برابر کی نکرتھی۔ اس کے علاوہ اس کا انداز ظاہر تھا کہ وہ لڑائی بھڑائی کے معاملات سے بخوبی واقف تھا۔ اس کے ابتدائی دو حملوں نے مجھے خاصاً پریشان کیا تھا۔ مگر اس تکلیف نے میرے اندر ایک جنوں خیز لہر کو جنم دیا تھا۔ میں نے اسے خالص طریقے سے اڑنکا لگا کر سڑک بوس کر ڈالا اور اچھل کر اپنے دونوں گھٹنے سیڑ کر اس کے پیٹ پر دے دیئے۔ اس کے حلق سے پھینپنے کے ذکرانے جیسی آواز بلند ہوئی تھی۔ میں اب اس کے پیٹ اور سوار ہو گیا تھا جبکہ اس کی موٹی گردن میرے دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں آچکی تھی۔ میں اس کا لٹیرا چلا گیا۔ اسے بھی اندازہ ہو چلا تھا کہ اس کا مقابل ہم پر کیا تھا۔ لہذا اس نے اپنے دفاع میں ایک جھک کر وٹ بدلی اور میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ میرے پہلو کے بل گرتے ہی اس نے ایک جھک میری گردن پر کمزور پڑتی گرفت کو چھڑا لیا اور ساتھ ہی اپنی داہنی ٹانگ کی بھر پور ضرب میرے رسید کرنا چاہی تو میں نے بھی فوراً اپنے پیٹ کو اس کی قیامت خیز ضرب سے بچاتے ہوئے اپنے گھٹنے سیڑ لے لئے اور بائیں ہاتھ کا مکا اس کی ناک پر جڑ دیا۔ یہ مکا کسی عام انسان کا نہیں بلکہ ایک اسٹینن رکھنے والے اسپورٹس ایتھلیٹ کا تھا۔ نتیجتاً اس کی ناک کا بانسہ ٹوٹ گیا اور اس کی زخمی ناک بھل بھل خون بہہ کر اس کے چہرے کو مزید دہشت انگیز بنا رہا تھا۔ یہ ایک بھر پور ضرب تھی جن

”سرا کیا اس طرح پولیس ہم سے انصاف کر پائے گی؟..... میرا مطلب ہے آپ کی غیر چوٹی میں؟“ وہ بولا۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ بغیر کسی ثبوت اور میری عدم موجودگی میں یہ سب اتنا سان نہ تھا۔

”میری مائیں تو سرا! اس رذیل کے ہاتھ پاؤں توڑ کر کسی گہری کھائی میں.....“ مردان شاہ نے ارے لہجے میں ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک وہ خاموش ہو گیا۔ ”یہ ہوش میں آ رہا ہے سرا“ اچانک مردان شاہ نے مضطرب سی آواز میں کہا۔ میں نے یکدم گاڑی سڑک کے کنارے تاریکی میں روک دی۔

”بچے مڑ کر دیکھا۔“  
 بلال عرف کالا ناگ کے بے سدھ وجود میں حرکت پیدا ہونے لگی تھی۔ مردان شاہ نے ہاتھ میں پڑی ہوئی گس ان پر تان لی اور میں نے بھی اپنا میگارد ہاتھ میں لے لیا۔ انجن میں نے گاڑی روکنے ہی کر دیا تھا۔

”اے باہر دھکیلو۔“ یہ کہتے ہوئے میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر چاندنی میں اتر گیا۔  
 بلال عرف کالا ناگ اب پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا۔ مردان شاہ نے اسے گن پوائنٹ پر باہر لیل کر نیچے اتار دیا۔

”شفاف آسمان پر دیکھتے چاند کی روشنی میں اس کا خون آلود چہرہ بڑا بھیانک نظر آ رہا تھا۔ خون اس کی ہڈیوں تک سے بہتے رہنے کے بعد چہرے پر جم کر خشک ہو چکا تھا۔ وہ سنسنائی ہوئی نظروں سے ہم لوگوں کو خاموشی سے گھورے جا رہا تھا۔“

”بلال عرف کالا ناگ! تم نے میرے ٹال کو آگ لگائی اور پھر مجھے قتل کرنے کے ارادے سے اپنے ہاتھوں سمیت روانہ ہوئے۔ کیوں، غلط کہہ رہا ہوں میں؟“ میں نے غضب آلود لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میرا خیال تھا کہ میری معلومات اس کے لئے حیرت کا باعث ہوں گی۔ مگر اس نے مجھے حیرت سے بے جا کر دیا۔ میرا سوال سننے کے بعد بھی وہ مجھے کینہ توڑ نظروں سے گھورتا رہا پھر بڑی ڈھٹائی سے دانت بٹا کر بولا۔“

”ہاں..... پھر.....؟“  
 مجھے اس کی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری پر طیش آ گیا۔ میں نے جوش غیظ سے مغلوب ہو کر اپنے میگارد کی نال اس کے بدبخت دہانے میں حلق تک ٹھونس دی اور سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں بلال عرف کالا ناگ!..... اور تُو بھی مجھے اچھی طرح جان لے۔ برا نام یاد علی خان ہے۔ چند ٹکوں کے عوض جن لوگوں نے تجھے میرے پیچھے لگا رکھا ہے، وہ عنقریب برس ہاتھوں عبرت ناک انجام کو پہنچنے والے ہیں۔ بول، اب تیرا کیا حشر کروں؟“

”اس کی چندی چندی آنکھوں میں استہزائیہ مگر سفاک چمک لہرائی، جس میں انگاروں کی تیش بھی نکل رہی تھی۔“  
 میں نے اسے بولنے کا موقع دینے کے لئے اس کے کمرہ دہانے سے نال واپس کھینچ لی تو وہ نفرت سے گردن موڑ کر تھوکنے کے بعد بولا۔

”یاد علی خان! ابھی کالا ناگ اتنا سستا نہیں ہوا کہ کوئی اسے چند ٹکوں کے عوض خریدنے کی جرأت کر سکے اور نہ ہی میرے دشمن اتنے سستے ہوئے ہیں کہ میں انہیں محض موت جیسی معمولی سزا سے دوچار

میں نے اسے سب سے پہلے اپنے ”گرین لاج“ نہ جانے کی وجہ بتائی، پھر اس سے پوچھا مجھے کون سی اہم خبر دینا چاہتا تھا؟

”سر جی! پھر ایسا کرتے ہیں، آپ میرے ساتھ ہی غریب خانے پر چلے چلے۔ وہیں اطمینان باتیں ہوں گی۔“

”مگر وہاں تو تمہارے گھر والے ہوں گے۔ اور ہمیں اس مردار بلال عرف کالا ناگ کا منہ بھی ہو گا۔“ میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”گھر میں میرے بوڑھے باپ ایک بہن کے سوا اور کوئی نہیں۔ رہی بات اس بلال عرف کالا ناگ کا منہ کھلوانے کی تو ضرورت کیونکہ میں سب جانتا ہوں کہ کس کے اشارے پر یہ سب ہو رہا ہے۔“  
 ”کیا ٹال کو آگ لگانے میں اس کا ہاتھ تھا؟“

”بالکل..... اسی بدبخت نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر گن پوائنٹ پر پہلے ہمیں باہر اس کے بعد ٹال پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔“ وہ بتانے لگا۔ ”جب یہ لوگ اپنی کارروائی کے واپس لوٹنے لگے تو میں نے ایک دوست کی موٹر سائیکل پر ان کا تعاقب کیا تھا۔ پھر ان کے ٹھکانے پہنچ کر میں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو بھی سن لی تھی۔ بلال کالا ناگ آپ کے دشمنوں نظر حیات اور شاہ میر کا شتر کہ غلام ہے اور یہ گیل اس بدبخت نے ان کے پر کھلایا تھا۔“

”ہوں.....“ میں نے ہونٹ بھیج کر طویل پُرسوج ہیکاری بھری۔  
 ”اور سرا!.....“ وہ مزید بتانے لگا۔ ”نظر حیات اور شاہ میر ہی کے اشارے پر اب یہ غیبت عرف کالا ناگ آپ کو بھی ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ یہ ناپاک منصوبہ بنانے کے بعد یہ لوگ آپ کی ”گرین لاج“ روانہ ہوئے تھے۔ مگر میں ان خونی ہرکاروں سے پہلے آپ کے پاس پہنچ کر آپ کو کرنے آ رہا تھا۔“

”ان کا وہ ٹھکانہ بتاؤ جہاں تک تم نے ان کا تعاقب کیا تھا اور ان کی آپس میں ہونے والی بندی کے بارے میں آگاہی حاصل کی تھی۔“ میں نے گھیر لہجے میں پوچھا تو اس نے مجھے ان کے ٹھکانے کا تفصیلی محل وقوع وغیرہ بتا دیا۔

”یہ ان کا خاص الخاص ٹھکانہ ہے سر جی!“ ٹھکانے سے متعلق تفصیل بتانے کے بعد مردان پُرجوش لہجے میں بولا۔

”تم ایک کام کرو مردان شاہ!“ میں نے گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے اس سے کہا۔  
 ”جی سر! حکم کریں۔“ وہ جاں نثارانہ مستعدی سے بولا۔

”پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لئے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ ورنہ یہ کام میں خود ہی انجام ڈالتا۔ تم ایسا کرو کہ بلال عرف کالا ناگ کو اسی وقت متعلقہ تھانے لے جا کر پولیس کے حوالے کر دو۔ وہاں رپورٹ لکھوا چکا ہوں۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں سر! میں اس کتے کو ابھی وہیں لے جاتا ہوں۔ مگر آپ.....؟“  
 ”میری فکر ابھی چھوڑو..... میں تمہیں مذکورہ تھانے کے ذرا قریب ہی چھوڑ دیتا ہوں۔“  
 کام بہت ہوشیاری اور حاکم دہی سے انجام دینا ہو گا۔



کرنے کی بے وقوفی کرتا ہوں۔ ہاں، تمہارے اس دم چھلے نے.....“ اس نے گن تائے کہ مردان شاہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”شاید ہمارا تعاقب کر کے ہماری ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ علی خان! میں تمہیں ہلاک کرنے کی بے وقوفی کی نیت سے تمہارے پاس نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ تمہاری اور بر بادی کا نوہ سنانے کے لئے تم سے ملنا چاہتا تھا۔“

مجھے اس کی بات پر ایک جھکا سا لگا۔ مجھے اس کا لہو انگیز لہجہ بتاؤٹی یا جھوٹا محسوس نہیں ہوا تھا۔ ”کیوں؟..... تمہاری مجھ سے بھلا کیا دشمنی ہے؟“ میں نے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا۔ ”دشمنی نہیں..... خون دشمنی کہو نا در!“ وہ وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ ”کیوں کہ تم نے میرے

ملک سردار خان کا خون کیا تھا۔“ میں اس کے اس چونکا دینے والے سنسنی خیز انکشاف پر ایک لمحے کے لئے سن سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ”ملک سردار خان میرا بڑا بھائی تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تیری ماں شینہ اور مامو گل کا نمک خوار بھی تھا..... مگر تم نے بے دردی سے اس کا خون کر ڈالا۔“ وہ میری کیفیت سے خبر اپنی رو میں کبے جا رہا تھا۔ ”اس نے ایک بے گناہ لڑکی صدف کو قتل کرنے کے احکام جاری کئے تھے۔“ اس بار مجھ سے

رہا گیا۔ ”مگر یہ کام اس نے تمہاری ماں اور تمہارے ماموں حیدر گل کے حکم پر ہی کیا تھا۔“ کالا ناگ غرا۔ ”یہ بہت لمبی کہانی ہے..... تمہارا اس.....“ وہ اچانک میری بات کاٹ کر غیظ آلود لہجے میں بولا۔ ”مجھے کسی لمبی کہانی سے کوئی سروکار نہیں۔ تم جتنی اونچی اڑان بھرنے کی کوشش کر رہے ہو، عنقریب زخمی چڑیا کی مانند پھڑ پھڑاتے ہوئے کھائی میں گرنے والے ہو۔ میں یہی تماشا دیکھنے کے لئے بے تاب ہوں۔ اسی لئے اب میں تمہا دشمنوں سے مل چکا ہوں۔“

اس سفاک گفتگو پر میرا ذہن بری طرح سائیں سائیں کرنے لگا اور سینے میں ہلچل سی مچنے لگی تھی۔ ”سرجی! حکم کریں..... اس کا لے ناگ کو اب زندہ چھوڑنا ہمارے مفاد میں نہیں ہوگا۔“ شاہ جو اب تک خاموش تھا، دانت پیس کر مجھ سے بولا تو کالا ناگ نے صرف ایک بار سنسنی خیز سے اسے گھورا، پھر اس کے بد ہیئت ہونٹوں پر خاموش سی سفاک مسکراہٹ ابھری۔ میں نے مردان کی بات کو نرسر..... از کرتے ہوئے کالا ناگ سے کہا۔

”میں تمہاری دلیری کی داد دیتا ہوں اور بہادر دشمن کی دل سے قدر کرتا ہوں..... تم نے پھر کے مجھے اس اقدام پر مجبور کر دیا ہے کہ میں تیرا گھمنڈ توڑنے کی خاطر تجھے زندہ چھوڑ دوں تاکہ دوبارہ تیرا میرا سامنا ہو تو تجھے تیری اصل اوقات پر لا کر بھیا تک انجام سے دوچار کروں۔“

”ہا..... ہا..... ہا.....“ میری خونخوار دھمکی پر اس نے ایک بد مست قہقہہ بلند کیا اور بولا۔ ”تم اپنی خیر مناد اور مجھے اپنی تباہی کے خوش کن منظر سے لطف اندوز ہونے دو۔ کیونکہ پولیس نے نہ میرے سوہنے بھائی ملک سردار خان کی لاش برآمد کر لی ہے بلکہ وہ آگ قتل بھی اس کے ہاتھ لگ گیا جس پر تمہارے فکر پرش موجود ہیں۔ کتنا مزہ آئے گا جب میں ماں بیٹے اور ماموں کو جیل کی سائے کے پیچھے دیکھوں گا۔ اور ہاں، یاد رکھنا، تم تک تمہاری مرحلہ وار تباہیوں کی خبریں میں خود پہنچاتا رہوں میں اس کے اس لرزا دینے والے انکشاف پر یکدم سنانے میں آ گیا تھا۔“ اور ہاں.....“

سنسنی خیز انکشافات کے انداز میں بولا۔ ”بے فکر رہو..... تم تینوں خدراؤں کی تباہی کے بعد میں آئے آرام سے جیل کے اندر ہی سب سے پہلے تمہاری خدراؤں کی تباہی کو خود موت کی نیند لاؤں گا۔ اس کے بعد تمہاری باری۔ ہا..... ہا..... ہا.....“

وہ وحشتانہ انداز میں قہقہے لگانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ٹوٹی ناک اور زخموں کی شدت کے باعث پوری طرح کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ تاہم اس کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ اس نے ہلکورے لیتے بدن کا تسخرانہ انداز مجھے بری طرح سلگا گیا۔ پھر جیسے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ شاید دانستہ مردان شاہ کی طرف لڑکھڑا گیا۔ مجھے اس کی اس لگا دینے والی دیکھنا نہ چاہی۔ وہ گن پوائنٹ پر ہونے کے باوجود کیوں اتنی دلیری دکھا رہا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی میں نے اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچی تو وہ دانستہ قریب کھڑے مردان شاہ کی طرف لڑکھڑا گیا اور دوسرے ہی لمحے جیسے ایکا اکی اس کے منہ وجود میں پارا دوڑ گیا۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلٹ کر مردان کے ہاتھ پر چھڑا اور بیک وقت اپنی ایک لات میرے میگا روڈ والے ہاتھ پر بھی جڑ دی۔ میگا روڈ میرے ہاتھ سے سا گیا۔ دوسری طرف اس نے مردان شاہ سے گن جھٹکتے ہی اسے اس کے زور پر دور دھکیل دیا اور میں نے دیکھا کہ مردان شاہ سے چھینی ہوئی گن کا رخ اس کی طرف کرتے ہی ٹرائیگر دیا۔ اس کے ٹرائیگر انے سے صرف ایک بل پہلے میں نے اس کی پشت پر لات رسید کر دی تھی۔ اس کی خوفناک گن سے بڑی خوفناک آواز ابھری مگر عین وقت پر میری لات اس کی پشت پر پڑنے کی وجہ سے نہ صرف اس کا

بنا خطا ہو گیا بلکہ وہ خود بھی ڈکراتا ہوا مردان شاہ کے اوپر جا پڑا۔ مردان شاہ نے فوراً بیدار مغزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس کی کٹ پر دونوں ہاتھ جماتے ہی گھٹنے کی زوردار ضرب اس کی ناف کے نیچے رسید کر دی۔ کالا ناگ کے حلق سے تیل کے ڈکرانے جیسی ہیبت ناک آواز برآمد ہوئی مگر اس نے گن نہ چھوڑی۔ مردان شاہ اس کی گن پر ہی اپنے دونوں ہاتھ جما کر اچھلا اور اپنی دونوں ٹانگیں اس کے پیٹ پر ٹکا دیں۔ نتیجتاً کالا ناگ جھٹکا چلا گیا۔ مردان شاہ نے عام روایتی ساداؤ بروقت آزمایا تھا لیکن کالا ناگ بھی ایک کانیاں تھا۔ اس نے مردان شاہ کے بوجھ کا سہارا لیا اور دو تین زوردار پھیریاں لگا کر مردان شاہ کو ہکا بکاتے ہوئے دور اچھال دیا۔ گن کالا ناگ کے ہاتھوں میں ہی رہ گئی۔ اس موقع پر میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور اسپرنگ کی طرح اچھل کر اس پر جھست لگا دی۔ میری دونوں ٹانگیں فلائنگ کلک کے انداز میں اس کے چہرے پر پڑیں اور وہ کئی قدم پیچھے لڑکھڑا کر زمین بوس ہو گیا۔ میں نے تاک کر ایک

ات اس کی گن پر رسید کی تو وہ اس کے ہاتھوں سے نکلتی چلی گئی۔ میں گن اٹھانے کے لئے لپکا۔ اور جیسے ہی گن اٹھا کر اس کی طرف گھوما تو وہ خبیث اپنی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے گاڑی اشارت کی۔ میں نے گن کا رخ گاڑی کی کھڑکی سے نظر آتے کالا ناگ کی طرف موڑا۔ مگر تب تک وہ گاڑی اشارت کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا چکا تھا۔ میں نے لمبی دبا دی۔ گن نے آتشیں قہقہہ اٹھا کر گولیاں دور ہوتی انٹر کلر کے شیشوں کو توڑنے کے سوا کچھ نہ کر سکیں۔

میں اس کی بیک ریڈ لائٹ کو دور ہوتے بے بسی سے دیکھنے لگا۔ اس اثنا میں مردان شاہ بھی ہانپتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

”یہ حرام زادہ تو نکل بھاگا سر!“ وہ دانت پیس کر بولا۔

”ہاں.....“ میں نے مختصر کہا۔

”سر! اب ہم واپس کس طرح چلیں گے؟“ وہ پریشانی سے بولا۔

”پیدل چلنے کے علاوہ اور دوسری کوئی صورت نہیں ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ شہر یہاں سے دور نہیں ہے۔“

میں نے اپنا میگارد تلاش کر کے اسے اپنے قبضے میں کیا اور بلال عرف کالا ناگ سے چھینی ہوا

دور تاریک جنگل میں پھینک دی۔

”تمہاری موٹر بائیک تو گاڑی میں ہی رہ گئی۔“ میں نے چلتے ہوئے اس سے کہا۔

”ہاں.....“ مگر مجھے پرواہ نہیں اس کی۔ شکر ہے آپ کی جان بچ گئی۔“ وہ بھڑا ہوا

انداز میں بولا۔ ”سر! اب کیا ہوگا؟ حالات آپ کے لئے تو بہت خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔ اب

یہ بد بخت بلال جیسا خطرناک ناگ۔“

”مجھے اس کی پرواہ نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”مجھے دوسری فکر کھائے جارہی

میرے دشمنوں نے مجھے قانونی اور غیر قانونی ہتھکنڈوں میں جکڑنا شروع کر دیا ہے۔“

”سر! آپ فکر نہ کریں..... میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔“ مردان شاہ فوراً بولا۔ ”آپ

کریں، میرے ساتھ میرے ہی گھر چلے چلیں۔ جب تک حالات موافق نہیں ہو جاتے، آپ کا اب

نکلنا صحیح نہیں۔“

میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اب یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ پولیس نے ”گرین لانا“

صرف نگینہ کی تلاش میں چھاپہ نہیں مارا تھا بلکہ وہ مجھے ملک سردار خان کے قتل کے جرم میں گرفتار کر

ارادہ رکھتی تھی۔ مجھے کالا ناگ کے سنسنی خیز انکشافات نے خاصی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس نے

بڑے بھائی ملک سردار خان کی لاش اور آلہ قتل، جس پر یقیناً میرے ہی فکر پرش ہو سکتے تھے، کے

ہونے کا جو انکشاف کیا تھا، میں اسے جھوٹ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ اگر یہ جھوٹ ہوتا تو بھلا کالا ناگ

کس طرح معلوم ہوتا کہ یہ قتل میں نے ہی کیا تھا؟

میں دماغ پر زور دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر یہ سب کیوں اور کیسے ممکن ہوا تھا؟ میں مرط

حالات کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ میں چلتے چلتے یکدم رک

مردان شاہ بھی رک گیا تھا۔ تاہم وہ کچھ بولا نہیں۔ شاید اس نے میرے چہرے کے پڑسوج اور

تاثرات سے اندازہ لگالیا تھا کہ میں اس وقت کہاں گم تھا۔

مجھے یاد آنے لگا کہ جب میں نگینہ کے اغواء اور قتل کے شبے میں ملک سردار خان کا تعاقب کر

ہوئے (اس دوران میں نے اس پر قابو بھی پایا تھا) پرانے ریٹ ہاؤس میں پہنچا تھا اور ملک سردار

نے موبائل پر اپنے ساتھی غفورے کو ”لڑکی“ کو ٹھکانے لگانے کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ وہ

جسے میں نگینہ سمجھے ہوئے تھا، صدف تھی۔ غفور اس کا گھلا دیوچ کر اسے ہلاک کر چکا تھا۔ میں نے کجا

تھا کہ اس نے ملک سردار خان کے سفاکانہ حکم کے مطابق نگینہ کا قتل کر ڈالا ہے تو میں اپنے ہوش و دم

میں نہ رہا تھا اور غصے کی شدت سے دیوانہ ہو کر میں نے ملک سردار خان کی پیشانی میں گولی مار دی تھی

پستول وہیں پھینک کر دیوانہ وار غفورے کی خبر لینے دوڑ پڑا تھا۔ مگر وہ خبیث اس وقت وہاں سے

لمبے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جب میں کبیر سے نمٹ کر باہر نکلا تو ملک سردار خان کا

دھڑکے ہاتھ سے نکلا ہوا پستول وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ ملک کی لاش غائب ہونے پر میں خاصا  
ڈر رہا تھا مگر بعد کے واقعات کے باعث وہ سب میرے ذہن سے اتر گیا تھا۔ تاہم اب کالا ناگ کے  
سنسنی خیز انکشاف کے بعد کہ پولیس ملک سردار خان کی لاش کو آلہ قتل سمیت برآمد کر چکی ہے، مجھے یہ  
سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ ملک سردار خان کی لاش کو آلہ قتل سمیت غائب کرنے میں ضرور کبیر  
کا ہی ہاتھ ہوگا۔ جس نے اسے میرے خلاف ترپ کا پتا سمجھ کر وہیں کہیں ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔ اس کے  
عداس نے دو کام کئے۔ ایک تو کالا ناگ کو میرے خلاف بھڑکایا، دوسرے پولیس کو لاش سمیت آلہ قتل  
راہم کر کے میرے پیچھے لگا دیا۔

ساری صورت حال مجھ پر واضح ہو گئی تھی اور میرا دماغ سنسنائے لگا۔ میری رگوں میں خون کی بجائے

گردش کرنے لگا تھا۔

”مردان شاہ! حالات واقعی جان لیوا حد تک خطرناک ہو گئے ہیں۔“ ساری صورت حال سمجھ میں

نے کے بعد میں نے مردان شاہ کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”ارے سر! آپ کیوں فکر کرتے ہیں؟ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ بس آپ اب میرے ساتھ چلیں

ے گھر۔“ وہ پرجوش ہو کر بولا۔ میں نے قدم بڑھا دیئے۔

”مردان شاہ! تم نے پہلے ہی میری خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری دشمنی

آگ تم تک پہنچے.....“

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں سر؟“ اس نے بے اختیار میری بات کاٹ ڈالی تھی۔ ”میں نے تو

پ کا منک حلال کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ پر کوئی احسان تو نہیں کیا۔ بلکہ آپ نے ہم تمام

دوروں پر جو احسانات کئے ہیں، ان کے سامنے میری کوشش کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ نہیں سر! میں

پ کو اس آڑے وقت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔“ وہ جذباتی ہونے لگا تھا۔

میں چند ٹائپے خاموشی سے چلتا رہا۔ پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو مردان شاہ! پھر تم مجھے تنہا

نہو۔ تم سمجھتے ہو کہ میں حق پر ہوں اور راہ حق کے مسافروں کی اللہ ضرور مدد کرتا ہے۔ کیا ہوا کہ میرے

نوں نے اپنی مکاری سے مجھے پریشان کر دیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ بالآخر حق میری ہی ہوگی۔ تم

میرے لئے دعا کرتے رہنا کہ خدا مجھے اس راہ پر قائم رکھے۔“

میں نے دیکھا، میری بات پر اس کی آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے سر جھکایا

آنکھوں کے گوشوں کو آستین سے صاف کیا۔ تب میں نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”تم رونے لگے؟“ میں نے آہستگی سے پوچھا۔

”جی سر! یہ غربت کے آنسو ہیں۔ آپ نے واقعی آج مجھے میری اوقات یاد دلادی کہ نوکر، نوکر بنی

ہے۔ اپنے مالک کے دکھ سکھ کا سامھی نہیں بن سکتا۔“ اس نے عجیب رقت آمیز جذباتی لہجے میں کہا۔

میرا دل بچ گیا۔ میں نے بے اختیار اسے اپنے گلے سے لگالیا اور بولا۔

”اے یار مردان شاہ! یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے؟..... میں نے تجھے اپنا نوکر کب سمجھا ہے؟ تو تو

اوست ہے۔ ایک وفادار اور جاں نثار دوست۔“

میری بات پر یکدم اس کا آرزوہ چہرہ کھل اٹھا۔

”بس سر! میرے لئے یہی اعزاز کافی ہے۔ آپ مجھے آزما کر تو دیکھیں، میں آپ کی خاطر جان لڑا

ں گا۔“

مردان شاہ ایک محنت کش اور شریف انفس نوجوان تھا۔ مگر اس کے اندر وفا اور غیرت بھی کر  
کر بھری ہوئی تھی۔ جب ہی تو اس نے اپنی جان پر کھیل کر میرے ٹال کو آگ لگانے والوں کا تہا  
تھا۔ راولپنڈی کے بدنام زمانہ غنڈے اور ٹیکسٹر کالا ناگ سے ٹکری تھی۔ مگر میں مردان شاہ  
خطرناک دشمنی کی آگ میں جھونکننا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ میرے شانہ بٹانہ چلنے پر ایضاً تھا۔  
نے بھی چپ سادہ لی۔ بالآخر ہم گرتے پڑتے کشمیر پوائنٹ کے قریب سالار ریٹ ہاؤس پر پہنچے۔  
یہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ”سالار ریٹ ہاؤس“ کے گرد ایک گول سڑک تھی، یہاں بے شمار ہوٹل اور  
خانے تھے۔ جو اس وقت بند پڑے تھے۔ یہیں سے مال روڈ شروع ہوتا تھا جس کے انتہائی سرے  
ٹال تھا جو اب جل کر محض خاک کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا۔ مردان شاہ کا گھر البتہ یہاں سے پیدل  
پر تھا۔

ہم ذرا دیر اس مقام پر سستانے کے لئے رکے اور پھر چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں  
شاہ کے گھر پہنچ گئے۔

مردان شاہ کا گھر چھوٹا مگر پختہ اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ مجھے داخلی دروازے کے ساتھ دیوار کی  
جانب ایک پت والا دروازہ بھی دکھائی دیا۔ اس پر باہر سے ٹالا لگا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ  
دروازہ تھا۔

بیٹھک کے دروازے پر ٹالا نظر آنے کی وجہ اس وقت سمجھ میں آگئی جب مردان شاہ نے اپنی  
سے چابی نکال کر اسے کھولا۔ یقیناً رات دیر سے گھر لوٹنے کے خیال سے ہی اس نے یہ ٹالا لگایا ہوگا  
دونوں اندر داخل ہوئے۔ بیٹھک بہت مختصر مگر صاف ستھری تھی۔ چند کرسیوں کے علاوہ ایک چھوٹا  
چارپائی بھی اس کمرے میں موجود تھی۔ اس نے کھکا دیا تو بجلی کا بلب روشن ہو گیا۔

میں ایک کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ مجھے ایک چھوٹا دروازہ  
دکھائی دیا تھا جو غالباً اندر صحن میں کھلتا تھا۔

”سرجی! یہ جگہ آپ کے شایان شان نہیں..... مگر.....“

”مردان شاہ!“ میں نے اس کی بات کاٹ کر ہولے سے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”ان باتوں کو چھوڑو  
کی میری نظروں کے سامنے کوئی اہمیت نہیں۔ اور ہاں، مجھے ”سر“ بھی مت کہا کرو۔“

”مم..... مگر..... سر!“ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کہ نہ سکا۔

”جب خود کو تم میرا دوست سمجھتے ہو تو پھر دوست ہی سمجھو..... صرف نادر خان۔ سمجھے؟۔  
اب بیٹھو۔“

”میں آپ کے لئے کھانے پینے کو کچھ لے آؤں۔“ اس نے اندر صحن میں کھلنے والے دروازے  
طرف بڑھتے ہوئے کہا تو میں نے اسے روک دیا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔ ہاں، اگر تمہیں آرام کرنا ہے تو تم جا سکتے ہو۔“

”نہیں..... مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔ آپ بھی پریشان ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ پھر  
پُر جوش سے لہجے میں بولا۔ ”ایسا کرتے ہیں، میں چاہے بنا کر لے آتا ہوں..... پھر سر جوڑ کر آتا  
کوئی لاکھ لکھ سوچتے ہیں۔“

مجھے اس کی بات معقول لگی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مردان شاہ چونکہ صدق دل کے ساتھ میرا دست راست بن چکا تھا اس لئے اسے اپنے حالات

بارے میں تفصیلاً آگاہ کرنا ضروری تھا۔ لہذا چائے پینے کے دوران میں اسے آہستہ آہستہ اب تک کے  
سارے حالات سے بلا کم و کاست آگاہ کرتا چلا گیا۔ وہ بڑے غور اور توجہ کے ساتھ سنتا رہا۔ کم و بیش پون  
تھن کے بعد وہ گہری سانس لے کر پُر عزم لہجے میں بولا۔

”میں آپ کے اس اعتماد کی دل سے قدر کروں گا کہ آپ نے مجھے ایک دوست کے ناطے ہی نہیں  
بلکہ بھائی سمجھتے ہوئے اپنے معاملات سے آگاہ کیا ہے۔ آپ اب بے فکر ہو کر آرام کریں۔ صبح تازہ دم  
ہو کر سوچیں گے کہ ہمیں سب سے پہلے قدم کون سا اٹھانا ہے۔“

میں نے اس کی بات پر دھیرے سے اپنے سر کو اٹھائی جھبش دی۔ پھر وہ ٹرے اور کپ سیٹے چلا گیا۔  
چارپائی پر بستر موجود تھا۔ میں لائٹ آف کر کے اس پر دراز ہو گیا۔

مردان شاہ کے ساتھ نے مجھے ذہنی طور پر کافی سہارا دیا تھا۔ میں ال قدر تھکا ہوا تھا کہ پریشان کن  
ذیالات کے باوجود گہری نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

\*\*\*

مجھے اندازہ نہیں ہے کہ میں کتنی دیر تک سویا۔ اچانک کسی نے مجھے بی طرح جھنجھوڑا اور ایک کرخت  
آواز میری سوتی جاگتی ساعتوں سے ٹکرائی۔  
”اٹھو!..... اٹھو!“

میں ہڑبڑا کر اٹھا اور اپنے اطراف مستعد پولیس والوں کو دیکھ کر سناٹے میں آ گیا۔ وہ تعداد میں پانچ  
چہرے ہوں گے جن کی قیادت انسپٹر اعجاز شمس کر رہا تھا۔ یہ وہی انسپٹر تھا جسے عدالت نے میرے باپ  
نادر علی خان مرڈر کیس کی نئے سرے سے تفتیش کرنے پر مامور کیا تھا۔ چالیس کے پینے میں، گینڈے  
جیسی جسامت کا ایک خاصا بھاری بھر کم روایتی پولیس آفیسر تھا۔

”نادر علی خان! خود کو پولیس کی حراست میں سمجھو۔ مجھے امید ہے کہ قانون شکنی نہیں کرو گے۔“ مجھے  
جاگتا پا کر وہ پاٹ دار آواز میں بولا اور میں نے خاموشی کے ساتھ گرفتار ہونے کی بات  
کی۔ جب مجھے ہتھکڑیاں لگا کر گھر کے باہر کھڑی موبائل میں سوار کیا جا رہا تھا تب میں نے دیکھا کہ ایک  
ضعیف شخص دونوں ہاتھ جوڑ کر اعجاز شمس کے سامنے گر گڑا رہا تھا۔ وہ یقیناً مردان شاہ کا بوڑھا باپ ہی ہو  
گا۔ وہ گر گڑا تے ہوئے انسپٹر سے کہہ رہا تھا۔

”انسپٹر صاحب! ام..... میرا بیٹا بے قصور ہے۔ اسے چھوڑ دو..... وہ مجھ بوڑھے کی لاشی ہے  
اور ایک جوان بہن کا واحد سہارا ہے۔“

اس کی فریاد کا انسپٹر اعجاز شمس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ میرا جگر جھنجھن ہو گیا۔ موبائل کی طرف اٹھتے  
میرے قدم رک گئے اور میں انسپٹر اعجاز سے مخاطب ہو کر سنجیدگی سے بولا۔ ”انسپٹر صاحب! آپ بے  
ٹٹک مجھے گرفتار کر لیں مگر مردان شاہ کو چھوڑ دیں۔ اس میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اس کا باپ درست نہ  
رہا ہے۔“

میری بات پر اس نے ایک طنز یہ نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور روایتی پولیس والے لہجے میں بولا۔  
”ایک مجرم کو پناہ دینے والا بہت بڑا قصور وار ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ڈرائیوگ کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ دو  
پولیس والے مجھے دھکیلتے ہوئے موبائل تک لے گئے اور میں مردان شاہ کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

میری ہتھکڑی کی زنجیریں ایک سپاہی نے اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام رکھی تھیں۔ موبائل ایک  
ٹھکے سے آگے بڑھی تو عقب میں مردان شاہ کا بوڑھا باپ روتا چلا تا رہا۔ لگا۔ مردان شاہ کی آنکھیں

”واہ انپکڑ صاحب! آپ نے کمال کر دیا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ لاش اور آلہ قتل برآمد ہو جانے کے بعد یہ خونی شخص آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مگر.....“

اس کی بات قریب بیٹھے اس کے دم چھلے کالا ناگ نے اچک لی۔ وہ ایک نفرت بھری نگاہ میرے چہرے پر ڈالتے ہوئے خوشامدی لہجے میں بولا۔

”اپنے انپکڑ شخص صاحب کوئی معمولی انسان نہیں ہیں۔ انہوں نے تو بڑے بڑے مجرموں کا پتہ صاف کر رکھا تھا کبیر صاحب! مجھے ہی دیکھ لیں، مجھ جیسے کوئیل ڈال کر آخر شریفانہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دی دیا ہے۔“

مجھے اس مرد کی آواز زہر لگ رہی تھی۔ میں خاموشی سے یہ سب سنتا رہا۔ البتہ اندر ہی اندر میں بری طرح سلگ رہا تھا۔ کالا ناگ جیسے خطرناک بد معاش کو کھانے میں دیکھ کر مجھے قدرے حیرت سی ضرور ہوئی تھی۔ انپکڑ اعجاز شخص اور کالو کا معاملہ کچھ عجیب دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں کے تہرے پر انپکڑ اعجاز شخص کی گھٹی مونچھوں تلے ہونٹوں پر ایک پُر غرور اور تفاخر آمیز مسکراہٹ ابھری۔ پھر وہ میز سے اپنا سیاہ رول (بید) ہاتھ میں لئے اٹھ کھڑا ہوا اور میری طرف چند قدم بڑھا۔ اس کے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہی کبیر اور کالا ناگ بھی ایک دم سے کھڑے ہو کر میری طرف رخ کر کے انپکڑ شخص کے قریب کھڑے ہو گئے۔

اب وہ تینوں برے کی طرح چبھتی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کی طرف گھورے جا رہے تھے۔ ”نادر علی خان! تم سمجھتے تھے کہ تمہارا بھیا یک جرم قانون کی نظروں سے پوشیدہ رہے گا.....“ معا انپکڑ شخص نے سیاہ رول کو اپنے بائیں ہاتھ کی پھیلی پر ہولے ہولے مارتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ پھر ہنکارا لے کر دوبارہ بولا۔ ”تم اپنے جرم کا اقرار کرو گے یا پھر اس کے لئے ہمیں روایتی تشدد سے کام لینا ہو گا؟“

اس کے انداز پر جانے کیوں مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر چیونٹیاں سی رہتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ ایک سوال میں نے بڑی ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

”ملک سردار خان کی لاش تم تک کیسے پہنچی؟“

میرے سوال پر انپکڑ کے ہونٹوں پر فخریہ مسکراہٹ ابھری۔ کہنے لگا۔ ”کسی بھلے مانس نے گمنام اطلاع دی تھی۔“

میں اس کے جواب پر الجھے بغیر جان گیا کہ یا تو وہ کبیر کا نام چھپا رہا تھا یا پھر یہ گمنام اطلاع کسی اور نے دی تھی۔

”اب کوئی سوال نہیں۔ صرف میری بات کا جواب دو۔“ انپکڑ شخص مجھے خاموش پا کر اس بار ذرا کرفت لہجے میں بولا۔

میں کچھ نہیں بولا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ مجھے ہی نہیں بلکہ میری ماں اور ماموں حیدر گل کو بھی قانونی شکبے میں پھنسانے کے لئے دشمنوں نے دہری چال چلی تھی۔ اگر میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا یا با القاعدہ دیگر میں اپنے دفاع میں قتل کا سبب یہ بتاتا کہ میں نے ملک سردار خان کا قتل اس اشتعال انگیزی میں کیا تھا کہ اس نے ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی (صدف) کے قتل کے احکامات اپنے مفرد سامنے غور سے کو جاری کئے تھے تو مجھے لالچالہ یہ بھی بتانا پڑتا کہ ملک سردار خان کو یہ سفاک حکم کس نے دیا تھا۔ یوں میری ماں اور ماموں حیدر گل کا کیس کمزور پڑ جاتا۔ پھر ہم تینوں بھی قانون کے شکبے میں بری طرح

اپنے ضعیف باپ کی حالت پر بھگینے کو تھیں کہ اس نے اپنی آنکھیں بھیج لیں اور سر نیچے جھکا دیا۔ مگر کتنے لگا۔ اسے میرا ساتھ دینے کی پہلی اور کڑی سزا بھگتنا پڑ رہی تھی۔ ساتھ ہی مجھے اپنی فاش غلطی کا احساس ہونے لگا تھا۔ ہم یہ بھول گئے تھے کہ کالا ناگ مجھے مردان شاہ کے ساتھ دیکھ چکا تھا اور اس ہی بعد میں کسی طرح پولیس کو میرے بارے میں مطلع کر دیا ہو گا۔

میرے دمن ایک مربوط طریقے سے آپس میں سختی ہو چکے تھے اور بڑے منظم انداز میں دوسرے کے ساتھ روابط استوار کئے مجھ پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مرگرج حیات کا بیٹا کبیر تھا جو میرا قریب بھی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسی نے سب سے پہلے کالا ناگ کو اپنے رشتہ شامل کیا ہو گا۔ موبائل تیز رفتاری کے ساتھ مال روڈ پر دوڑی جا رہی تھی۔ پھر سالار ریست ہاؤس کے چوراہے سے وہ پنڈی جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔

موبائل اپنا راستہ تیزی سے طے کر رہی تھی اور میری سوچوں کو بھی گویا پر لگ گئے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مردان شاہ کے گھر پر پولیس کی آمد کے پیچھے کبیر اور کالو کی خبری کار فرما تھی۔ کبیر نے اس وقت سے نظریں رکھے ہوئے تھا جب نگینہ سے میرے ”معاملات دل“ کا آغاز ہوا تھا۔ اسی باعث اس نے میرے ماضی کو کھنگال ڈالا تھا اور اس کے ذریعے نگینہ کو مجھ سے متفرق کرنے کی کوشش تھی۔ ایک طرف کبیر تھا، جو نگینہ کی خاطر میرے خلاف میدانِ عمل میں اُترا ہوا تھا۔ دوسری طرف حیات پھر شاہ میر اور اب کالو..... گویا مجھے اب چاروں طرف سے دشمنوں نے گھیر لیا تھا۔ اب تک انہیں مسلسل کامیابیاں مل رہی تھیں اور اس کی وجہ ان سب کا بیک وقت میرے خلاف محاذ پر آنا تھا۔ مجھے اس لمحے یوں محسوس ہوا کہ اگر یہی صورت حال رہی تو وہ اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب بھی ہو سکتے تھے۔

ملک سردار خان کا میرے ہاتھوں قتل مری سے تقریباً پچاس کلومیٹر پنڈی کی حدود میں ہوا تھا اور منصفہ تھانے کی جو حدود آتی تھی، وہاں انپکڑ اعجاز شخص کی قانونی عمل داری تھی۔

تھانے پہنچتے ہی مجھے اور مردان شاہ کو فی الفور حوالات میں بند کر دیا گیا۔

”یہ..... اچھا نہیں ہوا نادر صاحب! یہ اچھا نہیں ہوا۔“ مردان شاہ جیل کی سیلن زدہ دیوار اپنی پشت ٹکا کر ننگے فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میرے ساتھ تم بھی بے قصور دھر لئے گئے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے کہا بھی تھا تم سے کہ.....“

”نہیں نادر صاحب! ایسا نہ کہیں۔“ وہ اچانک میری بات کاٹ کر بولا۔ ”مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ تو جلد یا بہ دیر چھوٹ ہی جاؤں گا۔ مگر آپ کا معاملہ مجھ سے زیادہ نازک ہے۔“

”اللہ مالک ہے..... دیکھیں، آگے کیا ہوتا ہے۔“

ذرا دیر گزری تو دو پولیس والے مجھے جھکڑیاں ڈالے انپکڑ اعجاز شخص کے کمرے میں لے آئے وہاں پہنچ کر میں بری طرح ٹھنکا۔

”انپکڑ اعجاز شخص کی میز کے سامنے ان دونوں افراد کو دیکھ کر میری کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ وہ دونوں کبیر اور کالا ناگ تھے۔“

مجھے جھکڑیاں لگے دیکھ کر کالا ناگ اور بالخصوص کبیر کے چہرے پر مسرت انگیز لہر ابھر آئی تھی۔ ایک گہری نگاہ میرے چہرے پر ڈالنے کے بعد بڑی مکاری سے توصیفی لہجے میں بولا۔ اس کا معاملہ انپکڑ اعجاز تھا۔

پھنس جاتے۔ میں نے لمحاتی سوچ بچار کیا، پھر پر اعتماد انداز میں انپکٹر کو دیکھ کر بولا۔  
”یہ قتل میں نے نہیں کیا۔“

”ہوں.....“ انپکٹر اعجاز شمس کے حلق سے بے اختیار طویل ہنکارا برآمد ہوا۔

”یہ..... یہ جھوٹ بول رہا ہے انپکٹر صاحب!“ اچانک کالا ناگ پھٹ پڑا۔ ”یہ میرے بھائی قاتل ہے۔ یہ باتوں سے نہیں مانے گا۔“

”تم چپ رہو کالو!“ معاذ انپکٹر اعجاز شمس نے اسے ٹوکا۔ پھر مجھ سے بولا۔ ”تو گویا تم ایسے نہیں گے؟“ اس کے لہجے میں سفاکانہ سرسراہٹ تھی۔

میں نے اپنے دفاع میں کہا۔ ”مجھے حیرت ہے انپکٹر صاحب! کہ آپ نے محض ایک گناہ پر لاش برآمد تو کر لی مگر آپ کو یہ کیسے علم ہوا کہ یہ قتل میں نے ہی کیا ہے؟“

”آلہ قتل پر تمہارے فنگر پرنش موجود ہیں۔“ وہ دانت پیس کر بولا۔  
”کیا اتنی جلدی فنگر اسپیشلسٹ نے رپورٹ بھی دے دی؟“ میرے لہجے میں ہلکا طنز درآ رہا تھا۔

”زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں نادر!“ وہ کرخت لہجے میں بولا۔ ”تمہارے اس کا ایک چشم دید گواہ بھی یہاں موجود ہے۔“

میں اس کی بات پر بری طرح ٹھنکا۔  
”کبیر صاحب! ذرا بتاؤ اسے کہ تم نے بدھ اور جمہرات کی درمیانی شب کیا دیکھا تھا؟“ وہ فز

کھڑے کبیر سے طنز یہ انداز میں مخاطب ہو کر بولا اور میں سنائے میں آ گیا۔  
”میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے ملک سردار خان کی پیشانی پر گولی مارتے دیکھا تھا۔“ کبیر

میری طرف گھورتے ہوئے انپکٹر سے کہا اور میں سفید جھوٹ پر ششدر رہ گیا۔  
”تفصیل بتاؤ۔“ انپکٹر بدستور میرے چہرے پر اپنی جھپتی ہوئی نظریں مرکوز رکھتے ہوئے بولا اور

تفصیل بتانے لگا۔  
”آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ اس کی ماں اور ماموں حیدر گل نے ہم سے جانے کون سی پرانی

کے بدلے میری چھوٹی معصوم بہن صدف کو اغواء کروایا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ کام بھی اسی غلطی نے ہی انجام دیا ہو گا۔ چون کہ میں اس کا دست راست رہ چکا تھا لہذا میں اس کے خفیہ ٹھکانوں

بخوبی واقف تھا۔ اس رات بھی اس کا تعاقب کرتا ہوا اس پرانے ریٹ ہاؤس پر پہنچا تو یہ میرے ملانے

ملک سردار خان کی پیشانی پر گولی مار کر فوراً اندر بھاگا تھا۔ تب تک اس کا ساٹھی غفورا، جو ابھی تک غم

ہے، اس ظالم کے حکم پر میری بہن صدف کا گلا دبا کر معصوم کو ہلاک کر چکا تھا اور..... اور.....

کہنے کے بعد وہ مگر مجھ کے آنسو بہانے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اپنی بہن کے قتل پر وہ ایک ایسا غم

گیا ہو۔  
”یہ سراسر بکواس کر رہا ہے انپکٹر صاحب!“ میں جلا کر بولا۔  
”خاموش!“ اعجاز شمس نے دھاڑ کر کہا۔  
”انپکٹر! یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے خود محکمہ جنگلات کے کنزرویٹو آفیسر

کی بیٹی گنیز کو اغواء کیا تھا..... اور.....“  
”بس..... اب تم سچ کو جھوٹ میں بدلنے کی کوشش مت کرو۔“ انپکٹر میری بات کاٹ کر زہر

لہجے میں بولا۔ ”میں آج ہی فنگر پرنش کی رپورٹ تیار کروا کر تمہیں دکھائے دیتا ہوں۔ تمہاری ما

دھائی اور ہٹ دھرمی ناک کے راستے بہہ نکلے گی۔“  
”انپکٹر! آپ صرف اس سے ایک سوال تو پوچھ لیں کہ اگر اس نے ملک سردار خان کا قتل کرتے

ہوئے دیکھ لیا تھا تو پھر اب تک خاموش کیوں رہا؟..... اسے تو اسی وقت پولیس کو میرے خلاف پر

رپورٹ لکھوا دینی چاہئے تھی۔“ میں نے کبیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انپکٹر سے پرجوش لہجے میں کہا

تو اس کی بجائے کبیر نے اس کا جواب دیا۔  
”تمہارے جیسے سنگ دل انسان کے خلاف میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا..... کیونکہ تم نے

ملک سردار خان کا قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کہیں چھپا دی تھی اس لئے میں پہلے لاش اور آلہ قتل برآمد

کرنا چاہتا تھا اور میں بدستور تمہاری ٹوہ میں رہنے لگا۔ بالآخر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا اور فوراً

پولیس کو مطلع کر دیا۔“  
میں خونخوار نظروں سے اسے گھورنے لگا۔ اس نے میری ایک فاش غلطی سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔

اس کی یہ بات تو بہر حال مبالغہ نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ میری بدستور ٹوہ لئے ہوئے تھا۔  
میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ گلینز پر اسرار طور پر غائب تھی۔ جبکہ صدف مرڈر کیس کا ایک اہم مجرم

غفورا ہنوز مفروضہ تھا۔ میں نے اب تک کبیر اور بلال عرف کالا ناگ کے گٹھ جوڑ سے متعلق جو بھی محتاط

اندازے قائم کئے تھے، وہ سب ایک ایک کر کے درست ثابت ہو رہے تھے۔  
کبیر اپنا ٹرمپ کارڈ بڑی کامیابی کے ساتھ کھیل چکا تھا۔ اور میں بری طرح سے دشمنوں کے بچھائے

ہوئے جال میں گرفتار ہو گیا تھا۔  
انپکٹر اعجاز شمس نے مجھے یہ دھمکی دینے کے بعد کہ فنگر پرنٹ کی رپورٹ کے بعد وہ مجھ سے اچھی

طرح نئے گا، مجھے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا تھا۔

\*\*\*

دشمن نہ صرف مجھے بلکہ میری ماں اور ماموں حیدر گل کو بھی اپنا ٹارگٹ بنا چکے تھے۔ بلکہ میں ان کی

ہٹ لسٹ میں ٹاپ پر تھا۔  
حالات گجٹلک ہو چکے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، کیا ہو گا؟ اور میں کیا کروں؟ گلینز کی

طرف سے مجھے الگ فکر و تشویش لاحق تھی۔ میری گرفتاری کے بعد تو دشمنوں کا راستہ صاف ہو چکا تھا۔ وہ

اسے بے آسانی تلاش کرنے کے بعد اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ سب سے پہلے

مجھے سین وقت پر گرفتار کروایا گیا تھا۔ یہ ساری سازش قادر علی خان مرڈر کیس کو اپنے حق میں بدلنے کی تھی

جو میرے دشمن بڑی کامیابی اور شاطرانہ ذہنیت کے ساتھ کر رہے تھے۔

حوالات میں، میں نے ساری تفصیل اپنے انڈیشوں کے ساتھ مردان شاہ کو بتا دی تھی۔

”میرا آزاد ہونا بہت ضروری ہو گیا ہے نادر صاحب!“ مردان شاہ نے دبے دبے جوش سے کہا۔ میں

اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔ وہ پھر بولا۔ ”مگر میں اپنے لئے نہیں، آپ کے لئے رہا ہونا چاہتا

ہوں نادر صاحب! میں آپ کے خلاف دشمنوں کی چالوں کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں، کسی

طرح گلینز بہن کے ساتھ غفور کے کا بھی سراغ لگاؤں۔“

میں اس کی ذہانت اور ذوق فہمی پر عرش عرش کراٹھا اور جوش مسرت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ دھرتے

ہوئے بولا۔ ”مردان شاہ! تم بالکل درست خطوط پر سوچ رہے ہو۔ یہی دو افراد دشمنوں کی چال اٹھنے کا

باعث بن سکتے ہیں۔“

بدست کر دیں۔ یہ رہا ہوتے ہی عینہ کی تلاش میں لگ جائے گا۔“  
 ”ہاں..... ویسے میں انکسٹر اعجاز جس سے مل کر رہی آ رہا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں، کم از کم مردان  
 شاہ کو رہا کر ادوں۔“ وہ بولے۔ اس کے بعد وہ چلے گئے۔

فیجر مشتاق گوندل بھی آیا تھا۔ اس کے ساتھ مردان شاہ کا بوڑھا باپ اور بہن بھی آئی تھی۔ مجھے ان  
 دونوں پر بے انتہا ترس آ رہا تھا۔ تاہم میں نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا تھا کہ مردان شاہ کا جرم زیادہ  
 عینہ نہیں ہے۔ وہ دو ایک روز میں رہا ہو جائے گا۔“

اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ اعظم خان صاحب کی اس سلسلے میں کوششیں رنگ لائیں اور مردان شاہ کو  
 فیضی ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ جبکہ میرا عدالت سے سات روز کا ریماٹھ لے کر تفتیش شروع کر دی گئی۔  
 ایڈووکیٹ حامد ہمدانی صاحب بھی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ وہ بھی موجودہ اور اچانک بگڑی ہوئی  
 محذوشت صورت حال پر خاصے متفکر اور پریشان نظر آ رہے تھے۔

تاہم انہوں نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ میں ہرگز اقبال جرم نہ کروں۔ اس دوران وہ کوئی نکتہ سوچنے کی  
 کوشش کریں گے۔

میں نے انہیں ساری حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن جب انہوں نے بھی اعظم خان صاحب کی یہ  
 بات دہراتے ہوئے اس خدشے کا اظہار کیا کہ میری گرفتاری کے معاملے کو صدف مرڈر کیس یا بالفاظ  
 دیگر قادر علی خان مرڈر کیس سے تضحی کر کے میری ماں اور ماموں حیدر گل کا کیس کمزور کرنے کی کوشش کی  
 جائے گی تو میں نے ٹھوس لہجے میں ایڈووکیٹ ہمدانی صاحب سے یہ کہہ ڈالا۔  
 ”وکیل صاحب! آپ کوشش کیجئے گا کہ مجھے ماں اور ماموں حیدر گل کے کیس سے الگ ہی رکھتے  
 ہوئے مقدمہ چلایا جائے۔“

وہ میری بات پر حیران اور پریشان نظر آنے لگے اور پھر اسی لہجے میں بولے۔ ”مگر تار! اس طرح تو تم  
 ہی طرح قانون کی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔“

”میرا اللہ مالک ہے وکیل صاحب!“ میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ”میرا کیس کمزور ہے۔ میں نہیں  
 پانتا کہ میری وجہ سے ماں اور ماموں حیدر گل کا کیس متاثر ہو۔ آپ بس اپنی ساری توجہ میری ماں اور  
 ماموں حیدر گل کو رہا کرانے پر مرکوز رکھئے گا۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان عظیم ہوگا۔“

میرے حسی فیصلے پر وہ پریشان ہو کر صرف اتنا بولے۔ ”مگر..... تم.....!“  
 ”میں اپنی الگ راہ دیکھ لوں گا۔ اللہ میرے ساتھ ہے۔“

ایڈووکیٹ ہمدانی صاحب فکر مند چہرے کے ساتھ مجھے تسلی دے کر واپس لوٹ گئے۔

اگر عدالت سے سات روز کا ریماٹھ لینے کے بعد انکسٹر اعجاز جس کے تیسرے کچھ خطرناک سے نظر آنے  
 لگے۔ میرا خیال تھا کہ اعظم خان کے درمیان میں آنے سے وہ کچھ خیال کرے گا۔ مگر یہ میری خام خیالی  
 تھی۔ تیسرے روز مجھے اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ مگر اس کے کمرے میں نہیں بلکہ محفوت خانے  
 میں۔ جہاں کا منظر ہی دل پر دہشت طاری کرنے کے لئے کافی تھا۔

دیواروں کا پلستر اکھڑا ہوا تھا اور سلین زدہ فرش کی طرف دیکھتے ہوئے کراہت کا احساس ہوتا تھا۔  
 محبت قدرے بلند تھی۔ جس کے وسط میں لوہے کی فولادی چوٹی کے ساتھ موٹا سا سر جھول رہا تھا۔ مجھے  
 یوں لگا جیسے یہ کوئی مذبح خانہ تھا جہاں تھالی بکڑے ذبح کر کے اسے چھت سے جھولتے ہوئے رے سے  
 لٹکا کر اس کی کھال کھینچتے ہوں۔ روح فرسا ازیت گاہ کو دیکھ کر ایک لمحے کو میں اندر سے لرز اٹھا تھا۔

”لیکن نادر صاحب! میرا خیال تھا کہ غفور سے زیادہ عینہ بہن کا سراغ لگانا ضروری ہوگا۔“  
 پُرخیال لہجے میں بولا۔ ”جبکہ غفور اٹلا آپ کی والدہ اور ماموں حیدر گل کے لئے مصیبت بھی بن سکتا  
 کیونکہ.....“ وہ اچانک کچھ کہتے کہتے دانستہ رکاوٹیں اس کی ادھوری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے  
 دھیمی آواز میں بولا۔

”میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں مردان شاہ! تم یہ کہنا چاہ رہے ہو نا کہ غفور نے تو میری  
 ماں اور ماموں حیدر گل کے ایما پر صدف کا خون کیا تھا مگر ایسا نہیں تھا۔“  
 وہ خاموش مگر مستفسرانہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں..... جب میرے دل سے اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کی طرف سے یہ غلط فہمی نکل گئی  
 انہوں نے ہی میرے باپ کا خون کیا تھا تو میں نے ایک موقع پر ماموں حیدر گل سے اس ایسے  
 بارے میں بڑے دکھ کے ساتھ ذکر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے دیرینہ انتقام کی آگ میں ایک بے گناہ  
 معصوم لڑکی کو کیوں مروا دیا تو ماموں حیدر گل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ میری ماں کو اکثر و بیشتر سمجھاتا رہتا  
 کہ وہ اپنے شوہر (میرے باپ قادر علی خان) کے انتقام کی آگ صرف اس کے اصل قاتلوں (نظر  
 اور شاہ میر) تک ہی محدود رکھے۔ کوئی بے گناہ اس کی بھیٹ نہ چڑے۔ لیکن جب میری ماں نے  
 دیکھا کہ اس کے شوہر کے قاتلوں نے اس کے بیٹے یعنی مجھے بھی اس کی ماں کے خلاف کر دیا ہے تو  
 نے آتش انتقام میں مغلوب ہو کر یہ انتہائی قدم اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اور ملک سردار خان کو صدف  
 خون کرنے کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ مگر ماموں حیدر گل کے سمجھانے پر وہ اپنے فیصلے پر  
 ہوئی تھیں اور انہوں نے یہ احکامات واپس لے لئے تھے مگر افسوس تب تک دیر ہو چکی تھی۔“ یہاں تک  
 کر میں خاموش ہو گیا۔

وقت انجانے دوسوں اور اندیشاک لمحات کی خبر دیتا ہوا بھاری سل کی طرح سرک رہا تھا۔  
 انکسٹر اعجاز جس نے اس روز لاش کا پوسٹ مارٹم اور آکٹھ قتل پر فنگر پرنس کی رپورٹ تیار کروائی تھی۔  
 چونکہ ہمارا کیس پہلے ہی عدالت میں چل رہا تھا، لہذا اس معاملے کو بھی صدف ایڈووکیٹ قادر علی مرڈر کیس  
 کے ساتھ تضحی کر دیا گیا تھا۔

ماں اور ماموں حیدر گل بھی میری طرح جیل کی سلاخوں کے پیچھے مقید تھے۔ میری گرفتاری کی خبر  
 تک بھی ضرور پہنچ چکی ہوگی۔ بلکہ صرف ان تک تو بعد میں پہنچی ہوگی، پہلے تو آزاد لوگوں تک پہنچی ہوگی  
 کیونکہ مجھ سے سب سے پہلے ملاقات کے لئے آنے والے اعظم خان تھے۔

”یہ..... یہ سب کیسے ہو گیا نادر بیٹے؟“ وہ پریشان ہو کر بولے۔  
 میں نے مختصر انہیں ساری روداد بیان کر دی۔ وہ چند ٹاپے کے لئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے  
 ”انکل! آپ میری فکر چھوڑیں اور خدا کے لئے کسی طرح عینہ کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ  
 اس کی زندگی بھی خطرے سے دوچار ہو سکتی ہے۔“

”نادر بیٹے! معاملہ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ گہیر ہو چکا ہے۔ سارے شواہد تمہارے خلاف چل رہے  
 ہیں۔ بڑی مشکوکوں سے تو کیس کے جیتنے کی امید پیدا ہوئی تھی۔ اب اس تازہ صورت حال نے سب  
 بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ دشمنوں نے بڑی گہری چال چلی ہے۔ رہی بات عینہ کی تلاش کرنے کی تو میرا  
 ہے، اب یہی آخری امید بنتی ہے کہ اس کا پتہ چل جائے۔“  
 ”جی ہاں انکل!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”لیکن انکل! آپ کسی طرح مردان شاہ کی ضمانت

جلاد کا ہاتھ چابی ختم ہونے والے کھلونے کی طرح رک گیا۔  
لیکن مجھے نیچے نہیں اتارا گیا تھا۔ البتہ ایک سپاہی معنی خیز مسکراہٹ سے جلاد کی طرف دیکھتا ہوا اذیت  
گاہ سے نکلتا چلا گیا۔ میں ہوا میں جھولتا، ہانپنے لگا۔ تھوڑی دیر گزری تو میری نیم وا آنکھوں نے انسپکٹر اعجاز  
خس کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور وہ میری طرف دیکھتے ہوئے  
تنبیہ آمیز انداز میں بولا۔

”بس نادر میاں!..... اتنی سی دیر میں سارے کس بل نکل گئے؟“

”انسپکٹر!“ میں اپنی جسمانی اذیتوں کو جوش جنوں کے پہاڑ تلے دباتے ہوئے لبورنگ لہجے میں بولا۔  
”بے شک میں نے ملک سردار خان کا قتل کیا تھا۔ مگر انسپکٹر! یہ کسی بے گناہ کا قتل نہیں تھا۔ بلکہ ایک  
شک انسان کا قتل تھا۔“ میں اتنا ہی کہہ سکا۔ اس کے بعد میری قوت برداشت ختم ہو گئی۔ مجھ پر یکایک  
بی ٹی سی طاری ہونے لگی تھی۔ میرا سر ایک طرف کو ہلک گیا اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

\*\*\*

میری دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے خود کو سلاخوں کے پیچھے پایا۔ میں اوندھے منہ فرش پر بے سدھ پڑا  
تھا۔ حواس بیدار ہوتے ہی مجھے جسمانی ٹیسوں کا بھی احساس ہوا اور بے اختیار میرے حلق سے درد بھری  
کراہیں خارج ہو گئیں۔ قید خانے کے باہر رابرداری میں بلب کی بیماریاں روشنی نظر آرہی تھیں۔

نہ جانے میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔ میں نے دانتوں تلے اپنی تکلیف کو دبایا، پھر اپنے معزوب  
جسم کو حرکت دی۔ مجھے درد انگیز ٹیسوں کے ساتھ اپنے زخموں پر ٹھنک کا بھی احساس ہوا۔ میں نے  
بے مشکل اپنے وجود کو کھینٹ کر دیوار کے ساتھ ٹکایا اور ایک ہاتھ پشت پر لے جا کر زخم پر لگایا تو مجھے  
چکانہٹ کا احساس ہوا۔ تب مجھے اندازہ ہوا تھا، انسانیت سوز تشدد کے بعد میرے زخموں پر کوئی مرہم  
دیرہ بھی لگا دیا گیا تھا۔

کوئے میں پانی کا گھڑا رکھا تھا جس کے اوپر جست کا ایک ٹیڑھا میڑھا گلاس بھی اوندھا دھرا ہوا تھا  
میں اپنے حواس بحال کرنے کے بعد گھڑے کی طرف بڑھا اور گلاس اندر ڈال کر پانی بھرا اور اپنے لبوں  
سے لگا دیا۔ چند گھونٹ بھرنے کے بعد مجھے اپنے اندر کڑواہٹ کی محسوس ہوئی اور پھر میں جلدی جلدی دو  
گلاس غٹ غٹ چڑھا گیا۔

میرا اوپری بدن ابھی تک برہنہ تھا۔ ذرا دیر گزری تو ایک سنتری آیا۔ اس کے ہاتھ میں پرانے  
کپڑوں کا ایک جوڑا تھا۔ اس نے سلاخوں کے درمیانی خلا سے ہاتھ اندر لے جا کر وہ میری طرف اچھال  
دیا اور بولا۔ ”اے پھن لے..... ذرا دیر بعد تجھے پھر انسپکٹر صاحب کے سامنے پیش ہونا ہے۔“ یہ کہہ  
کر وہ واپس لوٹ گیا۔

میں لباس تبدیل کر چکا تو دو سنتری مجھے لینے آ گئے۔ میرے دونوں ہاتھوں میں جھکڑیاں ڈال کر  
یہاں انسپکٹر اعجاز خس کے کمرے میں لے گئے۔

وہ اپنا میز کے عقب میں دھری بھاری بھر کم کرسی پر بڑے ٹھسے کے ساتھ براجمان تھا۔ اس کی دونوں  
ہاتھ میز پر دھری تھیں اور وہ ہاتھ میں سیاہ رنگ کا رول پلڑے ہوئے تھا جس سے وہ ہولے ہولے اپنی  
پائیں ہاتھ کی پھٹی کو ”تھپتھا“ رہا تھا۔

اس کی تیز نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میری نگاہیں میز کے وسط میں پیپر ویٹ کے نیچے دبے  
ایک اسٹامپ پیپر پر پڑیں جس کے نیچے ایک عدد قلم بھی رکھا ہوا تھا۔

کمرے میں انسپکٹر اعجاز خس کے علاوہ مجھے لانے والے دو سپاہی اور ایک نیم برہنہ سا کالا بڑا  
قصائی صفت جلاد بھی کھڑا مجھے اپنی لال انگارا آنکھوں سے گھورے جا رہا تھا۔

عقوبت گاہ کے گٹھے گٹھے اور سیلین زدہ ماحول سے میرا جی اٹھنے لگا۔ ایک عجیب سی ناگوار بدبو  
دماغ سینے کے قریب ہو رہا تھا۔ معاً انسپکٹر اعجاز خس گونجیلی آواز میں مجھے مخاطب کر کے بولا۔

”نادر! میں آخری موقع دے رہا ہوں تمہیں۔ اپنا جرم سیدھی طرح قبول کر لو۔ یہ صورت دیگر  
پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔“ اس کا اشارہ قریب کھڑے قصائی صورت جلاد کی طرف تھا  
مجھے بڑی بے چینی سے خونخوار نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ میں نے اپنے شل پڑتے اعصاب پر  
پاتے ہوئے انسپکٹر خس سے کہا۔

”انسپکٹر! میں کوئی عادی مجرم نہیں ہوں جو تم میرے ساتھ ایسا انسانیت سوز سلوک کرنا چاہتے ہو۔  
ایک پڑھا لکھا شہری ہوں۔ ہمارا مقدمہ عدالت میں.....“

”بکواس بند کرو اپنی۔“ اچانک ہی وہ میری بات کاٹ کر خونخوار آواز میں دہاڑا۔ ”تم نے آؤ  
شریفانہ موقع بھی گنوا دیا۔ مگر اب بس.....“ وہ یہ کہتے ہوئے جلاد کو ایک مخصوص اشارہ کر کے غبر  
اپنا پاؤں سینٹے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

اب وہاں میرے اور جلاد کے علاوہ صرف دو سپاہی موجود تھے۔ انسپکٹر اعجاز خس کے عقوبت گاہ  
نکلتے ہی جلاد کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک ابھری اور پھر اس نے پھٹی پھٹی سی، کھروری آواز میں سپاہ  
سے کہا۔

”اس کی جھکڑیاں کھول دو۔“  
فورا میری جھکڑیاں کھول دی گئیں۔ گرائڈیل جلاد میری طرف بڑھا اور مجھے اپنے دونوں ہاتھوں

دبوج کر چھت سے جھولتے ہوئے رے کی طرف دھکیلا۔ پھر اس رے سے اس نے میرے دونوں  
بانڈھ دیئے۔ اب میری دونوں ٹانگیں تنگی اینٹوں والے فرش سے تقریباً دو فٹ بلند تھیں۔ میں گویا ہوا  
مطلق ہو چکا تھا۔

جلاد نے میری قمیض کو مٹھی میں دبوج کر ایک جھٹکے سے پھاڑ ڈالا اور پھر ایک دیوار کی میخ سے جو  
ہوئے ناگ کے چھوٹے پھن سے مشابہہ سیاہ رنگ کے چرمی بیلٹ کو اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

اگلے ہی لمحے دم بہ خود ماحول میں ”شراپ“ کی پھنکاری ہوئی آواز ابھری۔ چرمی بیلٹ میرا  
پٹھ پر پڑی اور اذیت کی ایک قیامت خیز لہر نے مجھے سر تا پا مرغ سفل کی طرح تڑپا دیا۔ میرے حلق  
جگر پاش جچ ابھری تھی۔

میں بھی ان کڑے حالات سے نہیں گزرا تھا۔ مجھے اپنی پیٹھ کی کھال نچتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔  
خیال تھا کہ ایک ضرب لگانے کے بعد وہ ذرا سستائے گا۔ مگر دوسرے ہی لمحے جیسے مجھ پر بے درجہ

تاثر توڑ ضربات کی بارش کر دی گئی۔ کمرہ میری اذیت ناک چیخوں، چرمی بیلٹ کی مہیب  
”شراپ“ اور وحشی جلاد کے ہانپنے کی آواز سے گونجنے لگا۔ میں درد و اذیت کے مارے اودھ موا ہونے  
میرے حواس ناقابل بیان اذیتوں کو مزید سنبھلنے کی تاب کھونے لگے تھے اور میرا ذہن اندھیاروں  
ڈوبنے لگا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں مکمل طور پر اپنے حواس کو ہیشٹا، میں نے ہمت کر کے اپنے

جسم کی ساری توانائی کو دہانے میں سینٹے ہوئے چلا کر کہا۔  
”بس کرو..... خدا کا واسطہ بس کرو..... انسپکٹر کو بلاؤ..... میں اپنا جرم قبول کرتا ہوں۔“

”اس پر اپنے دستخط کر دو۔“ وہ بہ دستور اپنی برہمائی ہوئی نظریں میرے چہرے پر مرکوز رکھے ہوئے کرکرا کر بولا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ تمہارا اقبالی بیان ہے۔ جس میں تم نے اپنے جرم کا اقرار کیا ہے۔“

میں نے کچھ سوچ کر اس کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ انپکڑ کا چہرہ یکدم کھل اٹھا۔ اس نے فوراً سیدھا ہوا کہ وہ دستخط شدہ اسٹامپ پیپر اٹھالیا اور آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہوں..... اب میں تمہیں اڈیالہ جیل پہنچا کر ہی رہوں گا۔“ دوسرے ہی لمحے وہ میری طرف گھورتے ہوئے سسنی خیز لہجے میں بولا۔ مگر مجھ پر اس کے لہجے کی سسنی خیزی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ مجھے داہن لوٹا دیا گیا۔

\*\*\*

سات روز بعد میری عدالت میں پیشی ہوئی۔

ماں اور ماموں حیدر گل کو بھی اس دن عدالت میں پیش کر دیا گیا تھا۔ گویا میرے کیس کو بھی قادر علی خان مرڈر کیس کے ساتھ نتھی کرنے کی کوشش کی گئی۔

ماں اور ماموں حیدر گل کے چہروں پر از حد تشویش و پریشانی کے آثار تھے۔ انہیں میری گرفتاری اور وجہ گرفتاری کا علم ہو چکا تھا۔

سماعت شروع ہوئی تو وکیل صفائی نے اپنے دھواں دھار دلائل کے زور پر میرے معاملے کو، ماں اور ماموں حیدر گل کے کیس سے الگ قرار دلوا دیا۔ یوں قادر علی خان مرڈر کیس کی شنوائی تو اس روز نہ ہو سکی

البتہ جب میرے سلسلے میں سماعت شروع ہوئی تو میں نے فوراً پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق صحت جرم سے انکار کر دیا۔

چونکہ میں باضابطہ طور پر ایڈووکیٹ ہدانی صاحب کو اپنا وکیل صفائی مقرر کر چکا تھا چنانچہ جیسے ہی دستخط شدہ بیان جج کے سامنے پیش کیا اور مجھ پر جرح کا آغاز ہوا تو میں نے

سپاٹ لہجے میں اس بات کا اقرار بھی کر لیا کہ اس اسٹامپ پیپر پر میرے ہی دستخط ہیں تو بھری عدالت جیسے سانپ سونگھ گیا۔

”تم پاگل تو نہیں ہو؟“ وکیل استغاثہ نے میرے کٹہرے کے قریب آ کر بھنائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ایک طرف تم صحت جرم سے انکار کر رہے ہو اور دوسری طرف، اسٹامپ پیپر پر اپنے دستخط کا حلیہ تصدیق بھی کر رہے ہو، جس میں تمہارا اقرار جرم درج ہے۔“

میں نے پُر اعتماد لہجے میں جج صاحب کی طرف دیکھ کر اذراہ احترام کہا۔ ”جج صاحب! میں وکیل استغاثہ سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا مجھے اس کی اجازت مل سکتی ہے؟“

جج صاحب نے مونے، سیاہ فریم کے عقب سے میری طرف دیکھ کر گہمیر لہجے میں مختصر کہا۔

”اجازت ہے۔“

میں نے طنزیہ نظروں سے اپنے کٹہرے کے سامنے کھڑے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا، پھر بولا۔

”وکیل صاحب! معذرت کے ساتھ..... اگر آپ کو ایک کمرے کی چھت سے جھولتے رہے۔

کر دی جائے تو میرا خیال ہے، آپ اس روح تک بلبلادینے والے انسانیت سوز تشدد کے آگے مجبور ہو کر اپنے خود ساختہ اقبال جرم کے اسٹامپ پیپر پر ضرور اپنے دستخط کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

میرا خیال تھا کہ وکیل استغاثہ میرے کڑوے جملوں پر پیش میں آجائے گا۔ مگر وہ بھی بڑا کایاں تھا۔

جانتا تھا کہ غصہ دکھانے یا جوابی تلخ کلامی کرنے سے مجھے ہی فائدہ ہوگا تو وہ مسکرا کر طنزیہ لہجے میں بولا۔

”نادر میاں! میں کوئی عادی مجرم نہیں ہوں جو پولیس میرے ساتھ یہ سلوک کرے گی۔“

اس کی بات پر میں نے فوراً جج صاحب کو مخاطب کر کے اپنی صفائی میں کہا۔ ”جج صاحب! وکیل استغاثہ نے میری بات کی سچائی خود ہی تسلیم کر لی کہ اگر کسی شریف انسان پر ایسا بھیاںک اور انسانیت سوز تشدد کیا جائے تو وہ مجبور ہو کر بالآخر اپنے ناکردہ جرم کو قبول کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائے گا۔ کیا میں کوئی عادی مجرم ہوں؟..... کیا میرا ریکارڈ کسی تھانے میں موجود ہے؟..... میری نمیش اتار کر دیکھئے

جج صاحب! آپ کو میری پیٹھ پر ہتھروں کے سرخ نشانات نظر آجائیں گے۔“

میری بات پر عدالت میں جیسے سانپ سرسرا گیا۔ وکیل استغاثہ پریشان سا نظر آنے لگا۔ وکیل صفائی ہدانی صاحب نے فوراً میری نمیش اتروانے کی عدالت سے اجازت چاہی۔ میری نمیش اتار کر میری

مضبوط پیٹھ جج صاحب اور حاضرین عدالت کی طرف موڑ دی گئی۔

کمرہ عدالت میں بھنبھناہٹ کو بجتے لگی تو جج صاحب نے تھوڑی مار کر حاضرین عدالت کو خاموشی اختیار کرنے کو کہا۔ قریب کھڑا انپکڑ اعجاز ٹمس مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔ جج صاحب نے بہ غور میری پیٹھ پر سرخ لکیروں کو دیکھا، اس کے بعد مجھے نمیش پینا دی گئی۔ میرے دستخط شدہ بیان کو

اور خارج کر دیا گیا۔ پھر جرح کا اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ جس میں آئل فٹل اور فنگر پرنٹس کی رپورٹ پیش کر دی گئی۔

یہاں وکیل صفائی نے میرے حق میں یہ دلیل پیش کی کہ میری ماں اور میرے دشمن چونکہ مشترکہ ہیں اور جس طرح میری ماں کے ہاتھ میں آئل فٹل دے کر اس پر اس کے شوہر کو قتل کرنے کا جھوٹا الزام لگایا گیا

نادر! میں تمہیں ایسی ہی چال دشمنوں نے اب میرے ساتھ بھی چلنے کی کوشش کی۔

جج نے اگلی پیشی تک کے لئے فیصلہ محفوظ کر لیا اور عدالت پرخواست کر دی اور ساتھ ہی عدالت نے اعجاز ٹمس کو بھی ایسا انسانیت سوز تشدد کرنے پر سختی کے ساتھ تنبیہ کر ڈالی۔

”نادر! میں تمہیں اڈیالہ جیل پہنچا کر ہی دم لوں گا۔“ حسب توقع جب مجھے انپکڑ اعجاز ٹمس کے حکم پر سامنے پیش کیا گیا تو وہ مجھ سے دانت پس کر بولا۔ میں نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ محض

نالی دمکی دے پایا تھا جس سے اس کی بے بسی کا صاف پتہ چلتا تھا۔ شاید اسے میرے پُر زووں کا بہ

بلی اندازہ ہو چکا تھا۔

میں نے لوہے کو لوہے اور زہر کو زہر سے کانٹے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دشمن ہر طرح کے اوچھے جھکنڈے

زبان سے تھے۔ میں نے بھی اب انہی کے انداز میں جواب دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایڈووکیٹ ہدانی صاحب نے مجھے اب اس بات کی بھرپور تسلی دی تھی کہ میرے خلاف کیس کمزور

سے لگا ہے۔ دشمن اگر ہیرا پیمیری کرنے کے گر جاتے تھے تو ہم نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا تھا۔

مجھے مردان شاہ کا بے چینی سے انتظار تھا جسے میں نے ہر صورت میں نگینہ کا سراغ لگانے پر مامور کر

تھا۔ وہ رہا ہونے کے بعد اب تک مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔

اگر اگلی دو تین پیشیوں کے بعد مجھے ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ جبکہ میری ماں اور ماموں حیدر گل کے



بارے میں ہمدانی صاحب نے ایک افسوس ناک خبر سنائی تھی کہ دو پیشیوں کے باوجود گلینے کی پارہ گمشدگی نے کیس کو کمزور کر ڈالا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ گلینے کو ذہنی مریضہ قرار دے دیا گیا تھا اور اس باب شاہ میر نے بھی کہا تھا کہ اس کی بیٹی کو پاگل پن کے دورے پڑتے رہتے تھے۔ اکثر وہ گھر بھی کرکٹ کئی روز کے لئے غائب ہو جاتی تھی۔

میں گرین لاج آچکا تھا۔ حالات میرے حق میں تو موافق ہو گئے تھے۔ مگر ماں اور ماموں حیدر کے خلاف بد سے بدتر ہونے لگے تھے۔

میں نے رہا ہوتے ہی سب سے پہلے مردان شاہ کے گھر کا رخ کیا۔ اس کے بوڑھے باپ نے ایک خط دیا جو مردان شاہ نے میرے نام لکھا تھا۔

”وہ خود کہاں ہے بابا؟ اور یہ خط.....؟“ میں کچھ کہتے کہتے رکا۔

وہ بولا۔ ”بیٹا! میں خود اس کی وجہ سے پریشان ہوں۔ نہ جانے وہ اچانک کہاں چلا گیا ہے؟ اسے دوسرا دن ہے۔ یہ خط اس نے مجھے نہیں دینے کے لئے کہا تھا۔“

میری پیشانی پر اُجھنوں کا جال سا پھیل گیا۔ بہر طور میں نے خط لیا اور وہاں سے چلا آیا۔ پھر ان میں کھڑے کھڑے میں نے بے چینی کے ساتھ وہ خط نکال کر کھولا اور پڑھنے لگا۔

”نادر صاحب! خدا کرے آپ جلد رہا ہو جائیں۔ یہ خط میں آپ تک پہنچا بھی سکتا تھا

مگر آپ پہلے ہی پریشان ہیں۔ لہذا میں نے سوچا اگر آپ کی جلد رہائی ممکن ہوگئی تو آپ

ضرور میرے گھر آئیں گے اس لئے یہ خط میں نے اپنے بوڑھے باپ کے حوالے کر دیا کہ

جب آپ خود آئیں تو وہ اسے آپ کے حوالے کر دیں۔“

نادر صاحب! میں نے جیل سے رہا ہوتے ہی فوراً سانپوں کے ٹولے کبیر اور کالا ناگ

کی ٹوہ لینا شروع کر دی تھی۔ خدا را نادر صاحب! ذرا حوصلے سے میری بات بہ غور سنئے گا۔

گلینے بہن ان دونوں خبیثوں کبیر اور کالا ناگ کے ہتھے چڑھ چکی ہے۔ وہ اپنے باپ شاہ

میر سے بد دل ہو کر اپنی سہیلی غزالہ کے ہاں رہنے لگی تھی۔ پتہ نہیں وہ ان دونوں خبیثوں

کے ہتھے کیسے چڑھ گئی تھی۔ بہر حال ایک روز جب میں کبیر اور کالا ناگ کا تعاقب کرتے

ہوئے انتہائی گلی سے باڑیاں گیا جہاں میں گھنے جنگل کے درمیان ایک کانچ تک پہنچا، وہاں

میں نے تن گن لینے کی بہت کوشش کی مگر مجھے زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ میں فقط اتنا ہی جان

سکا تھا کہ گلینے بہن کو انہوں نے یہاں پر غلامی بنا رکھا تھا اور اب یہ لوگ اسے نہ جانے

کس مقصد کے تحت نامعلوم برف پوش وادیوں کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ یہاں ان

کے بہت سے مسلح ساتھی بھی موجود تھے۔ بہر طور مجھے جیسے ہی ان کے منصوبے کا علم ہوا تو

میں نے اس وقت پولیس کو مطلع کرنے کا سوچا۔ مگر ایک تو میرے پاس وقت کم تھا

دوسرے اس طرح گلینے کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ نہایت خطرناک

نظر آ رہے تھے اور یہ پورا گینگ کالا ناگ کا ہی معلوم ہو رہا تھا۔ ان کی روانگی میں چند گھنٹے

تھے۔ میں نے آپ کو مطلع کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ کہیں آپ پریشان نہ ہوں۔

بہر حال جیسے تیسے یہ خط لکھ کر میں اپنے گھر پہنچا اور یہ خط اپنے باپ کو دے کر اسی وقت

وہیں لوٹ گیا۔ نادر صاحب! حوصلہ رکھئے گا۔ میں انشاء اللہ ضرور کامیاب لوٹوں گا۔“

آپ کا جاں نثار ساتھی..... مردان

خط پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ دل جیسے بھٹنے کے قریب ہو گیا اور رموں میں لاوا دوڑنے لگا۔ شدت غیظ سے میرا وجود لرزے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیات پر قابو پایا۔

اول تو میرے لئے یہ خبر ہی لرزادینے والی تھی کہ گلینے کبیر اور کالا ناگ جیسے کینے اور سفاک درندوں کے ہتھے چڑھ چکی تھی۔ دوسرا یہ کہ آخر یہ لوگ گلینے کو لئے کس مقصد کی خاطر نامعلوم برف پوش وادیوں کی

طرف جو سفر تھے۔ صورت حال جتنی نازک اور خطرناک تھی، اتنی ہی براسرار بھی۔ یقیناً مردان شاہ بھی ان کے تعاقب میں روانہ ہوا تھا۔ مجھے اس پر بھروسہ تھا کہ وہ اپنی جان پر بھی کھیل سکتا تھا۔ مگر وہ بہر حال کبیر

اور کالا ناگ جیسے خطرناک پیشہ ور ہرکاروں کے مقابلے میں تنہا تھا۔

مگر سوال اب یہ پیدا ہوتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟ ان لوگوں کو باڑیاں سے روانہ ہوئے دو دن بیت چکے تھے مگر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے کب بیٹھے والا تھا۔ چنانچہ میں سب سے پہلے گرین لاج پہنچا۔

مختصر تیاری باندھی۔ اس وقت دن کے بارہ بجے کا عمل تھا۔ قفل چاچا باغیچے میں مصروف تھے۔ سب سے پہلے میری سمجھ میں جو راستہ آیا، میں نے وہی اختیار کرنے کا حتمی فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لئے سب

سے پہلے میں نے باڑیاں پہنچنے کا ارادہ کیا۔ اور ابھی ”گرین لاج“ سے نکلنے ہی والا تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی ٹھنکی بج اٹھی۔

نہ جانے کیوں فون کی ٹھنکی سن کر مجھے عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا تھا۔



تھا۔ میرا خیال تھا کہ انہوں نے نگینہ کو جان سے مارنے کا حکم دیا ہے اس لئے میں نے ملک سردار کو بھی جہنم داخل کر دیا تھا۔

ایسا لگا تھا کہ اس خونی کھیل میں گیبوں کے ساتھ گھن بھی پسے جا رہا تھا۔ خونی کھیل کی ابتداء میرے باپ کے بے گناہ قتل اور بعد میں میری بد نصیب ماں جس کے قتل کو جھوٹے الزام میں جیل کی کال کوٹھڑی کے پیچھے دھکیلنے والے ان دونوں شیطانوں نظر حیات اور شاہ میر ہی نے کی تھی۔

زلزلے، طوفان اور سیلاب ..... انہیں قہر خداوندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر کون جانے، بد اعمالوں کے ساتھ نیک لوگ بھی اس کی زد میں آ جاتے ہیں۔ ہمارے دشمن نظر حیات کی بیٹی صدف کا بے گناہ قتل بھی خطا کاروں کے ساتھ بے قصور مارے جانے والا معاملہ ثابت ہوا تھا۔

اگرچہ صدف میرے دشمنوں کی بیٹی تھی، لیکن میں بہر حال اس کے قتل کے حق میں نہ تھا۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ میری ماں کے ساتھ تو اس سے بھی بڑھ کر ظلم ہوا تھا، اس کا انتقام کی آگ میں اس حد تک آگے بڑھ جانا فطری رد عمل تھا۔

بے جباری ..... اپنے ناکردہ جرم کی پاداش میں اپنی جوانی کے قیمتی سال جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں گزرا چکی تھی اور اصل مجرم دہناتے پھر رہے تھے۔ اور پھر یہی نہیں، دشمنوں نے بعد میں اس کے بڑھاپے کے سہارے کو بھی جھیننے کی کوشش کی اور اس کے بیٹے کو اپنی ہی دہی اور بد نصیب ماں اور ماموں کے خلاف ورغلا نا بھی چاہا۔

کون تھا .....؟ جو اس غم زدہ اور دکھوں کی ماری ہوئی ایک ماں کے دل کے زخموں کا احساس کرتا کہ دنیا نے تو اسے اپنے شوہر کا قاتل سمجھا ہی تھا، اس کے بڑھاپے کے سہارے، اس کے بیٹے یعنی میرے دل میں بھی یہ زہر بھردیا گیا کہ اس کے باپ کی قاتل اس کی ماں ہے۔ ایسے خطرناک اور چال باز دشمنوں کے خلاف میری ماں کے دل کی آتش انتقام اس قدر بھڑک اٹھی کہ اسے اپنے دشمنوں کی موت بھی ایک معمولی سزا محسوس ہونے لگی تھی۔ تو وہ بھی انہیں پہلے اسی طرح ذہنی اذیتوں سے دوچار کرنا چاہتی تھی۔

یہ سارے خیالات لمحوں میں میرے ذہن سے گزرتے چلے گئے۔ میں نے سر جھٹکا اور اپنی موجودہ حالت میں واپس آ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ اس واقعے کی اطلاع اعظم خان صاحب کو ضرور دے دینی چاہئے کہ وہی اس کے کیس کو دیکھ رہے تھے۔

”نادر بیٹا! ..... تم بالکل فکر نہ کرو۔“ ساری بات سننے کے بعد انہوں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔

”غور! ہمارا آدمی ہے ..... وہ ہمارے خلاف اپنی زبان بند رکھے گا۔“

”مگر ..... خان صاحب! .....“

”نہ ..... نہ ..... خان صاحب نہیں۔“ انہوں نے پُر شفقت لہجے میں مجھے ٹوکا۔

”سوری ..... انکل! میں یہ کہہ رہا تھا کہ غور! انسپکٹر اعجاز شمس جیسے قصائی کے سامنے اپنی زبان کھولنے پر مجبور ہو سکتا ہے۔“ میں نے تشریح بھرے لہجے میں کہا۔ دوسری طرف چند ٹاپے خاموشی چھائی رہی پھر آواز اُبھری۔

”نادر بیٹا! میں نے کہا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیا تم اپنے انکل کو معمولی آدمی سمجھتے ہو؟“ ان کے لہجے کی پراسراریت نے مجھے عجیب سی آنکھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

”تم دیکھتے جاؤ نادر! ..... میں کرتا کیا ہوں۔ دشمن اگر ہمارے ساتھ شاطرانہ کھیل، کھیل سکتا ہے تو

ٹرن ..... ٹرن ..... ٹرن ..... ٹیلی فون کی گھنٹی کرخت آواز میں بج رہی تھی۔

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ میرے بس میں ہوتا کہ میں اڑ سکتا تو اڑان بھر کر باڑیاں جا پہنچا میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ برق رفتاری سے اس طرف روانہ ہو جاؤں۔ مگر ٹیلی فون کی گھنٹی نے میرے روک دیئے تھے۔ لمحاتی توقف کے بعد میں ایک فیصلے پر پہنچا اور تیزی سے ٹیلی فون سیٹ کی طرف ہلکا ”نادر علی! .....!“ میری تمام تر حیات میری سماعتوں میں جمع ہو چکی تھیں۔ ان دو الفاظ ذریعے ہی میں نے ایڈووکیٹ حامد صدیقی صاحب کی آواز کو پہچان کر کہا۔

”جی ..... وکیل صاحب! ..... خبریت .....؟“ میرے لہجے میں پہچان تھا۔

”خبریت ہی تو نہیں ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔ میرے بیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔ ”پولیس نے ”صدف مرڈر کیس“ کے ایک اہم مفرد ملزم غفورے کو گرفتار کر لیا ہے۔“ انہوں نے سنسنی خیز انکشاف کیا۔

میں ایک لمحے کو نہ ہو کر رہ گیا، پھر فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”کک ..... کب ..... کہاں سے .....؟“

”رات دو بجے کے قریب ماسہرہ میں ”بٹ راس“ کے جنگل کی ایک بستی سے اسے گرفتار کیا ہے۔“ ایڈووکیٹ حامد صدیقی نے مختصر تفصیل بتائی۔

”کون سی پولیس کا کارنامہ تھا یہ؟“ میں نے پوچھا۔

”پنڈی کے متعلقہ تھانے کی پولیس نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔“ وہ بتانے لگے۔ ”انسپکٹر اعجاز شمس مجھے نے اطلاع پہنچائی تھی۔ تم جانتے ہو نا کہ انسپکٹر شمس ہی کو عدالت نے صدف ایڈووکیٹ خان صاحب کی مشترکہ کیس کا تفتیشی آفیسر مقرر کر رکھا ہے؟“

”جج ..... جی ہاں ..... مگر .....“ میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”تم محتاط رہنا نادر!“ انہوں نے تنبیہ کی۔ ”غفورے کا بیان تمہاری سمت موڑنے کی پوری کوشش جائے گی۔“ چند ثانیوں کی پُرسوج خاموشی کے بعد وہ تشکر لہجے میں بولے۔ تاہم دوسرے ہی لمحے ان سنہالا لے کر قدرے مختلف انداز میں بولے۔ ”اب بڑی مشکل پڑ جائے گی۔ خیر ..... میں سنبھالنے کی کوشش کروں گا اس کیس کو۔“

غورے کا پولیس کے ہاتھ آ جانا ..... ماں اور ماموں حیدر گل کے لئے ہی نہیں بلکہ خود میرے لئے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ غور! ملک سردار خان کا آدمی تھا۔ اسی نے ملک سردار خان کا حکم پر صدف کی جان لی تھی۔ اس وقت میں دشمنوں کے بہکاوے میں آ کر اپنی ماں اور ماموں کا دل بھرا ہوا تھا جبکہ ملک سردار خان نے انہی دو کی خواہش کی تعمیل میں غور! کے ہاتھوں معصوم صدف کا قتل

خرید کر ساجوں کے لئے پرائیویٹ گیٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس نے وہ بھی بالکل آجائز اور ویران نظر آ رہا تھا۔ میں نے جیب گیٹ کے قریب جا کر روکی۔ چار اطراف سے وہ بھی پرندوں کے چچھانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں جیب سے نیچے اتر آیا۔

نصف کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ اس کی بوسیدہ حالت سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ پرائیویٹ گیٹ ہاؤس کے طور پر کامیاب نہیں ہو سکا تھا یا پھر اس کا مالک دنیا میں نہیں رہا تھا۔

گیٹ ہاؤس کے کایک پت ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ جبکہ دوسرا بھی گرنے کے قریب تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔

جنگلی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ سالخورہ چوہی دیواروں میں جا بجا رخنے نظر آ رہے تھے جہاں اندر جانچا۔

ایلیوں اور دیگر پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ متروک احاطے میں ادک، چنار اور سلورخ کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ میں اپنے اطراف میں نظریں دوڑاتا ہوا مرکزی دروازے کی طرف بڑھا جو بند تھا۔

ابھی میں نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک وہ کھل گیا۔ میں بری طرح ٹھک گیا۔

مانے ایک خاستری چہرے والا ڈبلا پتلا شخص کھڑا مجھے اپنی زرد آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ پتہ نہیں اسے شاید قسم کا ریاقت تھا یا ویسے ہی اس کی آنکھیں پیلی زرد تھیں۔ البتہ میں اسے دیکھ کر بولا۔

”یہاں..... اور کون رہتا ہے؟“

اس نے ایک نظر سرتا پانچ مجھے بہ غور اپنی زرد آنکھوں سے گھورا، پھر اپنی شخصیت سے ہم آہنگ عجیب آواز میں مستفسر ہوا۔

”تم کو کس سے ملنا ہے؟“

”میرے یہاں کچھ دوست ٹھہرے ہوئے ہیں۔ دو روز پہلے کی بات ہے، تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہیں؟“ میں نے بلاتامل پوچھا۔

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”ہاں، ابھی تین چار روز پہلے کی بات ہے..... چار پانچ چھڑے چھانڈ لوٹے آئے تھے۔“

”ہاں.....“ میں جلدی سے بولا۔ اور پھر اسے کالا ناگ اور کبیر کے حلیے بتا کر پوچھا کہ وہ دونوں بھی ان ”لوٹروں“ میں شامل تھے؟ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ میرے اعصاب تن گئے۔

”ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہوگی؟“ میں نے مضطربانہ انداز میں جلدی سے پوچھا۔ میری بات پر وہ جواباً کچھ یاد کرتے ہوئے بولا۔

”ہاں..... ایک لڑکی تو تھی..... مگر وہ بے ہوش تھی..... اسے اونچے لمبے، کالے شخص نے اپنے کانڈروں پر اٹھا رکھا تھا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا کہ وہ بیمار ہے۔“

اس کی بات سن کر میرے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی۔

”وہ..... وہ سب کدھر گئے ہیں؟“ میں نے تیز تیز چلتی سانسوں کے ساتھ پوچھا۔

”پتہ نہیں..... مگر ایک روز بعد ہی وہ صبح تڑکے ایک لمبی سی جیب میں روانہ ہو گئے تھے۔ البتہ میں نے ان کی آپس میں ہونے والی باتیں سنی تھیں۔ وہ کسی ”بڈھیاز“ کے علاقے کا ذکر کر رہے تھے..... میرا خیال ہے وہ وہیں گئے ہوں گے۔“

اس نے بتایا اور پھر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

”بابو جی! مجھے وہ کچھ ٹھیک آدمی معلوم نہیں ہو رہے تھے۔ مجھے پورا شک ہے کہ انہوں نے اس بے

جاری لڑکی کو ضرور اغواء کیا ہو گا۔“

ہم بھی اس کا متور جواب اس کے انداز میں دینا جانتے ہیں۔ تم بتاؤ، نگینہ کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟“

”میں ابھی ابھی اسی کی تلاش میں جا رہا تھا۔“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”کیا مطلب؟“ وہ قدرے چونک کر بولے۔ ”کیا نگینہ کا کوئی سراغ مل گیا ہے؟“

ان سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ پھر میں نے انہیں مردان شاہ اور اس کے خط کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔ وہ یہ سب سن کر ہنسنا شروع انداز میں بولے۔ ”نگینہ کو تلاش کرنا اشد ضروری ہے۔ یہی ایک ہے..... ہمارے سارے مسائل کا حل..... جس کی بناء پر نہ صرف دشمنوں کو قانون کے شکنجے

جکڑا جا سکتا ہے بلکہ تمہاری ماں اور ماموں بھی جیل سے رہا ہو سکتے ہیں۔ اس لئے میں تمہیں نگینہ کو تلاش کرنے کی بڑھاپہ پر جانے سے نہیں روکوں گا۔ لیکن تمہارا انتخاب جانا کسی طور بھی مناسب نہ ہو گا..... میں اپنا ایک آدمی بھیج رہا ہوں..... وہ.....“

”نہیں انکل!“ میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا۔ ”آپ فکر مند نہ ہوں! مجھے اکیلا جانے دیں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے دشمنوں کے لئے میں اکیلا ہی کافی ہوں گا۔“

”پلیز بیٹے! خدمت کرو۔“ انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

”انکل!..... آئی ایم سوری..... مجھے جانے دیجئے۔ میرے پاس وقت پہلے ہی بہت کم ہے۔ آپ پلیز غفورے والا معاملہ سنبھالنے کی کوشش کیجئے گا۔“ میں نے بڑے اصرار سے کہا۔

”اچھا بیٹا..... خدا تمہاری مدد کرے..... تم بے فکر رہو..... میں غفورے والا معاملہ سنبھالنے کی پوری کوشش کروں گا۔“ وہ آخر میں میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے بولے اور پھر

نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور جلدی سے رکھا اس کے بعد تیزی سے باہر نکلا۔ اپنی جیب تباہ ہونے کے باوجود میں نے شوروم سے کرائے پر سینڈ وئچ جیب ہائر کر لی تھی۔ چنانچہ ذرا دیر بعد ہی میری جیب آندھی طوفان کی مانند اڑی چلی جا رہی تھی۔

\*\*\*

تقریباً نصف گھنٹے کی تیز رفتار اور نان اسٹاپ ڈرائیونگ کے بعد میں ”مکڈنلڈ چوک“ پر آ گیا۔ دائیں طرف ”تھریکا گلی“ اور چھ کلومیٹر کے بعد ”گالف کورس“ سے سیدھا راستہ بھور بن کی طرف جاتا تھا۔

روٹ مجھے طویل پڑتا اس لئے میں نے شارٹ کٹ راستہ اپناتے ہوئے جیب بائیں طرف موڑ لی۔

”باڑیاں“ پہنچ کر ”خیرہ گلی“ کی طرف مڑ گیا۔ میرے دائیں بائیں بلند و بالا بنبرہ زار پھاڑتے تھے۔

کے اطراف صنوبر کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ چار کلومیٹر کے بعد ”چھانڈ گلی“ شروع ہو گئی جو 400 فٹ بلندی پر تھی۔ اس قدر بلندی پر میری جیب کی رفتار مجھے کسی وقت بھی قصر فنا میں ڈھیل سکتی تھی۔

میرے سر پر نگینہ کو کبیر اور کالا ناگ جیسے درندوں کے چنگل سے بچانے کا اس قدر جوش آمیز جنون سوار تھا کہ مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں رہی تھی۔

خدا خدا کر کے ”گھڑہ گلی“ ختم ہوئی۔ گلیات کا سلسلہ ختم ہوا۔ میں مردان شاہ کے بتائے ہوئے

کے مطابق کلوڑی، باگنا کے درختوں والے گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اب میری جیب پختہ سڑک

اتر کر ناہموار راستے پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ تقریباً دو اڑھائی کلومیٹر بعد مجھے سامنے ہی ایک اُبلے

زار پر دیوار..... گہو کے پیڑوں کے بیچ..... کھنٹی رنگ کا چوٹی کا بیج نظر آ گیا۔ میں یہاں پہنچ

آ چکا تھا۔ میرا کاروبار ہی ایسا تھا کہ مجھے اپنے ٹال کی ٹکڑیوں کے لئے ان علاقوں کی طرف نکلتا ہوتا

یہ کایج درحقیقت کسی دور میں سرکاری ریست ہاؤس رہ چکا تھا۔ بعد میں اسے ایک ریٹائرڈ کنزرویٹو

## قیدی

نور و خوش کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ مجھے خیرہ گلی اور بڑھیا کے درمیانی راستے پر واقع پہاڑی بستیوں کے زیادہ پار کی سے کھگانا ہوگا۔

چنانچہ یہ فیصلہ کر کے میں نے جیب واپس موڑ دی۔  
سڑک پر دوویہ سبزہ زار کے درمیان پتلی نہری لکیر کی طرح ترائیوں میں اتر رہی تھی۔ دائیں بائیں نہایت درختوں سے بھینی بھینی خوشبو میں آ رہی تھیں۔ لیکن اس وقت میرے حواس پر نگینہ کی طرف سے تشویش پریشانی سوار تھی۔ آسمان پر تیری ہوئی بادلوں کی ٹکڑیاں ابھی برف رنگ کی تھیں مگر وہ کسی بھی لمحہ گھٹھوڑ گھٹاؤں میں بدل سکتی تھیں۔

میں نے ترائی میں دائیں جانب واقع کھیریل کے چند جموینڈی نما گھر دیکھ کر جیب ایک درخت کے قریب روک دی اور نیچے اتر آیا۔

درخت پر بیٹھا ہوا ایک سرخ سر کا مرغاب بھرا مارتا ہوا اڑا۔ سیٹی بجا کر ایک نیلے پروں والا Thrust بھی بالکل میرا سر چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں نے جیب کے دروازے وغیرہ لاک کئے اور سڑک کے کنارے واقع کھیریل کے جموینڈے نما گھروں کی طرف پیدل بڑھا۔ یہاں ایک دو گھروں کے سامنے کچھ جوان لڑکیاں بالیاں جنگلی مٹر اور نیلے پائے توڑ رہی تھیں۔ وہ مقامی لباس میں تھیں۔ میری طرف دیکھ کر وہ آپس میں چہلیں کرنے لگیں اور مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھنے لگیں۔ میں ان الہڑ لڑکیوں پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ وہ دوبارہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

ایک گھر سے میں نے پچاس پچپن سالہ ایک سرخ و سپید عمر رسیدہ شخص کو نکلے دیکھا۔ میں فوراً اس کی طرف بڑھا اور اسے سلام کرنے کے بعد پوچھا۔

”بابا!..... کیا تم نے آج سے دو تین روز پہلے یہاں سے کسی لمبی سی سرخی رنگ کی جیب کو گزرتے دیکھا تھا؟“

وہ ایک نظر میرے چہرے پر ڈال کر ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔ ”بابو صیب! یہاں سے روزانہ ہی طرح طرح کی موٹر کاریں گزرتی ہیں۔ کچھ یاد نہیں پڑتا۔“

میں نے اپنے سوال کی ذرا وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”بابا! میرا مطلب تھا کہ آپ نے نہیں تو یہاں کسی اور نے دیکھی ہو وہ جیب؟“

”اگر دیکھی بھی ہوتی تو ہم کیا بتا سکتے تھے کہ وہ کدھر گئی؟“ وہ بولا۔ ”ویسے بات کیا ہے آخر؟“

”بابا! دراصل وہ لوگ خطرناک مجرم تھے جو ایک لڑکی کو اغوا کر کے یہاں سے گزرے تھے۔“ اسے ٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اس کے چہرے پر ذرا چونکنے کے آثار نمودار ہوئے اور وہ نامحانہ لہجے میں بولا۔ ”بیٹا! پھر تو تمہیں پولیس کو اطلاع کرنی چاہئے گی۔ یہ کام وہ زیادہ اچھے طریقے سے کر سکتی تھی۔“

”میں نے رپورٹ درج کروا رکھی ہے اور پولیس بھی انہیں ڈھونڈ رہی ہے..... لیکن میں اپنے طور پر بھی ان کا کھوج لگانا چاہتا ہوں۔“

”کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ بد بخت بد معاش ادھر ہی سے گزرے تھے؟“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے اچانک پوچھا۔

”ہاں بابا! میں باڑیاں اور گہڑہ گلی سے ان مجرموں کا کھوج لگانا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اور ان کی آخری منزل ”بڑھیا“ کا بھی علاقہ تھا۔“

”ہاں۔“ تم صحیح کہہ رہے ہو۔“ میں نے کہا۔ اس کا شکریہ ادا کر کے میں اپنی جیب کی طرف یہ سارے علاقے تھپتھپکی کے بیرونی علاقے تھے۔

میں جس بھرپور امید کے ساتھ یہاں آیا تھا وہ پوری ہو چکی تھی۔ میں نے جیب اسٹارٹ کی جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

”بڑھیا“ یہاں سے زیادہ دور نہ تھا مگر راستہ دشوار گزار ہونے کی وجہ سے میں ایک لمبا پن بڑھیا کی طرف روانہ ہو گیا۔

شکر تھا کہ موسم خوشگوار تھا۔ ورنہ تو یہ سارا علاقہ بارانی تھا..... مگر میں موسم کی ”خوشگوار“ سلسلے میں زیادہ دیر تک پرامید نہیں رہ سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں کے موسموں کے تیور بدلنے میں زیادہ لگتی تھی۔

بھرپور..... میں تنک اور دشوار گزار راستوں پر اپنی جیب کو مہارت سے دوڑاتا ہوا بالآخر کے قریب جا پہنچا۔

”تھپتھپ“ کی طرح یہاں بھی کنڈال اور عباسی اقوام کے لوگ آباد ہیں جو ہندو اور پہاڑی کا امتزاج بولتے تھے۔ لیکن میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ لوگ نگینہ کو یہاں کسی مقصد لائے ہوں گے؟ میری تشویش میں لہو لہو اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اگرچہ مجھے کسی حد تک یہ تسلی تو تھی

جاں نثار ملازم دوست مردان شاہ، کبیر اور کالا ناگ کے شیطانی ٹولے کے تعاقب میں ہو گا مگر اس کے میرے دل کو کسی طور بھی قرار نہیں آ رہا تھا۔ مجھے تھوڑی بہت پہاڑی زبان آتی تھی اور باقی

میں اشاروں کی بین الاقوامی ”زبان“ سے پوری کر سکتا تھا۔ میں نے ”بڑھیا“ کا سارا علاقہ چھار لیکن مجھے کہیں بھی شیطانی ٹولے کا سراغ نہ مل سکا۔

خیرہ گلی کے اس مڑو کہ کالج کے زرد آنکھوں والے چوکیدار ٹائپ شخص سے میں نے ان کی ج رنگ وغیرہ کے بارے میں بھی پوچھ لیا تھا۔

لہذا میں نے یہاں پہنچ کر مقامی لوگوں سے سرخی کلر کی اولڈ ماڈل لینڈ کرورز جیب میں سوار افراد کے بارے میں استفسار کیا تھا..... لیکن کوئی بھی مجھے اس کے متعلق نہیں بتا پایا تھا۔ اب تو

پریشانی بڑھنے لگی تھی۔ نگینہ سے متعلق انجانے دوسروں اور پرتشویش اندیشوں کے چپوٹے میرے بدن پر ریگننے لگے۔

مجھے رہ رہ کر یہی خیال کسی ناگ کی طرح ڈسے جا رہا تھا کہ کہیں کالا ناگ کا یہ شیطانی ٹولا میرا کو کسی قسم کا جانی نقصان نہ پہنچانے کی کوشش کرے۔ اگرچہ کبیر بھی ان کے ہمراہ تھا اور وہ بہر حال قتل کرنے کے حق میں نہ ہوگا۔ لیکن کالا ناگ سفاک انسان تھا۔ اس سے کچھ بھی بعید نہ تھا کہ مجھے

اذیتوں میں مبتلا کرنے کے لئے خطرناک انتہائی قدم میرے خلاف اٹھا سکتا تھا اور مجھے سب سے تشویش بھی کبیر کی بجائے کالا ناگ کی طرف سے تھی۔

میں نے سوچا..... کہیں ایسا تو نہ تھا کہ ان کا یہاں آنے کا ارادہ ملتوی ہو گیا ہو اور وہ کہیں گئے ہوں..... اس خیال نے مجھے مزید پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ میرے اور کالا ناگ کے ٹولے کے درمیان پورے اڑتالیس گھنٹوں کا فاصلہ تھا..... یہ ”فاصلہ“ جغرافیائی حدود کا بھی

اور وقت و حالات کا بھی..... میرے دل و دماغ پر بری طرح وحشتیں سوار ہونے لگیں۔ بالآخر میں نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ نئے سرے

## قیدی

میرے دل کی دھڑکنیں یک لخت بے ترتیب ہونے لگیں اور میں خوش امیدی کے سہارے بے قراری بولا۔ ”ہاں..... ہاں..... وہی۔“

”اس میں چار پانچ افراد بھی سوار تھے۔ ایک لڑکی بھی تھی ان کے ساتھ۔ جو شاید بے ہوش تھی یا پھر وہ بتانے لگا۔ میرے سینے میں بے طرح ہلچل مچنا شروع ہو گئی۔ میں بے چینی سے اس کے آگے بڑھتا ہوں۔ وہ ہلچل کو چل دیا۔

”وہ لوگ ادھر ہی آئے تھے۔ لیکن وہ رکے نہیں تھے۔“ وہ صراحت بیان کرنے لگا۔ ”میں اس وقت اس میں گڑی کر رہا تھا۔ میں نے ذرا کھڑے ہو کر احاطے کی دیوار سے باہر جھانکا تھا، وہ سیدھا آگے چلے گئے تھے۔“

”کہاں؟“

”اچھا..... یہ بات ہے۔“ وہ یکدم پُر جوش نظر آنے لگا۔ وہ ایک پہاڑی غیرت مند شخص تھا۔

”آؤ کا کا! میرے ساتھ۔ وزیر خان سے پوچھتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک طرف کو چل دیا۔

اس کے ساتھ چلتے ہوئے وزیر خان کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ جنگل کا سرکاری دار تھا۔ میں اس بھلے مانس کے ساتھ چلتا ہوا سڑک پر آ گیا تو اس کی نظر قریب کھڑی میری جیب پر پڑی۔

”کیا یہ تمہاری جیب ہے؟“ اس نے ذرا رک کر مجھ سے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”جی ہاں..... اگر وزیر خان کا گھر دور ہے تو اس جیب میں چلتے ہیں۔“

”نہیں..... آگے جیب کا راستہ نہیں ہے۔ پیدل ہی چلنا ہو گا۔ زیادہ دور بھی نہیں جانا پڑے گا۔“

”وہ بولا اور پھر سڑک پار کر کے دوسری طرف کے جنگل میں داخل ہو گیا اور میں اس سے اس کے عقب میں چل پڑا۔

سڑک کے دوسری طرف کا یہ جنگل نسبتاً گھٹا اور گنجان تھا۔ یہاں کوئی آبادی نظر نہیں آ رہی تھی۔ دیودار اور چیز کے درختوں کے درمیان کھیت کھلیاں ضرور نظر آ رہے تھے۔ کچھ لوگوں کو بھی میں کرتے دیکھا تھا۔ لگ بھگ چالیس پچاس قدم چلتے کے بعد سامنے ایک خوبصورت چوٹی پر ریٹ دکھائی دیا۔ ریٹ ہاؤس چیز اور خروٹ کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ عقب میں بڑا خوبصورت انفراسبزہ پھیلا ہوا تھا جس کے پار برف پوش پہاڑیوں کے تاج ڈھوپ میں چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ریٹ ہاؤس کے نزدیک پہنچے۔ ریٹ ہاؤس پر عجیب سی خاموشی اور کارج تھا۔

”اوئے وزیرے!“ احاطے پر نصب گیٹ کے قریب پہنچ کر عمر رسیدہ شخص نے آواز دی۔ لیکن باری کی آوازوں پر بھی جب اندر سے کوئی برآمد نہ ہوا تو وہ بڑبڑایا۔

”جنڈرا (تالا) بھی نہیں لگا ہوا۔ لگتا ہے یا تو وہ حرام خور اندر سو رہا ہے یا پھر گھر چلا گیا ہے۔“

دیکھتا ہوں اندر جا کر۔“

وہ گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وزیر خان اندر ہی تھا اور سو رہا تھا۔ وہ عمر رسیدہ شخص ذرا بڑے سے لوتا تو اس کے ہمراہ ایک درمیانی قامت مگر مضبوط تن و توش کا لمبا شخص بھی تھا۔ اس کی عمر کے قریب ہوگی۔ اس نے ایک بوسیدہ سالبا ”پھیسز“ پہن رکھا تھا۔ کسی شہری آفسر کا انعام نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ بے چارہ شاید رات بھر پہرے کے بعد دن میں پوری کر رہا تھا۔

”یہ ہے وزیر..... اب تم خود ہی پوچھ لو۔“ وہ عمر رسیدہ شخص مجھ سے بولا۔ ”اور ہاں کا کا۔“

اگر اس نے لمبی تمہیں نہیں بتایا تو پھر سمجھو اور کوئی بھی تمہیں نہیں بتا سکتا۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

پھر جب وہ چلا گیا تو میں نے وزیر خان کی طرف دیکھ کر پہلے معذرت خواہانہ انداز اپنایا۔ سوال دہرا دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ذرا سوچنے کی کوشش کرے گا لیکن میرا سوال سنتے ہی وہ فوراً بولا۔

”ہاں بابو صیب!..... شاید دو دن پہلے ہی کا ذکر ہے۔ ایک ہی جیب اس طرف آئی تو“

”اس طرف.....“ اس نے ریٹ ہاؤس کے عقب میں سبزے سے ڈھکے ہوئے میدان کے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

میں ہونٹ ہنچ کر چند ٹانے کے لئے کچھ سوچنے کے بعد متفکر ہوا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ آگے کون سا علاقہ ہے؟“

”میرے خیال میں پچیس، تیس کلومیٹر کے فاصلے تک تو کوئی آبادی نہیں ہے۔ کیونکہ اس میدان کے پار کل، پڑتل اور دیودار کے ایک وسیع و عریض اور گھنے جنگل کی حدود شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد برف پوش وادیاں ہیں۔ وہ لوگ اس سے آگے نکل گئے ہوں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ اتنا بتا کر وہ راضی ہوئے کی نیت سے جہاں لیتے ہوئے ساتھ ہی اپنی آنکھیں بھی مسلنے لگا۔ میں نے اس کا کریہہ ادا کیا اور خود واپس سڑک کی طرف چل پڑا۔

میرے سینے میں زبردست پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ جہاں میں بڑی کامیابی کے ساتھ اب تک کالا ناگ دیکر وغیرہ کا کھوج لگاتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا، وہیں اگرچہ آگے بھی مجھے کامیابی کی امید پیدا دے گی تھی۔ لیکن میرے اور ان کے درمیان اڑتا گیس گھٹنوں کا جو طویل وقفہ تھا اس نے مجھے ہنوز بے زار اور پریشان کر رکھا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

وزیر خان نے مجھے ان کی گزرگاہ کا جو راستہ بتایا تھا، وہ ایک قدرتی ”ٹریک“ تھا جو دشوار گزار بھی ہو سکتا تھا لیکن چونکہ کالا ناگ بھی اس ٹریک سے گزر چکا تھا لہذا میں نے بھی وہی راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے رست وراج میں وقت دیکھا۔ اس ساری دوڑ ڈھوپ میں تقریباً پانچ چھ گھنٹے صرف ہو چکے تھے اور اب سہ پہر کے تین بجے کا عمل تھا۔ میں جلدی سے جیب پر سوار ہوا اور اسے اشارت کر کے آگے بڑھا دیا۔..... ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے بعد میں نے جیب بائیں جانب جنگل میں موڑ دی۔ پھر ایک لمبا پتھر کاٹ کر میں وزیر خان والے ریٹ ہاؤس کے قریب سے گزرتا ہوا اس کے بتائے ہوئے ٹریک پر روانہ ہو گیا۔

میری بھوک پیاس تو کب کی اڑ چکی تھی۔ چاہتا تو میں جتنے جتنے سے تھوڑا پانی پی سکتا تھا لیکن میرے سر پر ٹھیکہ کو تلاش کرنے کی ذہن بری طرح سوار تھی اور میں اس مقصد کے لئے ایک لمحہ بھی متوجہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

راستہ تنگ تھا اور کہیں کہیں ڈھلوان ہونے کے باعث مجھے جیب کی رفتار کم کرنا پڑ رہی تھی۔ لیکن

جہاں ذرا بھی راستہ سیدھا ہوتا، میں ٹاپ گیسر پر پورا ایکسلیٹر دبا دیتا۔ جیپ غراتی ہوئی ایک طوفانی آواز سے آگے بڑھتی مگر ذرا دور تک تیز رفتاری کے بعد اچانک کوئی نہ کوئی موڑ آ جاتا۔

راستہ مزید ڈشوار گزار ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف ڈھلوان سبز جنگل تھا تو دوسری طرف گہری ترانہ اور کھائیاں تھیں۔ کئی ”ھوکا“ دینے والے موڑ بھی آ رہے تھے۔ یعنی ایسے موڑ جو بظاہر دور سے پہچانے ڈگری کے محسوس ہوتے تھے لہذا ڈرائیور دھوکا کھا کر گاڑی کی رفتار مطلوب حد تک ڈرام کر کے جیسے ہی کانٹے لگتا تو نزدیک پہنچنے پر پتہ چلتا کہ موڑ کے فوراً بعد سڑک تقریباً ”یوٹرن“ لئے ہوئے ہے اور گاڑی کا کھائی میں گرنا لازمی امر ہوتا۔

میں بھی اس وقت کچھ ایسی ہی خطرناک قسم کی جلد بازی کا شکار تھا اور میرا واسطہ بار بار ایسے خطرناک موڑ سے بڑھ رہا تھا۔ ایک ایسے ہی موڑ پر میں نے جیسے ہی اپنی جیپ موڑی، آگے یک دم کھائی میں گر پڑا۔ میں نے بریک پر پاؤں رکھ دیا، ایکسلیٹر چھوڑ دیا۔ نتیجتاً جیپ کھائی میں گرنے سے تو بال بال بچ گئی مگر تباہوار سڑک پر اُٹتی اور پھر خود ہی سیدی ہو گئی۔

شکر تھا کہ میں نے بیلٹ باندھ رکھی تھی اس لئے سر پر معمولی سی چوٹیں آئی تھیں۔ البتہ وڈا ایک چھناکے سے ٹوٹ چکی تھی۔ لیکن جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے سامنے دیکھا، جیپ اگلے دونوں ٹائر سڑک سے اتر کر ہزاروں فٹ گہری کھائی میں جمبول رہے تھے اور جیپ نصف کھائی اور نصف سڑک پر کھڑی ہوئی ہوئی جمبول رہی تھی۔ میں پوری جان سے لڑ اٹھا اور اپنی جگہ پر تن بیٹھ رہا۔ حتیٰ کہ میں نے اپنی سانس بھی روک لی۔ جیپ کا توازن ذرا بھی بگڑتا تو وہ ہزاروں فٹ گہری کھائی میں جا لڑھکتی اور میری ہڈی پھلی ایک ہو جاتی۔ جیپ کا انجن بند ہو چکا تھا۔ میں ایک خوفناک حادثے سے بال بال بچا تھا۔ چند ثانیے بعد میں نے نہایت دھیرے دھیرے سیٹ بیلٹ کھولی اور آہستہ کے ساتھ دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور جیپ سے باہر نکلے ہی میں نے بے اختیار گہرے گہرے سانس لئے۔ اس کے بعد بغور جیپ کی اس خطرناک ”SEESAW“ پوزیشن کا جائزہ لینے لگا۔

بہت مشکل صورت حال تھی۔ میں جیپ کو ریورس نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے اندر سوار ہونا بھی خطر سے خالی نہ تھا۔ پھر پتہ نہیں وہ اشارت ہوئی بھی کہ نہیں۔ اگر اشارت ہو بھی جاتی تو ریورس گیسر ڈال اسے پیچھے کرنے کا خطرہ مول لینے کا مطلب خود کشی بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے سڑک پر کھڑے کھڑے اپنے چار اطراف نظریں دوڑائیں۔ مجھے کچھ مقامی آدمیوں تلاش تھی جو میرے ساتھ جیپ کو پیچھے کی طرف دھکیلنے میں میری مدد کر سکتے۔ لیکن دور دور تک پرندوں چپکار کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ تاہم نیچے بہت دور ترائیوں میں چند کھیریل کی ڈھلوانی چھتوں کی چٹنوں دھواں اُٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے عقب میں کوسوں دور ”میراں جانی“ کی برف پوش چوٹی دھوپ میں چمکتی نظر آ رہی تھی۔ میں بے بسی کے باعث جھنجھلا گیا اور خود اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ

جلد بازی کا کیا فائدہ کہ اب میں یوں ویرانے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے کھڑا تھا۔

رستہ وایج میں وقت دیکھا، سہ پہر کے چار بج کر پندرہ منٹ ہونے لگے تھے۔ سردیوں کے یوں بھی تیزی سے ڈھلتے ہیں اور شمالی برف پوش علاقوں میں تو سر شام ہی رات کا گماں ہونے لگتا ہے۔

مجھے اب یہ بھی فکر کھانے لگی کہ یہ سارا جنگلاتی علاقہ تھا۔ رات ہوتے ہی خطرناک جانوروں کے خطرہ الگ دامن گیر ہو رہا تھا۔ ان علاقوں میں دیگر چھوٹے موٹے جانوروں کے علاوہ جنگلی بھیڑیوں

ریچھوں کے اپنی کمین گاہوں سے نکلنے کا خطرہ بھی تھا۔

جیپ کے انجن کی تیز ہوتی گھر گھر اہٹ، ہتھوڑے کی طرح میرے سینے پر پڑ رہی تھی۔ جیپ کے

بائیں ٹائر گھومے۔ جیپ نے ایک جھٹکا کھایا اور وہ آگے سے کھائی کی طرف جھٹکنے لگی۔ میرا رواں

بائیں ٹائر اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ہوا میں معلق، سیدھا کھائی میں جانے والا تھا۔ مگر میں نے اپنی

بجائے رکھی اور دوسرے ہی لمحے جیپ نے پیچھے حرکت کی۔ چند اچ پیچھے حرکت کرتے ہی میں نے

پورا دبا دیا۔ جیپ زوردار غراہٹ کے ساتھ سڑک پر آ گئی۔ میں نے فوراً بریک پر پاؤں

جہاں ذرا بھی راستہ سیدھا ہوتا، میں ٹاپ گیسر پر پورا ایکسلیٹر دبا دیتا۔ جیپ غراتی ہوئی ایک طوفانی آواز سے آگے بڑھتی مگر ذرا دور تک تیز رفتاری کے بعد اچانک کوئی نہ کوئی موڑ آ جاتا۔

راستہ مزید ڈشوار گزار ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف ڈھلوان سبز جنگل تھا تو دوسری طرف گہری ترانہ اور کھائیاں تھیں۔ کئی ”ھوکا“ دینے والے موڑ بھی آ رہے تھے۔ یعنی ایسے موڑ جو بظاہر دور سے پہچانے ڈگری کے محسوس ہوتے تھے لہذا ڈرائیور دھوکا کھا کر گاڑی کی رفتار مطلوب حد تک ڈرام کر کے جیسے ہی کانٹے لگتا تو نزدیک پہنچنے پر پتہ چلتا کہ موڑ کے فوراً بعد سڑک تقریباً ”یوٹرن“ لئے ہوئے ہے اور گاڑی کا کھائی میں گرنا لازمی امر ہوتا۔

میں بھی اس وقت کچھ ایسی ہی خطرناک قسم کی جلد بازی کا شکار تھا اور میرا واسطہ بار بار ایسے خطرناک موڑ سے بڑھ رہا تھا۔ ایک ایسے ہی موڑ پر میں نے جیسے ہی اپنی جیپ موڑی، آگے یک دم کھائی میں گر پڑا۔ میں نے بریک پر پاؤں رکھ دیا، ایکسلیٹر چھوڑ دیا۔ نتیجتاً جیپ کھائی میں گرنے سے تو بال بال بچ گئی مگر تباہوار سڑک پر اُٹتی اور پھر خود ہی سیدی ہو گئی۔

شکر تھا کہ میں نے بیلٹ باندھ رکھی تھی اس لئے سر پر معمولی سی چوٹیں آئی تھیں۔ البتہ وڈا ایک چھناکے سے ٹوٹ چکی تھی۔ لیکن جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے سامنے دیکھا، جیپ اگلے دونوں ٹائر سڑک سے اتر کر ہزاروں فٹ گہری کھائی میں جمبول رہے تھے اور جیپ نصف کھائی اور نصف سڑک پر کھڑی ہوئی ہوئی جمبول رہی تھی۔ میں پوری جان سے لڑ اٹھا اور اپنی جگہ پر تن بیٹھ رہا۔ حتیٰ کہ میں نے اپنی سانس بھی روک لی۔ جیپ کا توازن ذرا بھی بگڑتا تو وہ ہزاروں فٹ گہری کھائی میں جا لڑھکتی اور میری ہڈی پھلی ایک ہو جاتی۔ جیپ کا انجن بند ہو چکا تھا۔ میں ایک خوفناک حادثے سے بال بال بچا تھا۔ چند ثانیے بعد میں نے نہایت دھیرے دھیرے سیٹ بیلٹ کھولی اور آہستہ کے ساتھ دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور جیپ سے باہر نکلے ہی میں نے بے اختیار گہرے گہرے سانس لئے۔ اس کے بعد بغور جیپ کی اس خطرناک ”SEESAW“ پوزیشن کا جائزہ لینے لگا۔

بہت مشکل صورت حال تھی۔ میں جیپ کو ریورس نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے اندر سوار ہونا بھی خطر سے خالی نہ تھا۔ پھر پتہ نہیں وہ اشارت ہوئی بھی کہ نہیں۔ اگر اشارت ہو بھی جاتی تو ریورس گیسر ڈال اسے پیچھے کرنے کا خطرہ مول لینے کا مطلب خود کشی بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے سڑک پر کھڑے کھڑے اپنے چار اطراف نظریں دوڑائیں۔ مجھے کچھ مقامی آدمیوں تلاش تھی جو میرے ساتھ جیپ کو پیچھے کی طرف دھکیلنے میں میری مدد کر سکتے۔ لیکن دور دور تک پرندوں چپکار کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ تاہم نیچے بہت دور ترائیوں میں چند کھیریل کی ڈھلوانی چھتوں کی چٹنوں دھواں اُٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے عقب میں کوسوں دور ”میراں جانی“ کی برف پوش چوٹی دھوپ میں چمکتی نظر آ رہی تھی۔ میں بے بسی کے باعث جھنجھلا گیا اور خود اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ

جلد بازی کا کیا فائدہ کہ اب میں یوں ویرانے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے کھڑا تھا۔

رستہ وایج میں وقت دیکھا، سہ پہر کے چار بج کر پندرہ منٹ ہونے لگے تھے۔ سردیوں کے یوں بھی تیزی سے ڈھلتے ہیں اور شمالی برف پوش علاقوں میں تو سر شام ہی رات کا گماں ہونے لگتا ہے۔

مجھے اب یہ بھی فکر کھانے لگی کہ یہ سارا جنگلاتی علاقہ تھا۔ رات ہوتے ہی خطرناک جانوروں کے خطرہ الگ دامن گیر ہو رہا تھا۔ ان علاقوں میں دیگر چھوٹے موٹے جانوروں کے علاوہ جنگلی بھیڑیوں

ریچھوں کے اپنی کمین گاہوں سے نکلنے کا خطرہ بھی تھا۔

جیپ کے انجن کی تیز ہوتی گھر گھر اہٹ، ہتھوڑے کی طرح میرے سینے پر پڑ رہی تھی۔ جیپ کے

بائیں ٹائر گھومے۔ جیپ نے ایک جھٹکا کھایا اور وہ آگے سے کھائی کی طرف جھٹکنے لگی۔ میرا رواں

بائیں ٹائر اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ہوا میں معلق، سیدھا کھائی میں جانے والا تھا۔ مگر میں نے اپنی

بجائے رکھی اور دوسرے ہی لمحے جیپ نے پیچھے حرکت کی۔ چند اچ پیچھے حرکت کرتے ہی میں نے

پورا دبا دیا۔ جیپ زوردار غراہٹ کے ساتھ سڑک پر آ گئی۔ میں نے فوراً بریک پر پاؤں

قیدی

رکھ دیا اور جب کو نوٹل کرنے کے بعد بے اختیار گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ غصہ خاتی ہوئی۔  
 باوجود میری پیشانی پر نضی نضی ہوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد  
 گیسٹر ڈال کر جب کاسٹیرنگ موڑا اور آگے روانہ ہو گیا۔

❄ ❄ ❄

اچانک آسمانی بجلی زوردار آواز کے ساتھ کڑکی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ وادی میں پھیلنے لگا تھا۔ میں نے جیب کی ہیڈ لائٹس روشن کر دی تھیں۔ اب مجھے پہلے سے بھی زیادہ اعتراضات ساتھ ڈرائیونگ کرنا پڑ رہی تھی۔ ونڈ اسکرین ٹوٹنے کے بعد کاٹ دار ہوا میں میرے چہرے سے لڑکتی تھیں۔ شکر تھا کہ بارش کا زور زیادہ نہ تھا مگر سڑک پر اب پھسلن ہونے لگی تھی۔ میں جیب کو تھم کی اسپڈ سے زیادہ چلانے کا تحمل نہ ہو سکتا تھا۔ چونکہ میں ڈرائیو پہلے ہی ایک انتہائی خطرناک سے بچ نکلا تھا اس لئے مجھے اتنا بھی غنیمت ہی محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اب میری کار کردگی بارش اور دار ہواؤں کن حد تک بہت گھٹا دی تھی۔

میں نہایت مہارت کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ بارش کا ایک ہموار سلسلہ جاری تھا۔ راستہ ہم  
ناہموار اور کچا ہوتا جا رہا تھا اور بارش کے پانی نے کچڑ جیسی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ ایک بار بار  
کاٹنے کے دوران میری جیب پھر گول گھوم گئی۔ میں نے نہایت ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے  
مطلوبہ سمت موڑا۔ اس موڑ کے بعد آگے کا راستہ مجھے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ڈرا سیدھا گھر عمودی نظر  
آ رہا تھا۔ جب جیب چڑھائی چڑھنے لگی تو نصف راستے پر پہنچ کر وہ رک گئی۔ ٹائر گول گھوم کر رہ گئے۔ کچڑ  
سے جیب دوبارہ نیچے کی طرف سرکنے لگی تھی۔ میں نے فوراً ایکسپلیٹر سے پاؤں ہٹا دیا اور بریک دیا  
اب صورتِ حال یہ تھی کہ میں جیب آگے بڑھانے کے لئے ایکسپلیٹر دباتا تو وہ پچائے چڑھائی  
کے پیچھے ہونے لگی اور ساتھ ہی اس کا زاویہ بھی بدلنے لگتا۔

میں بری طرح پریشان ہو گیا۔ میری کارکردگی ایک بار پھر صفر پر آگئی تھی۔ بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ میں نے بریک پر پاؤں رکھتے ہوئے دھیرے دھیرے جیپ کو ”بیک“ کیا۔ میں نے بریک دبا کر اس میں نہ آگے جا سکتا تھا، نہ ہی پیچھے۔

میری پیش قدمی ایک بار پھر رک گئی تھی۔ مگر اس مرتبہ میں پہلے سے زیادہ مشکل کا شکار تھا۔ پاؤں ٹوٹی ہوئی ونڈ اسکرین سے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں یہ غور سامنے پہنچاؤ زندہ راستے کا جائزہ لیا تو مجھے طرف پہاڑی کے ساتھ ساتھ والا حصہ کم کچھڑ والا محسوس ہوا۔ میں نے اسٹیئرنگ مذکورہ سمت مائل اور بریک سے ماؤں ہٹا کر کچھڑ پر رکھ دیا، پھر اس کیلیئر دباتے ہوئے کچھڑ چھوڑنے لگا۔

جیپ کا انجن غرانے لگا۔ چاروں پہنچنے کی حد تک گھومنے لگے۔ جیپ آگے بڑھنے لگا۔ عقب سے رخ بدلنے لگی اور پھر دوسرے ہی لمحے جیپ ذرا پیچھے کھٹکنے کے بعد چند انچ آگے بڑھ کر نے ایک سیلیٹر پورا دبا دیا۔ میری فور وہیل ڈرائیو جیپ کے چاروں پہنچنے کی تیزی سے گھومنے لگے اور دھیرے دھیرے آگے سرکتی ہوئی چڑھائی چڑھنے لگی۔ میں جیپ کو پہاڑی کے بالکل ساتھ مل کر بڑھانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ یہ راستہ نسبتاً کم کچڑ زدہ ہونے کی وجہ سے میری جیپ نے ریک ریک کر اپنی مقررہ رفتار پکڑ لی۔ اب چاروں پہنچے سو کی اسپید سے کچڑ میں پھسلنے ہوئے تھے۔ مگر جیپ تھیں، چالیں کی رفتار سے زیادہ نہیں دوڑ رہی تھیں۔ میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ اس اعصاب شکن ڈرائیوگ نے مجھے تھکا مارا تھا لیکن جستجو اور جوش جنوں نے اس کی پروا

آخر میں اسی طرح مہارت اور مشاقی سے چڑھائی چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب جب پوری طرح کنٹرول میں تھی۔ بارش کے چھیننے ٹوٹی ہوئی ونڈ اسکرین سے اندر پڑ رہے تھے اور میرا چہرہ بھیگ رہا تھا۔ ہر لمحہ بار ماننے والا تھا۔ جیسے تیسے میں نے اپنا سفر جاری رکھا۔

پھر مزید دو گھنٹوں کی اس خطرناک اور اعصاب شکن ڈرائیونگ کے بعد میں ایک قدرے صاف و سبز علاقے میں پہنچا۔ سامنے برف پوش پہاڑیاں میرا راستہ روکے ہوئے تھیں۔ اپنے بلند و بالا اور طویل حجم کی وجہ سے وہ دیکھنے میں تو بالکل قریب ہی محسوس ہوتی تھیں مگر میں جانتا تھا کہ ان کا فاصلہ ابھی کئی میلوں کی

بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے جیب روک دی تھی۔ کالے بادل خوب برسنے کے بعد گلیوں میں نچنے لگے تھے۔ نتیجتاً وسطی راتوں کے چاند کا رخ روشن اوٹ سے نمودار ہونے لگا تھا۔ رات اپنے دورِ نیم شب کی پہلی راتوں کے چاند کی روشنی نے خاموش اور تاریک وادی کو منور کر دیا تھا۔

جیب اسناٹ تھی۔ میں قریب و جوار میں نظریں دوڑانے لگا۔ سانسے میلوں دور تک تاریکی کا راج تھا۔ میں نے جیب دوبارہ آگے بڑھا دی۔ میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ آخر گنیز کو ان برف دراوڑوں میں لانے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ میرے اٹھنے ہوئے خیالوں میں بار بار یہی سوال ابھر رہا کہ اگر کبیر اور کالا ناگ نے گنیز تک رسائی حاصل کر لی لی تھی تو وہ اسے کہیں بھی ریغال بنا کر رکھ سکتے تھے۔ بھلا آبادی سے کسوں دور اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ وہ سوال تھا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ابھی بہ مشکل دو تین کلومیٹر کا فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ اچانک جبب کا انجن گھڑ گھرا خاموش ہو گیا۔ میں نے دوبارہ جیب اسناٹ کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ جبب فیول پیتانے والی ٹی ریفلٹر بڑی تو بے اختیار میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ سوئی E یعنی اینڈ کے قریب پہنچ چکی تھی۔

ڈھوڑ گزار راستوں کی وجہ سے جیب کا پٹرول مقررہ وقت سے بہت پہلے ہی کھپ چکا تھا۔ میرے ہا ایک فاضل ٹیکن تھا۔ میں دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ میرے دائیں جانب گھٹا جھگل تھا جبکہ بائیں طرف مختصر سے سبزے سے ڈھکا ہوا میدان تھا اور پار جھگل تھا جس کے عقب میں بریلی پہاڑیاں تھیں۔ ناکی ڈھلوانوں پر سبزہ کھرا ہوا تھا۔ چاند کی طلسمانی روشنی میں چہار اطراف بڑا خوبصورت اور اسرار بھرا نظر آ رہا تھا۔

میں نے جب کا کچھلا دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر ہری طرح ٹھک گیا کہ پٹرول کا فاضل کین آلت چکا اور جب کے اُٹنے اور پھر سیدھا ہونے کے بعد کین کا ڈھکنا بھی غالباً کینوں کی وجہ سے لوز ہو چکا تھا۔ میں اس سے سارا پٹرول رس کر ختم ہو چکا تھا۔ میں نے جلدی سے گرا ہوا کین اٹھایا مگر وہ خالی تھا۔ میں نے تجھلا کر جب کا عقبی دروازہ زوردار دھماکے سے بند کر دیا۔

سردی کی کٹ بڑھنے لگی تھی۔ بارش کے بعد برف باری بھی متوقع تھی۔ چھ پر جھنجھلاہٹ اور بے بسی اُٹنی ہوئے لگی تھی۔ اپنی جدوجہد کے رایگاں جانے کا احساس میرے لئے روح فرسا تھا لیکن میں نے نئی برکات کو عبور کرنے کا عزم کر رکھا تھا لہذا میں نے جیب کے ڈیش بورڈ سے اپنا میگارڈ نکال کر سڑک کے اندر رکھا۔ ایک چھوٹی ٹارچ پہلے ہی میری جیب میں موجود تھی جسے میں نے آگے پیدل روانہ کیے وقت نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

❄ ❄ ❄

اچانک میں چلتے چلتے ٹھک کر رہا۔

اس دور افتادہ اور ویران جنگلی علاقے میں اس کانچ کی موجودگی میرے لئے باعث حیرت نہ تھی۔ یہاں وادیوں میں ایسے کئی کانچ اور ریست ہاؤسز دیکھنے میں آتے تھے۔ میں آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا اور ساتھ ہی سامنے کانچ پر بھی اپنی نظریں مرکوز رکھی تھیں۔

جب ذرا نزدیک پہنچا تو مجھے یوں لگا جیسے یہ کانچ برسوں سے ویران پڑا ہوا ہو۔ یہ خاصا پرانا معلوم ہوتا تھا مگر ابھی درست حالت میں تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ یہاں کچھڑ میں چاند کی روشنی میں مجھے کسی گاڑی کے ٹائروں کے تازہ نشانات نظر آئے۔ میں ان نشانوں پر چلتا ہوا سیدھا کانچ کے بیرونی احاطے کے گیٹ تک جا پہنچا۔ یہ احاطہ جنگلی اور خاردار جھاڑیوں سے بنایا گیا تھا۔

گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور کانچ کے مرکزی دروازے تک جا پہنچا اور بری طرح ٹھکا۔ دروازے کا ایک پت کھلا ہوا تھا۔ اندر اندھیرا تھا۔ آس پاس ویرانی مسلط تھی۔ پتوں کی جب میں رکھ کر میں نے مارچ نکال لی اور دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ مارچ میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کی روشنی کا دائرہ کمرے کی تاریکی کو بڑی حد تک دور کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس روشنی میں جو کچھ میں نے دیکھا، اس نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔..... وہ منظر اتنا ہی کراہت آمیز تھا کہ مجھے اپنے اعصاب پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ مارچ میرے ہاتھوں سے گرتے گرتے پٹی۔

\*\*\*

یہ خوفناک منظر دیکھ کر ایک لمحے کو میں اپنی جگہ سن کر ہورہ گیا تھا۔ پھر فوراً ہی میں نے خود پر قابو پایا اور بغور لاش کی صورت اوندھے منہ پڑے وجود کو دیکھنے لگا۔ وہ کسی کی لاش ہی تھی اور صاف نظر آتا تھا کہ اسے بے پناہ تشدد کے بعد بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا کیونکہ لاش کے ارد گرد خون پھیلا ہوا تھا۔

ایک روح فرسا خیال کے تحت میں بے اختیار آگے بڑھا اور اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے میں نے جب لاش کا چہرہ دیکھنے کے لئے اسے پشت کے بل سیدھا کیا تو میرا دل جیسے دھڑکنا بول گیا۔..... وہ میرے جاں نثار ملازم مردان شاہ کی لاش تھی۔..... غم و غصے سے میرا حال ہو گیا تھا۔ میرے دماغ میں گویا آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ میں نے اپنی ذہنی حالت پر بے مشکل قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے مردان شاہ کی لاش کا معائنہ کیا۔ اسے بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

جسم پر جا بجا زخموں کے نشانات تھے۔ سر اور چہرہ بھی بری طرح ظالمانہ تشدد کا نشانہ بنا تھا۔ غم کے شدید احساس تلے بے اختیار میری آنکھیں نم ناک ہو گئی تھیں۔ یہ غور جائزہ لینے پر مجھے اتنا تو اندازہ ہو چلا تھا کہ یہ ساری وحشیانہ کارروائی چند گھنٹے پہلے ہی کی گئی تھی جو بلاشبہ کالا ناگ کے خونی اور سفاک گروہ کی ہو سکتی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے آنسو ضبط کئے۔ گہرے رنج و غم کی اتھاہ گہرائیوں سے ابھر کر اٹھ کھڑا ہوا پھر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

اچانک میری نگاہ مردان شاہ کی لاش کے قریب پڑی جہاں اس کا سر تھا۔ وہاں مجھے خون سے لکھے ہزاروں ترچھے لفظ نظر آ رہے تھے۔ میں نے ذرا قریب آ کر جھکتے ہوئے مارچ کی روشنی وہاں ڈالی اور بغور ان الفاظ کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ لفظ آڑے ترچھے ضرور تھے مگر ذرا سی کوشش کے بعد میں ”کس پور“ پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس لفظ کو پڑھنے کے بعد میرے سینے میں ہلچل مچ گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ یہ لفظ مردان

میرے سامنے بل کھاتا کچھڑ زدہ راستہ، دور تاریکی میں گم ہو رہا تھا۔ مجھے درحقیقت اپنے عقب غراہٹوں کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ میں نے ایک دم پلٹ کر دیکھا تو بری طرح چونک پڑا۔ میرے سر پر چند جنگلی بھیڑیوں پر مشتمل ایک غول چلا آ رہا تھا۔ ان کی خونخوار آنکھوں میں گرسنہ چمک مچ گئی۔ زکنا دیکھ کر وہ بھی زکے اور اپنے جڑے کھولے میری طرف دیکھتے ہوئے غرانے لگے۔ چاند کی روشنی ان کے خونخوار ادھ کھلے جھڑوں سے شکاری دانتوں کی وحشیانہ جھلک صاف نظر آرہی تھی۔ میں نے ہی اپنا ایک ہاتھ چیسر کی اندرونی جیب کی طرف بڑھایا تو بھیڑیوں کے غول نے فوراً حرکت کرتے ہوئے میری طرف لپکے۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پھرتی سے میگا روٹ نکال لیا۔ تاخیر بھوکے بھیڑیوں کے غول پر ایک فائر کر ڈالا۔ رات کے دم بخود اور ہیکے ہوئے سانے میں گولی کی دھماکے دار آواز دور تک وادی میں گونجتی چلی گئی۔ ایک بھیڑیا گولی کھا کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ میں نے دوبارہ قدم آگے بڑھا دیئے مگر جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ بھیڑیوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

وہ خود رو جھاڑیوں اور گھنے چھتھار پیڑوں کی آڑ لے، بدستور میرے تعاقب میں تھے۔ میرے فاضل رائف بھی تھے جبکہ میگا روٹ کے چیمبر میں اب سات میں سے چھ گولیاں بچی تھیں مگر میں انہیں نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے اب تیز تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا تھا۔ جنگلی بھیڑیے اپنے ساتھی کا بھیا تک انجام دیکھ کر اب میرے سامنے آنے کی جرأت نہیں کر پا رہے تھے لیکن بھوکے ”شکار“ کی بُو سے دور جانے بھی نہیں دیا تھا۔ وہ مجھے کسی مقام پر گھیرنے کی کوشش میں تھے اور ہولے ہولے غراتے ہوئے میرے تعاقب میں چلے آ رہے تھے۔ میں بھی محتاط روی کے ساتھ اپنے بائیں اور عقب میں گردن موڑے، گاہے گاہے ان پر نظر رکھے آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک ایک مقام پر دو بھیڑیوں نے بیک وقت دائیں بائیں جانب سے مجھ پر غراتے چھلانگیں ماریں۔ مجھے گولی چلانے کا موقع تو نزل سکا البتہ میں پھرتی کے ساتھ ایک دم نیچے ہونے دوںوں بھیڑیے فضا میں ہی ایک دوسرے سے ٹکرا گئے اور میں تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ اب ساتھیوں کی بے باک جرأت پر باقی بھیڑیے بھی بے درنگ غراتے ہوئے دائیں بائیں کی جھاڑیوں نمودار ہو گئے۔ مجھ پر چھلانگ مارنے والے دونوں بھیڑیے دوبارہ خوفناک غراہٹوں کے ساتھ طرف لپکے۔ بھیڑیوں کے اس غول نے مکاری کے ساتھ مجھے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اب فائر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی طرف لپکتے ہوئے ان دونوں بھوکے بھیڑیوں اور دو فائر کر ڈالے۔ وہ دونوں کر یہہ غراہٹوں کے ساتھ ڈھیر ہو گئے۔ باقی بھیڑیے دوبارہ تتر بتر لگے تو میں نے طیش میں آ کر ان پر بھی ایک گولی چلا دی۔ چوتھا بھیڑیا بھی خاک چاٹنے لگا۔ مگر یہ کم بخت میرے ساتھ چوہے جلی کا ٹھیل کھینے کی کوشش کریں گے اس لئے میں نے کسی محفوظ

تک جلد سے جلد پہنچنے کے لئے اب تقریباً دوڑنا شروع کر دیا۔

بچے مجھے بھیڑیوں نے خاصی دور تک میرا پیچھا کیا، پھر اس کے بعد وہ یا تو واپس لوٹ گئے یا پھر وہیں دبک کر اپنے ہی مردہ ساتھیوں کو چٹ کرنے کے ارادے سے زک گئے تھے۔ میرے

کے چیمبر میں اب صرف تین گولیاں باقی بچی تھیں۔

آگے ڈھلوانی راستہ آگیا۔ میں نے ذرا ٹھہر کر مدھم چاندنی میں نیچے قدرے ترائی میں دیکھا

ذرا دور ایک مسطح قطع رکنا کچھ نما گھر کا ہولا دکھائی دیا۔



ساہ نے اپنی اذیت ناک موت سے ذرا دیر پہلے اپنے لہو سے انگلی کی مدد سے لکھا ہو گا۔ اسے پورا پورا  
تھا کہ اس کا خط ملتے ہی میں جین سے ہرگز نہیں بٹھوں گا اور جلد یا بدیر اس تک ضرور پہنچوں گا۔ وہ چہرہ  
کی بازی ہارتے ہوئے مردان شاہ کی آخری کوشش تھی بلکہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ اسے بخوبی انداز  
تھا، نگینہ کو کالا ناگ اور اس کے ساتھیوں کے جنگل سے نکالنا آسان نہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی  
جان پر کھیل کر ان تک رسائی حاصل کر لی تھی جس کے نتیجے میں اس کی جان تک چلی گئی تھی۔ لیکن پھر  
وہ مجھے میرے دشمنوں کی آئندہ منزل سے آگاہ کر گیا تھا۔ مجھے مردان شاہ کی دوستی اور اس کی ہمتوں پر  
ہونے لگا۔ ایسے بے لوث، جری اور دھن کے کئے لوگ اب بھلا کہاں ملتے ہیں۔

مجھے دشمنوں کے آئندہ ٹھکانے کا علم ہو چکا تھا اور مجھے بلاتا خیر وہاں روانہ ہو جانا چاہئے تھا۔  
مردان شاہ کی تشدد زدہ لاش کو یوں بے گور و کن چھوڑنا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ میں سر جھکائے بیٹھا تھا  
اچانک میری نظریں مردان شاہ کی مردہ آنکھوں پر پڑیں تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے جلدی کرنے کی  
اتجا کر رہی ہوں۔ ”نادر صاحب! میں تو اپنی جان ہار چکا ہوں اور اب آپ تاخیر کر کے میری قربانی  
رایگاں نہ جانے دیں۔ آپ فوراً یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ نادر صاحب!..... نادر صاحب!.....“  
مجھے یہ صدمہ مردان شاہ کے رویوں سے اٹھتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

یہ گونج اتنی بڑھی کہ میں بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے مردان شاہ کے جسد خاکی رالودائی  
ڈالی اور باہر نکل آیا۔

میرا اندازہ تھا، کش پور اس مقام سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں پیدل چل کر ڈیڑھ دو گھنٹوں میں وہاں  
سکتا تھا۔ جیب میں اگر پٹرول ہوتا تو یہ فاصلہ شاید چند منٹوں کا رہ جاتا۔ مجھے اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا  
کہ میں نے پٹرول کے ٹیکن کو مضبوطی سے کیوں نہ باندھ کر رکھا تھا۔

میں نے کانچ کا دروازہ بند کر دیا تاکہ جنگلی جانور اندر کھس کر مردان شاہ کی لاش کو نقصان نہ  
دیں۔ پھر میں تیز قدموں سے کش پور کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہر طرف جنگلی ہوئی چاندنی میں جیب کے ٹائروں کے نشانات میری راہنمائی کر رہے تھے۔ اس دن  
یوں رات گئے ویران جنگلوں کی خاک چھانسنے والا، میں کسی دیوانے ہی کی اس وقت تفسیر بنا ہوا تھا۔

میرے اطراف میں شب کا پرسرا اور پرسکوت سناٹا چھایا ہوا تھا۔

رات دے پاؤں آخری پہر میں سرک رہی تھی۔ میں نشانات دیکھتا ہوا قدم بہ قدم آگے بڑھا چلا  
رہا تھا۔ معاً میں ایک آواز پر ٹھک کر رک گیا، پھر اپنی تمام ساعتوں کی مدد سے شب کے اس سناٹے میں  
کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر میری سماعت نے وہ آواز سن لی۔ وہ کسی انجن کی مخصوص گھر گھر آہ  
تھی۔ چند ثانیے بعد ہی مجھے سامنے روشنی اُبھرتی نظر آئی جسے دیکھتے ہی میں نے دائیں جانب کی طرف  
جنگلی جھاڑیوں میں دبک کر روشنی کی سمت نظریں جمادیں۔ کچھ ہی دیر بعد گرے کلر کی اولڈ ماڈل لینڈ  
کروزر میرے پاس سے اُچھلتی ہوئی گزر گئی۔ میری آنکھوں میں اُبھرنے لگی۔ مجھے یاد تھا کہ ”گھنٹہ  
گلی“ والے سرکاری ریست ہاؤس میں زرد آنکھوں والے چوکیدار نے مجھے اسی جیب کا اشارہ دیا تھا۔  
کا مطلب تھا کہ میرے دشمن ابھی ابھی میرے سامنے بلکہ برابر سے گزرے تھے۔ اس بار ان کی منزل  
جانے کہاں ہوتی؟

میرے بدن میں جیسے جوش و غضب کسی بجلی کی مانند دوڑ گیا۔ میں جھپٹتا ہوا جھاڑیوں کی اوٹ  
نکلا اور بے تحاشا جیب کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔

میں جانتا تھا کہ یہ میری ہچکا نہ کوشش تھی۔ میں جیب کی رفتار کا مقابلہ محض اپنی ٹانگوں کے زور پر ہرگز  
نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ بل کھاتے کچے راستے پر جیب تیز رفتاری سے نہیں دوڑ سکتی تھی  
لیکن اس کی رفتار اتنی بھی کم نہیں ہوتی کہ میں محض اپنی دو ٹانگوں کی قوت سے اسے پکڑ سکتا یا اس کے  
ساتھ چل سکتا۔ لمبائی غور کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں راستے کی بجائے براہ راست درختوں سے ڈھکی  
ڈھالان پر چل پڑوں تو جیب سے آگے بھی نکل سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ شب کی تاریکی اور  
اونچا چٹا ڈھلوان۔ چند ہی لمحوں بعد میرا سانس بری طرح پھول گیا تاہم میں اپنی تمام تر طاقت کے ساتھ  
مستل نیچے کی طرف اُترتا رہا۔ میری یہ جدوجہد رایگاں نہیں گئی اور میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جس  
طرف سے جیب آ رہی تھی۔ میں وہیں کھڑا ہو کر گہرے سانس لیتے ہوئے اپنے بے حال نفس پر قابو  
پانے کی کوشش کرنے لگا۔

جلد ہی مجھے جیب نظر آنے لگی۔ وہ ہچکولے کھاتی میری طرف بڑھتی آ رہی تھی۔ میرے پاس اب  
جیب کو روانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ سوچ کر میں نے میگارڈ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میں نے اس  
جیب کا تاثر برست کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر کہ اگر اس میں میرے  
دشمن سوار ہوتے تو وہ محتاط ہو سکتے تھے۔ کیونکہ نفری اور اسلحے میں وہ مجھ پر بہر حال فوٹ رکھتے تھے اور  
پیرے پاس اسلحے کی صورت میں صرف ایک میگارڈ تھا اور اس میں بھی اب صرف تین گولیاں ہی باقی بچی  
تھیں۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ جلدی فیصلہ کرنا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ایک بڑا سا نوکیلا پتھر  
ٹاش کر لیا اور اسے ہاتھ میں پکڑ کر میں جھاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ جوں ہی وہ جیب ذرا قریب پہنچی  
تو میں نے اوٹ سے ذرا اٹھ کر پوری قوت سے وہ پتھر جیب کی وڈ اسکرین پر دے مارا۔ جیب کی وڈ  
اسکرین ایک دھماکے سے ٹوٹ گئی۔ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دوبارہ جھاڑیوں میں دبک گیا۔ جیب  
رک چکی تھی۔ میں بہ غور دھڑکتے دل سے جیب کی طرف گھورے جا رہا تھا۔ پھر میں نے جھاڑیوں کی  
اوٹ میں حرکت کی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جیب کے سوار نیچے اُتر کر ضرور یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ  
یہ کام کس نے کیا ہو گا؟..... ایسا ہی ہوا۔ میں اب جیب کے ذرا قریب دائیں جانب کی جھاڑیوں میں  
دبک آیا تھا۔ میری نظریں جیب پر مرکوز تھیں۔ جیب کے دروازے کھلے اور میں نے بیک وقت چار پانچ  
سک افراد کو اترتے دیکھا اور پھر ان میں سے دو افراد کو دیکھ کر میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں اور رگوں میں  
خون کی گردش یلکھت تیز ہونے لگی۔

وہ کالا ناگ اور کبیر حیات تھے۔ باقی تین یقیناً ان کے ”غلام“ رہے ہوں گے۔ ان کے ہاتھوں میں  
ٹارچیں بھی تھیں۔

”یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟“ معاً کالا ناگ نے غراہٹ سے مشابہہ آواز میں کہا۔ ساتھ ہی وہ  
بڑی خوفناک نظروں سے آس پاس کی جھاڑیوں کا انکسارے کرنے میں مصروف تھا۔ موت کا کھیل شروع  
ہونے والا تھا مگر مجھے سب سے زیادہ فکر نگینہ کی تھی۔ جانے یہ بد بخت لوگ اسے کہاں چھوڑ آئے تھے؟  
اپنے بدترین اور سفاک دشمنوں کا یقین کر لینے کے بعد اب میں بے دھڑک ان سے ٹکرانے کا مصمم  
ارادہ کر چکا تھا۔

”چلو چھوڑو یار!..... جانے دو۔“ معاً کبیر کی بیزار کن آواز ابھری۔ ”ہو گا کوئی پاگل۔ چلو، دیر ہو  
رہی ہے۔“

”ہرگز نہیں۔“ کالا ناگ نے پھٹکارتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”یہ حرکت کسی پاگل کی نہیں ہو  
سکتی۔“

سکتی۔ بھلا اس دیرانے میں کوئی پاگل کہاں سے آگیا؟“

”پاگل ان دیرانوں میں ہی تو ہوتے ہیں۔“ کبیر نے ایک قہقہے کے دوران کہا۔

ہاں..... یہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ واقعی ایک پاگل اس وقت ان سب کو جہنم واصل کرنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ میں نے دانت پیس کر سوچا۔

کالا ناگ نے خطرے کی بوسنگھ لی تھی۔ اس نے اپنے تینوں خونی ہرکاروں سے حکماندہ انداز میں کہا اور پھر وہ تینوں مستعدی کے ساتھ حرکت میں آ گئے۔ ایک تو عقب کی جھاڑیوں میں راستے کی جانب غائب ہو گیا جبکہ باقی اس طرف بڑھنے لگے جہاں اس وقت میں دبکا ہوا تھا۔

دونوں شکاری نما شکاروں کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر میرے اعصاب تن گئے۔ میں ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ دونوں نارچوں کی روشنیاں بکھیرتے ہوئے جیسے ہی میرے ذرا قریب میں بے آواز، سینے اور کہنوں کے بل پر ریٹنگتا ہوا ان کے عقب میں آگیا اور اچانک ہی کھڑا ہو کر مجھ نے خاموشی سے ایک گردن دیوچ کر اسے زوردار جھٹکا دیا۔ حلق سے ”اوغ“ کی صورت میں آخری اُبھری۔ اس کا دوسرا ساٹھی جھپٹ کر پلٹا تو میں اس وقت تک مردہ شکار سے گن جھین چکا تھا تاہم میں فائر کرنے کی بے وقوفی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی دوسرا شکاری بدک کر میری طرف متوجہ ہوا میں نے اپنے بازوؤں کے ٹکڑے میں جھولتے اس کے مردہ ساٹھی کو اسی پر دھکیل دیا۔ وہ جب تک اپنی کارخ میری طرف کرتا اس کا ساٹھی اس سے جا کر گیا۔ مردہ ساٹھی کی لاش سے اچانک کھڑاؤ کے نتیجے میں وہ لڑکھڑایا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا توازن سنبھالنے کی کوشش کرتا، میں نے اس کے ساٹھی سے پکڑ کر اسے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھمایا اور اس کا سر چنچ گیا۔ کٹے ہوئے ہتھیر کی طرح گرتے ہوئے اس کے حلق سے ایک زوردار مکروہ چیخ اُبھری تھی۔ اسے بے ہوش چھوڑ کر میں دوبارہ گن سنبھالا جھاڑیوں میں دبک گیا۔

میں نے دیکھا، لینڈ کروزر کے قریب کھڑے کالا ناگ اور کبیر چیخ کی آواز پر بری طرح جھٹکے اور پھر دوسرے ہی لمحے انہوں نے اپنی جیبوں سے نہایت پھرتی کے ساتھ پستول نکال لئے۔ اس کے بعد وہ دونوں جھاڑیوں کی طرف چونکنا نظروں سے گھورنے لگے۔ کالا ناگ کے سیاہ چہرے پر غضب و خست طاری تھی البتہ کبیر خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔

کالا ناگ نے چلا کر اپنے انہی دونوں ہرکاروں کو پکارا جنہیں میں ڈھیر کر چکا تھا مگر جواب نہ پا کر وہ بھی اُنھیں کا شکار ہو گیا۔ غالباً وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ آگے بڑھے یا وہیں کھڑا رہے۔ البتہ چلانے پر اس کا تیسرا ہرکارہ ان کے عقب سے نمودار ہوا۔ پھر کالا ناگ نے کبیر کو وہیں رکے رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے ساٹھی ہرکارے کے ساتھ جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ میرا دل اب گویا سائیں سائیں کرتی گھنٹوں میں دھڑکنے لگا۔ پہلے میں نے اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کیا مگر پھر کچھ سوچ کر میں نہایت آہستہ سے ایک طرف کور بیگ گیا۔ مجھے پوری تسلی تھی کہ اب یہ لوگ میرے آہستی پنچوں سے بچ کر نہیں جاتے تھے۔ لہذا میں کالا ناگ اور اس کے اکلوتے ہرکارے کو اندھیروں میں ٹاک ٹوئیاں مارتا چھوڑ کر چشم زدن میں دوسری طرف رینگ گیا۔ پھر کچے راستے پر ابھر کر میں نے فوراً جیب کے عقب میں آنے کی کوشش کی تو اچانک وہاں کھڑے کبیر کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے میری جھٹک دیکھتے ہی بلا تامل مجھ پر گولی دی۔ مجھے اگر جیب کی آڑ میں آنے پر ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو گولی مجھے شکار کر سکتی تھی۔ لیکن اب صورت حال خطرناک رخ اختیار کرنے والی تھی۔ کبیر میری جھٹک پر گولی داغنے کے بعد پھرتی

جھاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ میں اس کی چالاکی بھانپ گیا۔

شکار اور شکاری کے درمیان جو بے ملی کا خطرناک کھیل شروع ہو چکا تھا۔ میں نے جیب کی آڑ لیتے ہوئے دوسری طرف، دیکھنے کی کوشش کی۔ کبیر بنیادی طور پر ایک بزدل مگر لومڑی کی طرح عیار اور مکار تھا۔ جبکہ کالا ناگ دشمن کے مقابلے پر بے دھڑک اُتر آتا تھا۔ لہذا یہی سبب تھا کہ کبیر کی چلائی ہوئی گولی کی آواز پر وہ جہاں کہیں بھی تھا، فوراً ہی اپنے ”اکھوتے“ ہرکارے کے ساتھ واپس پلٹا تھا۔ کبیر کی جھٹک بھی مجھے نظر آئی تھی۔

اب وہ تینوں جان چکے تھے کہ ان کے مد مقابل کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ مردان شاہ کی قربانی کے

بجائے انہیں اندازہ ہو گا کہ میں کسی بھی وقت ان کے مقابل آ سکتا تھا۔ وہ تینوں مجھے گھیرنے کی کوشش میں تھے۔ میرے پاس ان میں سے ایک کی چیمنی ہوئی ایم بی فائیو رائل تھی۔ یہ ایک زبردست آتشیں ہتھیار تھا، جس کے میگزین کلب کے ساتھ ایک اور فاضل گولیوں کا بک بھی منسلک تھا۔

میں نے شکار کو تاننے کے لئے اپنی پوزیشن بدلی اور جیب کے ساتھ لگے حرکت کی تو اچانک مجھے جیب کے اندر ایک اور وجود کی جھٹک دکھائی دی۔ میں نے چونک کر ذرا ششے سے اندر دیکھا اور پھر جیسے دوسرے ہی لمحے میں سانس لینا بھول گیا۔ اس وقت اعصاب شکن سنائے کو گولیوں کے ایک برست نے ختم کر دیا۔

میں غیر ارادی طور پر نیچے جھک گیا۔ کھڑکی کے ششے ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی جیب کے اندر ایک تیرنواں چیخ اُبھری۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی میں نے جیب کے اندر نیم بے ہوشی کے عالم میں بڑے نوابی وجود کو دیکھا تھا، وہ حقیقت بھی یا میرا خواب؟..... لیکن میری جاکتی آنکھیں خواب نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ہاں..... وہ میرے وجود کا حصہ تھیں ہی تھی۔

تھیں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہی جیسے میرا پورا وجود جواا لکھی بن کر رہ گیا تھا..... برست اڑنے کے فوراً بعد میں نے ایک بار اندر موجود تھیں کو دیکھا اور یہ تسلی ہونے کے بعد کہ وہ صحیح سلامت تھی، میں نے یکدم زمین پر لیٹ کر جیب کے نیچے سے سامنے دیکھا تو اچانک ہی مجھے تیزی کے ساتھ کروٹ بدلتا پڑی۔ ایک اور برست نیچے سے مجھ پر داغا گیا تھا۔ شکر تھا کہ بروقت میری نگاہ کالا ناگ کے اکلوتے ہرکارے کی پوزیشن پر پڑ گئی تھی جو خود بھی زمین پر سینے کے بل مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولیوں کی خوفناک سنناہٹ مجھے اپنے چہرے کے بالکل قریب سے گزرتی محسوس ہوئی تھی مگر میں نے پھرتی سے کروٹ بدلتے ہی دوبارہ شست بانڈی اور مذکورہ ہرکارے پر برست فائر کر دیا۔ وہ ایک کربناک چیخ کے ساتھ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

میں کچل کی سی تیزی کے ساتھ اٹھا تو سامنے ہی مجھے کبیر دکھائی دیا۔ وہ پستول ہاتھ میں تھامے ہوئے تھا انداز میں جیب کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جیب کے سامنے والے حصے کی طرف سرک رہا تھا۔ میری نظروں نے کالا ناگ کو بھی دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا تھا۔ کبیر کو جیب کی طرف بڑھتا دیکھ کر میں اس کا مقصد سمجھ چکا تھا۔ وہ جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہونے کے لئے بے تاب تھا۔ میں نے اس کی غلت آمیز بے وقوفی سے فائدہ اٹھایا اور نہایت پھرتی اور ہوشیاری کے ساتھ پلٹ کر مقررہ جگہ پر اس کے پستول والے ہاتھ پر گولی چلا دی۔ اس کے حلق سے ایک کربناک چیخ نکلی۔ پستول چھوٹ کر دور جا پڑا اور اس کے ہاتھ سے خون جاری ہو گیا۔ وہ جب تک

سنجھا، میں اس کے سر پر پہنچ کر اسے گن پوائنٹ پر لے چکا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ہکا بکا کر اس کے چہرے پر شدید اذیت کے آثار نمایاں تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا زخمی ہاتھ تھامے کھڑا کر رہا تھا۔ ”کبیر!..... کہاں ہے تمہارا وہ کتا کالا ناگ؟.....؟“ میں نے اسے لبو رنگ نظر دل گھورتے ہوئے غرا کر پوچھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میری عقابانی نظریں اس پاس گردش کر رہی تھیں۔ ناگ کے پر اسرار ”غیب“ پر میں پریشان ہونے لگا تھا۔ وہ بہت مکار اور شاطر انسان تھا۔ ضرور خطرہ بھانپ کر کہیں خاموشی سے گھات لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ مگر میں اب اس کی تلاش میں وقت ضائع نہیں چاہتا تھا۔ کبیر البتہ میرے سوال پر محض لکت زدہ آواز میں ہکا کر رہ گیا تھا۔ کالا ناگ کے اچانک چر کر وار کرنے کے ممکنہ خطرے کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں فوراً کبیر کو ڈھال بنانے کی خاطر اس پر تھپا اسے بازو سے دبوچ کر فوراً چپ کی طرف آگیا اور غرا کر کبیر سے بولا۔

”دروازہ کھولا!..... جلدی۔“

اس نے فوراً اپنے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا تو سب سے پہلے میں جلدی سے جیب میں سوار ہوا پھر ایک نگاہ عقبی سیٹ پر بے سدھ پڑی گیند کو دیکھا۔ وہ ہڈیانی پیچ مارنے کے بعد شاید دوبارے بول ہو چکی تھی۔ چونکہ اب کبیر میرے ہتھے چڑھ چکا تھا اور اس کا منہ کھلوانا کافی تھا لہذا میں اس کی غنیمت سونپ گئی چابی کو اب گھمانے ہی والا تھا کہ اچانک کھڑکی سے ایک سیاہ نال میری کینٹی سے آگئی اور ساتھ ایک پھٹکاری ہوئی آواز ابھری۔

”جیب سے نیچے اتر آؤ نادر!.....!“ یہ کالا ناگ تھا۔ میرے دجود میں چو نہیںاں ریگئے لگیں۔ جانے کس وقت ریگتا ہوا جیب کی ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کی طرف آن دھکا تھا۔ میں نے بازو پر بیٹھے بیٹھے ذرا گردن موڑ کر کالا ناگ کو سنسنائی نظروں سے گھورا۔ اس کے بد ہیئت ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ادھر میرے برابر میں بیٹھے ہوئے کبیر نے دانت پیستے ہوئے میری طرف قبضہ جما لیا تھا۔ میں دروازہ کھولنے لگا تو کالا ناگ مجھ پر پستول تانے ہوئے یلکھت چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں خاموشی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور بے خونی سے تن کر اس کے رو برو کھڑا ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو چند تانے خون ناک نظروں سے گھورتے رہے۔ اس اثناء میں کبیر میری جھ سے ہوتی گن تھامے نیچے اتر آیا تھا اور میری طرف گھورتے ہوئے اس نے کالا ناگ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”کالا ناگ!..... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی گن میرے بچے طرف تان لی۔

کبیر!.....“ اچانک کالا ناگ نے اسے تنبیہ آمیز لہجے میں پکارا۔ ”ابھی اس کا وقت نہیں آ رہا تھا۔“ میں نے اسے لرزہ خیز مناظر کا نظارہ کروانا ہے۔..... ورنہ تو میں جب چاہوں اسے بڑے سے موت کی نیند سلا سکتا ہوں۔“

”میں اتنا تر نوال نہیں ہوں کالا ناگ!“ اس کی خوش فہمی پر میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”بھڑا ہے کہ میں اس وقت دشمنی کی جس آگ میں سلگ رہا ہوں، اسے میرے اور میرے دشمنوں تک ہی محدود رہنے دو۔ اس کا دائرہ تم خود تک نہ بڑھاؤ۔ ایسا نہ ہو، پھر مجھے اپنے دشمنوں کے عبرت ناک انجام شروعات تم سے کرنا پڑ جائے۔“ میرے لہجے کی گھن گرج اور ارادوں کی تیش کو محسوس کرنے کے باوجود کالا ناگ کے سر سے خوش فہمی کا بھوت نہیں اترتا تھا۔..... وہ مارے طیش کے اپنے دانت چیتا ہوا قدم آگے بڑھا اور میرے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے پستول کی نال میری پیشانی سے لگا دی

میرے آنکھوں میں خوف کی ایک ذرا رقت تک نہ ابھری تھی..... اس نے سینٹی کیج بٹایا، ٹرائیگر پر انجی رکھ دی۔

”اب کیا کہتے ہو؟..... چلاؤں گولی؟“ وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میرے ساتھی مردان کا قتل کس نے کیا ہے؟“ میں اس کی خوفناک دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

میرے استفسار پر اس کے بد ہیئت ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ ابھری تھی۔ ”تمہارا ساتھی ویسے فائو بڑا اچھی دار۔ لیکن افسوس، اس نے مجھ سے ٹکر لینے کی بے وقوفی کی..... اور..... اس نے خود اپنی جان اپنے ہاتھوں میں رکھ کر میرے حوالے کر دی۔“

اس کے منہ سے اپنے جاں نثار ملازم مردان شاہ کی ہلاکت کا یقین ہوتے ہی جیسے میرے پورے وجود میں قہر و غضب کی بجلیاں دوڑ گئیں۔ اب کالا ناگ جیسے سفاک اور سنگ دل درندے کا بھیا نک انجام مقدر بن چکا تھا۔

”گولی چلاؤ کالا ناگ!..... اسے یہیں ختم کر دو۔ یہ اب ہمارے لئے بہت خطرناک بن چکا ہے۔“ قریب کھڑے کبیر نے ہڈیانی انداز میں چلا کر کالا ناگ سے کہا۔

”کاش..... میں تیری ہو پڑی میں سوراخ کر سکتا نادر!..... کاش.....“ وہ غیظ آلود لہجے میں دانت چیں کر بولا اور دوسرے ہی لمحے اس نے پستل میری پیشانی سے ہٹاتے ہوئے اس کا آہنی دست میری کینٹی پر مارنے کی کوشش کی لیکن میں، جو اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا، اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آیا اور اپنے ایک ہاتھ سے اس کے پستول والے ہاتھ کے وار کو روکتے ہوئے دوسرے ہاتھ کا زور دار گھونسا اس کی ناک پر رسید کر دیا۔ وہ بے اختیار ڈالا لیکن میں تب تک اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ اس کی گن سے نکلنے والی گولیوں کی باڑ لینڈ کر زور کی باڑی میں پیوست ہو گئی۔ میں تب تک کبیر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے دوبارہ اپنی گن کا رخ میری طرف کرنا چاہا مگر اس وقت کالا ناگ درمیان میں آگیا۔ میں بھی ٹھٹھک کر اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

اس کی ناک پر پڑنے والے میرے ایک ہی گھونٹنے سے اس کی شکل بگاڑ کر رکھ دی تھی۔ خون بھل بھل کی ناک سے بہہ رہا تھا، جس نے اس کے کمریہ چہرے کو مزید بھیا نک بنا دیا تھا۔ کبیر ششدر رہ گیا۔ کالا ناگ کی وحشت ناک نظریں میرے چہرے میں خجروں کی طرح پیوست تھیں۔ پھر وہ خرخراتی آواز میں مجھ سے بولا۔

”نادر علی خان! آج میں اپنے زور بازو پر تیرا یہ غرور خاک میں ملا کر رہوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے کبیر سے کہا۔ ”کبیر! تم گاڑی اور لڑکی کو لے کر روانہ ہو جاؤ..... لیکن خبردار! نادر پر گولی ہرگز مت پانا۔ کیونکہ یہ میرا شکار ہے۔“

میں اس کی بات پر بے چین ہو گیا۔ پھر کالا ناگ نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے اس وحشی ہاتھ کی مگر سے خود کو بچانے کے لئے پھرتی سے پیٹیرا بدلنا چاہا لیکن وہ پہلے سے ہی میرے ارادے کو مانپ گیا اور ارادہ ہی میں رخ بدل کر مجھ سے ٹکرایا۔ اس نے اپنے کاندھے کی بھر پور ضرب میرے سینے پر لگی تھی۔ ضرب میری توقع سے زیادہ محسوس اور طاقت ور ثابت ہوئی۔ نتیجتاً میرے قدم زمین سے اٹھ کر اترے اور میں جیب سے جا ٹکرایا۔ ادھر کبیر نے جیب کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہونا

چاہا تو میں کالا ناگ کو چھوڑ کر اس کی طرف لپکا مگر کالا ناگ میری راہ میں آگیا۔ میں نے اس کے لات رسید کرنے کی کوشش کی تو وہ خود کو میری لات سے بچانے کی بجائے اپنی جگہ جم کر کھڑا ہوا۔ پھر میری باتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے میری ٹانگ کو پکڑ کر مروڑ ڈالا۔ میں نے ایک ٹانگ پر اپنی فضا میں ایک طوفانی انداز کی کروٹ لی اور اس ٹانگ کی بھرپور ضرب کالا ناگ کے جڑ سے پر رسید کر کے اس کے حلق سے نسل جیسی ڈکراہٹ ابھری اور اسے میری ٹانگ چھوڑتے ہی بنی۔ میں نے اپنے قدم پر سیدھے کھڑے ہوتے ہی اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس بارجم کر اٹھتے ہوئے اپنی دونوں ٹانگوں کے سینے پر رسید کر دیں۔ وہ غراہٹ سے مشابہہ کراہ خارج کرتا ہوا کئی قدم دور جاگرا۔ میں گبولے کی طرح پلٹا اور جیب میں سوار ہوتے ہوئے کبیر کو کالر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور گنجلے سے پرے دھکیل دیا۔ گن میرے ہاتھوں میں آتے ہی کبیر کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا جبکہ کالا ناگ اب سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا، میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھ سے بولا۔

”نادر علی!..... میں دشمنی بھی اپنے معیار کے لوگوں سے رکھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے اس معیار کو برقرار رکھو گے۔“

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ میں نے گن دور چھاڑیوں میں اچھال دی تو وہ خوشی سے بھرپور لہجے میں بولا۔ ”واہ نادر!..... تم نے آج کالا ناگ کی دشمنی کی لاج رکھ لی۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں گھور کر زہر بھرے لہجے میں کہا۔

”لیکن..... کالا ناگ! تم میری دشمنی کے معیار کے نہیں ہو۔ ہتھیار میں نے تمہارا قرض چکانے کے لئے پھینکا ہے۔“

لاہور کے معروف ”گجر چوک“ کے بدنام زمانہ بد معاش کالا ناگ کے سینے میں میرے قہقہے آواز نکلتے تھے۔

”آج تو تیرا یہ گھمنڈ توڑنا ہی بڑے گا..... کیونکہ تو پہلا شخص ہے جس نے کالا ناگ کو یوں نظر پڑا ہے پر اتنا ہنسناٹے کی سی کیفیت تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر خواب کی مار سے ذلیل کرنے کی جرات کی ہے۔“ وہ غیظ و غضب سے کانپتے ہوئے بولا اور پھر وحشیانہ انداز میں لڑکھائی کرنے لگا۔

”میرے سب سے ذلیل کرنے کی جرات کی ہے۔“ وہ غیظ و غضب سے کانپتے ہوئے بولا اور پھر وحشیانہ انداز میں لڑکھائی کرنے لگا۔

”میرے سب سے ذلیل کرنے کی جرات کی ہے۔“ وہ غیظ و غضب سے کانپتے ہوئے بولا اور پھر وحشیانہ انداز میں لڑکھائی کرنے لگا۔

اب ہمارے درمیان خالص جسمانی طاقت کا مقابلہ تھا۔ وہ اگر توانا اور گراں قدر تھا تو کم میں بھی تھا۔ میں اسے بچوں کے بل دھکیلا ہوا چند قدم آگے تک لے گیا تو دوسرے ہی لمحے وہ اپنے جسم کی طاقت کو گویا بچوں میں منتقل کر کے جواباً مجھے عقب میں دھکیلا ہوا جیب تک لے گیا اور میری پشت سے جا لگی۔ اب وہ میرے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ بلاشبہ وہ طاقت کا پہلا نمونہ تھی۔

مجھے اپنی انگلیاں چنچتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میں چاہتا تو اپنی ایک لات کا آزادانہ استعمال اس پر کر سکتا تھا لیکن میں بھی اسے اسی طرح ”پنچ آزمائی“ کی صورت میں جواب دینا چاہتا تھا۔ میں نے بھی اپنے وجود کی ساری قوت کو گویا بچوں میں منتقل کر کے زور آزمائی شروع کی اور وہ بھی قوت صرف کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ ہم دونوں کی پیشانیوں ایک دوسرے سے آن ملیں اور لاوا لاکتی نظر پڑی۔ دوسرے کی آنکھوں میں تیر کی طرح پوسٹ ہو گئیں۔ بالآخر میں اس کے دونوں ہاتھوں کے بچوں کو

نہیں۔“ میرے نشست سنبالنے کے بعد اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ”مگر پھٹت کی مسلسل بے نیکی کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ میں نے طاقت وغیرہ کے انجکشن شروع کر دیئے ہیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ ہوش میں آ سکتی ہے۔ بہ صورت دیگر کسی نورو فزیشن سے رابطہ کرنا پڑے گا۔“

”تو ابھی ان سے کسٹل کر لو۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”تم پریشان نہ ہو۔ پھٹت کے واسطے سائز آلات پر لگا دیئے ہیں اور انہیں مانیٹر کیا جا رہا ہے۔“ وہ میں خاموش ہو گیا۔ تب اس نے بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا تم یہ بتا سکتے ہو اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟..... میرا مطلب ہے، کوئی شدید ذہنی صدمہ وغیرہ.....؟“

میں اسے کیا جانتا۔ شخص اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ہوسکتا ہے کوئی ایسی ہی بات ہو۔ پھر میں دوبارہ آنے کا ہر دہاں سے چلا آیا۔ میرا رخ ٹیلی فون بوتھ کی طرف تھا جہاں سے مجھے حامد صدیقی ایڈووکیٹ کو فون رہا تھا۔

”یہ بہت اچھا ہوا۔“ انہوں نے میری زبانی گھینے کی بازیابی کا سن کر پرجوش آواز میں کہا۔ میں نے انہیں مردان شاہ کی موت اور پھر کالو اور کبیر سے ہونے والے مقابلے کی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ لیکن نارمیاں! گھینے کا ہوش میں آنا ضروری ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟ میں بھی وہیں پہنچتا ہوں۔ اور ابھی اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھنا۔“

ان کے استفسار کے جواب میں، میں نے انہیں ہسپتال کا پتہ اور ڈاکٹر منصور کا نام وغیرہ بتا دیا۔ پھر رابطہ منقطع کرنے کے بعد میں نے اعظم خان کے نمبر ملائے۔ انہوں نے سب سے پہلے مجھے یہاں آنے کی نصیحت کی۔ اعظم خان وہ واحد ہستی تھے جنہیں میں ساری تفصیل سے لفظ بہ لفظ آگاہ کر چاہتا تھا۔ لیکن میں گھینے کو اس کے ہوش میں آنے سے پہلے تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں انہیں فون پر ہی تفصیل سے آگاہ کرنا شروع کیا تھا کہ انہوں نے میری بات کاٹ دی اور نمبر لہجے بولے۔

”تم ایسا کرو..... اس کے باپ کو ایک گمنام کال کر کے گھینے کا بتا دو کہ وہ کون سے ہسپتال میں ہے۔ اور تم خود ادھر آ جاؤ۔ ان کی بات پر میں نے بتایا کہ میں ایڈووکیٹ حامد صدیقی کو بھی فون کر چکا ہوں اور وہ کی بھی وقت ہسپتال پہنچنے والے ہیں۔“

”ٹھیک ہے..... پھر میں بھی وہیں پہنچتا ہوں..... اوکے!“

\*\*\*

میں آئی سی یو کے سامنے چلنے کو بڑبڑا رہے چینی سے ٹہلنے لگا۔ گاہے گاہے میری نگاہیں دروازے کی طرف بڑھتی رہتی تھیں۔ وہ میرے دل کی دھڑکن تھی۔ میرا ہوش بیدار تھا۔ جانے اس کے ساتھ ان غیبت شیطانوں کا لانا ناگ اور کبیر نے کیا سلوک کیا تھا؟

مردان شاہ کی موت کا خیال آیا تو میرا دل تم سے بھرنے لگا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں ہو پا رہی تھی کہ اس کے بوڑھے باپ کو اس اعمو ہناک خبر سے آگاہ کر سکتا۔ کالا ناگ نے میرے سامنے اس کا اتنا اثر کر کے کہ مردان شاہ کے پرتشدد قتل میں اس کا ہی ہاتھ تھا، اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھوکی۔ لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اگر کبیر کا بھی مردان شاہ کے قتل میں ہاتھ ہوا تو میں بھی عبرت ناگ انجام سے دوچار کر کے ہی رہوں گا۔ بلکہ یہی نہیں، اگر میری گھینے کے ساتھ ڈاکٹر کوئی دل دکھانے والی بات ظاہر ہوئی تو میں نے ان دونوں کو ہی زندہ نہ چھوڑنے کا پختہ ارادہ

پہلے تو میں یہی سمجھ رہا تھا کہ ان خبیثوں نے کورٹ میں آئندہ ہونے والی ”متوقع“ فیصلہ کن پیشی میں باپ شاہ میر اور نظر حیات کے خلاف گواہی دینے سے معذور رکھنے کے لئے گھینے کو یہ غمال بنایا تھا۔ ان کی گھینے سمیت ”مکش پوز“ کے راستے غیر متوقع اور اچانک واپسی نے مجھے سوالات اور سوچ کی ایک پراسرار کھائی میں ڈھکیل دیا تھا۔ پھر گھینے کی طویل خواب ناک سی بے ہوشی خاصی پراسرار تھی۔

تقریباً آدھ پون گھنٹے کی دشوار گزار ڈرائیونگ کے بعد مجھے اپنی جیب کھڑی نظر آ گئی۔ میں نے کروڑوں قریب لے جا کر روک دی۔ لینڈ کروزر کے اندر موجود میں نے پٹرول کے دو ٹینک دیکھ لئے۔ یہ نہیں وہ بھرے ہوئے تھے کہ خالی۔ بہر طور کسی خیال کے تحت میں جیب سے آٹا اور عقی دروازہ کر دوں جیری کین اٹھا کر دیکھے تو ان میں ایک بالکل خالی تھا جبکہ دوسرا ذرا وزنی تھا۔ وہ نصف بھرا تھا۔ میں نے اسے ہی کافی جان کر اٹھایا اور اپنی جیب کے قریب آ کر اسے فیول ٹینک میں اڈیلے۔ اس کے بعد میں نے لینڈ کروزر کے اندر سے بے ہوش گھینے کے وجود کو اٹھایا اور اپنی جیب کی سیٹ پر آہٹگی سے لٹا دیا اور اپنی لیدر کی نرم جیکٹ اتار کر گھینے کے اوپر ڈال دی۔ پھر اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے۔ میری کائنات میرے سامنے تھی، مجھ سے قریب تھی، اتنا قریب کہ میں نے اس کی پیشانی پر اپنی سبب محبت ثبت کر دی تھی۔ وہ چند لمحوں نہایت جاں فزا تھے۔ میں سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔ یہ کیفیت زیادہ دیر پر قرار نہیں رہی۔ اس کی مدد ہوشی نما نیند کا خیال آتے ہی میں عالم فراموشی حقیقت کی سطح دنیا میں لوٹ آیا۔ مجھے اس کو طبی امداد فراہم کرنے کے لئے جلد ہسپتال پہنچانا تھا۔ اور بعد میں اپنی جیب پر واپسی کے سفر پر گامزن تھا۔

\*\*\*

جاڑے کی گلابی دھوپ وادی میں پوری طرح پھیل چکی تھی۔ میں اب پنڈی جانے والی تھی۔ رواں تھا۔ گھینے کو حاصل کرنے کی جہاں مجھے از حد مسرت ہو رہی تھی، وہیں مردان شاہ کی موت پر ہوا ہوا تھا۔

شہر کی حدود شروع ہو چکی تھی۔ میں گھینے کو سب سے پہلے ہسپتال پہنچانا چاہتا تھا اور میں نے کیا۔ سینٹرل ہسپتال میں ایک ڈاکٹر سے میری واقفیت تھی۔ اس کی مدد سے گھینے کو فوری طور پر نگہداشت کے شعبے میں داخل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے اور میں آئی سی یو باہر نہایت بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ میں اس کی اطلاع فوری طور پر اعظم خان اور ایڈووکیٹ صدیقی کو دینا چاہتا تھا۔ مگر اس سے پہلے میں گھینے کی حالت کے بارے میں جاننے کا خواہش مند تھا۔ دیر بعد آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور میرا واقف کار ڈاکٹر منصور پُرسوج چہرے کے ساتھ نمودار ہوا۔

”سن..... گھینے، اب کیسی ہے ڈاکٹر صاحب! آخر اسے ہوا کیا ہے؟..... وہ..... ٹھیک تو ہو جائے گی نا؟“ میں اضطرابی کیفیت میں تھے اور بے ربط سوال پوچھتا چلا گیا۔ ڈاکٹر مدھرے سے میرا شانہ تھپتھپایا، پھر تشفی آمیز لہجے میں بولا۔

”کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے مگر..... خیر..... آؤ.....“ وہ بات ادھوری چھوڑا۔

ایک کمرے میں لے آیا۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔

”مگر کیا ڈاکٹر صاحب.....؟“ میں نے شکر بے چینی سے پوچھا۔

وہ اپنی چیئر پر بیٹھ گیا اور مجھے اپنی سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”ویسے تو کوئی خطرہ“

اسی غم، شاید اس بار وہ مجھے پہچان لے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جہاں کبھی میرے لئے شناسائی کا ایک جزیراں ہلکورے لیتا رہتا تھا اور اب وہاں گم نام جزیروں کے سنالے اترے ہوئے تھے۔  
اس کے چہرے پر مجھے دیکھتے ہی بہاریں کھل اُٹھتی تھیں..... لیکن اب وہاں اجنبیت کی نزاکتیں رہاؤں کچھ بھی نہ تھا۔

”ت.....ت.....تم کون ہو؟“

مجھے ہوں لگا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں لے کر مسل ڈالا ہو۔

میں نے زہنی لہجے میں اس کا استفسار دہرایا۔ ”گنہگار! تم..... میں کون ہوں؟“

پلے، بجھے پیا کے پاس جانے دو..... خدا کے لئے..... ورنہ..... ورنہ میں پاگل ہو جاؤ گی۔“ گنبد نے سسک کر ملتجیانہ انداز میں کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل کو شہتیر چیرنے والے آرے کے نیچے رکھ دیا گیا ہو۔

”ٹیک اٹ ایزی نادر!..... حوصلہ رکھو۔“

آ..... انکل! نن..... گمنہ مجھے پ..... پہچان نہیں رہی..... بالکل  
پہچان رہی ہے اعظم انکل!“ میں کرب انگیز لہجے میں بویلا۔

بیری حالت اس وقت ایک ایسے دھکی بچے کی سی ہو رہی تھی جس کا کوئی قیمتی کھلونا کھو گیا ہو۔  
 ”حوصلہ رکھو نادرمیاں!“ قریب موجود ایڈووکیٹ حامد صدیقی نے بھی ازاراہ تشفی کہا۔ ”تم نے ڈاکٹر  
 کی بات نہیں سنی؟..... ابھی نگینہ بیٹی کا ذہن پوری طرح بیدار نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ یہ تمہیں بھی  
 سننے لگے گی۔“

دھر اعظم خان، گیند کے سر پر ازراہ شفقت ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دینے لگے کہ وہ بالکل ننانہ ہو۔ اسے اس کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔

”میرا خیال ہے، مجھے شاہ میر کو اطلاع دینا

”مگر.....“ میں کچھ کہتے کہتے رک گیا تو ایڈووکیٹ حامد مہمانی بھی اعظم انکل کی تائید میں مجھ سے ملے۔

”ہاں نادر!..... یہی زیادہ بہتر رہے گا۔ تم واپس ”گرین لاج“ لوٹ جاؤ..... باقی معاملات فیصلہ لوں گا۔“

”اؤ نادرا! میرے ساتھ چلو۔“ اعظم انکل نے ہولے سے میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ میں نے گانگائین کے چہرے پر ڈالی کہ شاید وہ بے اختیار مجھے پکارے۔ لیکن اس کے چہرے پر شاسائی کی رات قہقہے نہ ابھری تھی۔

ہم انکل کی کار ہسپتال کے احاطے میں موجود تھی۔ انہوں نے مجھے کار میں بٹھایا اور میری جیب کی

کر لیا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد ایڈووکیٹ حامد صدیقی وہاں آپہنچے۔ جب ہی ڈاکٹر منصور آئی سی یو میں  
معائنہ کر کے باہر نکلا۔ اس نے خوش کن خبر سنا لی کہ گزینہ کو ہوش آ چکا ہے اور اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔  
خوشی سے نہال ہو گیا لیکن جانے کیا بات تھی، میرا دل نامعلوم سی بے چینی میں مبتلا تھا۔

اس دور ان اعظم خان بھی آگئے۔ ان کے ہمراہ ایک باؤی گاڑو بھی تھا، اس کا نام شیر دل تھا۔ سب سے پہلے میں نے نگینہ کے سر ہانے آ کر اسے پکارا۔

”نگہ بندہ“.....!

وہ پوری طرح ہوش میں تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عجیب نامعلوم خوف سمٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لے گی مگر اس کے چہرے پر مجھے دیکھ کر ذرا سی بھی شہلاہے۔  
 رقت نہیں ابھری تھی۔

وہ ہراساں سے لہجے میں بولی۔ ”مم..... میں..... کہاں ہو؟“

ڈاکٹر منصور وہیں موجود تھا۔ میرے بولنے سے پہلے وہ مسکرا کر ٹنگینہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”آپ ہسپتال میں ہیں..... اور بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کا نام.....؟“

”مم..... میرا نام..... نن..... نگینہ.....“

”آپ اپنے ڈیڈی کا نام بتائیں کی؟“ ڈاکٹر منصور شاید اس کی ذہنی کیفیت جاننے کی غرض سے

سوالاں کر رہا تھا۔

پ۔ پتا!..... وہ کہاں ہیں؟..... م۔ بسے پتا کے پاس سے چوروں کا جھگڑا

”ہاں، ہاں..... آپ کے یہاں کو بھی ادھر ہی ملا لیتے ہیں۔ آپ ان کا نام تو بتائیں؟“ ڈاکٹر

ملائمت آمیزی سے کہا۔

”ان کا نام..... شاہ میر ہے۔“

مکینہ نے اپنے چچا کا نام بتایا تو ڈاکٹر منصور ایک گہری اور طمانیت بھری سانس لے کر ہم

”یہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔“

”کل..... عین ذالتر صاحب! یہ..... یہ بھی عیسٰی چچان رہی..... کیا اس کی پادری.....“

”الذکر اندیشہ الکلمہ درست ہے البتہ کہ یہ سطر طے رہی ہوگی کہ باعث ان کے

غیر ہو سکتا ہے اب تک خوابیدہ اثرات ہوں۔ ذرا در بعد جب ان کا ذہن پوری طرح بیدار ہوگا۔

نہ قریبی افراد کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی پہچانے لگیں گی۔

مجھے ڈاکٹر منصور کی بات پر زبردست ذہنی شاک پہنچا تھا۔

مجھ سے زیادہ قربت نگینہ کی اور کس سے ہوسکتی ہے.....؟ اگر وہ اپنا نام بتا سکتی سی، آپ

.....جگہ پر عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔

ایک بار پھر تینہ کو مخاطب کیا۔

میں سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے خاموش بیٹھا تھا۔  
میرے ذہنی غلبان کو محسوس کرتے ہوئے اعظم انکل نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔  
میرے اندر ایک طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ آندھیوں نے جیسے میرے پورے وجود کو لپیٹ میں رکھا تھا۔ دل و دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل اپنی دگرگوں کیفیات پر قابو پائے ہوئے حالات گزشتہ کا جائزہ لینا شروع کیا تو ہر بار ایک ہی سوال مجھے شدت سے بے چین اور مضطرب کر رہا تھا کہ نگینہ آخر مجھے کیوں نہیں پہچان پارہی ہے؟..... باپ شاہ میر کے بارے میں یہ بتا رہا ہے کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔ بہ قول ڈاکٹر منصور کہ نگینہ کی یادداشت بالکل درست کام کر رہی ہے۔ تو مجھ نے مجھے پہچاننے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟..... کوئی ایسی بات تھی، اور کوئی ایسا راز جو کسی ظاہر کر رہا تھا۔ نگینہ کے ساتھ کچھ کیا گیا تھا؟..... اور یہ بھی اسی دوران ہوا تھا جب کالا ناگ اور نے نگینہ کو اس کی سہیلی غزالہ کے ہاں پرغمال بنایا تھا اور پھر نگینہ کو اغواء کر کے فوری طور پر ان شیطاں کے نو لے کا برف پوش وادی کش پور لے جانا اور پھر وہاں سے نیم بے ہوشی کے عالم میں نگینہ کو واپس لوٹا کسی پر اسرار معاملے کی نشاندہی کر رہا تھا۔  
ڈاکٹر منصور کا یہ کہنا کہ چند گھنٹے بعد جب نگینہ کے دل و دماغ سے دھند دھیرے دھیرے چٹنے گی تو وہ مجھے خود ہی پہچان لے گی، طفل تسلی کے سوا کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ تاہم پھر بھی میں نے اس دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔  
میں نگینہ کو اس کے باپ شاہ میر کے سپرد کرنے کے حق میں نہ تھا لیکن نگینہ کی ذہنی حالت، پھر ان خود یہ اصرار کرنا کہ وہ اپنے باپ کے پاس جانا چاہتی ہے، یہ سن کر مجھے مجبوراً اپنا ارادہ بدلنا پڑا تھا اور وہاں ایڈووکیٹ حامد صدیقی اور اعظم انکل کا بھی یہی کہنا تھا۔ اس لئے میں نے بھی چپ سادھ لیا۔  
بے اختیار ان پریشان کن خیالات کے بھنور سے ابھر کر اپنے برابر میں براجمان اعظم خان سے کہہ ہی ڈالا۔  
”انکل!..... کیا ان حالات میں نگینہ کو باپ شاہ میر کے حوالے کرنا درست تھا؟“  
”ہاں۔“ انہوں نے بلا تامل جواب دیا۔ ”اس صورت میں یہی مناسب تھا۔ تمہارے لئے بھی نگینہ کے لئے بھی۔“  
”مگر انکل! نگینہ نے بھری عدالت میں اپنے باپ کے خلاف گواہی دی تھی..... اور یہ گواہی ان کے بعد وہ اپنے باپ سے اس قدر متفر ہو چکی تھی کہ اپنے گھر جانے کی بجائے وہ خاموشی سے اپنا قریبی سہیلی کے ہاں شغف ہو گئی تھی۔ اور پھر وہیں سے اسے کالا ناگ اور کبیر نے اغواء کیا تھا۔“ انہوں نے انہیں یاد دلانے کی غرض سے کہا۔  
”میں سب جانتا ہوں۔“ وہ ایک گہری اور پُر سوچ ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولے۔  
”تو پھر آپ کو اب نگینہ کی اس بات پر حیرت نہیں ہوئی کہ آخر اب پھر وہ کیوں اپنے باپ کے جانے پر بضد ہے؟“ میں نے کہا۔  
”یہ اس کا ایک فطری رد عمل ہے۔“ وہ بولے۔ ”کیونکہ بہ قول تمہارے وہ کسی ایسے سنگین حالات گزری ہے جو اس کے دل و دماغ پر بری طرح اثر انداز ہوئے ہیں کہ وہ اپنے باپ کے گھر ہی کے لئے محفوظ پناہ گاہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی ہے۔“  
”لیکن انکل! میرا دل اس بات کی نفی کر رہا ہے۔“ میں نے اچانک اسرار بھرے انداز میں انہوں نے پہلی بار قدرے چونک کر میری طرف دیکھا اور مختصر کہا۔

”کیا مطلب؟“  
جوابات میرے دل و دماغ میں گردش کر رہی تھی، اسے اعظم انکل کو بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لئے میں نے یہ موضوع بدلنے کی غرض سے ان کی توجہ ایک اور اہم مسئلے کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔  
”انکل!..... دراصل میرا مطلب یہ تھا کہ نگینہ نے میرے باپ قادر علی خان مرڈر کیس کے سلسلے میں بھری عدالت کے اندر میری ماں کے حق میں اور اپنے باپ کے خلاف گواہی دینے کے بعد کہ آج سے پچیس سال قبل میرے باپ کو میری ماں نے نہیں بلکہ اس کے باپ شاہ میر اور نظر حیات نے قتل کیا تھا تو ایسے میں اب نگینہ کو اس کا باپ شاہ میر کیا ورغلانے کی کوشش نہیں کرے گا کہ وہ اس کے خلاف اپنی گواہی واپس لے لے؟“  
”ہاں..... اس کا امکان تو سو فیصد ہے۔“ اعظم انکل تائیدی لہجے میں بولے۔ ”لیکن میرا خیال نہیں ہے کہ نگینہ اس کی بات مانے۔“  
”ان کی بات پر میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ اعظم انکل میری پریشانی بھانپ کر بولے۔  
”تم بے فکر رہو..... نگینہ کی پہلی گواہی کافی ہے۔ چند دنوں بعد کیس کی پیشی ہے۔ پھر دیکھیں گے کیا ہوگا؟“  
اچانک مجھے غفورے کا خیال آیا۔  
”انکل!..... غفورے کی گرفتاری کے سلسلے میں آپ نے کیا سوچا؟“  
”ہاں..... میں نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے اسے پیغام بھیج دیا تھا کہ وہ اپنی آواز بند رکھے جو اس کے لئے بہتر ہوگا۔ بعد میں اسے چھڑانے کی میں نے اسے تسلی بھی دے دی۔“ وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئے۔ میں نے بھی چپ سادھ لی۔ لیکن میری آنکھیں تھیں کہ بڑھتی جا رہی تھی۔  
مجھے ماں اور ماموں حیدر گل کا کیس بھی کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا۔ اعظم انکل کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شاید نظر حیات اور شاہ میر جیسے شاطر اور عیار شیطاںوں کی سفاکانہ اور مکارانہ چالوں سے واقف نہ تھے۔  
شاہ میر اور نظر حیات اب میری ماں اور ماموں حیدر گل سے اتنے خوف زدہ نہ تھے جتنا کہ انہیں میری طرف سے خوف تھا۔ حالات گزشتہ کی رستاخیزی سے انہیں بہ خوبی اس حقیقت کا اندازہ ہو چکا تھا کہ میں نے اپنے باپ کے قاتلوں اور اپنی مظلوم ماں کو بے گناہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں عمر قید کی سزا بھگتنے والے سازشیوں کی سرکوبی کے لئے اپنی جان پھینکی پر رکھ لی تھی اور کفن سر پر باندھ رکھا تھا۔  
میری اب تک کی کارکردگی دونوں خبیثوں کے سامنے تھی۔ یہی بہت تھا کہ اس نے اپنے اسی خوف سے اپنی نیندیں حرام کرنے کے متوقع ڈر کی بناء پر انہوں نے میرے خلاف بھی یہ سازش کی تھی کہ مجھے اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف ایک حد تک ورغلانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ میرے سینے کی قتل اور ارادوں کی مضبوطی کا انہیں بہ خوبی اندازہ تھا اور انہوں نے یہ بھانپتے ہوئے بڑی چالاکی کے ساتھ میرے عزائم اور ارادوں کے بادبانوں کا رخ میری اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کی طرف موڑنے کی کوشش کی تھی۔  
اچانک میں خیالات سے چونکا۔ کار اعظم انکل کی رہائش گاہ کے سامنے رک گئی تھی۔

اعظم انکل کی رہائش گاہ میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد میں نے واپس ”گرین لاج“ کا قصد کیا۔ اس دوران اعظم خان نے حالات سے آگاہی حاصل کر لی تھی۔ سب ٹھیک ہونے کا اطمینان کر لینے کے بعد ہی انہوں نے مجھے اپنے مکان سے رخصت کر کے اجازت دی تھی۔

میں اپنی جیب میں ”گرین لاج“ کی طرف گامزن تھا۔ میرے دل کو عجیب سی بے چینی لاحق ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہو۔

گرین لاج پہنچا تو چاچا فضل اور سکیٹ نے مجھے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ میرا ارادہ تھوڑی دہاں قیام کرنے کے بعد مردان شاہ کے باپ کی طرف نکلنے کا تھا۔ اسے مطلع کرنا ضروری تھا ورنہ چارہ بیٹے کے نہ ختم ہونے والے انتظار میں مغل مغل کھل کر مر جاتا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے کس طریقے سے یہ جانکا خبر سنانی تھی۔ وہ ایک غریب شخص تھا۔ اپنے بیٹے کے قاتلوں کے خلاف قانونی کارروائی کرنا اس کے بس میں نہ اور نہ میں اسے پوری بات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ مردان شاہ کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں خود عزمِ مصمم کر چکا تھا۔

چنانچہ ذرا دیر بعد میں پھر روانہ ہو گیا۔ مردان شاہ کے گھر پہنچا تو اس غریب کو بیٹے کے انتظار میں ہی پایا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی بوڑھی آنکھوں میں امید کے چراغ جل اٹھے۔

”مم..... میرا پتر مردان کہاں ہے صیب!..... کک..... کہیں پھر..... اسے پولیس تو گرفتار نہیں کر لیا؟“

میں چند ثانیے خاموش کھڑا اس کا چہرہ سمجھتا رہا۔ بوڑھے کے عقب میں ایک لڑکی کی بھی جھلک نظر آئی۔ وہ دو بیٹے کی اوٹ سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بھائی کا انتظار کر رہی تھیں۔ نم ناک سا تاثر پیش کر رہی تھیں۔

”صیب!..... آپ چپ کیوں ہو؟..... بتاتے کیوں نہیں؟..... میرا پتر مردان کہاں ہے؟“

مجھے خاموش پا کر معافی بوڑھے نے دوبارہ فکر آمیز بے چینی سے پوچھا۔ مجھ میں بالکل ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ ابھی میں انہیں یہ اندوہناک اطلاع دوں۔ میری آواز بے گنگ ہو گئی تھی۔ بالآخر میں نے سوچا کہ کیا ضروری تھا انہیں ابھی یہ غم ناک خبر سناؤں کہ وہ جس کے ہاتھ تھے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ ان دونوں باپ بیٹی کے غم کا مداوا میں کر سکتا تھا۔ بعد میں مناسب وقت اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں حقیقت بتانے میں کوئی عار نہ تھی۔

میں نے بوڑھے کے شانے پر ہاتھ رکھا اور راستہ دینے پر میں اندر صحن میں آ گیا۔ پھر اس سے بولا۔ ”بابا! مردان کو اچانک ایک ضروری کام سے لاہور جانا پڑ گیا ہے اور بہت جلد لوٹ آئے گا۔ یہ بات کہہ کر اس سے نظریں چرانے لگا۔

”صیب!..... مردان پتر نے ہمیں نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔“ بوڑھے نے پریشان ہو کر تو میں نے اسے خط کا حوالہ دیتے ہوئے یاد دلایا کہ مردان نے اس خط میں اس کا ذکر کیا تھا کہ اچانک نکلنا پڑ گیا تھا اور اب میں یہ اطلاع اس کے بوڑھے باپ کو دے آؤں۔

مردان شاہ کی پھر بھی تسلی نہ ہوئی تو میں نے اس سے کہا۔ ”بابا! میں بھی تمہارے بیٹے کی طرح ہوں۔“ پھر میں نے قریب کھڑی بد نصیب مردان شاہ کی بہن کے پاس ہاتھ رکھتے ہوئے ملائمت سے کہا۔

”ابھی! اپنے بابا کو تسلی دو۔ میرے ہوتے ہوئے تم دونوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میرے لہجے کی اچانکیت پر وہ بولی۔ ”بھائی صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مگر میرا بھائی کہاں ہے؟“ آپ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔ آپ کا احسان ہو گا ہم پر۔“

آپ نے دوبارہ محبت آمیز لہجے میں اس سے کہا۔ ”میری بہن! میں نے تجھے صرف منہ سے بہن نہیں کہا ہے بلکہ سمجھا بھی ہے۔ آپ بے فکر رہو..... میں بہت جلد اسے ڈھونڈ لاؤں گا۔ بس حوصلہ رکھو۔“ کہنے کے بعد اب مجھ سے مزید جھوٹ نہیں بولا گیا۔ تاہم میری باتوں سے دونوں باپ بیٹی کو کئی دن تسلی ہو گئی۔ پھر میں دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔

چند دن بعد ماموں حیدر محل کے مقدمے کی تاریخ تھی۔ مجھے بھی کورٹ میں حاضری کا سمن مل چکا تھا۔ میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ وکیلوں کی دھواں دھار جرح کا آغاز ہوا۔ غفورے کو بھی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اعظم انکل کے کہنے کے عین مطابق غفورے نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔

پھر جب نگینہ کو پھر گواہوں کے کھڑے میں پیش کیا گیا تھا، میرے دل کی دھڑکنیں یکلخت بے ترتیب ہونے لگیں۔ مگر یہ دیکھ کر میری حالت غیر ہونے لگی تھی کہ اس نے نگاہ بھر کر میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ پھر جب اس سے اس کے باپ شاہ میر کے خلاف پہلے والی گواہی دہرانے کا کہا گیا تو نگینہ نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی اسے اس بات کا علم تھا کہ اس نے اپنے باپ کے خلاف ہماری عدالت میں کوئی گواہی دی تھی۔

میں جیسے سکتے میں آ گیا۔ نگینہ کا چہرہ بالکل ساٹ تھا۔ میرے اندر بری طرح ہلچل ہونے لگی۔ مگر وکیل صفائی ایڈووکیٹ صفائی نے عدالت کے ریکارڈ میں موجود نگینہ کی پہلے والی گواہی پر زور دیتے ہوئے دلیل دی کہ نگینہ اب اپنے باپ کے ورغلانے میں آئی ہے اور اس لئے وہ پہلے والی گواہی واپس لینے پر مجبور ہوئی ہے۔

اس کے جواب میں مخالف پارٹی کے وکیل استغاثہ نے نگینہ کو ذہنی مریضہ قرار دے دیا تو وہیں صفائی نے اس کے جواب میں ڈاکٹر منصور سے حاصل کیا ہوا میڈیکل سرٹیفکیٹ منج کے سامنے پیش کر دیا۔ یوں عدالت نے میری ماں اور ماموں حیدر محل کو باعزت پری کر دیا۔

مجھے جہاں ماں اور ماموں حیدر محل کے رہا ہونے کی خوشی تھی، وہاں نگینہ کی اچانک ذہنی کاہلی کھلنے پر غم تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ نگینہ کے ساتھ ضرور کوئی پراسرار واقعہ پیش آیا تھا۔ اور اس میں کالا نک اور کیر کی برف پوش وادیوں میں اس پراسرار جہم کا دخل تھا جب وہ نگینہ کو اس کی سہیلی غزالہ کے گھر ساتھ لے کر ”کیش پور“ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔

ایڈووکیٹ حامد صفائی نے بعض مصلحتوں کے پیش نظر کچھ باتیں حذف کر لی تھیں جن کا میں ان سے باز کر چکا تھا۔ البتہ نظر حیات اور شاہ میر کی نظر بندی کے احکامات پھر سے عدالت نے واپس لے لئے تھے۔ یوں تقیثی آفیسر اسٹینڈرٹ ایجاز شمس کے گلے میں ایک بار پھر نئے سرے سے تقیثش کرنے کا طوق ڈال دیا گیا تھا۔ وہ بری طرح ہچکچاتا ہوا تھا۔



قرائن سے یہی نظر آتا تھا کہ کس کو اب داخل دفتر ہی کیا جائے والا تھا۔  
اور میں بھی خود یہی چاہتا تھا کہ میں نے اب اپنی عدالت میں ان دونوں خبیثوں کو کفر کردار  
پہنچانے کا عزم مصمم کر لیا تھا۔

\*\*\*

”گرین لاج“ میں اس وقت جشن کا سماں تھا۔ اعظم خان بھی موجود تھے۔

”گرین لاج“ کی عرصے سے روٹی ہوئی رونقیں بحال ہو گئی تھیں۔ مگر میرا دل اُداس تھا۔ ماں،  
بارماتا بھرے انداز میں پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ ماموں حیدر گل بھی خوش تھے میں۔  
ماں کی آنکھوں سے آنس انعام کی وہ چنگاریاں بھانپ لی تھیں جو میرے سینے میں بھی بھڑک رہی تھیں۔  
غالباً وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ سارے معاملات بظاہر درست ہو جائیں اور اس کے بعد اپنے دشمنوں  
خلاف نئے سرے سے کمر بستہ ہوں۔ لیکن میری ماں کو شاید اپنے دشمنوں کی ”خطرناکی“ کا پورا اندازہ  
ہو سکا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ دشمنوں کی خطرناک چال بازیوں اور سازشوں کا جال ہمارے گرد کس قدر  
مضبوط اور گنجلک ہو چکا ہے۔ اور جب تک میں ان کی سازشوں کو سمجھتا اور اس کا سراغ لگاتا، ہو سکتا  
تجربہ تک دشمنوں کا خوبی کھنچہ ہمارے گرد دنگ ہو جاتا۔

رات کے دس بجے کا وقت تھا۔ ماموں حیدر گل نال کے معاملات اور اس کی تعمیر کو۔ نئے سرے  
ترتیب دینے کی حکمت عملی سے فیصلہ مشاق کوئل کو آگاہ کرنے میں مصروف تھے جب کہ ماں، اعظم خان  
اور میں شاہ میر اور نظر حیات کے خلاف ایک مربوط حکمت عملی جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک  
باہر ایک سے زائد گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں ابھریں۔ ہم سب چونک گئے۔ پھر ہم سنبھلے بھی نہیں  
پائے تھے کہ اچانک بہت سے دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپیں سنائی دیں اور اگلے ہی لمحے ایک دھماکا  
سے دروازہ کھلا۔

سامنے کالا ناگ اپنے آٹھ دس مسلح ساتھیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی میرے سارے  
وجود میں چوٹیاں سی رہ گئیں۔

”خبردار!..... کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے..... ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دیا  
گا۔“ کالا ناگ نے وحشت انگیز لہجے میں دہاڑ کر کہا۔ اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنے ہاتھ  
پکڑی ہوئی گن کا رخ میری جانب کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں حد درجہ سفاکی اور چہرے پر غیظ و غضب  
الاؤ سا بھڑک رہا تھا۔  
ہم سب سنائے کی حالت میں کھڑے رہ گئے تھے۔



کالا ناگ سمیت وہ نو افراد تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خوفناک ہتھیار اور آنکھوں میں ہمارے  
نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کالا ناگ کے پستول کی نال کا رخ میری طرف تھا۔ مجھ سمیت سب  
اس دیدہ دلیری پر حیران تھے۔ مجھے اپنے اطراف کچھ عجیب سا سناٹا محسوس ہو رہا تھا جس میں کالا  
ناگ اور اس کے ساتھیوں کی پھنکار سے مشابہہ سانس کی آوازیں بری طرح گونجتی سنائی دے رہی تھیں  
بدم بخود تھے۔ اس بھیاںک سنائے کو کالا ناگ نے اپنی سردار سفاک بلند آواز سے توڑا۔  
”خبردار! کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہ کرے۔ کوئی بھی غلط حرکت اس کی آخری  
رک ثابت ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے پستول کو خطرناک انداز میں اوپر سے نیچے کی طرف جنبش بھی  
کی تھی۔

میری نظریں کالا ناگ کے وحشت ناک چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی سفاکانہ چمک  
سے عیاں تھا کہ وہ کسی کو بھی ہلاک کرنے سے دریغ نہیں کرنے والا تھا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ ایسے  
ہیں اس کے ساتھ ذرا سی بھی جوشیلی گفتگو اسے مزید مشتعل کر سکتی تھی۔ ماں اور ماموں حیدر گل سمیت  
اعظم خان اسے نہیں جانتے تھے۔ تاہم سب سے پہلے ماموں حیدر گل کو ہی اپنا سکتہ توڑنا پڑا۔ انہوں نے  
کالا ناگ کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”تم لوگ کون ہو؟..... اور تمہاری ہم سے کیا دشمنی ہے؟“  
”دشمنی!.....“ کالا ناگ نے نفرت سے ہونٹ سیڑھتے ہوئے پھنکار کر ماموں حیدر گل سے کہا۔  
”دشمنی تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ یہ معاملہ تو بہت آگے کا ہے۔ اور یہ سوال کہ میں کون ہوں، یہ تو تمہیں  
ہمارے اس جیتے بھانجے نے بتایا دیا ہو گا۔ نہیں بتایا تو اب سن لو..... کیونکہ تم لوگوں کا اتنا حق تو  
میں ہے کہ مرنے سے پہلے میرے بارے میں جان لو..... میرا نام بلال عرف کالا ناگ ہے۔“  
کالا ناگ کا نام سن کر ماں اور ماموں دونوں ہی چونک اٹھے تھے۔ کیونکہ میں انہیں اس خبیث کے  
بارے میں آگاہ کر چکا تھا۔

”میرے نام کے علاوہ یقیناً تمہارے بھانجے نے تمہیں یہ بھی بتایا ہو گا کہ.....“ اس نے ایک  
لحظے کی توقف کے بعد اپنی بک بک جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے وفادار، نمک خوار ملک سردار  
خان کا بھائی ہوں، جسے اس کی وفاداریوں کا صلہ موت کی صورت میں دیا گیا تھا۔“  
اس کی بات ختم ہوئی تو میری ماں نے اثبات میں سر ہلایا اور متانت سے پُر دھیمے لہجے میں بولی۔  
”بے شک وہ سب ہماری غلط فہمی کے سبب ہوا..... لیکن اس میں تمہارے بھائی ملک سردار خان کی  
بے بازاری کا بھی دخل تھا۔“  
”غلط فہمی..... ہونہ!“ کالا ناگ نے غیظ برساتی نظروں سے ماں کو گھورتے ہوئے خونخوار

اکل قریب سے گزر گئی۔ اس کا نشانہ خطا ہو گیا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید گھبرا کر اس کی ٹانگ چھوڑ دیتا۔ مگر مجھ پر تو کوئی اور کیفیت طاری تھی۔ نت یا تختہ..... انسان جب یہ سوچ لے تو پھر اس کے لئے کچھ بھی عجب اور حیرت ناک نہیں رہتا۔ ذرا خوف اور سراسیمگی اس سے دور ہو جاتی ہے۔ میں نے بھی بے خونی سے بشیر چیرا کی ٹانگ پوری قوت سے مروڑی اور پھر اپنی تمام تر توانائیوں سے اسے کالا ناگ کی طرف دھکیل دیا۔ اس کش مکش نے کالا ناگ کو ہوشیار کر دیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ اس لئے وہ اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا اور بلند آواز میں دھاڑا۔

”ان سب کو خون میں نہلا دو۔“

ٹھیک اسی وقت چھوٹے دار کا تروس چلنے کے دواؤ پر تلے گونج دار دھماکے ہوئے اور اس کے باقی مسلح ساتھیوں میں جیسے کھلبلی مچ گئی۔ ان میں سے کئی گولی چلانے کی حسرت دل میں لئے کر یہہہ چیخوں کے ساتھ زمین بوس ہوتے چلے گئے۔ ان کے گرتے ہی عقب میں مجھے چاچا فضل بندوق تھا کہ کھڑا نظر آیا۔ وہ بارہ بور کی ڈبل بیرل بندوق میں بڑی پھرتی کے ساتھ کارٹوس لوڈ کر رہا تھا۔ جنگلی اور خونخوار درندوں کو پھاڑ دینے والے ”ڈم ڈم“ کارٹوسوں کے چھروں کے بھیاک اور ہلاکت خیز ”پھیلاؤ“ نے گویا شکار گھونٹ کے برست کا کام کر دکھایا تھا۔ باقی دو تین ہرکارے جو قریب ہونے کی وجہ سے چھروں کی زد میں نہیں آ سکے تھے، وہ سنبھلے اور پلٹ کر فضل چاچا پر اپنی گولوں کے منہ کھول دیئے۔ گولیوں کی بھیاک تر تر اہٹ میں فضل چاچا کی دلچراش جینیں گونجیں اور وہ ٹپ قدم پیچھے لڑکھڑاتا ہوا زمین پر ڈھے گیا۔ ادھر کالا ناگ نے سنبھل کر مجھ پر گولی چلا دی۔ میں پہلے ہی اس کی خوفناک جنبش کو بھانپ چکا تھا لہذا تیزی سے جھکانی دیتے ہوئے اپنی لات اس کے پستول والے ہاتھ پر رسید کر دی۔ نتیجتاً پستول اس کے ہاتھ سے نکلا چلا گیا۔

ادھر بشیر چیرا نے میرے دیئے ہوئے دھکے سے فوراً سنبھلنے کی کوشش کی تھی اور دھشیا غراہٹ کے ساتھ میری طرف گھومنا۔ ٹھیک اسی وقت فضا میں اوپر تلے تین دھماکے ہوئے۔ فضل چاچا پر گولیاں برسانے والے وہ تینوں خونی ہرارے مجھ پر بھی فائرنگ کرنے کے لئے پرتول رہے تھے۔ لیکن اٹل اعظم خان نے اس ہڑ بولگ سے فائدہ اٹھا کر بڑی پھرتی سے اپنا پستول نکال لیا تھا۔ اچانک اور غیر متوقع انفاد نے کالا ناگ اور بشیر چیرا کو بھلا سا دیا تھا۔ تاہم بشیر چیرا نے مجھے اچانک اپنے پستول کے ذریعے مگن پوائنٹ پر لے لیا اور چلا کر اعظم خان کی طرف دیکھ کر بولا۔

”خبردار!..... گولی مت چلا۔ ورنہ میں اسے بھون ڈالوں گا۔“

میں اپنی جگہ جہاں کا تھا رہ گیا۔ میرا رواں رواں جوش غیظ کے باعث کپکپا رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ان دونوں خونی قاتلوں کی بوئیاں نوچ لوں۔

بازی ایک بار پھر پلٹ گئی تھی۔ اعظم خان اور بشیر چیرا دونوں ہی ایک دوسرے پر پستولیں تانے کھڑے تھے جبکہ میں ان دونوں کے درمیان کھڑا تھا۔ میں اپنی جگہ جم کر کھڑا تھا۔ جیسے ہی نیبے کالا ناگ نے اپنے اٹھوتے مسلح ساتھی بشیر چیرا کے قریب سرکنے کی کوشش کی تو اعظم خان نے چلا کر اس سے کہا۔

”خبردار کالا ناگ!..... اپنی جگہ سے بالکل حرکت مت کرنا۔ تم اس وقت میرے نشانے پر ہو۔“

اعظم خان کی تنبیہ پر کالا ناگ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔

”جب تک نادر تمہارے ساتھی کے نشانے پر ہے، تم اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی بے وقوفی نہیں

غراہٹ سے کہا۔ ”یہ غلط فہمی نہیں تھی۔ بلکہ میرے پیارے بھائی کے ساتھ تم لوگوں کی کھلی غدارانہ دغا باز عورت!“

اپنی ماں کے بارے میں کالا ناگ کے یہ الفاظ میرے لئے ناقابل برداشت تھے۔ میں طبعاً لہجے میں کالا ناگ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”کالا ناگ! میری ماں کے بارے میں یہ الفاظ تمہارے پڑ سکتے ہیں۔“

میری اس مداخلت پر کالا ناگ نے شعلہ بار نظروں سے مجھے گھورا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے بیت ہونٹوں پر بڑی زہریلی اور کینہ پرور مسکراہٹ ابھر آئی۔ پھر وہ نفرت انگیز لہجے میں بول۔

”میں اسی موقع کا تو منتظر تھا نادر علی خان! جس کے لئے میں نے تمہاری زندگی کی چند گھنٹوں کی تحقیر کی۔ مگر آج یہ مہلت سمجھو پوری ہونے والی ہے۔ آج تم اپنی دغا باز ماں اور ماموں کی برکت موت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھو۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے دائیں طرف کھڑے ایک پستہ قد مگر کینہ جیسے طاقت ور جسم کے مالک ساتھی سے کہا۔ ”بشیر چیرا!..... اس عورت کی پیشانی پر میرے انٹو سرخ نشان بنا ڈالو۔“

یہ حکم سنتے ہی بشیر چیرا کی آنکھوں میں سفاکانہ چمک ابھری اور اس نے اپنے پستول کی نال ماں کی جانب کیا۔ میں نے ماں کو بچانے کے لئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی مگر چونکہ حیدر گل ماں کے زیادہ قریب تھے۔ وہ آگے آگے۔ گولی چلنے کا دل دہلا دینے والا دھماکا ہوا اور گولی کی بجائے ماموں حیدر گل کے سینے میں پیوست ہو گئی۔

ماں کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ میں ماموں کو سنبھالنے کے لئے لپکا۔ اس وقت کالا ناگ نے بھی پر گولی چلا دی۔ ماں کے حلق سے ابھرنے والی کرب انگیز چیخ نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میری آنکھوں سامنے لادا ایلنے لگا۔ میں نے زخمی ماموں حیدر گل کے بے سدھ پڑتے وجود کو چھوڑا اور لپک کر تمام لیا۔ کالا ناگ دھشیا نہ قہقہہ لگا رہا تھا۔

”نادر!..... میرے بھائی کے قاتل!..... دیکھو یہ منظر..... سنبھالو اپنے پیاروں کی لاش تاکہ میرے سینے کی آگ شہدی ہو۔ ہا..... ہا..... ہا.....“

”کالا ناگ!.....!“ میں حلق کے بل اپنی زور سے دھاڑا کہ میری آواز تک پھٹ گئی۔ ”میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی کراہتی ہوئی ماں کو فرس پر ڈالا اور کھڑے ہو کر دھش غضب بھری نظروں سے کالا ناگ اور بشیر چیرا کو گھورنے لگا۔ ان کے باقی مسلح ساتھی گھنٹیں تھامے کھڑے تھے۔

”بہت جاؤ آگے سے نادر علی!“ کالا ناگ دھاڑ کر بولا۔ ”میں تمہاری ماں اور ماموں کی خون لاشوں کو تڑپتے اور پھڑکتے دیکھنا چاہتا ہوں..... ابھی تمہاری باری نہیں آئی ہے۔ بہت جاؤ۔“

لبورنگ منظر سے انتقام کی آگ بجھانے دو۔“ وہ دھشیا نہ لہجے میں بولے جا رہا تھا۔ مگر میرا دل وہ اندھیوں کا مسکن بن چکا تھا۔ جہاں سوائے غضب ناک کیوں اور دھشوتوں کے کچھ اور نہ تھا۔

”بشیر چیرا! اسے ہٹاؤ آگے سے۔“ کالا ناگ نے گرج دار آواز کے ساتھ اپنے ساتھی سے کہا۔

چیرا اپنے پستول کے زعم میں دانت کپکپاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر اس نے اپنی دائیں کی ضرب سے مجھے پرے دھکیلنے کی کوشش کی تو میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اس کی ٹانگ کی

”کونرا ہسپتال پہنچانا ہوگا۔“  
 میں رک گیا۔ اعظم خان اپنے سیل پر پولیس سے رابطہ کرنے لگے۔  
 \*\*\*

ماں کی جان بچ گئی تھی۔ انہیں پنڈی کے ایک بڑے پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔ جبکہ  
 ماموں حیدر گل اور فضل چاچا کو سپردِ خاک کر دیا گیا تھا۔ پولیس نے ضابطہ کی کارروائی شروع کر دی  
 تھی۔ زندہ بچ جانے والے بدعاشوں کو تحویل میں لے کر ان سے پوچھ گچھ اور ساتھ ہی کالا ناگ اور اس  
 کے خفیہ ساتھی بشیر چیرا کی تلاش بھی جاری تھی۔ میں غم سے بالکل بڑھ چکا تھا۔ ماموں حیدر گل کی  
 موت کا یہ اندوہناک سانحہ معمولی نہ تھا۔ انہوں نے مجھے باپ کی شفقت دی تھی۔ ان کی اگر اپنی اولاد  
 ہوتی تو وہ یقیناً اسے بھی اتنا ہی چاہتے۔ انہوں نے حقیقی معنوں میں مجھے اولاد کی طرح پالا تھا۔ جس کا  
 ایک واضح ثبوت یہ تھا کہ انہوں نے شروع ہی سے مجھے ان خونی اور دیرینہ معاملات سے دور رکھنا چاہا تھا  
 اور خود ہی خاموشی سے میرے باپ کے دشمنوں اور قاتلوں کو کفر کردار تک پہنچانے کے لئے کوششیں  
 کرتے رہے تھے۔ البتہ میری ماں کا معاملہ مختلف تھا۔ چونکہ وہ بذاتِ خود ماضی کی اس خوں ناک اور  
 کرب انگیز داستان کا ایک اہم کردار تھیں اس لئے ان کے وجود میں بجز کئی ہوئی آتش انتقام کا اندازہ  
 دینی ناممکن تھیں۔ یا پھر میں..... لیکن ماموں حیدر گل کے برعکس، ماں مجھے ایک ایسے جی دار بننے کے  
 روپ میں دیکھنا چاہتی تھیں جو ان کے متاثرہ بچے کو ادا کرتے ہوئے ان پر ڈھائے گئے ستم کا  
 ظالموں سے حساب لے۔ یہی سبب تھا کہ میری وجہ سے ماموں اور ماں کے درمیان کبھی کبھی تلخی بھی ہو  
 جایا کرتی تھی۔

کیونکہ ماموں حیدر گل نے اپنی مظلوم بہن کا یہ قرض ایک غیرت مند بھائی کی صورت میں اپنے سر پر  
 اٹھا رکھا تھا اور بالخصوص مجھے اس خونی معاملے سے کوسوں دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ماں کا خدشہ  
 درست ثابت ہوا تھا کہ اس طرح مجھے لاعلم رکھنے سے میں اپنی ماں اور ماموں سے بد دل ہو سکتا ہوں۔  
 اور واقعی، یہی ہوا تھا۔ میں نادانستگی میں اپنے ہی ازلی دشمنوں شاہ میر اور نظر حیات کے ہاتھوں کھلوٹا بن  
 کر اپنی ہی ماں اور ماموں کا دشمن بن بیٹھا تھا۔ اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلتا چاہئے تھا۔ پہلے تو میں اپنے  
 دشمنوں کے ہاتھوں کھلوٹا بنا اور پھر حالات اتنے بگڑ گئے کہ میرے ماموں کو اپنی جان سے ہاتھ دھوٹا پڑے  
 اور ماں شدید زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ گئی تھی۔

کالا ناگ اپنی جگہ کچھ بھی سمجھتا رہے تاہم یہ حقیقت تھی کہ اس کے بھائی ملک سردار خان کا قتل ہماری  
 ہی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ حالات ہی کچھ ایسے بن گئے تھے کہ مجھے اسے قتل کرنا پڑا۔ وہ  
 معذرت کا قائل تھا..... کبیر کی بہن صدف..... اور میں نے یہ سمجھ کر کہ اس نے گنیز کو مار ڈالا ہے،  
 اسے بھی موقع پر ہی اس کے جرم کی سزا دے دی تھی۔ گویا صدف اور ملک سردار خان کی ہلاکتیں محض  
 پہولیا کے ساتھ گھمن کے پسے والا معاملہ تھا۔

سچ اور غلط کی بحث سے قطع نظر بہر حال ماموں حیدر گل کی دشمنوں کے خلاف غلط پالیسیوں کا نتیجہ  
 آٹھ ماموں کے بے دردی سے قتل ہونے کی صورت میں نکل چکا تھا اور ماں مرتے مرتے پئی تھی۔  
 دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ ہمارے چاروں دشمنوں کا ٹوٹا کچا ہو چکا تھا۔ شاہ میر، نظر حیات،  
 سردار کالا ناگ۔

کالا ناگ نے اب تک مجھے بہت زک پہنچائی تھی۔ وہ میرا مقروض بن چکا تھا۔ اس خبیث اور بے

”کرو گے۔“

اب میں بشیر چیرا کے رحم و کرم پر تھا جبکہ کالا ناگ اعظم خان کے پستول کی زد پر تھا۔  
 ”نادر!..... تم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے۔“ معاشرہ چیرا کی عقابانی آنکھوں نے میرے  
 چہرے کے جارحانہ تاثرات سے کسی ”متوقع“ حرکت کا اندازہ لگاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ اب وہ دھڑلے  
 دھیرے دھیرے دروازے کی طرف سرکنے لگے تھے۔ وہ شاید اب راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئے  
 تھے۔ اس اعصاب شکن ماحول میں ماں کی تکلیف دہ کراہوں کی گونج خاصی بلند تھی۔ وہ دونوں فرار  
 لئے پر تول رہے تھے مگر میں انہیں اس کی اجازت دینے والا نہیں تھا۔ اس طرح گویا اعظم خان کی مدد  
 و برکت کارگزاری ضائع ہو جاتی۔ ان کی نظریں کالا ناگ پر لگی ہوئی تھیں جبکہ بشیر چیرا مجھ پر پستول تانے  
 میری طرف تہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے دھیرے دھیرے اُلٹے قدموں سرک رہا تھا۔ ان دونوں  
 کھسکا دیکھ کر مجھ پر اضطراب طاری ہونے لگا تھا۔ مگر شاید اعظم خان کی سوچ مجھ سے مختلف تھی۔ وہ دروازے  
 خون خرابے سے بچنے کے لئے ان کے نکل جانے سے متفق نظر آ رہے تھے۔ انہیں زیادہ فکر و پریشانی  
 زخمیوں کی حالت زار پر ہو رہی تھی۔ میں بے بسی سے کھڑا کالا ناگ اور اس کے سفاک ساتھی بشیر چیرا  
 دروازے تک پہنچتے دیکھتا رہا۔ پھر جونہی وہ دروازے سے باہر نکلے، میں ماں کی طرف لپکا۔ اعظم خان  
 دروازے کی طرف بڑھے اور پھر ان دونوں کے غائب ہو جانے کا اطمینان کرنے کے بعد زمین پر آگ  
 ترچھے پڑے کالا ناگ کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان میں بھی ابھی چند زخمی تھے۔ اعظم خان  
 نے سب سے پہلے ان کی گتوں کو پیر سے ٹھوکر مار کر پرے کیا۔

میں نے ماں کے قریب فرش پر گرنے کے انداز میں بیٹھ کر اس کا سراپا گود میں رکھ لیا۔ کالا ناگ  
 چلائی ہوئی گولی ان کے دائیں شانے پر لگی تھی جہاں سے بھل بھل خون جاری تھا۔ ماں کی حالت دیکھ کر  
 میرے وجود میں کرب کی لہر دوڑ گئی اور آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ ماں کے ہونٹ کپکپائے۔

”نن..... نادر بیٹا! گل کی خبر لو۔“

میں تڑپ کر قریب بے سدھ پڑے ماموں حیدر گل کی طرف بڑھا۔ وہ آخری سانسوں پر تھے۔  
 ”مم..... ماموں!..... ماموں!..... مم..... میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔“ مجھے  
 احساس نہیں تھا کہ قلمی انداز کا یہ جملہ کیونکر میرے لبوں سے ادا ہوا تھا۔ میری آواز سن کر ان کے لبوں  
 ارتعاش پیدا ہوا۔

”نن..... نادر بیٹا! مم..... میں تمہیں اس خونی جنگ سے بچانا چاہتا تھا۔ مم..... مگر آہ.....  
 سب کچھ ختم ہو گیا۔“ انہوں نے یہ مشکل پہ آخری جملے ادا کئے تھے اور پھر ان کا سراپا ایک طرف ڈھلک گیا  
 میری سانسیں جیسے سینے میں ایک کر رہ گئیں۔ دکھ اور کرب کی لہر کسی گولے کی طرح میرے سینے  
 حلق میں آ کر ایک لمبے کو ایک گئی۔ ایک لمبے بعد میرا سارا غم ایک چیخ کی صورت میں میرے لبوں  
 برآمد ہوا۔

”ماموں!.....!“

میری بلند آواز سن کر ماں اپنی جگہ لرزی اور پھر اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ میں ماں کی طرف  
 لپکا اور اسے بے سدھ دیکھ کر میرا سینہ جلنے لگا۔ میں یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور مجنونا نہ انداز میں دروازے  
 طرف لپکا۔ اعظم خان میری اچانک اور مجنونا نہ پیش قدمی کا مفہوم سمجھتے ہی پکارے۔  
 ”نادر!..... رک جاؤ۔ اب کوئی فائدہ نہیں۔ وہ دونوں خونی دور جا چکے ہوں گے۔ ہمیں شینہ

میں ایک سالخوردہ سی میز پر جا بیٹھا تھا۔ اوپری منزل تک جانے کے لئے ایک گوشے میں بیٹھ گیا تھا۔ وہاں بھی میں نے کچھ ادبائش اور عیاش فطرت افراد کو کچھ عورتوں کے ساتھ اوپر نیچے آتے جاتے دیکھا۔ یہ ”عورتیں“ گھر بیٹھیں تھیں، کسی برائیوٹ اڈے یا محلے سے ”ہاڑ“ کردہ تھیں۔ ”کیا پیش کروں جناب؟“ معا ایک ویٹرنما شخص جس کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں، میری میز کے قریب آکر بولا۔

”چائے لے آؤ۔“ میں نے کہا۔ وہ الٹے پاؤں پلٹا اور ذرا ہی دیر بعد سیدھے ہیروں چائے کا کپ لے دوبارہ نازل ہو گیا۔ اس برق رفتار سروس پر مجھے مطلق حیرت نہ ہوئی۔ کیونکہ صرف چائے ملتی تھی اور اس لئے بروقت ملتی تھی۔

”اور کچھ.....؟“ وہ چائے کی پیالی میرے سامنے میز پر دھرتے ہوئے بولا۔ میں نے چائے لے کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی کھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

”مثلاً.....؟“ میں نے بھی معنی خیز مسکراہٹ کا تبادلہ کرتے ہوئے پوچھا تو وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی کو اپنی ناک پر دستک دینے لگا۔ عورت کی عیاشی فراہم کرنے کا یہ ایک عام مردوجہ اشارہ تھا جو اکثر راہ چلنے عورتوں کے دلال، کسی نئے آنے والے گاہک یا مسافر کو کرتے تھے۔

”اچھا.....“ میں نے ہولے سے کہا۔ پھر بولا۔ ”لیکن مجھے کچھ اور چاہئے۔“

”وہ بھی مل جائے گا..... آپ حکم تو کریں۔“ وہ اندوہانہ مستعدی سے بولا۔

”کچھ پینا پلانا تھا..... اور خریدنا بھی۔“ میں نے ٹھٹھ لہجہ میں کہا۔

”سب کچھ ملے گا۔ آپ چائے ختم کریں، میں ابھی آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مجھے راستہ بنانا تھا اور یہ ادبائش ویٹرنما میرا رات بھر رہا تھا۔ میں نے چائے کے چند گھونٹ بھرے۔ چائے اچھی تھی۔ ذرا دیر بعد وہ دوبارہ لوٹا اور میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کیا چاہئے؟“

”دو زنی پانی۔“

”کیسا دو زنی پانی؟“

”جس، انیم..... اگر ہیرن بھی مل جائے تو کیا بات ہے۔“

”سب کچھ ملے گا..... ویسے آئے کہاں سے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”اندرون سندھ سے آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”وہ..... مال کیسے لے جاؤ گے؟ ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک مال لے جانا مشکل ہے۔“

”یہ میرا دوسرا ہے..... میں تو نہیں (عورتیں) بھی لے جاتا ہوں۔“

”ان کی اور بات ہے..... وہ تو چلتا پھرتا مال ہے۔ خیر، اگر استاد سے یہ معاہدہ بھی کر لو تو تمہارے دونوں کام آسان ہو جائیں گے۔“ اس نے مشورہ دیا اور ”استاد“ کے ذکر پر فوراً میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں اسے مزید ”ٹرائس“ میں لینے کی غرض سے خوش ہو کر بولا۔

”اچھا..... اگر یہ کام ہو جائے تو سمجھو، تمہارا کمیشن بھی ختم۔ مگر استاد سے کیسے ملا جائے؟“ میں نے اسے لالچ دیتے ہوئے آخر میں مطلب کی بات کی۔

وہ چاروں شانے چت ہو گیا۔ ”ابھی چلو..... مگر میرا کمیشن.....؟“

رحم انسان نے پہلے میرے جاں نثار دوست مردان شاہ کو کش پور کے ایک ویران کالج میں بے دردی ساتھ قتل کیا۔ میری جان جانان گینگہ کو وہ درندہ صفت میرے کینہ پرور رقیب کی ملی جھگت سے جانے کس گھٹاؤ نے اور پراسرار مقصد کے لئے لے کر روانہ ہوا تھا۔ پھر جب ایک منسنی خیز مارا مارا بعد ان کی کش پور سے واپسی ہوئی تو گینگہ کی ذہنی رو بڑے ہی عجیب اور پراسرار طور پر پلٹ چکی تھی۔ میرے علاوہ سب کو پہچان رہی تھی۔ میں تو اس کے لئے جیسے سراسر اجنبی ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ کیا راز اور مجھے اس راز سے پردہ اٹھانا تھا۔ جبکہ اس راز سے کبیر اور کالا ناگ ضرور واقف تھے۔ چنانچہ میں نے کبیر کے منہ سے اگلوانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

دوسری بڑی زک مجھے کالا ناگ نے ماموں حیدر گل کا قتل کر کے پہنچائی تھی۔ چنانچہ اب یہ حقیقت کھل کر سامنے آچکی تھی کہ دشمن ایک منظم ٹولے کی صورت میدان میں اتر آئے تھے اور اب بھی ان کا فوری طور پر منہ توڑ جواب دینے کے لئے میدان کارزار میں غم ٹھونک کر بے خطر بصورت دیگر دشمنوں کے حوصلے بلند ہو سکتے تھے۔ جبکہ میری ماں کی جان کو بھی بدستور خطرہ لاحق تھا۔ وقت کا تقاضا تھا۔ اس کے لئے مجھے سب سے پہلے کالا ناگ اور اس کے دست راست بشیر چیرا سے ضروری تھا۔

ماں کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ اعظم خان نے پولیس گارڈز کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ ماں کی حفاظت کے پیش نظر اپنے ہی چند سسٹم آدمیوں کو ہسپتال کے ارد گرد تعینات کر دیا تھا۔

یہاں سے بے فکر ہونے کے بعد میں نے فوراً لاہور کا رخ کیا۔ مگر اس سے پہلے میں متعلقہ کے ریکارڈ کیپر کی معنی گرم کر کے اس سے کالا ناگ کے گھر چوک والے اڈے اور ٹھکانے کی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ وہ ہسٹری میٹر تھا اور کئی مقدمات میں ملوث ہونے کے باوجود ضمانت گھوم رہا تھا۔ شام کے چھ بجے تھے جب میں ایک تیز رفتار اور نان اسٹاپ فلائنگ کوچ کے ذریعے پہنچا۔ میرے پاس اپنا قابل اعتماد میگارڈ موجود تھا۔ میں نے گرم شال اس طرح اوڑھ رکھی اس نے میرا سر اور چہرہ خاصی حد تک ڈھانپ لیا تھا۔ میری حالت کسی قلو کے مریض کی کی تھی۔ وقت میرے اندر لاوا سا پھوٹ رہا تھا۔ سائیں سائیں کرتے کرتے دل و دماغ میں زبردست ہوشی ہوئی تھی۔ میں کالا ناگ اور بشیر چیرا سے ماموں حیدر گل کی موت کا بدلہ لینے کے لئے بری طرح رہا تھا اور اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ ہوش میرے عقبات تھے اور جوش جنوں فزوں تر۔ ایک رکشے کے ذریعے میں سیدھا ”گھر چوک“ پہنچا۔ میری معلومات کے مطابق ”زمیندار“ کالا ناگ کی مستقل کمین گاہ تھی۔

میں مذکورہ ہوٹل کے قریب پہنچا تو مجھے بادی انکسر میں یہ ہوٹل عام سا کوئی چائے خانہ عمارت بھی خاصی پرانی ہی نظر آ رہی تھی۔ البتہ اس کا رقبہ وسیع تھا۔ یہ دو منزلہ ہوٹل تھا۔ اوپری شاہد اقامتی کمرے بنے ہوئے تھے جن کی اکثرے ہوئے پلستر والی دیواروں کی بالکونوں سے پت والے دروازوں کی قطار صاف نظر آ رہی تھی۔

میں نے وہاں گاہکوں کی خاصی تعداد کو دیکھا۔ سب ہی مجھے بے کار، بد معاش اور بد قماش نظر آتے تھے۔ ہوٹل میں اندر داخل ہو کر میز سنبھالنے کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہاں صرف چائے ہی کھانے وغیرہ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ شاید یہ دوسرے بلکہ تیسرے درجے کا ایک سستا اقامتی اس لئے یہاں صرف چائے چلتی تھی۔ تاہم مجھے اور بھی کچھ ”چلنے“ کے لوازمات بہ کثرت نظر آئے۔

”کیا چاہئے؟“  
”انیم اور جس چاہئے۔“ میں نے ٹھٹ لہجے میں کہا۔ ”اگر ہیروئن کی ڈیلوری بہ آسانی ہو سکے تو وہ بھی تھوڑی بہت خرید لوں گا۔“

”جہیں یہاں کا پتہ کس نے بتایا تھا؟“ وہ شک آمیز نظریں میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے بولا۔  
”میرا ایک ہندو سیٹھ دوست ہے۔۔۔۔۔۔ لاہور سے گریزی کا مال سندھ لے جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ اس نے ہی بتایا تھا۔“ میں نے کہا۔

اس نے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور ایک طویل کش لیا۔ دھوئیں کے کثیف مرغولوں میں جس کی بارگاہی۔ ”سندھ سے تو ہمارے بہت سے گاہک آتے ہیں۔“ وہ تھرا آئیز رعونت سے بولا۔ ”خیر، ہم نہیں بھی مایوس نہیں کریں گے۔ جس اور انیم کی ڈیلوری جاہوتو ہم کروادیں گے۔۔۔۔۔۔ لیکن ہیروئن بانی کروانا مشکل ہے۔ آج کل ایکسائز پولیس نے بہت سختی کر رکھی ہے۔“ اس کا لہجہ دوستانہ ہو گیا۔

میں نے اپنے مقصد کی خاطر بحث کو طویل دینے کی غرض سے اپنی سوئی ہیروئن کی ”تسلی بخش“ سپلائی رکالادی۔ لہذا مسکرا کر بولا۔ ”استاد! اگر آپ جس اور انیمون کی سپلائی کر سکتے ہو تو ہیروئن کیوں نہیں کر سکتے؟“

”کر تو سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔ مگر اس میں خرچہ بہت آتا ہے۔ کرائے سے تین گنا زیادہ بھتا دینا پڑ جائے گا۔ ادا کر دے تم؟“

”مال دو۔۔۔۔۔۔ ابھی کر دوں گا ادا کیگی۔“ میں نے فوراً کہا۔ ”اور ہاں، میں ذرا جلدی میں ہوں۔ کیش ساتھ لایا ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں گرسنہ چمک اُبھری۔ پھر اسی وقت اس نے دراز سے ایک سیل فون نکالا اور کسی کا بریف کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر وہ انتہائی مودبانہ لہجے میں بولا۔

”استاد! اندرون سندھ سے ایک گاہک آیا ہے، مال کے ساتھ۔ تسلی بخش ڈیلوری چاہتا ہے۔ خرچہ بھی ڈھانٹے گا۔“ اتنا کہہ کر وہ دوسری طرف سے کچھ ستارہا۔ پھر بولا۔

”مگر استاد!۔۔۔۔۔۔ وہ کہہ رہا ہے کہ میں کیش ساتھ لایا ہوں اور اسے لوٹنے کی ذرا جلدی ہے۔“ وہ دوبارہ بولا۔ ”نہیں استاد! بس ایک باری پولیس آئی تھی۔ اسے میں نے ٹھنڈا ٹھار کر کے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ دوبارہ چھاپے کا امکان تو نظر نہیں آتا۔ یوں بھی ہماری نمک حلال بھیڑیں تھانوں میں موجود ہیں۔ جیسے ہی کوئی بات ہوتی ہے، وہ ہمیں خبر کر دیتے ہیں۔“

”تمہیں بہتر رہے گا استاد!۔۔۔۔۔۔ اب بے غم ہو کر خود ہی آ جائیں تو اچھا ہے۔۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے سیل آف کرنے کے بعد مجھ سے کہا۔ ”تمہارا کام ہو گیا۔ استاد خود یہاں پہنچ رہا ہے۔“

میرا دل جیسے یکبارگی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ جی میں تو آئی کہ ”آنے والے“ استاد کا نام پوچھ رہا تھا۔ لیکن میں کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم چالاکی سے بولا۔ ”کیا یہاں پولیس کے پانچ بھی پڑتے ہیں؟“

”میری بات پر ہنسا۔“ گلتا ہے تم کے کھلاڑی ہو۔ یہ چھاپے تو روز کا معمول ہیں۔ ہوتا کچھ بھی نہیں۔ بڑی تیار رکھتے ہیں۔ فکر نہ فاق، تمہیں کر کا کا۔“ یہ کہہ کر وہ مجھوٹے انداز میں ہنسا اور مجھے ایک ہانسی مار کر گریٹ پیش کیا۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں اپنی بے چینی کو دباتے ہوئے بولا۔

”کیا دیر میں پہنچ جائے گا تمہارا استاد؟“

میں نے سو کے دونوٹ نکالے۔ اس نے منہ بتایا۔ میں نے مزید سو کے دونوٹ نکالے۔ اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک اُبھری۔ اس نے وہ نوٹ میرے ہاتھ سے لے کر اپنی قمیض کی جیب میں ڈالے، پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔  
”اٹھو!۔۔۔۔۔۔ آؤ میرے ساتھ۔“

اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے لئے اوپری منزل کی طرف جانے والی سڑکیوں کی طرف بڑھ گیا۔ پھر دار سڑکیوں سے اوپر پہنچ کر ہم طویل بالکونی میں آ گئے اور کمروں کے دروازوں کی قطاروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آخری کمرے سے ذرا پہلے بائیں جانب مڑ گئے۔ یہ ایک مختصر راہداری تھی جس سے دائیں بائیں سیلین زدہ سے بدبودار غسل خانے وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ اندازاً اُس بارہ قدموں کے بعد زینہ نظر آیا۔ میں اس بڑی بڑی موچھوں والے دیڑ کے عقب میں سڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔ اب یہاں ہوٹل ٹاپ (چھت) پر کھلے آسمان تلے کھڑے تھے۔ چھت کے چاروں طرف چھٹ اوپری دیوار بھی تھی۔ یہاں ایک ہال کمرے کا دروازہ نظر آیا۔ کچھ اور لوگ بھی دروازے کے باہر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ یہ ”خاص“ گاہک تھے۔ اور ”خاص“ شغل کے لئے انہوں نے ان کے بیٹھنے کا یہاں ”ٹاپ“ بندوبست کر رکھا تھا۔ میں نے ایک طائرانہ نظر ان پر ڈالی۔

کل چار پانچ میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ ہر میز کے گرد چار سے پانچ کرسیاں تھیں۔ شراب بھی چل رہی تھی اور سگریٹوں میں بھری ہوئی جس کے لیے لمبے لمبے کش بھی لگائے جا رہے تھے۔ ان میں دور ایک کمرے کے ساتھ ”اس بازار“ کی عورتیں بھی تھیں۔ حالانکہ دیوار پر غالباً کونسلے سے جلی مگر ٹیڑھے میز سے لٹھروں میں لکھا بھی تھا۔ ”عورتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔“

یہاں ایک دیڑ بھی ان بد مست گاہکوں کو سرو کرنے میں مصروف تھا۔ وہ موچھل دیڑ مجھے لئے سیدہ ہال کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے شمال کے اندر اپنے ریگتے ہاتھ سے میگارڈ کی موجودگی کا اطمینان کیا اور ہال کمرے میں داخل ہو گیا۔

اس کمرے کو ”ہال“ میں نے اس لئے کہا تھا کہ یہ دوسرے کمروں کی بہ نسبت بڑا تھا۔ ورنہ تو اس میں ”ہال“ والی کوئی بات نہ تھی۔ اٹھارہ بائی بائیں کا لمبا چوڑا کمرہ تھا۔ یہاں دائیں بائیں دو چار پائیاں سالخورہ سے صوفے بھی دھرے تھے۔ سامنے ایک بڑی میز تھی اور اس کے پیچھے ایک ریوالوگ چڑھی تھی۔ چیمبر پر ایک ہٹا کٹا سرخ آنکھوں والا بد معاش ٹائپ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں جانب دیوار سے لگے صوفے پر دو افراد بیٹھے تھے۔

”اوئے۔۔۔۔۔۔ یہ کون ہے؟“ سرخ آنکھوں والے نے میرے ساتھ آئے دیڑ کو گھورتے ہوئے میرے بارے میں پوچھا۔ جبکہ میں اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اپنے ”شکار“ کو بیاہ موجود نہ پا کر مجھے مایوسی ہوئی۔

”استاد!۔۔۔۔۔۔ یہ بہت بڑا سیٹھ ہے۔ اندرون سندھ سے آیا ہے۔ اسے مال خریدنا ہے۔“ دیڑ نے مودبانہ لہجے میں کہا تو سرخ آنکھوں والے نے میری طرف بغور برائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ”کیا نام ہے تیرا؟“

”لعل خان۔۔۔۔۔۔!“ میں نے غلط نام بتایا۔ سرخ آنکھوں والے نے دیڑ کو جانے کا اشارہ کیا۔ مجھ سے دوبارہ مخاطب ہو کر کھر کھرائی آواز میں بولا۔

”مال عرف کالا ناگ۔“ اس نے جیسے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا اور میری رگوں میں خون کی بخش لاوا بھڑکنے لگی۔ اور ساتھ ہی مجھے تسلی بھی ہو گئی کہ میں بالکل ٹھیک جا رہا تھا۔

”کیوں، سوکھ گیا نا ساپ.....“ وہ میری یکنخت خاموشی پر غریب انداز میں بولا۔

”اچھا، تمہارے استاد کا بڑا ہی خوف ناگ نام ہے۔“ میں نے اسے مزید ہانس پر چڑھاتے ہوئے کہا وہ وہاں تنہا رہتا ہے یا بیوی بچے بھی رہتے ہیں ساتھ؟“

”استاد ابھی ان مہنجیوں میں نہیں بڑا۔ وہاں وہ اسنے کئی کے چند دوستوں کے ساتھ رہتا ہے۔“ اس نے میرے سینے میں جوش غیظ کی آگ مزید بھڑکنے لگی۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد ہماری موٹر سائیکل ایک پوش علاقے میں داخل ہو رہی تھی..... یہاں بہت صورت کوٹھیاں اور بنگلے قطار اندر قطار نظر آرہے تھے۔ ان کے اندر باہر خوب صورت پھولاریاں لگی

تھیں۔ صوبہ اور سیلون کے ناریل پیز بھی نظر آرہے تھے۔ بید مٹک کی بھی بہتات تھی۔ ایک دو بلاک ڈرک ہم ہلکے آسانی رنگ کے ایک بنگلے کے قریب پہنچے۔ میرے اعصاب یک دم تن گئے تھے۔ گرم

ہوا سے میں نے اپنا چہرہ اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا۔ میرے پورے وجود میں سسٹناہٹ ہونے لگی تھی۔

میں نے غصے سے میرے دل کی دھڑکنیں سینے کا پتھر توڑے ڈال رہی تھیں۔ گیٹ پر موجود ایک چوکیدار ہمیں دیکھتے ہی آہنی گیٹ کا ایک پٹ ذرا وا کر دیا۔ اسے یا تو ہماری متوقع آمد کے بارے میں بتا دیا

یا تھا یا پھر وہ موٹر سائیکل سوار کو جانتا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل سیدھا اندر لے جا کر بنگلے کے وسطی

باب دروازے کے قریب پختہ روش پر روک دی۔

میں نیچے اتر آیا۔ اس نے موٹر سائیکل سائیڈ اسٹینڈ پر کھڑی کی۔ مجھے پورٹیکو میں گرے کلر کی ایک

س (سوزوکی) کار کھڑی دکھائی دی۔

میں نے سرسری نگاہ قرب و جوار میں ڈالی اور اس کے ہمراہ چار پانچ قد چمچوں والی ماربل چپس کی

پاڑھی چھتا ہوا مرکزی دروازے پر پہنچا۔

دروازہ کھلا تھا۔ اس نے ذرا دھکا دے کر وا کر دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں بھی دھڑکتے دل کے

انداز میں داخل ہو گیا۔ سامنے نشست گاہ کا سنگل پٹ والا دروازہ نظر آیا جس کے اندر مجھے باتوں کی

آوازیں سنائی دیں۔ وہ مجھے لئے اندر داخل ہوا۔ سامنے صوفوں پر تین افراد اور دو تھیکے نقوش والی

پاؤں بھی تھیں۔ تین مردوں میں سے ایک میرے لئے اٹھ بیٹھا جبکہ دو افراد پر نظر پڑتے ہی میری

پاؤں دوڑتا ہوا خون منٹل آتش فشاں لاوا اگلنے لگا۔ ان میں سے ایک بشیر چیرا تھا جبکہ دوسرا کالا ناگ!

میں نے اپنی گرم شال کے اندر ہی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا میکارڈ نکال لیا۔ پھر جب تک وہ

شال، میں نے شال الٹ دی۔ کالا ناگ اور بشیر چیرا کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی وہ یک بیک ساکت ہو

گئے۔ ان دونوں خبیثوں نے اسی طرح ہی اپنے مسخ خونی ہر کاروں کے ساتھ ہماری رہائش گاہ

کا لالچ پر شب خون مارا تھا اور اب میں بھی انہیں اسی طرح جواب دینا چاہتا تھا۔

”کالا ناگ! اب تم بھی انہوں کو کھوتا دیکھو گے۔“

میں نے جوش اشتقام سے لرزتی آواز میں کہا تو اس کے دست راست بشیر چیرا نے حرکت کی۔ وہ اپنی

پس سے کوئی ہتھیار نکالنا چاہتا تھا۔ میرے سر پر تو خون سوار تھا۔ میں بھلا اسے اب کب موقع دینے والا

ہوئے میکارڈ نے ایک شعلہ اگلا اور اڑتا کیس بوری کی گولی نے بشیر چیرا کی پیشانی اڑا دی۔ صوفے پر

دونوں لڑکیاں ہراساں ہو کر چیخنے لگیں۔ میرے ساتھ آنے والے زمیندارہ ہوٹل کے استاد نے مجھ

ابھی میں نے اتنا ہی پوچھا تھا کہ اچانک اس کا موبائل فون گنگنایا۔ اس نے لپک کر اپنا سیل فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کسی نے کچھ پوچھا تو وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

”تمہیں مال کتنا چاہئے؟“

میں چونکا۔ اس وقت میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے کچھ سمجھتے ہوئے دانستہ زیادہ

مقدار بتائی۔ ”تیس کلو افریم، پچیس کلو جس اور تین کلو ہیرون۔“

سرخ آنکھوں والے گماشتے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے سیل فون پر یہ تعداد

دوہرا دی۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”ٹھیک ہے استاد!..... پھر یہی بہتر رہے گا۔ ہم ابھی پہنچتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے سیل فون آف

کر دیا۔

”آؤ میرے ساتھ..... استاد کے پاس چل کر معاملات طے کر لیتے ہیں“ اس نے کھڑے ہونے

ہوئے مجھ سے کہا۔ میرا دل جیسے کپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اس نے قریب بیٹھے دو افراد سے کہا۔ ”میں ذرا

ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتا ہوں..... ٹھیک ہے؟“

دونوں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد میں اس کے ساتھ چلتا ہوا زینے طے

کرتا زمیندارہ ہوٹل سے باہر آ گیا۔

ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہم روانہ ہو گئے۔

میں نے پوچھا۔ ”کدھر چلے آ؟“

”زیادہ دور نہیں..... استاد کا بنگلہ قریب ہی ہے۔“ اس نے موٹر سائیکل کو مین شاہراہ کی طرف

موڑتے ہوئے کہا۔

”مگر استاد تو خود آ رہا تھا..... پھر یہ اچانک.....“ یہ کہتے ہوئے میں نے دانستہ اپنا جملہ احوال

چھوڑا تو وہ بولا۔

”اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے سائیں لوکو! مال کی نئی بنائی کھپ تمہیں وہیں مل جائے گی۔ اور اس کی

سندھ با آسانی سلائی سے متعلق معاملات بھی وہیں طے ہو جائیں گے۔“

”یہ تو اور اچھی بات ہے..... لیکن دیر تو نہیں ہو جائے گی؟“ میں نے اپنی بات میں وزن بنانے

کرنے کے لئے کہا۔

”او نہیں یار!..... بلکہ استاد نے تمہیں وہیں اپنے بنگلے پر بلوا کر وقت کی بچت کر دی ہے۔ ورنہ“

یہاں آتا اور مال کی جتنی کھپ تمہیں چاہئے، اتنی اڑے پر بھی نہیں تھی۔ اور ہمیں یوں بھی پھر استاد

ساتھ بنگلے میں جانا پڑتا۔“

”کیا بنگلے میں زیادہ مال گودام ہے؟“

”ہاں..... زمین دوز مال گودام۔“

”بڑا شیک والا ہے تمہارا استاد..... کیا نام ہے اس بہادر شخص کا؟“ بالآخر مجھے اپنے شکار کا

پوچھنے کا موقع ہاتھ آئی گیا۔

”نام نہ ہی سنو تو بہتر ہے..... خواہ مخواہ ڈر جاؤ گے۔“ اس کے لہجے میں غرور تھا۔

”پھر بھی..... بتاؤ تو..... یہ کہہ کر تو تم نے خواہ مخواہ ہی میرے بخش کو بڑھا دیا ہے۔“

نہر اشتقاق، انداز میں کہا۔

پر جھپٹنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے ایک لات رسید کر دی۔ وہ کالا ناگ کے قدموں میں جا کر صوفے پر بیٹھنے اس کے دوسرے ساتھی نے خوف زدہ ہو کر بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے اس کی ٹانگ گولی چلا دی جو اس کی ران پر لگی۔ وہ کہ یہہ چیخ کے ساتھ قالین پر گر اور زخمی ران پکڑے مارے مارے کے کراہتے لگا۔ وہ دونوں فیشن ایبل لڑکیاں ہسپتالی انداز میں چیخے جاری تھیں۔

”خاموش ہو جاؤ..... ورنہ تم دونوں کو بھی گولی سے آڑا دوں گا۔“ میں نے ان دونوں کی طرف گھورتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ”میری تم لوگوں سے دشمنی نہیں۔ لیکن اگر کسی نے میرے آڑے آنے کی کوشش کی تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

میرے ساتھ آنے والا کالے ناگ کا ساتھی اٹھنے لگا تو میں نے ایک عدد گولی اس پر بھی چلا دی اس کے دائیں بازو پر لگی۔ وہ بری طرح کراہ کر رہ گیا اور پھر اس نے حرکت نہ کی۔ کالا ناگ کے چہرے پر وحشت طاری تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے بڑی خوفناک نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس اچانک صور حال نے ایک لمحے کو اسے بھی کسی حد تک اعصاب زدہ کر دیا تھا۔ اسے شاید میری اس اچانک کارروائی نے اچھی طرح باور کرا دیا تھا کہ میں اس وقت جوش انتقام سے مغلوب ہو رہا تھا۔ مد مقابل کی ذرا ذرا جہنش میری آتش غیظ کے لئے جلتی پر تیل ثابت ہو سکتی تھی۔ میری اس دہشت نے ”گمجر چوک“ سفاک، شاطر بد معاش کالا ناگ کو اپنی جگہ سینٹے پر مجبور کر دیا تھا۔

”کالا ناگ!“ میں اسے لاوا لگتی نظروں سے گھورتے ہوئے شعلہ بار لہجے میں بولا۔ ”میرے بار وقت نہیں ہے۔ میں صرف گولی سے بات کروں گا۔ ٹکینہ کے ساتھ تم نے کیا، کیا تھا؟..... اسے تم کبیر کش پور کیوں لے کر گئے تھے؟“

میرے سوال پر کالا ناگ کے تنے ہوئے اعصاب جیسے پُرسکون ہوتے چلے گئے۔ اسے غالباً یہ فہمی ہونے لگی تھی کہ میں اسے ابھی ہلاک کرنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔

یہی سبب تھا کہ وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی خواہش سے مجھے اس کا یہ انداز بری طرح کھل گیا تھا۔ میں نے میگارد کا رخ پہلے ہی اس کی طرف کر رکھا تھا۔ اس خوش فہمی دور کرنا لازمی ہو گیا تھا۔ میں اس کے دائیں شانے کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا تا ہی چاہتا تھا۔ اچانک مجھے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا..... میں جیسے ہی پلٹا تو میری نظر ایک لٹھ بد معاش پر پڑی جو خوفناک ارادوں کے ساتھ میری جانب بڑھ رہا تھا۔ مجھے چوکتے دیکھ کر اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑا ہوا وہ ڈنڈا اچھال کر دے مارا۔ میں نے پھرتی سے جھکا کر اس پر چلا دی۔ اس وقت میں اسے پہچان چکا تھا۔ وہ وہی بد معاش تھا جس نے ہمارے لئے اس جنگ کا کارواں کھولا تھا۔

میرے تباہ کن میگارد نے ایک دھماکے سے شعلہ اُگھا۔ مگر اس نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کر کے اس سے پہلے ہی خود کو جھکا کر دے کر دروازے کی طرف اچھال دیا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر اصلی دشمن یعنی کالا ناگ کی طرف جیسے ہی پلٹا، اس نے اس لمبائی وقفے سے فائدہ اٹھایا۔ بہ سرعت جگہ سے اٹھ کر مجھ پر چھلانگ لگائی۔ میں اس اچانک حملے کی زد میں آ گیا۔ وہ مجھے رگیدتا ہوا نشانہ تک گھسٹا چلا گیا۔

میگارد میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں سنہلنے کی کوشش کرتا، اس نے غراہٹ کے ساتھ میری کینٹی پر ٹکا رسید کر دیا..... میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا۔ آنکھوں کے سامنے

چلنے لگی۔ وہ بھی ایک کایاں تھا جو مجھے سنہلنے کا ذرا بھی موقع دیتا نہ چاہتا تھا۔ سنہل کر اس نے میرے ہاتھوں میں اپنے دائیں ٹانگ کا گھٹنا میرے پیٹ پر بھی رسید کر دیا۔ اذیت کی جاں کش لہر نے مجھے زخمی کر رکھا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میرے اندر کا غیظ جنون میں تبدیل ہو گیا اور میں سب کچھ بھول کر زپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کالا ناگ نے بھی کھڑے ہونے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ لگائی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے اندر کا کھلاڑی پوری شد و مد کے ساتھ بیدار ہو گیا تھا۔ میں غراتا ہوا اس پر بھپٹا۔ اپنی پھرتی سے اپنی دائیں ٹانگ کا اڑنگ لگا کر میں نے اسے دوبارہ زمین بوس کر دیا۔ یہ ایک اسپورٹس فل یک داؤ تھا۔ میں چونکہ آل راؤنڈر کھلاڑی تھا اور اکثر فٹ بال کھیلنے کے دوران جب مد مقابل ٹیم کا کوئی کھلاڑی فاول پلے کرتے ہوئے مجھے اڑنگ لگا کر گرانے کی کوشش کرتا تو میں الٹا یہ داؤ اس پر آزمائتا تھا۔ کالا ناگ جیسے ہی زمین بوس ہوا، میں نے اپنے بوٹ کی ایک زوردار شوکر اس کی کینٹی پر رسید کر دی۔ اس کے حلق سے نبل جیسی ڈکراہٹ اُبھری۔ پھر تو جیسے مجھ پر جنون سوار ہو گیا اور میں نے اسے لاتوں پر کھینچا۔ وہ تباہ تو دھمکوں سے بری طرح گھبرا گیا اور اس کے حلق سے وحشیانہ غراہٹیں اُٹھنے لگیں۔ پھر اس نے توپ کر لوٹ لگائی اور جیسے ہی اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی، میں نے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی ہاک پر بڑ دیا۔ اس کے حلق سے مارے اذیت کے وحشیانہ چیخ اُبھری اور وہ کئی قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ میں نے باؤنگ کرانے کے انداز میں مختصر سا اشارت لیا اور دوڑتا ہوا اس کی طرف آیا اور اچھل کر اپنی ایک ٹانگ اس کے سینے پر جڑ دی۔ یہ ضرب زوردار ثابت ہوئی، جس نے کالا ناگ جیسے گرائیڈل شخص کو بھی فرش سے چند انچ اُچھل کر عقب میں دیوار سے ٹکرانے پر مجبور کر دیا۔ اور جب دوبارہ اپنے قدموں پر آیا تو اس کے انداز میں واضح طور پر لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ اپنی پشت دیوار سے ٹکا کر ہانپنے لگا۔ اس کے ناک سے بھل بھل خون بہنے لگا تھا جس نے اس کا چہرہ مزید خوفناک، لہو رنگ بنا دیا تھا۔ اچانک بری نگاہ اپنے میگارد پر پڑی۔ میں پھرتی سے اسے جھپٹنے کے لئے بڑھا اور پھر جیسے ہی اسے اٹھا کر سیدھا ہوا، میں نے کالا ناگ کو دروازے سے باہر بھاگتے دیکھا۔

میں نے دانت پیستے ہوئے اس پر گولی چلا دی مگر میرا نشانہ خطا ہو گیا۔ وہ نکل بھاگنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں بھی اس کی ”یقینی“ موت بنا اس کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔ دفعتاً مجھے گیٹ کے باہر لوگوں کا شور سنائی دی۔ ارد گرد کے لوگ شاید گولیوں کے دھماکوں کی آوازیں سن کر وہاں آن موجود ہوئے تھے۔ مگر میری جنوں خیز نظریں اپنے درندہ صفت دشمن کالا ناگ پر جمی تھیں جو گیٹ کی طرف دیوانہ وار دوڑا جا رہا تھا۔ مجھ پر بھی جیسے خون سوار تھا۔ میں بھی میگارد ہاتھ میں تو لے اس کی طرف بھاگا۔ میں نے اس کا نشانہ لیا اور لمبی دبا دی۔ گولی کا ایک اور دھماکا ہوا اور کالا ناگ اذیت ناک چیخ مار کر پختہ فرش پر گر پڑا۔ گولی اس کی پشت پر لگی تھی۔

اچانک باہر پولیس سائرن کی آواز اُبھری۔ شاید کسی ترقیبی کمین نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی۔ میرا ذہن بری طرح سائیں سائیں کرنے لگا۔ میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو مجھے دائیں جانب وسیع لان کے پار ایک گھبراہٹ نظر آیا، جو جنگ کی مشرقی دیوار اور باؤنڈری وال کے عین درمیان میں واقع تھا۔ میں نے میگارد قبضے کے نیچے کر کے گرد بندھے ہوئے سائیں میں اڑا اور مذکورہ سمت کی طرف دوڑا۔ گھارے دروازے داخل ہونے کے ساتھ ہی میں نے سامنے دیکھا۔ یہ مختصر گھبراہٹ ذرا آگے جا کر بائیں جانب جنگ کی کئی سمت میں گھوم رہا تھا۔ میں دوڑتا ہوا اختتام پر پہنچ کر بائیں جانب مڑا تو مجھے سامنے اختتام پر ایک گھبراہٹ سا ٹوائٹ روم دکھائی دیا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ سیڑھیوں کا کام دے سکتا تھا۔ میرے ذہن

میں فوراً یہ خیال ابھرا اور پھر لپک کر میں دروازے کے سہارے اوپر ٹوائلٹ کی چھت پر چڑھ گیا۔ اور نہایت احتیاط سے باؤڈری وال پر آ کر دوسری طرف باہر کود گیا۔ یہ کٹھنوں اور بنگلوں کے عقب میں بنی ہوئی گندی گلی (کچرا گلی) تھی۔ کچرے کے ڈھیر پر کود کر میں نے دوڑ لگا دی اور تاریکی کا فائدہ اٹھاتا ہوا دور تک دوڑتا چلا گیا۔ اور پھر ایک طویل چکر کاٹ کر شاہراہ پر آ گیا۔ یہاں آ کر میں نے اپنے حواس پر قابو پایا۔ کچھ دیر بعد میں نے ایک آٹو رکشہ روکا اور بوہڑا چوک چلنے کا کہہ کر اس پر سوار ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں بوہڑا چوک پر تھا۔ یہاں تیز رفتار اور ویکوں کا اڈا تھا جو مختلف چھوٹے بڑے شہروں کی طرف جاتی تھیں۔ مگر میں نے بس کی بجائے جانے والی ایک تیز رفتار ہائی ایس ویکن کا انتخاب کیا۔ بیس منٹ بعد اس کی روانگی کا نمبر آیا تو اس ریٹکنا شروع کر دیا۔ میں جلد سے جلد لاہور سے نکل جانا چاہتا تھا۔

سیدہ سحر نمودار ہونے تک میں راولپنڈی پہنچ چکا تھا بس اسٹاپ سے میں سیدھا ہسپتال کی طرف ہوا جہاں ماں داخل تھی۔

ماں کو اب انتہائی نگہداشت کے وارڈ سے وی آئی پی روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ وہاں نرس وقت موجود رہتی تھیں۔ جس وقت میں روم میں داخل ہوا تھا تو ایک نرس ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے نکل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

”آپ کہاں تھے؟..... آپ کی والدہ بار بار آپ کا نام لئے جا رہی تھیں۔“

میں نے مضطربانہ بے چینی سے پوچھا۔ ”سسر! خیریت تو ہے نا؟..... ماں کی طبیعت کیسی ہے؟“

”وہ ٹھیک ہیں..... جائے اندر۔“ وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ ماں بیڈ پر دراز تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔

”نادر!..... میرے بچے!“

میں لپک کر ان کی طرف بڑھا اور ان کے سر ہانے بیٹھ گیا۔ ماں کے پر نور چہرے پر میرے لئے کا سمندر موجزن تھا۔ مگر اس کے ساتھ ان کی آنکھوں میں بھائی کی جدائی کا اندھنا غم بھی تھا۔

صورت جھللا رہا تھا۔ میں نے فوراً جذبات سے مغلوب ہو کر ماں کی پیشانی کو چوم لیا اور ان کا ہاتھ کپکپاتا ہوا ہاتھ محبت سے تھام لیا۔ اور اپنے حلق میں اتری ہوئی غم و اندوہ کی رقت کو نکلتے ہوئے بولا۔

”ماں! کیسی ہے تو؟“

”میرے بچے!..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر تو..... تو اچانک کہاں چلا گیا تھا؟“

نجیف اور کاپٹی آواز میں پوچھا۔ ”میں تو تیرے اچانک غائب ہونے پر ڈر ہی گئی تھی کہ کہیں پھر ہمارے دشمنوں نے..... تجھے بھی.....“

اس سے آگے ان میں کچھ کہنے کی سکت نہ رہی اور وہ خاموش ہو گئیں۔

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”ماں! تو کیا اپنے لخت جگر کو اتنا کمزور سمجھتی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں لئے تر نوالہ ثابت ہو سکتا ہے؟“

”نہیں میرے بچے!..... نہیں۔“ ماں نے ایک دم تڑپ کر کہا۔ ”میں جانتی ہوں، تو.....“

دودھ پیا ہے..... اور تیری رگوں میں ایک بہادر اور غیرت مند باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ سوئے کے بعد ایک تیرا ہی تو آسرا ہے مجھے کہ تو اپنے باپ کے قاتلوں کو کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔

نادر! دشمنوں نے مجھے اب میرے بھائی گل (حیدر گل) کی موت کا زخم دے کر میرے سینے میں

نادر! دشمنوں نے مجھے اب میرے بھائی گل (حیدر گل) کی موت کا زخم دے کر میرے سینے میں



ایک دن جب میں ٹال کے دفتر میں اپنی ریو لوگ چیئر پر براجمان میز پر جھکا کچھ اعداد و شمار کرنے لگا تھا تو اچانک مجھے دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے نیپال کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ جانے کب سے خاموشی کے پیرا مجھے کام میں مگن دیکھے جا رہا تھا۔

”اے آؤ چا چا جی!..... کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھو!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ پھر قدرے چونک کر ”تم رو کیوں رہے ہو؟“ میں نے اب اسے ”نہجیر“ کی بجائے ”چا چا جی“ کہنا شروع کر دیا تھا۔

”مرد بھائی سے لگائے آگے بڑھا اور میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے لرزیدہ آواز میں بولا۔

”صاحب! آپ کو آج دوبارہ اس کرسی پر بیٹھا دیکھ کر مجھے خوشی بھی ہو رہی ہے اور دکھ بھی.....

”بڑے صاحب (ماموں حیدر گل) بھی یہاں بیٹھا کرتے تھے۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے، بہت آری تھے۔ بڑے لوگ تھے جی۔“ وہ اپنا مخصوص تکیہ کلام نہیں بھولا تھا۔ مگر پھر جیسے اسے فوراً یاد آ گیا

”جیسے اس کے تکیہ کلام سے سخت چڑھتی۔ لہذا فوراً ہی قدرے شرمندہ ہو کر بولا۔ ”معافی چاہتا ہوں

”صاحب!..... آپ بھی..... بڑے لوگ ہیں۔“

”مجھے بے اعتبار رہی آگئی اور میں ملاحت سے بولا۔ ”چا چا جی! ماموں حیدر گل کے بعد واقعی ٹال سونا

”گ رہا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کی وجہ سے میرے دل کو کافی سہارا ہوا ہے۔ ورنہ تو میں

”ابول ہی گیا تھا۔ آپ نے دن رات اپنی جان مار کر اسے دوبارہ تعمیر کر دیا۔ بلکہ مجھے تو ہوش بھی نہ

”اس پر توجہ دیتا۔“

”چھوٹے صاحب جی! برا تو مجھے بھی لگتا تھا۔ آپ پریشان تھے اور میں بار بار آ کر آپ سے چکیوں

”نظر کروا کر اپنی راہ لیتا تھا۔ مگر کیا کرتا صاحب! مزدوروں کی بیکاری اور ان کے گھروں میں بھوک و

”لجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اللہ بخشے بڑے صاحب کو، ان کے اخلاق و حسن سلوک کی مزدوروں

”لوں میں بوٹی ہوئی عجیب سی فصل تھی کہ انہوں نے بھی جیسے کہیں دوسری جگہ کام نہ کرنے کی قسم کھا

”لی۔ حالانکہ اکثر بڑے صاحب (ماموں حیدر گل) اور مزدوروں کے درمیان گرامری بھی ہوتی رہتی

”تھیں۔ لیکن باوجود اس کے سارے مزدوروں کو بڑے صاحب سے عقیدت تھی۔ وہ ہر وقت مجھے گھرے

”تھے۔“ وہ اپنی رو میں بے جا رہا تھا۔

”ہاں!..... تم نے واقعی مجھ پر ہی نہیں، ان مزدوروں پر بھی احسان عظیم کیا ہے۔“ میرے لہجے

”میں نے جھوٹے صاحب! یہ تو میرا فرض تھا۔ رقم تو آپ ہی کی تھی، میں نے کیا کیا بھلا؟“

”تمہاری محنت تھی چا چا جی! اور تمہاری ماموں سے عقیدت تھی۔ تمہارے دل میں مزدوروں کے لئے

”محبت تھی..... اور سب سے بڑی بات اس ٹال کی نئے سرے سے تعمیر میں تمہاری دیانت دارانہ

”کوشش تھی۔“

”دراصل چھوٹے صاحب! آپ کو تو معلوم ہی ہے، کاروبار میں مقابلے کی دوڑ پہلے کے مقابلے میں

”زیادہ ہے۔ ہماری ایک ساکھ بنی ہوئی ہے۔ اگر دیو ہو جاتی تو باریاں ہمیں آرڈرز ہی نہ دیتیں اور

”موجل جاتیں۔ پھر نئے لوگ آتے رہتے ہیں۔ دوبارہ ساکھ بننا ناممکن حد تک مشکل ہو جاتا۔“

”میں بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر جیسے وہ ماحول کے بوجھل پن کو دور کرنے کی خاطر بولا۔

”چھوٹے صاحب! اب آپ کی وجہ سے اس ٹال کی رونقیں دوبارہ لوٹ آئی ہیں۔ اب انہیں

## قیدی

میں نے کسی خدشے کے تحت ان سے کہا۔ ”انکل! کیا ڈائریکٹ پولیس سے رابطہ کرنا مناسب ہوگا؟“ میری بات پر وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ”میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ بے فکر رہو۔ میں پرسنل سیکرٹری کو اس معاملے میں باؤنڈ کر کے ضروری ہدایات دے رہا ہوں۔ وہ خود مناسب اقدامات سے ذیل کر لے گا۔“

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے کسی بہرام نامی سیکرٹری سے سیل فون پر رابطہ کر کے ساری صورت حال بارے میں اسے بریف کیا اور چند ضروری ہدایات بھی دیں۔

ابھی وہ اس کام سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ڈاکٹر صاحب اندر داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں

”نرس نے وائٹل سائن چیک کیا اور ان کی ریڈنگ بتائی۔ پھر میڈیکل فائل کا مطالعہ کرنے لگے۔ اس

”بعد انہوں نے اعظم خان سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اب ان کی کنڈیشن خاصی حد تک بہتر ہو چکی ہے۔ میں انہیں ڈسچارج کر رہا ہوں۔ البتہ ان کو

”چوتھے روز ہیڈنٹج ہوتی رہنی چاہئے۔ چند روزیں روز معاملے کے لئے او پی ڈی لا سکتے ہیں۔“

”تھینک یو ڈاکٹر صاحب! ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔“ اعظم خان نے ممنونیت بھرے لہجے

”کہا۔ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر ماں میرے ساتھ مری واپس آئیں۔ اعظم خان بھی ہمارے ساتھ

”فضل چاچا کے بھیمانہ قتل کے بعد ان کی بیوی سیکنڈ بے چاری غم سے غڑھال تھی۔ مگر آفرین

”عورت پر..... وہ چند روز اپنے گاؤں میں گزار کر ہمیشہ کے لئے ”گرین لاج“ آگئی تھی۔ اب

”ماں کی دیکھ بھال پر مامور تھی۔

”انکل اعظم خان واقعی ہمارے لئے ایک فرشتہ صفت انسان ثابت ہوئے تھے۔ ماں نے مجھے ان

”بارے میں تفصیلاً آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ درحقیقت ماموں حیدر گل کے دوست ہی نہیں، میر

”مرحوم باپ قادر علی خان کے پرانے اور بچپن کے دوست تھے اور بلاشبہ انہوں نے دوستی کا حق ادا کیا

”بلکہ کر رہے تھے۔

”اگرچہ بعض سیاسی حوالوں سے ان کی ذات سے متعلق کچھ مشکوک قسم کی سرگرمیوں کی دہ لفظوں

”بازگشت شتارہتا تھا لیکن میں نے اس حوالے سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی اور نہ ہی میں اس کی

”ضرورت محسوس کرتا تھا۔ بہر طور ٹال کو آگ لگنے کے بعد جن دو اشخاص نے اس سلسلے میں میرے

”سنجھایا دیا تھا، وہ دو افراد تھے۔ انکل اعظم خان اور دوسرا شخص نہجیر مشتاق سیال۔ بلکہ یہ قول انکل

”خان کے ٹال کی نئے سرے سے تعمیر میں نہجیر مشتاق سیال کی شبانہ روز محنت اور توجہ کا دخل زیادہ تھا۔

”یہ وہی شخص تھا جس کی احمقانہ گفتگو اور حرکتوں کے باعث میں اکثر جھلّا جایا کرتا تھا۔ ایک دن

”ایسا نہیں گزرا تھا کہ جب وہ مری سے پنڈی ہسپتال میں ماں کی خیریت پوچھنے نہ آیا تھا۔ ٹال کے

”کے بعد سے میں کچھ ایسے درگوں حالات کا شکار رہا تھا کہ اس کی دوبارہ نئے سرے سے تعمیر کا خیال

”میرے دل و دماغ سے نکل گیا تھا۔ حتیٰ کہ مجھے یہ بھی یاد نہ رہتا تھا کہ کب وہ آکر مجھ سے ٹال کی

”تعمیر کے سلسلے میں چیک وغیرہ سامان کروا کر لے جایا کرتا تھا۔

”اسی طرح جب اسے میرے اور ماں کے ہسپتال سے ”گرین لاج“ آنے کی خبر ہوئی تو وہ

”آیا اور ٹال کی تعمیر و مرمت کے سلسلے میں ایک ایک پائی کا حساب مجھے دکھایا۔ اس کی دیانت دار

”سے پاک تھی۔ بعد میں، میں نے بھی اس کے پُر زور اصرار پر ٹال کا معائنہ کیا تو اس کی وفاداری اور

”شہاسی کا دل سے قائل ہو گیا۔

بنیاب میں مرمت کے لئے دے رکھا تھا جہاں سے وہ ٹھیک ٹھاک مرمت کر کے بالکل درست حالت میں لے کر واپس مل چکی تھی۔

سواپاچ بچے کے قریب میں اپنی جیب پر پنڈی کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ پنڈی پہنچنے تک سردرات کی چار اطراف پھیل چکی تھی۔ میرے دائیں طرف راول ڈیم کی بٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ آری ڈیم کے سامنے سے گزرتا ہوا میں ایوب پارک پہنچا اور یہاں ذرا قریب ہی ایک فاسٹ فوڈ سینٹر کے سامنے جیب روک دی۔ ایک لڑکا میری طرف لپکا۔ میں نے اسے ایک چکن برگر اور کافی کا آرڈر دیا اور بٹ سے پشت لگائے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

وہ پوش علاقہ جہاں ازلی دشمن نظر حیات کے بیٹے کبیر کی کوشی تھی، اس مقام سے زیادہ دور نہ تھا۔ ”سچ بھانا چوک“ سے دائیں جانب پوش علاقے کی حدود شروع ہو چکی تھیں۔ کچھ سوچ کر میں نے لڑکی سے باہر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو بونے ریستورنٹ کے قریب ایک پبلک فون بوتھ نظر آ گیا۔ ابھی دروازہ کھول کر اترنے ہی والا تھا تو وہ نعر لڑکا ایک ٹرے میں برگر اور پلاسٹک کے کپ میں پانی اٹھا کر میری جیب کے پاس آن پہنچا۔ میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اسے تھا کر بات کرنے کا کہا، پھر بولا۔ ”مجھے ایک بے انگ کارڈ لا دو گے؟“

اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تو میں نے سو روپے کا ایک اور نوٹ اسے تھمایا اور ٹرے اس کے لئے لے کر جیب کے بونٹ پر رکھ دی۔ ذرا دیر بعد وہ لڑکا کالنگ کارڈ لئے آ گیا۔ میں نے دس کا نوٹ اور نوٹ ”اجرت خاص“ کے طور پر اسے تھمایا۔ پھر جلدی جلدی برگر چبانے کے بعد کافی ختم کرنے کا غم پری کرنے کے بعد میں ٹیلی فون بوتھ کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اگرچہ میرے پاس اپنا ٹیلی فون بھی تھا لیکن میں اسے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔

بوتھ میں آ کر میں نے نظر حیات کے نمبر بیچ کئے۔ دوسری طرف تیل جاری تھی۔ تیسری تیل پر کسی نے ریسیور اٹھا کر ہلو کہا۔ یہ آواز میرے لئے اجنبی تھی۔

”کبیر سے بات کرنی ہے..... میں اس کا دوست بول رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ وہ شاید کوئی لڑکھلازم تھا، بولا۔

”جی..... چھوٹے صاحب تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ کوئی پیغام ہے تو دے دیں۔ آئیں گے تو لکھنا دوں گا۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جی..... مجھے معلوم نہیں۔“ وہ بولا تو میں نے کسی خیال کے تحت فوراً کہا۔

”چھا..... ان کے ڈیڑی گھر پر ہیں؟“

”نہیں جی..... وہ تو اسلام آباد گئے ہوئے ہیں؟“

”کب تک واپس آئیں گے؟“

”کون جی؟..... بڑے صاحب یا چھوٹے صاحب؟“

”بڑے صاحب کے بارے میں بتاؤ پہلے۔“

”وہ تو جی کل ہی آئیں گے۔ صبح سویرے۔“

”اور چھوٹے صاحب؟“

”وہ تو اپنے کسی دوست کی شادی پر گئے ہیں۔ دیر بھی ہو سکتی ہے۔“

بحال ہی رہتا چاہئے۔“

”انشاء اللہ.....!“ میں نے زیر لب کہا۔

\*\*\*

حالات کسی حد تک معمول پر آئے۔ دل کو دل سے یارا ہوا تو کوئی پیارا یاد آنے لگا۔ لیس ”پیارے“ کی یاد نے ہی دل بے قرار کو سوس کر رکھ دیا۔

نگینہ میری پہلی اور آخری چاہت..... میری محبت، میرے دل کا اول و آخری جذبہ۔ نگینہ نے میری روح تک کو بھی تڑپا کر رکھ دیا۔ دل بے چین کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے فون کیا۔

میں اس وقت اپنے آفس میں موجود تھا۔ باہر گلابی جازوں کی خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ نگینہ گھر کے نمبر بیچ کرنے کے بعد میں دوسری طرف سے کسی کے ریسیور اٹھانے کا منتظر رہا۔ دوسری طرف سے ابھرنے والی ہرنیل پر میرا دل بے اختیار دھڑک اٹھتا تھا۔ معا کسی نے ریسیور اٹھایا۔ میرا دل بے زک گیا۔

”ہیلو.....!“ وہی آواز جو کانوں میں رس گھولتی تھی، دل و دماغ میں الوہی محبت کے سارے تھی۔ یہ نگینہ کی مدھر آواز تھی۔

میں نے بہ مشکل ایک گہری ہمکاری خارج کر کے دل کی دھڑکنوں کو بحال کیا اور پھر جیسے میرے دل سے آواز ابھری۔

”نگینہ.....!“

”آپ کون.....؟“ نگینہ کی قدرے چوکتی ہوئی آواز ابھری اور گویا میرا دل کٹنے لگا۔ یہ کب کی اجنبیت تھی؟ کہاں تو میری ایک آواز پر نگینہ کی آواز میں محبت بھری حلاوت کے گلاب گل اٹھتے تھے۔

آج تو جیسے اس کی آواز بے اعتنا میں لقمہ و دق صحرا آباد تھا۔

”نگینہ!..... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم..... تم مجھے نہیں پہچان رہی ہو؟ اپنے تار کو؟“ میں نے زخمی دل کے ساتھ بچھے لہجے میں کہا تو وہ بیزار سی بولی۔

”اوہو، بھی آپ آخر کون پاگل ہیں؟..... بلاوجہ ہی گلے پڑ رہے ہیں۔“

”ہاں..... میں پاگل ہی تو ہوں۔“ میں نے ٹوٹے دل سے کہا۔ ”پلیز نگینہ! مجھے پہچانو۔“

تمہارے ساتھ ایسا کیا ہو گیا ہے کہ تم مجھے.....“ میری آواز ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ دوسری طرف سے نگینہ نے شاید ریسیور رکھ دیا تھا۔ رابطہ منقطع ہوتے ہی میرا دل جیسے کسی نے مٹی میں لے لیا۔ مجھے اپنا گھٹنا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے ریسیور رکھا اور اپنا سر پکڑ لیا۔ میں نے چند گہری گہری سانسیں لے کر خود

پُرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہوئے باریک بینی سے سوچا۔

نگینہ کو آخر کیا ہو گیا تھا؟..... یہ کیا اسرار تھا؟..... آخر یہ سب کیا تھا؟..... اتنا تو مجھے

معلوم تھا کہ یہ سب جو کچھ بھی تھا نگینہ کے کش پور جانے کے بعد ہوا تھا۔ میں نے اسے وہاں سے واپس

پر کبیر کی جیب میں نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تھا۔ آخر ان دونوں خبیث شیطانوں نے اس کے ساتھ ایسا کیا، کیا تھا؟..... یہ سب کچھ اب مجھے کبیر ہی بتا سکتا تھا اور صرف ایک ہی طرح بتا سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہی میں اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں غیظ و غضب کے عالم میں پھینچنے لگا جیسے کبیر کی گردن دہانہ

ہوں۔ میں نے فوری طور پر راولپنڈی کا قصد کیا۔

کش پور والی مہم کے دوران چونکہ جیب کا انجر پنجر ایک ہو چکا تھا اس لئے میں نے اسے

”اچھا ٹھیک ہے..... شکریہ!“ یہ کہہ کر میں نے جلدی سے رابطہ منقطع کر کے ریسور ہیک پر لوٹا۔ اور باہر نکل گیا۔ کبیر پر ہاتھ ڈالنے کا یہ بہت سنہری موقع تھا۔ میں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا سوچا اور اپنی جیب میں سوار ہو گیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ منج بھاننا چکر سے میں دائیں جانب مڑا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ چند بلاک چھوڑ کر میں نے جیب نظر حیات کے وسیع و عریض کوٹھی نما بیٹنگ کے آہنی گیٹ کے سامنے روک دی جس کے عکسائی ستونوں پر دو دریا گلوب کی روشنی کے علاوہ وہاں مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ آس پاس ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ اطراف کے بنگلوں کے چند کمنوں کو میں نے واک کرتے دیکھا۔ میں جیب سے نیچے اتر آیا اور آگے بڑھ کر کال تیل کے پٹن پر اُلٹی رہ دی۔ ذرا در بعد ایک چرخ سے شخص نے ذیلی گیٹ کھول کر جھانکا۔ میں نے اس سے پہلے قرب و جوار میں کسی ذی نفس کی غیر موجودگی کا اطمینان کرتے ہی اپنی جیب سے بھاری دستے والا میگارد نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ لہذا جیسے ہی اس نے اپنا سر باہر نکال کر مجھے پہچاننے یا دیکھنے کی کوشش کی، میں نے اس کی ”صحت“ دیکھتے ہوئے ذرا ”ہولا“ ہاتھ رکھ کر آہنی دستے سے اس کی کپٹنی پر وار کیا اور اس کے طق سے ”اوغ“ کی مخصوص آواز نکلی اور وہ اندر پختہ روش پر گرا۔

اس کے اٹنا غفلت ہوتے ہی میں اندر داخل ہو گیا۔ ذیلی دروازہ بند کر دیا۔ ملازم بے سدھ پڑا تھا۔ میں نے عکائی نظروں سے قرب و جوار میں دیکھا۔ پختہ روش کے دو اطراف لان تھا جہاں ذرا ذرا فاصلوں پر الیکٹریک پائپوں کے بنے پول نصب تھے جن پر نصب کچھ گلوب روشن تھے۔ پورٹیکو ویران تھا۔ ملازم کے سوا شاید اور کوئی اندر موجود نہ تھا اور فون ریسو بھی اس نے ہی کیا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے بے سدھ ملازم کو کاٹھ سے پر ڈالا اور مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ ظاہر ہے اندر سے کھلا ہوا تھا۔ میں اسے آہستگی سے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ سامنے شاہانہ طرز کی نشست گاہ تھی۔ بنگلہ ویران تھا۔ میں نے سب سے پہلے بے ہوش ملازم کو ایک صوفے پر ڈالا اور جتنی جلدی مختلف کمروں میں جھانک کر ”کسی دوسرے“ کی موجودگی کی تسلی کر سکتا تھا، وہ میں نے فوراً کر ڈالی۔ اس کے بعد نالون کی ایک مضبوط ڈوری نمارتی تالار کے میں نے بے ہوش ملازم کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ میں پکڑا ٹھوس کر اسے ایک تاریک کمرے کے انچ بابتھ روم میں لے جا کر بند کر دیا۔ میں ذرا ستانے کے لئے صوفے پر بیٹھا۔ پھر اٹھ کر گیٹ کے قریب آیا۔ گیٹ کے اندرونی ستونوں پر نصب ایک الیکٹریک ریوٹ کنٹرول سسٹم دیکھ کر حان گیا کہ بنگلے کا کوئی بھی کمین (جن کے پاس ریوٹ کنٹرول موجود ہو، باہر سے ہی کار میں بیٹھے بیٹھے گیٹ کھول کر یا آسانی اندر داخل ہو سکتا تھا۔ لیکن مجھے بہر حال خود ہاتھوں سے گیٹ کھولنا پڑا۔ پھر اپنی جیب میں سوار ہو کر میں جیب اندر لے آیا۔

اندر لا کر میں نے جیب اس طرح دیوار کی آڑ میں کھڑی کی کہ باہر سے آنے والے کی اس پر نورا نگاہ نہ پڑ سکے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں بڑے آرام سے اتر کر دوبارہ اندر نشست گاہ میں آ کر بیٹھ گیا۔

اب میں اپنے ”شکار“ (کبیر) کا منتظر تھا۔ میرے لئے میدان صاف تھا۔ یہ قول ملازم کے نظر حیات تو اسلام آباد دفعتان ہو چکا تھا اور اس کی آمد صبح سے پہلے ممکن نہ تھی۔ جبکہ کبیر اپنے کسی دوست کی شادی اٹینڈ کرنے گیا ہوا تھا۔ نائٹ فنکشن تھا، اس لئے اس کی واپسی دیر سے ہو سکتی تھی۔ میں نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے رست و اوج میں وقت دیکھا۔ دس بجتے والے تھے۔ تاہم مجھے اندازہ تھا کہ اس کی واپسی میں ابھی بہت وقت باقی تھا۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ وہ نہ آیا تب مشکل ہو سکتی تھی۔ یہ سنہری موقع

نکل جانے کا بھی زیاں ہوتا۔ ماں الگ میرے لئے پریشان ہو رہی ہوتی۔ ویسے تو نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں اپنے کسی دوست کی دعوت پر ہوں اور دیر ہو سکتی ہے، فون کر دوں گا۔ لہذا بارہ بج گئے تو ماں سے تیل پر رابطہ کرنے ہی والا تھا کہ اچانک سیل فون کی بیل گنگنائی۔ ماں نے کہا تھا۔

”میں نے تیل کان سے لگا کر کہا۔“ بیلو ماں! تو پریشان ہوگی۔“

”ہاں میرے لعل تو کہاں ہے؟..... ابھی تک آیا کیوں نہیں؟“ ماں کے لہجے سے گہری فکر مندی رہی تھی۔

”ماں! میں جہاں بھی ہوں، بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تو میری فکر نہ کر۔ میں اپنے دوست ہاں ہوں۔ شاید کل ہی آؤں۔“

”ماں سے جھوٹ بولتا ہے..... مجھے تیرے لہجے سے سرت کی بو آرہی ہے جیسے تو اس وقت دشمنوں کے سینے پر بیٹھا سوگند دل رہا ہو۔“ ماں نے عجیب پُر جوش لہجے میں کہا تو مجھے ماں کی زود ہجرت ہوئی۔ تاہم میں نے بھی مسکرا کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

”ہاں ماں!..... بس ایسا ہی کچھ ہے۔ میں دشمنوں کی نیندیں حرام کرنے میں مگن ہوں۔“

”ہاں! میرے لعل!..... اپنا خیال بھی رکھنا۔“ ماں نے متا بھری حلاوت سے کہا۔

”تو بے فکر رہ ماں! میں نے ایک بہادر ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ میری تو جائے پیدائش بھی ماں جگہ رہی ہے، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ اچھا پھر.....“

”ٹھیک ہے میرے بچے! اللہ تیرا حامی و ناصر ہو۔“ ماں نے کہا اور میں نے سیل فون آف کر کے یہی رکھ لیا۔

جب رات کے بارہ بج گئے تو میری بے چینی میں اضافہ ہونے لگا۔ میں اب مایوس سا ہو گیا تھا۔ میں ابھی جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے کبیر کے خلاف بڑی کامیابی کے ساتھ جال بٹانا جو رانچاں جانا نظر آ رہا تھا۔ جب بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تو اچانک ٹیلی فون کی کھنٹی بجی۔

میں بڑی طرح بدک گیا۔ ٹیلی فون سیٹ میرے دائیں جانب ایک فینسی اسٹینڈ پر دھرا ہوا تھا۔ دوسری ٹال گنگنائی۔ دم بے خود سناٹے اور اعصاب شکن خاموشی میں ٹیلی فون کی ہر بار بجنے والی بیل دھماکے کی مانند میرے دل و دماغ میں گونج رہی تھی۔

میں شش و پنج میں تھا۔ بالآخر میں نے ذرا کھسک کر صوفے پر بیٹھے بیٹھے ریسور اٹھا کر کان سے لگایا۔

”سور! ڈیڈی تو نہیں آئے اب تک؟“ میں فوراً سمجھ گیا، وہ ملازم قسمو تھا جسے میں نے بے ہوش سنے کے بعد رن بستہ حالت میں دوسرے کمرے کے انچ بابتھ میں بند کر دیا تھا۔ بہر طور میں نے اپنی کار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی آواز بدل کر مختصر آ کہنے کی کوشش کی۔

”جی جی چھوٹے صاحب! وہ تو صبح ہی آئیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے؟“ اس نے قدرے چونک کر پوچھا۔ میں نے اپنے وجود کے پُر جوش ہونے کا پوچھا۔

”جی جی! ٹھنڈا گرم پی لیا تھا اس لئے..... آواز ذرا بیٹھ گئی ہے۔“

”اٹھنا ندیوں والی عادت نہیں چھوڑو گے۔“ وہ بولا۔ ”اچھا سنو! تم گیٹ کو آٹوٹیک لاک کر کے

اور پھر میں نے نہایت آہستگی کے ساتھ اپنا سیل فون نکال لیا۔ اس میں مووی کیرا بھی تھا۔ کسی اچانک خیال کے تحت میں نے ان کی مووی بنانا شروع کر دی۔  
”میڈم!..... آج تو دل کھول کر پیار کروں گا میں تمہیں۔ بالکل فری اسٹائل!“ کیرا کی لڑکھاتی آواز ابھری۔

”اچھا!..... اتنا پیار کرتے ہو مجھ سے؟“ میڈم نما اس عورت نے اٹھلا کر کہا۔  
”ہاں میڈم!..... بہت زیادہ..... گھر میں ہمارے سوا کوئی نہیں۔“ کیرا کی ہانپتی ہوئی پڑھوس آواز ابھری۔ اس نے عورت کو خود سے ذرا پرے دھکیلا مگر اس کی ساڑھی کا پلو پکڑ لیا۔ عورت بھی ترنگ بن گئی۔ وہ کمرے کے وسط میں نیچے قالین پر گھول گھومتی چلی گئی اور ساڑھی اس کے بھرے بدن سے کھلتی چلی گئی۔ کیرا اس کے نیم عریاں، بھرے بھرے گداز جسم کو بڑی ہوس ناک نظروں سے دیکھنے جا رہا تھا۔ ہر وہ اسے جھپٹنے کے لئے بڑھا۔ مگر وہ عورت کھلتی لمبی کے ساتھ اس کی پہنچ سے دور ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرس تھا۔ وہ ہنستی ہوئی بھاگ کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی اور دروازہ بند کر دیا۔  
”پلیز میڈم! مجھے اتنا مت ترپاؤ۔ نکلو باہر۔“

کیرا نے دروازہ پینٹے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو اندر سے عورت کی کھٹکتی ہوئی آواز ابھری۔  
”دراغبر جاؤ..... میں پوری تیاری کے ساتھ باہر آتی ہوں۔“  
میں صرف خاص خاص ”پوز“ کے مناظر قید کرنا چاہتا تھا لہذا اس عورت کے باہر نکلنے کا خطرہ تھا۔  
تھوڑی دیر بعد وہ عورت نکلتی تو اسے دیکھ کر میرے دل میں بڑی ہلچل ہونے لگی۔ میں نے ایک بار ہر مووی ریکارڈنگ آن کر دی۔

کیرا نے اسے دبوچ لیا۔ میں دل کڑا کر کے ان کی یہ شرم ناک مووی ریکارڈ کرنا رہا۔ پھر ذرا دیر بعد وہ دونوں ہانپتے ہوئے صوفے پر جا بیٹھے تھے۔ کیرا نے ان کے بالوں کی آوارہ لٹ سے کھیلنے ہوئے کہا۔ ”کہو تو چھوڑ آؤں تمہیں؟“ وہ اب شرم سیر جانور کی طرح نظر آ رہا تھا۔  
”کیوں..... اتنی جلدی بیزار ہو گئے؟“ عورت نے تھکے تھکے لہجے میں شکوہ کیا۔  
”نہیں تو..... مجھے تمہارے شوہر کی فکر ہو رہی تھی۔“ کیرا نے جیسے بات بنائی۔  
”وہ بوڑھا تو اب تک نیند کی گولیاں کھا کر سو چکا ہو گا۔“ عورت نے بیزار سے کہا۔  
”تو کیا صبح جانے کا ارادہ ہے؟“

”ہاں..... پوچھنے چلی جاؤں گی۔“  
”اے نہیں بابا! سچ تو ڈیڈی آن دھمکیں گے..... اور ملازم بھی آ جائیں گے۔ چلو، میں تمہیں چھوڑتا ہوں۔“

”ہاں..... ذرا تھکن اتار لوں۔“ عورت نے کہا پھر ذرا سستانے کے بعد وہ اپنی ساڑھی پہننے لگی۔  
”اس لڑکی کا کیا بنا جس سے تم شادی کرنا چاہتے تھے؟..... کیا نام بتایا تھا..... ہاں، یاد آیا، ”دھ“ عورت ساڑھی پہننے کے دوران کیرا سے بولی۔ گیند کے ذکر پر میرے کان یکدم کھڑے ہو گئے۔ کیرا جواباً مسکرا کر بولا۔

”ہاں..... ہماری عقیب معنی ہونے والی ہے اور جلد شادی بھی متوقع ہے۔“  
کیرا کی بات پر میرے اندر زلزلے سے ابھرنے لگے۔  
”مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ مان کے ہی نہیں دے رہی تھی۔“ اس نے آخر میں ساڑھی کا پلو درست

چلے جاؤ۔ مجھے آنے میں ذرا دیر ہو جائے گی۔“  
جواباً میں نے جی اچھا کہا تو دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔  
میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اس کے فون سے یہی اندازہ ہوتا تھا اس نے دیر سویر ضرور آنا تھا۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس نے ہمسو کو چلے جانے کا کیا کہا تھا؟

میں زیادہ دیر نہیں سوچ سکا اور خود کو پڑ سکون کرنے کے لئے میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنا صوفے کی پشت سے نکلا دیا اور آنکھیں موند لیں۔  
ٹھیک ایک بجے باہر مجھے کسی گاڑی کے انجن کی گھر گھر اہٹ سنائی دی۔ میں بری طرح چونکا اور کمرے صوفے سے اتر آ۔ دروازے کی طرف دوڑا اور باہر نکلنے کی بجائے اس کی متوازی جھری سے اپنی ایک آنکھ چپکا دی۔

میں نے دیکھا، آہنی گیٹ کے دونوں پٹ دھیرے دھیرے خود کار انداز میں وا ہو رہے تھے۔ اور ایک کار میں نے اندر داخل ہوتے دیکھی۔ میرا دل جیسے سانس سانس کرتی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ کار کی اگلی نشست پر مجھے کیرا بٹھا نظر آیا۔ مگر اس کے ہمراہ ایک خوبصورت بھی براجمان تھی۔ ظاہر ہے وہ میرے لئے اجنبی ہی رہی ہوگی۔ میں کیرا کے تنہا آنے کی توقع کئے بیٹھا تھا مگر ایک عورت کو دیکھ کر میں اُلجھ گیا۔ میں نے دونوں کو کار سے اترتے دیکھا۔ میں نے عورت کو یہ غور دیکھا۔ وہ مجھے ”آئی“ نام کی عورت نظر آ رہی تھی۔ عراس کی پینتیس چالیس کے قریب ہی نظر آتی تھی۔ اس نے بڑی زرق برق سیاہ رنگ کی کادار ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بغیر آستینوں کا بلاؤز بھی اسی رنگ کا تھا جو اس کے گورے اور بھرے بھرے جسم پر بہت فٹ رہا تھا۔ اس نے بیش قیمت چوڑی پہن رکھی تھی۔ گھنے بالوں کا جوڑا بنا کر سیاہ مہین جالی میں فرینے سے لپیٹ رکھا تھا۔ پیروں میں اونچی پٹیل ہیل والے سینڈل تھے۔ چہرے کے نقش مونے مگر جاذب نظر تھے۔ اس نے واقعی اپنی سچ دھج میں ”ایزی چونی“ کا زور لگا رکھا تھا۔ خاص فیشن اہل اور المٹا ماڈرن نظر آ رہی تھی۔ اس عورت کو دیکھ کر میں سب سے پہلے یہی سمجھا تھا کہ وہ اس کی کوئی دور پرے کی رشتہ میں آئی لگتی ہوگی۔ لیکن اس وقت میرا دماغ بھک سے اڑ گیا، جب کار اترتے ہی وہ نئے نئے نویلے جوش بھرے نوجوان کی طرح ایک دوسرے سے لپٹ کر بوس و کنار میں مصروف ہو گئے۔ وہ کیرا سے پندرہ بیس سال بڑی ہی تھی۔ بلکہ دونوں ماں بیٹی ہی نظر آتے تھے۔

میں نے ان پر لعنت بھیجی۔ وہ آپس میں ذرا دیر کی ”بے قرار“ آنکھیلیوں کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے مرکز کی دروازے کی طرف بڑھے تو مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا۔ دونوں پیٹے ہوئے اور نشے میں بری طرح دھت تھے۔

میں ایک دم دروازے سے ہٹ گیا۔ میں چھپنے کے لئے پہلے ہی ایک جگہ منتخب کر چکا تھا۔ چنانچہ کی سی تیزی کے ساتھ مذکورہ گوشے کی طرف لپکا۔ یہ خفیہ گوشہ لمبے چوڑے ریفریجریٹر اور 41 اینچ پروجیکشن ٹی وی کے عقب میں تھا۔ یہاں فلاور وال بھی تھی اور مصنوعی پھولوں کے تختے بھی تھے۔ ایک عجیب بھرے چنگھاڑتے ہوئے تیندوے کا مجسمہ بھی تھا۔

اب میں وہاں دم سادھے بیٹھ گیا۔ میری ٹھکی ہوئی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر دروازہ اور دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، بدست قہقہے لگاتے اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کو باہم پیوست کر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔

کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... پہلے تو یہ بل منڈھے نہیں چڑھ رہی تھی۔“ وہ بتانے لگا اور میں سائیں سائیں کرتی بہاتوں کے ساتھ ہنسنے لگی۔  
”مگر پھر میں نے..... ایک ایسا چکر چلایا کہ..... وہ بے چاری اپنے عاشق نامراد کو ہی دل سے نکال بیٹھی۔“

”اچھا..... ایسا کیا چکر چلایا تم نے؟“ عورت ساڑھی پہننے کے بعد اس کے قریب صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

کبیر بھی ہنسنے کی حالت میں تھا، بتانے لگا۔ ”میں اسے اپنے ایک دوست کے ساتھ کش پور لے گیا تھا۔ وہاں ایک عاروب نامی عامل رہتا تھا جو درحقیقت وادی کیلاش سے تعلق رکھتا ہے..... وہ خود کو کیلاشیوں کا روحانی پیشوا بتاتا ہے۔ کش پور میں وہ ایک طویل ریاضت کے سلسلے میں رہتا تھا۔ مگر اس نے میرے ایما پر ایک خاص عمل کے ذریعے برین واش کر ڈالا۔ یوں وہ اپنے محبوب نادر علی کو بالکل فراموش کر بیٹھی۔“

”مگر..... اس طرح تو نکلیہ پھر کسی کو بھی نہیں پہچان پا رہی ہوگی؟ مثلاً اپنے ماما، چچا وغیرہ کو؟“ عورت نے پوچھا۔

”نہیں..... عاروب نامی اس کیلاشی روحانی پیشوا نے اپنے ایک عمل کے ذریعے اس کا Partially برین واش کیا تھا۔ یعنی اس کے دل و دماغ سے صرف اس کے محبوب کی یاد بخور دی گئی تھی۔ جبکہ وہ اپنے چا اور دیگر لوگوں کو اچھی طرح پہچانتی ہے۔“

”اوہ.....“ اس نے مصنوعی تاسف کے اظہار میں سر ہلایا اور بولی۔ ”یہ تو تم نے اس کے عاشق اور اپنے رقیب کے ساتھ بہت سہرا کام کیا ہے..... بلکہ اگر یہ کہوں کہ دونوں کے ساتھ ہی کیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ویسے یہ کیا کوئی جادو ہے؟“

”ارے نہیں.....“ کبیر نے لڑکھاتی آواز میں جواب دیا۔ ”یہ جادو نہیں بلکہ سائنس ہے۔ تحلیل نفسی یا Suggestion کا کھیل بلکہ کارستانی ہے۔“ آخر میں اس کا لہجہ قدرے فخریہ ہو گیا تھا۔

وہ عورت کچھ نہیں بولی۔ محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ چند لمحے خاموش رہی۔ پھر یکایک کبیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ ایک کمرے کی طرف تھا۔

”کہاں چلے؟“ اس کی ساتھی نے بھوین اچکا کر اسے دیکھا۔

جواب میں کبیر نے سیدھے ہاتھ کی چھوٹی انگلی فضا میں بلند کر کے فحش اشارہ کیا اور دروازے کے اندر غائب ہو گیا۔ چند منٹ کے بعد وہ لوٹا تو اس کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ وہ شاید پانی کے چھیننے چہرے پر ہل کر آیا تھا۔

”چلو..... اب میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“ اس نے عورت کو مخاطب کیا تو وہ بھی فوراً صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا نشہ ابھی باقی تھا۔ اس لئے اس کے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ جبکہ کبیر مستحکم قدموں کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں ان دونوں کو جاتا دیکھتا رہا۔ میرا مقصد بغیر ہنگامہ آرائی کے پورا ہو گیا تھا۔ نگینہ کی کیفیت کی وجہ مجھے معلوم ہو گئی تھی۔ نگینہ کے ساتھ ہونے والے عمل کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے جیسے شرارے پھوٹنے لگے تھے۔ وہ دونوں باہر نکل چکے تھے۔ میں نے اپنے منتشر حواس پر بہ مشکل پابو پایا۔ اگرچہ میرا جی تو چاہا؟

غاسی وقت بشیر چہرا اور کالا ناگ کی طرح کبیر کو بھی سفر آخرت پر روانہ کر دوں۔ لیکن کچھ سوچ کر میں نے اس ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔

وہ دونوں باہر نکلے تو میرے ذہن میں ان کے تعاقب کا خیال آیا۔ میں نے اس پر عمل درآمد کا ارادہ کر لیا۔ لہذا جونکی بیرونی دروازہ ان کے عقب میں بند ہوا، میں تیزی سے ان کے پیچھے لپکا۔ دروازے کی جھری سے میں نے دونوں کو کار میں بیٹھے دیکھا اور پھر فوراً ہی وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان کی کار جسے ہی گیٹ سے باہر لگی اور پھر گیٹ سرکنا ہوا دوبارہ بند ہونے لگا، میں ایک زقند لگاتا ہوا باہر نکل آیا۔ میرا رخ اپنی جیب کی طرف تھا۔ چند لمحوں بعد میں اسے اسٹارٹ کر کے مرکزی گیٹ تک لے آیا تھا۔ میں نے اتر کر گیٹ کھولا اور جیب سے باہر نکل کر دوبارہ اندر آیا۔ دروازے کے سسٹم کو آٹو پر کر کے میں باہر آتا اور جیب میں سوار ہو کر بہت دور کار کی سرخ بتی کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ لہذا مجھے بھی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ سڑک سنان تھی اس لئے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ دس منٹ کی ذرا بے گنگ کے بعد اس کی منزل آگئی۔ میں نے وہ مقام اور علاقہ ذہن نشین کر لیا۔ وہ وہاں اس عورت کو چھوڑنے آیا تھا جس کے بعد وہ واپس ہو گیا۔ اب اس کے تعاقب میں جانا فضول تھا۔ لہذا میں مری کی طرف روانہ ہو گیا۔

\*\*\*

سیدہ سحر نمودار ہونے سے پہلے ہی میں گرین لاج پہنچ چکا تھا۔ میں تھکن اتارنے کی غرض سے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ چند لمحوں میں ہی میں گہری نیند میں ڈوب چکا تھا۔ صبح میں دیر سے سوکر اٹھا۔ ناشتہ کر کے میں نے ماں کی خیریت معلوم کی۔ وہ مجھ سے گزشتہ رات کی بابت جاننا جانتی تھیں مگر میں کبیر کی عیاشی کی داستان کس طرح سنا سکتا تھا اس لئے ادھر ادھر کی باتیں کر کے باہر نکل آیا۔ میرا رخ ہال کی طرف تھا۔

نہج مشتاق سیال نے ہال کے سارے معاملات بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سنبھال رکھے تھے۔ میں نے اسے کمرے میں بلا کر چند کاروباری معاملات پر گفت و شنید شروع کر دی۔ باتوں کے دوران اس نے کہا۔ ”صاحب جی! ایک بات کہنی تھی آپ سے۔“

”ہاں کہو..... لیکن یا! مجھے یہ صاحب جی، چھوٹے مالک نہ کہا کرو۔“

”بڑے لوگ..... کہہ دیا کروں جی؟“ وہ ذرا جھجک کر بولا۔

”اس کی بھی ضرورت نہیں..... صرف نادر۔ ہاں اب بولو۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بولا۔

”نادر میاں! میں ہال کی رکھوالی کے حوالے سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔“

”ہاں کہو۔“ میں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے اس وقت دو چوکیدار تو اپنا کام کر رہے ہیں نا۔“

”وہ دونوں بڑے آدمی ہیں جی۔“ اس کی بات پر میں نے اسے گھورا۔ ”مم..... میرا مطلب ہے نادر چھوٹے آدمی ہیں..... بلکہ اصل بات یہ ہے جی کہ وہ تھوڑے آدمی ہیں جی۔ میں ہانتا ہوں..... دو گن مین اور رکھ لیں۔“

اس کی بات پر میں ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے خاموش پا کر وہ بولا۔ ”دیکھیں نا، نادر میاں! پہلے بھی ایک حادثے سے گزر ہی چکے ہیں۔ دشمنی ہماری ختم نہیں ہوئی۔ ہال میں لوہے کا سامان تو ہے نہیں، ہال کی کڑی ہے..... ایک جگہ ہوتی تیلی برابندھن بن سکتی ہے۔ دو چوکیداروں کے ساتھ مسلح افراد کا

بھی موجود ہونا ضروری ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے..... مگر اس کے علاوہ بھی خفاتی انتظامات پر نظر رکھو۔“ میں نے کہا۔  
”بہت بہتر جی۔ وہ بولا۔“

”اچھا سنو..... میں ذرا جا رہا ہوں کہیں۔ دیر بھی ہو سکتی ہے مجھے۔ اور کوئی کام تو نہیں؟“ میں نے آخر میں پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ذرا دیر بعد میں اپنی جیب میں پنڈی کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔

پنڈی پہنچ کر میں نے براہ راست اس عورت کے بنگلے کی طرف رخ کیا جس کے ساتھ گزشتہ روز کبیر رنگ رلیاں مناتا رہا تھا اور جس کی ساری مووی میرے موبائل فون میں محفوظ تھی۔ میں نے مذکورہ بنگلے کے قریب سے گزرتے ہوئے دانستہ جیب آہستہ کی اور گردن موڑ کر نیم پلیٹ پڑھنے لگا۔ نیم پلیٹ پر ”جواد احمد“ کے الفاظ کندہ تھے۔ ”تو گویا یہ عورت..... جواد احمد کی بیوی تھی۔“ میں نے ہونٹ پہنچ کر سوچا۔ اس کے بعد جیب تیزی سے آگے لے گیا اور سڑک کے کنارے جیب روک کر اکنیشن سوئچ آف کر دیا۔ اس کے بعد اپنا سیل فون نکال کر نظر حیات کے نمبر شیچ کرنے لگا۔ مجھے یقین نہ کہ اب تک کبیر احمد نے اپنے ملازم کو کمرے کے اٹیچڈ ہاتھ سے برآمد کر لیا ہوگا۔

دوسری طرف سے کبیر نے ہی ریسور اٹھایا تھا۔ ”ہیلو!“

”ہیلو..... کبیر! میرے رقیب!..... بچانا مجھے؟“ اس کی آواز پہچانتے ہی میں نے استہزائے لہجہ میں کہا تو دوسری طرف جیسے اسے چپ سی لگ گئی۔  
”اتنی جلدی سانپ سوکھ گیا تمہیں؟ ابھی تو بہت سا حساب بے باق ہونا ہے۔“ میں نے اس کی خاموشی سے گویا لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

اس کا سکتا ابھی تک نہیں ٹوٹ سکا تھا۔ میں نے غیظ آلود لہجہ میں کہا۔ ”تم نے اپنے دو کتوں بچہ اور گرجر چوک کے کالاناگ کا انجام دیکھ ہی لیا ہوگا۔ اور ہاں..... تم نے اپنے بیڈ روم کے اٹیچڈ ہاتھ سے اپنے ملازم کو برآمد بھی کر ہی لیا ہوگا۔ بے چارہ..... کل رات سے بند تھا، جب تم اپنی رسیدہ محبوبہ کے ساتھ ”فزی اسٹائل“ رنگ رلیاں منارہے تھے۔“ میں نے دانستہ رات کا ذکر کیا تھا۔ انکشاف نے بھی اس کے اعصاب کو بھرپور جھٹکا دیا۔ یہی سبب تھا کہ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں کئی سی ہکلاہٹ ابھر آئی تھی۔

”تت..... تو..... وہ..... تم تھے؟“

”ہاں..... میں ہی تھا وہ، جو تمہارے ملازم کو اٹیچڈ ہاتھ روم میں بند کرنے کے بعد بڑے آرام سے تمہاری اور تمہاری چیتھی محبوبہ..... آں..... نہیں، بلکہ مسز جواد کی رنگین و سنگین کارگزاری تصویریں اتارتا رہا تھا۔“

”تم..... لگ..... کیا کہہ رہے ہو؟“ اس کی بوکھلائی ہوئی آواز سن کر میرے پر زہر جی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”نہیں..... میں تو یونہی تم سے مذاق کر رہا ہوں۔ میں نے تو وہ بھی نہیں سنا جو تم نے کئی عرصہ میں اپنی چیتھی میڈم کو کیلاشی عامل عاروب کے بارے میں بتا رہے تھے، جس سے تم نے نگینہ کی برین واشنگ کا کردہ اور گھناؤنا کام کرایا تھا۔“ میں نے تاؤ دلانے والے انداز میں کہا اور تصویر نے میں اسے اسے سر کے بال نوچتے ہوئے دیکھنے لگا۔ میں بھی جیسے اسے شاک پر شاک پہنچانے پر تیار تھا۔

”ہاں! میرے رقیب! معاف کرنا..... میں نے تمہارے میڈم کے ساتھ گزارے ہوئے خوب

پورے لمحوں کی عکاس تصویریں بھی تیار کر لی ہیں۔ اب ان کا مصرف سوچ رہا ہوں۔ ایک خیال تو یہ ہے کہ انہیں ایسی تصویریں چھاپنے والے بدنام اخبارات کو دے دوں جو انہیں شاندار انداز میں شائع کریں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تصویریں نگینہ اور اس کے باپ کو بھجوا دوں تاکہ وہ تمہارے کروتات اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں..... ایک خیال یہ بھی ہے کہ انہیں جواد کو بھجوا دوں۔ وہ اپنی بے وفاء، رنگین مزاج ہونے کے ساتھ تمہیں بھی جہنم واصل کر دے گا۔“

”تت..... تم..... کیا چاہتے ہو؟“ میرا جملہ مکمل ہوتے ہی اس کی لرزیدہ آواز ریسور میں ابھری۔ وہ اگر ہارٹ کا مریض ہوتا تو یقیناً ان باتوں سے اسے زبردست ایک ہو چکا ہوتا اب وہ میرے ہاتھ کی بات اپنی زبان پر لایا تو میں نے خونخوار غراہٹ سے کہا۔

”صرف دو باتیں..... نگینہ کی مجبوری سے کھیلنے کا خیال بھی اپنے دل میں لانے کی جرأت نہ کرنا۔“  
”اب تم مجھے یہ تاؤ گے کہ نگینہ کی یادداشت کی بحالی کس طرح ممکن ہو سکے گی؟“ میں اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔

دوسری جانب چند لمحے گہری اور پُرسوج خاموشی طاری رہی۔ پھر اس کے بعد ایک گہری ہکاری کی آواز ابھری اور وہ بولا۔

”ناڈرلی!..... شاید تم نے میدان مار لیا۔“

اس کی آواز میں اگرچہ شکست خوردگی تھی لیکن مجھے اس میں کینٹھلی بدلنے والے سانپ کی سی ہکاری کی لگاؤ آنے لگی جو شکار کو لگنے کے لئے دم سادھے پھن کینز کرمٹی میں منہ رکھ دیتا ہے۔

”کام کی بات کرو..... ابھی ایسے بہت میدان کھلے پڑے ہیں۔“ میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔  
”ہاں..... مجھے منظور ہے۔“ اس کی آواز میں واضح طور پر لرزش تھی۔ کہاں تو وہ میری آواز سننے کی غارش زدہ کتے کی طرح بھونکن شروع کر دیتا تھا اور آج اس کے لبوں سے آواز تک نہیں نکل پائی۔

”اب آئے ہو تم پہاڑ کے نیچے۔“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ پھر لہجہ بدل کر گہری سنجیدگی سے کہا۔  
”میں ان سب میں سے کچھ بھی نہیں کروں گا۔ تم صرف نگینہ کی جان چھوڑو اور اس پر کئے گئے اپنے گناہ کو ہٹانے کا بندوبست کرو۔“

”م..... میں.....“ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ ”اچھا..... اچھا ٹھیک ہے۔“ شاید اسے یاد آیا تھا کہ اس کی آنا کافی اس کے لئے کس قدر بھیا تک ثابت ہو سکتی تھی۔ ”م..... مگر مجھے اس کے شواہد نگینہ کو وادی کیلاش لے جانا پڑے گا۔ کیونکہ وہ عامل وہیں رہتا ہے۔ وہی اس کا علاج کر سکے گا۔“  
”کیوں..... وادی کیلاش کیوں؟“ میں نے غرا کر کہا۔ ”اس کی ذہنی حالت تباہ کرنے کے لئے تم نے اس کو پورے کر گئے تھے۔ اب اس کی بحالی کے لئے تم مجھے وادی کیلاش کی کہانی سنا رہے ہو؟“

”تم یقین کرو، میں سچ بول رہا ہوں۔“ میری غراہٹ کے جواب میں اس کی گھگھائی ہوئی آواز ابھری۔ ”عامل عاروب اپنی طویل ریاضت کے بعد واپس کیلاش چا چکا ہے۔ اب اس سے وہیں ملاقات کرو۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہوا، پھر ذرا ہچکچاتا ہوا دوبارہ بولا۔ ”نگینہ چونکہ تمہیں پہچان رہی ہے اس لئے میرے کہنے پر وہ گھومنے پھرنے کے بہانے تیار ہو سکتی ہے۔ پھر وہاں



گلر نہایت پرکشش تھا۔

”بیٹھو.....“ میرے قریب پہنچنے پر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس کی تیز نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”ہاں..... اب کہو، کیا کہنا چاہتے تھے مجھ سے؟“ میرے نشست سنبھالتے ہی اس نے بائیں راست گفتگو کا آغاز کرنا چاہا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس وقت وہ ملازمہ ہمارے قریب کھڑی تھی جو صدر دروازے سے لے کر اس تک لائی تھی۔ میرے اندازے سے وہ ملازمہ کم اور مسز جواد کی راست سبیلی زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔ یہ لمبائی تجزیہ تھا جو میں نے بیٹھتے بیٹھتے کر لیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی موجودگی میں مطلب کی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ملازمہ کی طرف دیکھا اور مسز جواد پر نگاہوں کا مفہوم بھانپ گئی۔ اس نے سر کی خفیف حرکت سے ملازمہ کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ مؤدبانہ انداز میں روانہ ہو گئی۔

میں نے ہولے سے کھٹکھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”آپ کے شوہر کیا کر رہے ہیں؟..... اور وہ اس وقت کہاں ہیں؟“

وہ پہلے ہی میری طرف سے ایک اضطراب آمیز پریشانی میں مبتلا تھی۔ میرے اس سوال نے اسے مزید کھولا دیا۔ وہ چڑ کر بولی۔ ”تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔“

”مگر مجھے اس سے غرض ہے..... کیونکہ میں دیکھنا چاہتا ہوں، آخر کبیر جیسے امیر کبیر بابے بیٹے نے آپ کو بلیک میل کرنے کا کیوں سوچا؟..... شاید وہ آپ کو موٹی آسامی سمجھتا ہے اس لیے میں پر اسرار انداز میں دھیرے دھیرے بولا تو وہ بری طرح چونک اٹھی۔

”بلیک میل؟..... اور وہ بھی کبیر مجھے کرنا چاہتا ہے؟“

”جی ہاں.....“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور نہایت راز دارانہ لہجے میں مزید بولا۔

”اس نے آپ کی غیر اخلاقی اور شرم ناک تصاویر تیار کرائی ہیں۔“

میرے الفاظ نے گویا بم دھماکا کیا۔ وہ اپنی نشست پر اچھل پڑی۔ تھی۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر زردی نظر آئی۔ دوسرے ہی لمحے وہاں پر بھیگی سرخی نظر آنے لگی۔

”کیا کو اس ہے؟..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے مسکراتی نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ کوئی جواب نہ پا کر شاید مزید جھٹلا گئی مگر اس کا دوسرا سوال نہایت معقول تھا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ اس سوال نے بتا دیا کہ وہ اس معاملے میں پوری طرح دلچسپی لے رہی تھی۔

”اس نے مجھے خود بتایا ہے۔“ میں نے سرسرائی ہوئی آواز میں کہا تو اس کے چہرے پر بے یقینی نظر آئی۔

”آپ یقیناً گزشتہ شب اس کے ساتھ تھیں، تب اس نے خفیہ گیرے کی مدد سے عریاں تصاویر بند کی ہیں۔ میں اس کا گہرا دوست ہوں اس لیے اس نے اس کا نام سے نہایت خفیہ انداز میں آگاہ کر کے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ان کی مدد سے آپ کو بلیک میل کرے گا۔“

”میں ابھی اس سے بات کر کے کسفرم کرتی ہوں۔“ اس نے منمنائی ہوئی آواز میں کہا اور قریب آ کر دوسری کرسی پر موجود اپنے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ وہ تمام تصویروں مع ٹیکٹو میرے پاس ہیں۔ میں نے دوست کی بات میں جھرا گھونٹ کر یہ کام کر لیا ہے۔“

اس کا بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ میری بات ختم ہوئی تو وہ نفرت انگیز نظر سے مجھے گھورنے لگی۔

”تو گویا اب تم مجھے بلیک میل کرو گے؟“

”ہرگز نہیں محترمہ!“ میں نے ٹھوس لہجے میں اس کے پریشان حال چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کبیر کی یہ حرکت انتہائی غیر اخلاقی اور مکروہ محسوس ہوئی تھی اسی لیے میرے ضمیر نے گوارا دیا کہ وہ ان سے کوئی فائدہ اٹھائے۔ اور ویسے اگر مجھے آپ کو بلیک میل کرنا مقصود ہوتا تو میں آپ کو یہ باتانے کی بجائے آپ سے موٹی رقم کا مطالبہ کر رہا ہوتا۔“

میری اس بات پر مسز جواد کے چہرے پر ایک تاثر اُبھرا۔ اپنی عریاں تصاویر کے ذکر پر بھی اس کا چہرہ رام سے سرخ ہو رہا تھا۔

”لاؤ پھر..... وہ ٹیکٹو اور تصاویر میرے حوالے کر دو۔“ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔

”بالکل۔ میں وہ آپ کے حوالے کر دوں گا۔ لیکن ایک شرط پر۔“ میں نے اس کے اب سرخ پڑتے

رہے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

”کیسی شرط.....؟“ اس کی نگاہوں میں شک کی پرچھائیاں لہرائے لگیں۔

”آپ کے چہرے پر جو شرم کی سرخی ہے، اس سے بڑھ کر ایک مشرقی عورت کا کوئی زیور نہیں ہوتا۔ پ اپنی اس شرم کی قسم کھا کر وعدہ کریں کہ آئندہ آپ اپنے نفس پر کنٹرول رکھیں گی۔ اپنے شوہر سے باہمی کی حرکت نہیں ہوں گی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اور اپنی گفتگو کا اثر دیکھنے کے لیے اس کے چہرے پر نگاہوں کو مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

وہ شاید سمجھی تھی کہ میرا وعدہ میرے کسی ذاتی لالچ پر مبنی ہوگا۔ مگر میری اس فرمائش پر وہ ہکا بکا رہ گئی۔

”اس کے چہرے اور آنکھوں میں میرے لئے تشکر اور احترام کی جھلک اُبھری۔ لمبائی تو قف کے بعد وہ لب انداز میں بولی۔

”آپ کو میرے وعدے پر کس طرح یقین آئے گا؟“ یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پر پہلی بار ہلکی سی لکڑاٹ اُبھری تھی۔ ”ممکن ہے کہ آپ سے ٹیکٹو اور تصاویر لینے کے بعد میں پھر اسی روش پر چل نکلوں۔“

”سورج کہاں سے طلوع ہوتا ہے؟“ میں نے اچانک اس سے پوچھا۔

”مشرق سے۔“ اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی جھلک اُبھری۔

”پورا یقین ہے آپ کو؟“

”ہاں۔“

”بس..... تو سمجھیں مجھے بھی آپ کے وعدے پر اتنا ہی کامل یقین ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ اندر آپ نہیں، آپ کے اندر کی عورت گرے گی، جو اس وقت احساسِ ندامت کی سرخی بن کر آپ کے

سے عیاں ہو رہی ہے۔“

میری اس بات پر اچانک ہی مسز جواد کی آنکھیں جھلک پڑیں۔

”میں نے کہا نا..... آپ کے اندر کی عورت ابھی زندہ ہے۔ پلیز، اسے زندہ رہنے دیں۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر رخساروں پر بہنے لگے تھے۔ اس نے

ہٹالیا۔ پھر کچھ دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”آپ نیک دل انسان معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم میں آپ کی خواہش شاید پوری نہ کر سکوں گی۔“ اس نے

”بلیک میل میں کہا اور اس کی صورت کھٹنے لگا۔ ”کبیر کی حد تک تو میں آپ کی بات مان لیتی



باری دولت میری ہے جو میرا پاپ میرے لئے چھوڑ کر مرا تھا۔“ اس کے چہرے کی سرخی کا سبب میری

”میرا حال.....“ میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے اس کے حال پر پہچاننے کا فیصلہ کیا تھا۔ ”یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ میری خواہش تھی کہ آپ محض اپنے نفس کی غلام نہ بنیں، لیکن شاید.....“ میں کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

بکیرے کوئی تعلق نہیں رکھوں گی۔ اور مجھے یہ بھی توقع ہے کہ آپ وہ تصاویر میرے خلاف استعمال نہیں کریں گے۔“

نہیں کریں گے۔  
 ”ہرگز نہیں۔“ میں نے اسے یقین دلانے کے انداز میں جواب دیا۔ ”میں وہ تمام چیزیں آپ کو  
 دے دوں گا۔“

اسے دہلا گا۔  
 ”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولی۔ ”آپ انہیں خود ہی ضائع کر  
 دیں۔ مجھے آپ پر اعتبار ہونے لگا ہے۔“

”میں اس اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ ”میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہئے۔“

”آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“ یکا یک اسے یاد آیا۔  
 ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے بے پرواہی سے کہا۔ ”آپ اتنا سمجھ لیں کہ پہلے میں کبیر

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے بے پرواہی سے کہا۔ آپ اساتذہ کرام سے پہلے سے یہ بات کہہ رہے تھے۔“



میرے پاس دو دن تھے۔ اگرچہ کبیر کو میں نے چوبیس گھنٹوں کی مہلت دی تھی مگر میں جانتا تھا کہ اس مدت میں اس کے لئے روانگی خاصی مشکل تھی اس لئے اپنے طور پر میں نے اسے دو دن کا وقت دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ میں اس امر سے بھی بہ خوبی واقف تھا کہ وہ میرا دشمن تھا اور دشمن کی کسی بات پر اعتبار کرنا کبھی عقلمندی نہیں ہوتی۔ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر کوئی بھی چال چل سکتا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے حد درجہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ میرا خیال تھا کہ مسز جواد کے ساتھ بنی ہوئی اس کی تصویر اسے کسی احاطہ سے مازر رکھنے میں خاصی مددگار ثابت ہوں گی۔

صوبوں اسے کسی حمایت سے باز رکھنے میں خاصی مددگار ثابت ہوں گی۔  
ایک طرف یہ معاملہ تھا، دوسری طرف مجھے یہ بھی فکر تھی کہ میں اپنی اس آئندہ مہم کے بارے میں ماں  
بوس طرح آگاہ کروں۔ کیونکہ یہ تو طے تھا کہ میں گلگت کو صرف کبیر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔  
مجھے اس کے ساتھ وادی کلاش کا سفر ضرور کرنا تھا۔

مجھے اس کے ساتھ وادی کیلش کا سفر ضرور کرنا تھا۔  
 ماں اگرچہ تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھیں تاہم ایسی حالت میں بھی نہیں تھیں کہ میں انہیں تنہا  
 جوڑ کر کسی نامعلوم سفر پر روانہ ہو سکتا۔ میں اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ماں کو اس  
 بارے میں آگاہ کروں یا نہ کروں۔ مگر اس رات کھانے پر انہوں نے خود ہی نگیلے کا ذکر چھیڑ کر مجھے موقع  
 فراہم کر دیا۔

”بیٹا! تم نے دیکھ لیا نا..... سانپ کی اولاد سانپ ہی ہوتی ہے۔ گنہگار نے پہلے تو تمہاری محبت کے جوش میں آکر بھری عدالت میں اپنے باپ کے خلاف گواہی دے کر کیس ہی پلٹ دیا تھا لیکن بعد

ہوں، کیونکہ اس نے نہایت گھٹیا پن کا ثبوت دیا ہے..... مگر.....“ وہ چپ ہو گئی۔  
 میں اس کے بولنے کا خطر رہا۔ کئی لمحے گزر گئے اور اس کی خاموشی نہ توئی تو میں نے اسے تھام  
 کیا۔ ”مگر کیا.....؟“ میرے لہجے میں خود بخود ہی ہلکی سی جھنجھکی در آئی تھی۔

”اس کا جواب آپ کو ابھی مل جائے گا۔“ یہ کہتے ہی وہ یک لخت اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 اختیاری طور پر میں نے بھی نشست چھوڑ دی۔ اس نے ایک لفظ کہے بغیر اندرونی عمارت کی طرف  
 بڑھا دیئے تھے۔ مجھ پر نہ جانے کون سی رو آئی تھی کہ میں بھی اس کے نقش قدم پر پاؤں آگے بڑھا  
 گیا۔ وہ گویا کسی ٹرانس میں تھی اور میں اس کے انداز کے ٹرانس میں آیا ہوا تھا۔ اس نے پختہ روش

گیا۔ وہ گویا کسی ٹراس میں بیٹھی اور اس کے انداز سے ٹراس میں آیا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک اور پھر چند سبز ہیاں چڑھ کر اندرونی دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازہ کھول کر ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ کوریڈور سے گزر کر وہ ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں اس کے عقب میں تھا۔ وہ کمرہ ایک بیڈ روم جس کے جہاز ساز بیڈ پر ایک تختی الوجود گہری نیند میں لیٹا نظر آ رہا تھا۔ بیڈ کے ساتھ ہی ایک ٹیبل چیر رکھی ہوئی تھی۔

وہاں پہنچ کر وہ مڑی اور عجیب لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”اس سوئے ہوئے شخص کا نام جواد ہے۔۔۔۔۔۔ معذور اور بے مصرف جواد احمد۔۔۔۔۔۔!“ اس کے لہجے میں استہزاء کے ساتھ بالکل کی ٹی ٹی تھی۔ میرے سامان و گمان میں بھی یہ صورت نہیں آ سکتی تھی۔ میں دم بخود اپنی جگہ کھڑا تھا۔ چند لمحوں کے بعد گھر پر گزرا۔ پھر گویا میں کسی ٹرانس سے باہر نکل آیا۔

”اے کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔  
”اے اس کے کرتوتوں کا انجام ہے۔“ اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”یہ جب تک ٹھیک تھا، گڑبڑ

”یہ اس کے کرتوتوں کا انجام ہے۔“ اس نے حج لے کر جواب دیا۔ ”یہ جب تک تھیل مالا، تک عیاشیوں میں غرق رہتا تھا۔ مجھ پر اس کی توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں اس کی رفاقت کو ترک کر دیا۔ مگر اس کی تمام تر توجہات وہ خوب صورت مگر بد سیرت تتلیاں ہوتیں جو مردوں کو رجھانے اور انہیں نحوڑنے کا فن اچھی طرح جانتی ہیں۔“

”میں سمجھاتی، بلکہ، اس کی خوشامدس کرتی مگر اس کی روش نہ بدل سکی۔ پھر اچانک اسے گردان

”میں سمجھاتی، بھلتی، اس کی خوشامدیں کرتی مگر اس کی روس نہ بدل سکی۔ پھر اچانک اسے لڑکھا بخار ہوا جو جاتے جاتے اس کا یہ حال کر گیا کہ اب یہ محض زندہ لاش بن کر رہ گیا ہے۔ جبکہ میں خواہ مخواہ اور جوان اُمٹگوں کا چلتا پھرتا، سانس لیتا بھر پور بدن رکھتی ہوں..... اس لئے میں کبیر سے تو دلچسپی اختیار کر لوں مگر.....“ اس نے سر جھٹکا اور زہر بھرے لہجے میں دوبارہ بولی۔ ”یہ میرا اس غیبت نہ

اختیار کر لوں مگر.....“ اس نے سر جھکا اور زہر بھرے لہجے میں دوبارہ بولی۔ ”یہ میرا اس حلیہ انتقام بھی ہے۔“ اس کا اشارہ اپنے شوہر کی طرف تھا۔  
اس کی باتوں سے میرے جسم میں چیونٹیاں سی ریگئے لگی تھیں۔ وہ ہمارے معاشرے کے ایک رنخ کی عکاس تھی۔

رخ کی عکاس تھی۔  
 ”آپ اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔  
 ”سب سے پہلے یہی ارادہ تھا۔ مگر پھر مجھے اس برزس آگیا.....“

”پہلے میرا ہی ارادہ تھا۔ مگر پھر مجھے اس پر ترس آ گیا.....“

”شاید اس کی دولت آڑے آ گئی ہو گی؟“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کئے بغیر، انداز میں کہا۔

انداز میں کہا۔  
 ”آپ کو یہ بے ہودہ خیال کیوں آیا؟“ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ ”اس کی جب مجھ سے  
 ہوئی، یہ اس وقت بڑکن صحاب تھا۔ میں اس کی نہ معلوم کس ادا پر فدا ہوئی کہ اسے اپنا شوہر بنا لیا۔“

”ایسا ہو گا نادرا!..... اور ضرور ہو گا۔“

”لیکن ماں!.....“

”ہاں نادرا!..... تمہیں آج ہی اور اسی وقت ایک فیصلہ کرنا ہو گا۔“ ماں نے میری بات کاٹ کر دم بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تمہیں اب ہم دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو گا۔.....“

”یا ماں کا۔“

”ہاں! نگینہ میری زندگی ہے۔“ میں تڑپ کر بولا۔

”یہ زندگی تجھے چھوڑنا ہو گی۔“ ماں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور نشست چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نماز میں اس قدر سرد مہری تھی کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکن زکٹی ہوئی محسوس ہونے لگی۔



میں وہ صاف مگر گئی۔ ”ان کے لہجے میں نگینہ کے لئے نفرت ہی نفرت تھی۔ چونکہ انہیں نگینہ کے حالات سے مکمل طور پر آگاہی نہ تھی اس لئے ان کی سوچ کو بے جا نہیں کہا جاسکتا تھا۔ میں نے نگینہ کی صفائی میں صرف اتنا کہا۔

”نہیں ماں! یہ بات نہیں ہے۔ نگینہ واقعی ایک اچھی، نیک فطرت کی لڑکی ہے۔ اس نے عدالت میں اپنے باپ شاہ میر کے خلاف میری محبت کے جوش میں گواہی نہیں دی تھی بلکہ وہ بذات خود سچ کو سامنے لانے کا عزم کئے ہوئے تھی۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو نادرا؟“ ماں نے میری طرف چونک کر دیکھا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں ماں!“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”نگینہ کے ساتھ درحقیقت ایک بہت بڑی اور پراسرار ٹریجڈی ہوئی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے انہیں ساری حقیقت بتا دی۔ میرا خیال تھا کہ یہ سن کر نگینہ سے متعلق اپنی غلط فہمی ترک کر دیں گی۔ مگر وہ اٹل لہجے میں گہری متانت سے بولیں۔

”نادرا!..... کچھ بھی سہی، نگینہ ہمارے دشمن کی بیٹی ہے۔ تم کیا یہ چاہتے ہو کہ میں دشمن کی بیٹی اپنے شوہر کے قاتل شاہ میر کی بیٹی کو اپنی بہو بنا لوں گی؟..... ہرگز نہیں۔ اگر تمہارے دل میں ایسا کوئی خیال ہے تو اسے کھرچ کر نکال ڈالو۔“

ماں کی اس بات پر میں گنگ رہ گیا۔ میرے تو یہ تصور میں بھی نہ تھا کہ ماں اپنے بیٹے کی خوشی کو اپنے انتقام کی بجائے چڑھانے میں بھی دریغ نہیں کریں گی۔

”ماں!..... یہ..... یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟“ بے اختیار میرے ہونٹوں سے نکل گیا۔ میرے ہر الفاظ گہرا کرب لئے ہوئے تھے۔ مگر ماں اسے خاطر میں لائے بغیر سرد اور سپاٹ لہجے میں بولیں۔

”ہاں نادرا!..... میں جو کہہ رہی ہوں، بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مجھے تو حیرت ہے، آخر تُو نے اپنے باپ کے قاتل اور اپنی ماں کو بے گناہ داخل زندان کرانے والے بے رحم و سفاک دشمن کی بیٹی سے محبت کی پیچشیں کیسے بڑھائیں؟..... کیا تُو بھول گیا کہ صرف شاہ میر کی وجہ سے تُو نے جیل کی سٹاکا دیواروں کے پیچھے جہنم لیا تھا..... وہی ان سارے مصائب کا ذمہ دار ہے۔ اور ہاں، ابھی تیرے ماموں کی جان بھی اسی وجہ سے گئی ہے۔“

ماں کے لہجے میں جوش غیظ کی گھن گرج تھی۔ چہرہ آتش انتقام سے تہمتا رہا تھا۔

”ماں! یہ سب بھلا میں فراموش کر سکتا ہوں.....؟“ میں نے رساں سے کہا۔ ”ماں! میری تو زندگی کا مقصد ہی اپنے باپ کے قاتلوں اور تمہارے ساتھ زیادتی کرنے والوں کو کفر کر دار تک پہنچانا ہے۔ لیکن ماں!..... ذرا سوچو تو، اس میں نگینہ کا کیا قصور ہے؟“

”اس کا یہ قصور کیا کم ہے کہ وہ میرے شوہر کے قاتل کی بیٹی ہے؟“ ماں نے تیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو کوئی قصور نہ ہوا۔“ میں نے کہا۔

ماں چند ثانیے میرے چہرے کو بغور، پُر سوچ نظروں سے بکھتی رہیں۔ پھر جیسے اندر ہی اندر کسی جھمی فیصلے پر پہنچ کر فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔ ”نگینہ جب تمہاری زندگی کا حصہ بن جائے گی تو پھر تمہارے بچے میں بھڑکتی ہوئی آگ پراوس پڑ جائے گی اور جس طرح آج تم دشمن کی بیٹی کی وکالت کر رہے ہو، پھر اس کے باپ کی وکالت بھی کرنے لگو گے۔“

”ایسا ہرگز نہیں ہو گا ماں!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

مجھے ماں سے بے اندازہ محبت تھی۔ مجھے اس بات کا قلق ہو رہا تھا کہ ماں نے مجھے غلط سمجھا تھا۔ شاید ماں نے اس کے دل کو سخت بنا دیا ہے۔ اس میں ان کا بھی تو تصور نہیں تھا۔ لیکن بہر حال انہیں اپنے بچے پر بھروسہ کرنا چاہئے تھا۔ ایسے میں مجھے اب ماموں حیدر گل بہت یاد آنے لگے۔ وہ ہوتے تو آج شاید ماں کو میری طرف سے سمجھانے کی کوشش کرتے۔

انتقام نے ماں کو اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ اسے اپنے بیٹے پر بھی شبہ ہونے لگا تھا۔ ماں نے نگینہ کا اس انداز میں تذکرہ چھیڑ کر مجھے سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ اور یہی نہیں، ماں نے تو مجھے کل تک کا اتنی غم بھی دے دیا تھا کہ میں انہیں ایک فیصلہ کر کے بتا دوں کہ مجھے دونوں میں سے کس کا انتخاب کرنا تھا؟..... نگینہ میری زندگی تھی۔ اسے بھلانے کا تو میں تصور نہیں کر سکتا تھا۔ جبکہ ماں تو ماں تھی۔ میں اس کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا۔

آج مجھے ماموں حیدر گل کی بات کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کیوں بار بار میری اس سے التجا کرتے تھے کہ مجھے اس جنگ سے دور رکھا جائے۔ یہی وہ اہم موضوع تھا جس پر دونوں بہن بھائی (ماں اور ماموں) کے درمیان اکثر تلخ کلامی بھی ہوتی رہی تھی۔ میرے دل و دماغ بری طرح جھنجھلا رہے تھے۔

ماں نے مجھے کل تک سوچنے کی مہلت دی تھی۔ جبکہ یہ کنھن اور نامکن حد تک مشکل فیصلہ تو مجھ سے مدیوں کی مہلت ملنے پر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ پاگل ہو رہا تھا۔ یہ بہت کنھن لمحات تھے جنہوں نے مجھے بری طرح اعصاب زدہ کر دیا تھا۔

ادھر کبیر کو دی ہوئی مہلت کا ایک دن گزر چکا تھا اور کل صبح ہم نے نگینہ کو لے کر چترال اور پھر وادی کیش روانہ ہونا تھا۔ مگر اس نئی اور غیر متوقع صورت حال نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ ماں کو میں نے نگینہ کی طرف سے بہت قائل کرنے کی کوشش کی تھی، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ ماں نے مزید اس سلسلے میں کوئی بات کرنا گوارا ہی نہیں کیا تھا۔ نگینہ کے ساتھ بڑی گھٹاؤنی سازش کی گئی تھی۔ اس کا برین داس کر کے مجھے اس سے دور کر دیا گیا تھا اور یہی نہیں بلکہ اب کبیر اس کے ساتھ چٹ منگنی پٹ بیاباہ کا بمایک منصوبہ بنا چکا تھا۔ لیکن میری بروقت حکمت عملی نے اس کے گھٹاؤنے منصوبے پر کسی حد تک پانی بکیر کر رکھ دیا تھا۔ چنانچہ مجھ پر یہ لازم تھا کہ میں اپنی نگینہ کی ہر ممکن مدد کروں۔ وہ بے چاری کچھ نہیں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا بھیانک کھیل کھیلا جا چکا تھا اور کھیلا جانے والا تھا۔

میں اگلے دن ناشتہ کئے بغیر سیدھا ٹال پہنچا۔ ایک تو دیسے ہی میرا ناشتہ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ میں ماں کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ ٹال میں اپنے آفس میں آنے کے ذرا دیر بعد میں نے کبیر سے بات کرنے کے لئے نظر حیات کی رہائش گاہ کے نمبر سچ کئے تو دوسری جانب سے کسی ملازمہ نے ریسپورڈ اٹھا لیا تھا۔ اس سے پتہ چلا کہ کبیر کہیں باہر نکل چکا تھا۔ میں نے غصے سے دانت چاٹ لئے۔

کبیر کو دی ہوئی مہلت کا صرف ایک دن باقی تھا۔ میں نے سوچا، ہو سکتا ہے وہ نگینہ کو تیار کرنے کے لئے گیا ہو؟

ایک بجے کے قریب میں نے دوبارہ اسے فون کرنا چاہا تو میز پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کی بیل گنگٹانے لگی۔ میں نے فوراً ریسپورڈ اٹھا کر بیلو کیا۔

”نادر علی خان؟“ دوسری طرف سے استفہامیہ کہا گیا۔ یہ کبیر احمد تھا۔

چند قدم چل کر وہ ٹھہری اور کچھ سوچتی رہی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں مختلف متضاد کیفیات کا جھلکا نظر آیا تھا۔ وہ یقیناً میری کیفیات سے اور واردات ہائے قلبی سے بخوبی واقف تھی۔ مائیں تو اب اولاد کی خوشی کو ہر شے پر مقدم رکھتی ہیں، انہیں ہر حال میں ان کی خوشی عزیز ہوتی ہے۔ مگر میری ماں میری خوشیوں کی راہ میں حائل تھی۔ شاید اس میں کچھ تصور میرا بھی تھا کہ میں نے اپنے دشمن کی بیٹی سے دل لایا تھا۔ ایک طرف میری ماں کے لئے میری محبت تھی جس کا تقاضا تھا کہ وہ میری پسند کو اپنی پسند سمجھے دوسری طرف وہ نفرت تھی جو نگینہ کے باپ کے کرتوتوں کے باعث اس کے وجود میں پیہم موجزن تھی۔ وہ چند لمحے وہیں خاموش کھڑی رہی۔ پھر گویا کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”نادر! مجھے پورا امید ہے کہ تم میرے حکم سے روگردانی کا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لاؤ گے۔“ اس کے لئے مجھے کچھ چٹانوں کیسی سختی اور برف جیسی سرد کاٹ تھی۔ ”میں اپنے دشمن کی بیٹی کو اپنی نگاہوں کے سامنے چھپاؤں گے۔ ہرگز نہیں دیکھنا چاہتی۔“

”مگر ماں!.....“ میں نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے تو اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔ بولی۔ ”اس معاملے میں کسی ”اگر مگر“ کی کوئی توجائش نہیں ہے۔“

”ماں! مجھے اتنی بڑی آزمائش میں نہ ڈال۔“ میں نے التجا بھرے انداز میں کہا۔ ”میں تیار ہوں۔“ میری آواز میں رقت اترنے لگی۔

”ہاں.....“ تو میرا بیٹا ہے۔ اس لئے تجھے یاد دلاد رہی ہوں کہ تو اپنی ماں کے دشمنوں کو نہ بھولنا۔ یاد رکھ کہ تیرے باپ کے قاتل بھی وہی ہیں جنہوں نے تیری ماں کو زندہ درگور کر دیا تھا۔“ اس کے لئے میں اس قدر سنسناتا تھی کہ میں لرز کر رہ گیا۔ ”غور سے میری بات سن اور ہمیشہ دھیان میں رکھ۔ اگر تیرے میرا کہنا نہ مانا تو میں سمجھوں گی کہ تو قادر خان کی اولاد نہیں ہے۔“

”ماں!.....!“ شدت کرب سے میری آواز پھٹنے لگی تھی۔ ”مجھے اتنی بڑی گالی تو نہ دے۔“

”یہ گالی تیرے لئے ہی نہیں میرے لئے بھی ہے۔“ اس نے میرے انداز پر کوئی توجہ دینے کے بجائے جواب دیا۔ ”غیرت اور حمیت کا تقاضا یہی ہے کہ تو اپنے باپ کے قاتلوں سے انتقام کی منصوبہ بندی کرے۔“ وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی مگر خاموش ہوئی۔ میں اپنی جگہ لرزتا، کانپتا رہا۔

”اب تو کل تک مجھے فیصلہ کر کے بتا دے کہ تو کیا چاہتا ہے..... اپنی محبت یا پھر باپ اور انتقام؟“ اس نے کبیرہ سنجیدگی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں بے دم سا ہو کر صوفے پر گر پڑا۔ ماں کے تیر و نشتر جملوں اور تند رویے نے مجھے بے حال کر کے رکھ دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ماں اولاد کے معاملے میں اس قدر کنھور ہیں اور بے اعتدال کا مظاہرہ بھی کر سکتی ہے۔

ناک میں اسے بھی ان شرم ناک تصاویر کو پشت ازبام کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے راہ راست پر لانے کی ہنسنے لگی۔ اور شاید کسی حد تک میں کامیاب بھی ہوا تھا۔ چنانچہ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ شرم ناک ایٹھ ہر عام پر آئے۔ میں نے تو محض کبیر کو دھمکانے کے لئے ایسا کہا تھا۔

تو کیا پھر..... کبیر کو کبھی اس بات کا احساس ہو گیا تھا؟ ایک خیال یہ بھی میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ لیکن کیسے؟ اُسے بھلا اس بات کا کیونکر اندازہ ہو سکتا تھا؟ جب تک کہ اسے مسز جواد اپنی اور میری ملاقات کے بارے میں نہ بتائی۔

تو کیا پھر مجھے مسز جواد سے کنفریشن کرنی چاہئے تھی؟ میں نے سوچا اور یہ خیال آتے ہی مسز جواد کا نبر لانے لگا۔ رابطہ ہونے پر اس کی ملازمہ نے فون اٹھایا۔

”مسز جواد تشریف رکھتی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں..... وہ تو دفتر گئی ہوئی ہیں۔“

”دفتر کا نمبر.....؟“

”جی مجھے معلوم ہے۔“ وہ بولی اور اس نے مجھے مسز جواد کے دفتر کا نمبر بتا دیا۔ میں نے اسی وقت وہ نمبر لانا شروع کر دیا۔

”میڈم سے بات کروادیں۔“

”آپ کون.....؟“

”آپ پلیز ان فضول باتوں کو چھوڑیں، مجھے ان سے فوراً ضروری بات کرنا ہے۔ میری ان سے فوراً بات کرانی۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

”وہ میننگ میں مصروف ہیں۔“ اس بار لڑکی نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

”دیکھیں، میں ان کا قریبی عزیز ہوں۔“

”کمال ہے۔ آپ ان کے قریبی عزیز ہیں اور آپ کے پاس میڈم کا سیل نمبر بھی نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان کے آفس جیمبر کا ذاتی فون نمبر ہے۔“

لڑکی نے طنز یہ لہجے میں کہا اور میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ مگر اس کا بھی دوش نہ تھا اور پھر غلطی کی بھی تھی۔ میں نے مسز جواد کو اب تک اپنا نام ہی نہیں بتایا تھا۔ میں کیا پیغام دیتا۔ چنانچہ میں نے قطع کر دیا اور گہری سوچ میں غطلاں ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگلا قدم کون سا اٹھایا جائے۔ کبیر مجھے ڈانچ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب یہ تو وقت ہی بتاتا کہ اس کی نیت میں کیا فور تھا۔ مجھے گھینے کے اس پر اسرار معاملے کے سلسلے میں جلد از جلد اگلا اسٹیپ اٹھانا تھا۔ اس گھبر معطلے میں ان کی تاخیر گھینے اور میرے لئے نقصان دہ ہوئی۔

ایک خیال یہ بھی میرے دل میں آیا کہ گھینے کو اغواء کر کے واڈی کیلاش کا رخ کروں۔ اگرچہ یہ ایک ہلکا اور دشوار کام تھا۔ لیکن میں گھینے کی بھلائی کی خاطر یہ مشکل کام بھی کرنے کی ٹھان سکتا تھا۔ لیکن مامسب سے بڑی قیامت کیلاشی عامل عاروب کی تلاش اور اسے پہچاننے کی تھی۔ یوں تو وہ بہ قول بڑے خود کو کیلاشیوں کے ایک مخصوص گروہ کا روحانی پیشوا اور مربی بتاتا تھا اور ایسی معروف شخصیت کو ٹھکرنا بھی مشکل نہ تھا۔ مگر پھر اسے اس کام پر رضامند کرنا اور گھینے کو دوبارہ اصل حالت میں لانے کے اقدام کرنا، یہ ایک اور مشکل کام تھا۔ البتہ کبیر کی موجودگی میں یہ کام آسان ہو سکتا تھا۔

بالوں تو میں شام پانچ بجے ہی گھر کی طرف روانہ ہوتا تھا۔ کبھی موڈ ہوتا تو ”کلڈ انہ چوک“ پر کشمیری

”ہاں بول رہا ہوں میں..... کل تیار ہونا پھر؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تو تیار ہوں لیکن گھینے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ بولا تو طیش کی ایک لہر میرے وجود پر سرایت کر گئی۔

”بکواس بند کرو اپنی۔ تم مجھے بلف کرنا چاہ رہے ہو۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”اگر میری بات پر بھروسہ نہیں ہے تو خود جا کر گھینے سے مل کر دیکھ لو۔“

”بکواس نہ کرو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو، میں گھینے سے نہیں مل سکتا۔ آخر ہوا کیا ہے اسے؟“ میں نے دانت پیس کر کہا۔

”کچھ خاص نہیں۔ موسیٰ بخار ہے اسے۔ تین چار روز میں ٹھیک ہو جائے گی۔“ وہ بولا۔

”یہ معمولی بات ہے..... تم اسے راضی کرو۔ وہ مان جائے گی۔“

میں نے اصرار کیا تو وہ بولا۔ ”وہ بہت نازک مزاج ہے۔ ایسے میں تو اس کے پیٹا بھی سنر کی اجازت نہیں دیں گے۔“

میں نے محسوس کیا کہ کل کے مقابلے میں آج اس کے لہجے میں ڈر، خوف یا پریشانی نہ تھی۔ وہ بہت بے خوفی سے اور بے پرواہانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کی بوئیاں نونہ ڈالوں۔ جی تو چاہا کہ اسے ٹیلی فون پر ہی خطرناک نتائج کی دھمکیاں دوں..... لیکن پھر یہ سوچ

میں نے اپنا ارادہ بدل دیا کہ ہو سکتا ہے، یہ بیٹھ اور اس شیطان ٹیلی فون پر میری گفتگو ریکارڈ کر رہا ہو۔ تاہم پھر بھی میں نے اپنے دل کی بجز اس نکالتے ہوئے اس سے کہا۔

”کبیر! میری ایک بات یاد رکھنا۔ اگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو یہ مت بھولنا کہ تمہاری دیکھتی رگ میرے ہاتھوں میں ہے۔“

دوسری طرف چند لمبے اسرار بھری پُسوچ خاموشی چھائی رہی۔ پھر اچانک ہی اس نے کچھ کہے اور رابطہ منقطع کر دیا۔ مجھے اس کی دیدہ دلیری پر پہلے تو سخت طیش آیا، پھر حیرت آمیز اُبھمن بھی ہوئی۔ آخر

اسے کس بات کی تسلی ہو چکی تھی کہ میں مسز جواد کے ساتھ بنائی گئی اس کی شرمناک تصاویر سے کوئی ناام نہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔

تب پھر اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ کہیں ایسا تو نہ تھا کہ کبیر، مسز جواد سے ملا ہو۔ اگرچہ میں مسز جواد کو آخر میں تاکید کر آیا تھا کہ اس بات کا ذکر کبیر سے ہرگز نہ کرے اور نہ ہی اسے اظہار کرے۔ بس غیر محسوس طریقے سے اس کے ساتھ قطع تعلق کر لے۔ ہو سکتا ہے اس نے کبیر سے

میری ملاقات کا ذکر کر دیا ہو؟ مگر مجھے اس کا خدشہ کم ہی تھا۔ کیونکہ مسز جواد یہ حقیقت اسے بتا کر اپنے پاؤں پر خود کھڑائی نہیں مار سکتی تھی۔

تو پھر آخر کبیر کے لہجے میں آج اتنی بے خوفی اور طمانیت کیوں در آئی تھی؟ ایسا کیا ہوا تھا آخر؟ آنا

اس کا لہجہ کل کے مقابلے میں اتنا بدلا بدلا کیوں تھا؟ کل تو جیسے اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ مگر آج ایسا

تھا۔ کیوں؟..... اور اس کیوں کا جواب میری سمجھ میں بھی آ رہا تھا کہ خود کبیر سے جا کر ایک ملاقات کروں یا پھر ایک خیال یہ بھی میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ میں تھوڑے دن مزید انتظار کر کے دیکھ لوں۔

یہ ایک سلسلہ حقیقت تھی کہ میں ان تصاویر کو بہر حال دنیا کے سامنے نہیں لانا چاہتا تھا۔ یہ ارادہ میں نے مسز جواد سے ملاقات کرنے کے بعد کیا تھا۔ کیونکہ مسز جواد بہر حال کوئی پیشہ ور عورت یا طوائف زادہ

نہیں تھی۔ تلخ حالات اور مجبوری نے اسے غلط راہ پر ڈال دیا تھا اور میرا مسز جواد سے ملنے کا مقصد بھی یہی

کی کڑا کے۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

”کیا؟..... اب نیا نیکہ کلام اپنا لیا ہے تم نے؟..... بڑے لوگ جھوٹ دیا؟“ میں نے ازراہ حق کہا۔

وہ جھپٹے ہوئے بولا۔ ”آہو جی..... سال نیا، کلام نیا تو نیکہ بھی نیا۔“

”اچھا، اچھا..... اپنے پاس رکھو یہ نیکہ بھی اور کلام بھی۔ میں چلتا ہوں۔“ میں نے کہا اور جیب کا دروازہ کھول کر اسٹیرنگ سنبھال لیا۔

گرین لاج پہنچ کر میں نے ماں کو انکل اعظم خان کا پیغام دے دیا۔ ان کا بھی وہی ردِ عمل تھا جو میرا بن کر ہوا تھا۔ وہ نفرت خیز لہجے میں بولیں۔

”ایس پی وجاہت قریشی اور کشنر نے ہمارے ٹل میں لگنے والی آگ کے بارے میں اب تک کیا نقیصہ کی ہے، جو یوں ڈھکے چھپے انداز میں دھمکیاں پہنچا دیں ہم ماں بیٹے کو؟“

جواباً میں خاموش رہا۔

”نادر! کل صبح ہم دونوں ایس پی وجاہت قریشی سے ملیں گے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ میں نے نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ماں رات والی لنگوٹ نہ جھپٹ دیں۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ ہم نے خاموشی سے اکٹھے کھانا کھایا اور پھر آرام کرنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

اگلے دن علی الصباح ماں تیار ہوئیں۔ انہوں نے ہلکے آسانی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جس کے اوپر ہم کی مناسبت سے فر کا کوٹ لے رکھا تھا۔ ان کی شخصیت اس عمر میں بھی جاذبِ نظر اور پُر وقار تھی۔ ہلکا ملاؤں فر کوٹ ان کی شہابی رنگت پر بہت فحج رہا تھا۔ پہاڑی عورتوں کی طرح ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں ہلا کی پُر جوش چمک اور چہرے پر رعب و دبدبہ تھا۔ کھڑی ناک اور تھکے چوتوں پر پُر اعتمادی تہمتاہٹ تھی۔ اس وقت وہ بڑی دنگ اور بھاری بھر کم خاتون نظر آ رہی تھیں۔ میں نے گرین لاج سے روانہ ہوتے وقت انہیں اپنے فر کے کوٹ کے اندر کمر سے بندھے ہوئے لٹرس میں ایک اڑتیس بور کا جرن رپوالور بھی لٹاتے ہوئے دیکھا تھا۔

گرین لاج سے باہر آ کر انہوں نے مجھ سے جیب کی چابیاں لیں اور پھر بڑے غصے کے ساتھ جیب کا دروازہ کھول کر اسٹیرنگ سنبھال لیا۔

میں ان کے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول کر براجمان ہو گیا۔ انہوں نے جیب اسٹارٹ کی اور گیر ہل کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ دور تریاؤں میں پھیلے مرغزاروں پر برف کے بادل سے تیر رہے تھے۔ نیچے صوبہ اور چیز کے دور دوریہ درختوں کے سچ سانپ کی طرح تل کھائی سڑک کے کنارے رات بھر ہونے والی ہلکی برف باری کے آثار دودھیا پٹی کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ موسم خاصا خوش گوار تھا۔ ماں خاصی تیز رفتاری مگر بڑی مہارت سے جیب دوڑائے جا رہی تھیں۔ کلڈانہ چوک پر آ کر فیول گھولایا اور پنڈی کی طرف جانے والی سڑک پر جیب ڈال دی۔

یوں ہیڈ کوارٹر پہنچ کر ہم دونوں ماں بیٹے نیچے اترے۔ ایس پی وجاہت قریشی اپنے کمرے میں موجود تھے۔ ان کے اردلی کے ہاتھ پیغام پہنچایا تو انہوں نے فوراً ہمیں اندر بلا لیا۔

ایس پی وجاہت قریشی پچاس پچپن کے بیٹے میں تھے۔ وہ درمیانی قد و قامت مگر اچھی صحت کے مالک تھے۔ ماں کو دیکھتے ہی وہ احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ انہوں نے ہمیں

چائے پیتا ورنہ بائیں طرف تھپکا گلی جانے والے راستے ہو لیتا تھا۔ مگر آج میں تین بجے ہی ٹال سے اتر کے لئے تیار ہوا اور جیسے ہی دفتر سے باہر ٹال کے احاطے میں کھڑی اپنی جیب کی طرف بڑھا، ایک رنگ کی سرگلر اندر داخل ہوئی۔ میں ڈراچونک کر رک گیا۔ یہ کار اعظم خان کی تھی۔ وہ ڈرائیور کی برابر اگلی نشست پر براجمان تھے اور عقبی سیٹ پر ایک گن مین بھی موجود تھا۔ کار رکستے ہی ڈرائیور اتر آ کر دفتر خان خود ہی دروازہ کھول کر نیچے اتر آئے۔ ان کا باڈی گارڈ بھی نیچے اتر آیا تھا۔

”انکل!..... آپ..... آئیں، اندر تشریف لائیے۔“ میں نے مسکرا کر ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور مصافحہ کیا۔

”ہاں نادر بیٹا! اچھا ہوا تم مل گئے۔“ وہ بولے۔ ”ورنہ مجھے گرین لاج جانا پڑتا۔ آؤ، میں نے ہر ضروری بات کہنی ہے تم سے۔“

ہم اندر آفس روم میں آ گئے۔ میں نے انہیں ریوالونگ چیئر پر بیٹھنے کا کہا۔

”نہیں بیٹا! میں یہیں ٹھیک ہوں۔ بیٹھو تم۔“ وہ سامنے ایک کرسی سنبھال کر براجمان ہو گئے تو میرا جواباً چیئر پر بیٹھ گیا۔

”نادر بیٹے! آج صبح ایس پی وجاہت قریشی اور کشنر صاحب مجھ سے ملنے آئے تھے۔“ انہوں نے کہنا شروع کیا۔ میری نظریں ان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ بولے۔ ”وہ امن عامہ کے حوالے سے گفتگو کرنے آئے تھے۔ انہیں یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے کہ ہماری شاہ میر اور نظر حیات برائی رنجش چلی آ رہی ہے۔ انہوں نے مجھ سے دوستانہ درخواست کی تھی کہ میں ان کی تادیب سے تمہیں بالخصوص بھائی شبنہ کو آگاہ کر دوں کہ اگر شاہ میر یا نظر حیات کو خوف زدہ کرنے کی کوئی گناہم کو کوشش کی گئی، لاء اینڈ آرڈر کی چوہینشز پیدا کی گئی تو تم سے اور بھائی شبنہ سے جواب طلب کیا جاسکتا ہے۔“

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئے تو میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ چھج گئی اور میں اعظم خان سے بولا۔

”انکل! کیا یہ تادیب آمیز دھمکی صرف ہم ماں بیٹے کے لئے تھی یا.....؟“ میں نے طنزیہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا جھوڑا تو وہ میری طرف دیکھ کر خلیقانہ لہجے میں مسکرا کر بولے۔

”کسی غلط فہمی میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی کے کہنے پر نہیں بلکہ بالکل غیر جانبدارانہ طور پر آئے تھے اور اس سے پہلے وہ یہی تادیب شاہ میر اور نظر حیات کو بھی کر چکے ہیں۔ تم گھر جا کر یہ بات بھائی شبنہ سے بھی کہہ دینا۔ میں بھی کسی وقت آؤں گا۔ اوکے، اب میں چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ

کھڑے ہوئے۔

”ارے انکل! یہ کیا..... آپ بیٹھئے تو سہی۔“

”نہیں بیٹا! میں جلدی میں ہوں..... پھر بھی سہی۔“ انہوں نے کہا اور واپس لوٹ گئے۔

ٹائیے احاطے میں اپنی جیب کے قریب آ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

”بڑے آدمی ہیں جی.....“ اچانک فیبر مشتاق سیال نے کھٹکھارنے والے انداز میں کہا۔

میں خیالات سے یکدم چونک کر اس کی طرف پلٹا۔ وہ گھبرا سا گیا۔ ”وہ..... مم..... مطلب تھا جی، خان صاحب چائے شائے پیئے بنا ہی چلے گئے۔“

”ہاں..... انہیں جلدی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اچھا سنو..... میں جا رہا ہوں۔ کوئی بات فون پر بتا دینا۔“

”اوجی، میرے ہوتے ہوئے آپ فکر ہی نہ کریں۔ کوئی گل بات ہوئی تو میں سنبھال لوں گا۔“

اپنے سامنے رکھی دو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔  
 ”ایس پی صاحب! اعظم خان کے ہاتھوں آپ کا اور کشنر صاحب کا پیغام مجھے موصول ہوا تھا۔“  
 نے ان سے مخاطب ہو کر گہری متانت سے کہا۔  
 ”مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمارے دوستانہ پیغام کا نوٹس لیا اور یہاں آنے کی زحمت کی۔“ ایس پی صاحب نے جوابت قریشی نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔  
 ”تو اس کا مطلب اگر شاہ میر اور نظر حیات کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا ہے تو لاجمالہ میر ہی زیر عتاب لایا جائے گا۔“

میرا خیال تھا کہ ماں کی بات پر ایس پی صاحب مرونا کچھ بولیں گے۔ مگر انہوں نے بھی یک دم سنجیدہ ہو کر صاف گوئی سے کہا۔ ”ہاں!..... پوچھ کچھ اور تفتیش کے سلسلے میں ہم بھی سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کیونکہ آپ دونوں کی چیقلش کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ یہ آن دی ریکارڈ ہے۔“  
 ”تو پھر آپ کے علم میں یہ بات بھی ہو گی کہ کچھ عرصہ پہلے ہمارے ٹال کو آگ لگا دی گئی تھی اور پولیس نے یہ واقعہ ”نامعلوم شرپسندوں“ کے روایتی عنوان کے کھاتے میں ڈال کر تفتیش شروع کر دی تھی۔ تو کیا شاہ میر اور نظر حیات کو آپ کی تفتیش یا پوچھ گچھ کے عمل سے گزرنا پڑا یا نہیں؟“ ماں کے ان بچے تلے جملوں نے ایس پی صاحب کو ذرا جزبز تو کیا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ بولے۔  
 ”ہاں!..... متعلقہ تھانے کے انچارج انسپٹر اعجاز شمس تفتیش کر رہے ہیں۔“  
 ”آپ نے شاید میرے سوال پر غور نہیں کیا ایس پی صاحب!“ ماں نے دبنگ لہجے میں ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ لیکن شاہ میر اور نظر حیات کے خلاف شواہد نہیں ملے۔“ وہ جواب دیا۔  
 ”ہوں!.....“ ماں نے ایک اسرار بھری ہنکاری بھری، ”اگر یہی آگ شاہ میر اور نظر حیات کی رہائش گاہ کو نکل لے تو.....؟“  
 ”آخر آپ کہنا چاہتی ہیں محترمہ شبیہ؟“ ایس پی صاحب نے بغور ماں کے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”میں یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ جو دھکی آمیز پیغام آپ نے اعظم صاحب کے ہاتھوں ماں بیٹے تک پہنچایا تھا، کیا وہ نظر حیات اور شاہ میر تک بھی پہنچایا گیا تھا؟“ ماں نے پوچھا تو جواب میں ایس پی صاحب لمحائی خاموشی کے بعد مختصر اُبو لے۔  
 ”ان دونوں تک بھی ہمارا پیغام عنقریب پہنچا دیا جائے گا۔“  
 ان کی بات پر ماں نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا اور گویا ہوئیں۔ ”نادر! تم تو کہہ رہے تھے اعظم صاحب نے بتایا تھا کہ ہم سے پہلے ان تک یہ پیغام پہنچایا گیا تھا۔“  
 ماں کی بات پر میں نے ایس پی صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”جی ہاں ایس پی صاحب! خان صاحب نے یہی بتایا تھا۔ کیا یہ بات درست نہیں؟“  
 ”میں نے یہ نہیں کہا تھا ان سے۔ البتہ ہو سکتا ہے، کشنر صاحب نے یہ سوچ کر اعظم صاحب سے کہہ دیا ہو کہ آپ لوگوں تک پیغام پہنچانے کے بعد شاہ میر اور نظر حیات تک بھی فوراً یہ پیغام پہنچا جائے گا۔“

”اور وہ ”فورا“ اب تک نہیں آئی..... اور شاید آئے بھی نہ۔“ ماں نے استہزائیہ کہا تو میں نے بھا، ایس پی صاحب کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے تھے۔  
 ”دیکھئے خاتون! ہم نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں، یہ ہم بہتر جانتے ہیں۔ آپ کو اس قسم کے ریمارکس میں دینے چاہئیں۔“  
 ”چاہے آپ لوگ جانبداری برتتے ہوئے مظلوم کو ظالم ثابت کرنے پر تہل جائیں؟“  
 ”شبیبہ خاتون!..... آپ حد سے بڑھ رہی ہیں۔“ ایس پی کو بھی غصہ آ گیا۔ تب میں نے بھی بکٹائی کی۔

”ایس پی صاحب! آپ اخلاقی اور قانونی دونوں اعتبار سے غلط بات کر رہے ہیں۔ ہمارا ٹال نذر نذر کر دیا گیا، پولیس کچھ نہ کر سکی۔ اس کے بعد ہماری رہائش گاہ پر شب خون مارا گیا۔ میری ماں بال بائیں اور میرے ماموں اور ہمارے ایک پرانے ملازم (قتل چاچا) کو قتل کر دیا گیا۔ انتظامیہ نے کیا، کیا ایک ہک؟..... اُلٹا ہمیں ہی بلک سیل کیا جا رہا ہے؟“  
 ”مسٹر نادر علی خان! تم ماں بیٹا کیا سمجھتے ہو کہ ہم نے تم لوگوں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں؟“ ایس پی وجاہت قریشی نے میری طرف گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لاہور کے گجر ہک کے زمیندار ہوں اور گلبرگ کے بنگلے میں جو خون ریزی کی گئی، ہم اس سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ ہمیں بتایا بھی گیا کہ یہ خون ریزی کس نے پھیلانی ہے۔ لیکن ہم نے تم ماں بیٹے سے کوئی پوچھنا چاہا۔“

مجھے ایس پی وجاہت کی بات پر ایک جھکا سا لگا مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے پوچھا۔  
 ”کیا آپ بتا سکتے ہیں، آپ کو یہ اطلاع دینے والے کون تھے؟..... اور انہوں نے اس خون ریزی کا ذمے دار کس کو ٹھہرایا تھا؟“  
 ”یہ ہمارا سیکرٹ ہے..... جسے ہم اپنی نظروں میں رکھ کر کسی بھی وقت خفیہ کارروائی کر سکتے ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”یہ سیکرٹ نہیں ہے ایس پی صاحب! بلکہ چشم پوشی ہے۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”کیونکہ آپ جان گئے ہوں گے کہ جن لوگوں نے آپ کو خون ریزی کی اطلاع ابھم پہنچائی، ان کو سب سے پہلے آپ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا کہ آخر انہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیونکہ پولیس، مسٹر اور اخباری اطلاعات کے مطابق اس خون ریزی کا شکار ہونے والے انتہائی خطرناک مجرم تھے جو ہمیں کو مطلوب تھے۔ پھر تو یقیناً آپ کو خفیہ ذرائع سے اطلاع دینے والوں کا کوئی نہ کوئی تعلق، ان کو ختم کرنا مقول مجرموں سے بنتا تھا۔“

میں نے دانستہ اخبارات کی خبروں کا حوالہ دیا تھا۔ حالانکہ میری نظروں سے شاید یہ خبر گزرنے سے وہ مجھے بھی میری بات پر ایس پی وجاہت قریشی نے چند لمحے سنسناتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور میرے لہجے میں بولے۔  
 ”جس کسی نے بھی یہ خون ریزی پھیلانی ہے، اسے ہرگز اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کہ انتظامیہ محض یہ سمجھ کر کہ اس خون ریزی کی زد میں آنے والے انتہائی مطلوب اور خطرناک مجرم اس کیس کو داخل دفتر کر دے گی۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے پھر جھک کر اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیاں منہ پر بٹھا کر ترہا ہوا لڑکا جیسا دکھائی دیا۔  
 ”اگر سر اسٹارٹ“

”یہ بات نہیں ہے ماں!“ میں نے برا منائے بغیر کہا۔ اور پھر ماں کی توجہ ایک اہم بات کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتے ہوئے مزید بولا۔ ”آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ کالا ناگ زندہ بچ چکا ہے اور وہ اس وقت پولیس کھڑی میں ہے اور یقیناً اس کلیو کو ہمارے دکن ہمارے خلاف ٹارگٹ بناتے رہے پولیس پر کالا ناگ سے پوچھ گچھ کرنے کے لئے دباؤ ڈال سکتے ہیں اس لئے سب سے پہلے ہمیں کالا ناگ کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ ورنہ ایک بار پھر ہمیں لمبی چوڑی قانونی کارروائی میں پھنسا دیا جائے گا۔“

ان اتنا کہ کر خاموش ہو گیا۔ میری بات کا ماں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ کیونکہ وہ خاموش ہو کر سوچ میں مبتلا ہو گئی تھی۔

میں نے کن آنکھوں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ ان کی سرخ و سپید فراخ پیشانی پر الجھن پر تشویش کا جال سا بن گیا تھا۔ تب وہ بولی۔

”یہ کیسے معلوم ہوگا کہ کالا ناگ کو کہاں رکھا گیا ہے؟“

”اُسے یقیناً پولیس کے پیرے میں لاہور کے کسی ہسپتال میں ایڈمٹ کیا گیا ہوگا۔ میں آج ہی لاہور کی طرف روانہ ہونا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے..... مجھے گرین لاج چھوڑ کر تم جیب لے جاؤ۔“ ماں نے کہا۔ میں نے خاموشی سے بات میں اپنا سر ہلادیا۔ گرین لاج پہنچے تو ایک چونکا دینے والی خبر ہماری منتظر تھی۔

ہال سے چند مزدور آئے تھے اور ہمارے انتظار میں بیٹھے تھے۔ پھر ہمارے وہاں پہنچے ہی انہوں نے چونکا دینے والی اطلاع ہمیں دی کہ آج صبح پولیس نے ہال کو سیل کر ڈالا ہے اور میجر مشتاق سیال کو انڈر کر کے لے گئی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارے ہال پر فاریسٹ کنزرویٹو آفیسر شاہ میر نے پولیس نفری کو ساتھ چھاپہ مارا تھا اور وہاں موجود عمارتی لکڑیوں اور شہتیروں کو غیر قانونی جنگل کی کٹائی سے چوری کر رہا تھا۔

یہ سن کر میں نے غصے سے اپنے دانت بھینچ لئے۔ دشمن اوچھے جھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔

”آخر بغیر ثبوت کے انہوں نے کیسے اتنی بڑی کارروائی کر ڈالی؟“ میں غصے میں بڑبڑایا تو ماں نے ہنسنے کے ساتھ طنز یہ کہا۔

”یہ سب تمہاری خوش فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ تم سمجھ رہے تھے، دشمن خوف زدہ ہو چکا ہے۔ یہ سب ناگ ڈھیل دینے کی وجہ سے ہوا ہے نادر بیٹے!“

ماں کے ریمارکس نے مجھے مزید تھلا دیا۔ تاہم میں نے کہا۔ ”ماں! پریشان نہ ہو۔ میں ابھی جا کر ملتا ہوں، اصل معاملہ کیا ہے۔“ یہ کہہ کر میں اسی وقت مزدوروں کے ساتھ اپنی جیب میں مری کی طرف لہہ ہو گیا۔

\*\*\*

میں سب سے پہلے ہال پہنچا۔ ہال کے دیو بیکل چوٹی گیٹ کو بند کر کے تالا لٹکا دیا گیا تھا۔ تالے پر لٹکا لٹک کی سیل پھٹا کر چپکا دی گئی تھی۔

باہر سارے مزدور حیران و پریشان اور سوگوار کھڑے تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی اور سیدھا متعلقہ

لہجے میں گویا اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔ ”کیونکہ..... ان میں سے ایک مجرم کالا ناگ زندہ بچ گیا ہے۔“

ایس پی وجاہت قریشی کے اس انکشاف نے میرے وجود میں سنسنی دوڑا دی۔ اور ایک لہری میری ریڑھ کی ہڈی میں کن بجھوڑے کی طرح رینگتی محسوس ہوئی۔ یہ لہر اس خوف کی نہ تھی کہ کالا ناگ زندہ بچ جانے کے بعد میرے خلاف پولیس کو بیان دے گا۔ بلکہ یہ ایک جوش کی لہر تھی کہ کالا ناگ میری کپاٹنے کے باوجود زندہ بچ گیا تھا۔

”کالا ناگ کو کہاں رکھا گیا ہے؟“ میں نے گھبر لہجے میں اپنے اوپر جھکے ہوئے ایس پی وجاہت قریشی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”بس تم ماں بیٹے کے لئے یہی کافی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنی چیئر پر براجمان ہو گئے۔

میں نے ماں کی طرف دیکھا۔ کالا ناگ کے زندہ بچ جانے کا سن کر ماں کی بھی کم و بیش میرے جیسی کیفیت ہو رہی تھی۔ ماں نے خاموشی سے میری طرف دیکھا۔ اس کے بعد ہم پولیس ہیڈ کوارٹر سے واپس لوٹ گئے۔

میں اور ماں سارے راستے خاموش رہے تھے۔ پھر جب کلڈا ناگ چوک سے ہم تنہا گلی اور ڈونگ گلی تک جانے کے لئے تھیرکا گلی کا شارٹ کٹ اختیار کرنے لگے تو ماں نے میری طرف دیکھے بغیر مجھ سے کہا۔

”کالا ناگ کیسے بچ گیا تھا؟..... تم نے تو کہا تھا کہ بشیر جیرا کے ساتھ وہ بھی ہلاک ہو چکا ہے۔“

ماں کے لہجے میں مجھے استفسار کم، تادیب زیادہ محسوس ہوئی تھی۔

”میں خود حیران ہو رہا ہوں ماں!“ میں نے الجھ کر کہا۔ ”میں نے خود اپنی آنکھوں سے کالا ناگ پست میں گولی کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ شاید ڈاکٹروں نے بروقت طبی امداد دے کر اسے بچالیا ہے۔“

”تم نے ایس پی وجاہت قریشی کا رویہ دیکھا۔ مجھے اس میں جانب داری کی بو آ رہی تھی۔“ ماں نے جیسے میری رائے لینا چاہی۔

”میرا خیال ہے ماں! وہ اپنی جگہ درست کہہ رہے تھے۔“ میں نے پُر متانت لہجے میں کہا۔

ماں نے ذرا گردن موڑ کر قدرے چوکتے ہوئے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ انہیں شاید مجھ کی ایسی تردید کی امید نہ تھی۔

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“ ماں نے دوبارہ سامنے نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو پورا یقین ہے کہ تمہاری اس خنزیر کارروائی کے بعد شاہ میر اور نظر حیات ہم سے بری طرح خوف زدہ ہو چکے ہیں اور یہ جان گئے ہیں کہ اب ان دونوں کی باری ہے۔ اس لئے انہوں نے بڑی مکاری سے کام لیتے ہوئے ایس پی وجاہت قریشی اور کشن کو واشگاف لفظوں میں اپنے اس خدشے کے بارے میں آگاہ کر دیا۔“

انظامیہ کے ذریعے ہم پر دباؤ ڈال سکیں۔“

”آپ کی یہ بات کسی حد تک درست ہو سکتی ہے۔“ میں نے بہ دستور سنجیدگی سے مختصر کہا۔

ماں!..... ہمیں بہر حال دشمنوں کے خلاف سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔“

”سوچنا کیا ہے؟.....“ ماں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اب سب سے پہلے شاہ میر کی باری آئے گی۔ میں پولیس انظامیہ کی بلیک میلنگ سے خوف زدہ نہیں ہوں۔“

”لیکن باوجود اس کے ہمیں احتیاط کا دامن تھامے رکھنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ ہماری کارروائی نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ ہم بھی ان کی زبان میں جواب دینا جانتے ہیں۔“

تھانے پہنچا۔

یہاں کا انچارج انسپکٹر ٹمٹس تھا۔ یہ وہی جلا دھشت شخص تھا جس نے مجھ پر ایک روز اس تھانے پر انسانیت سوز تشدد کیا تھا۔ نیز مجھے اڈیالہ جیل پہنچانے کا عزم بھی کیا تھا۔ مگر اس کا یہ خواب کبھی شرمندہ تجربہ نہ ہو سکا تھا۔

میں سیدھا اس کے کمرے میں پہنچا۔ وہ میز پر اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر چونکا، پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اب اس کی ٹھنی مونچھوں تلے زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔

”آؤ نادر علی!..... بروقت آئے تم۔“ مجھے اس کے پورے کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔

”آپ نے میرا ٹال کیوں سیل کیا ہے؟ اور ہمارے نیجر مشتاق کو بھی لاگ اپ کر دیا ہے۔ آؤ کیوں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرا قریب آ کر دانت پیس کر بولا۔

”تمہارے ٹال پر کنزرویٹو آفیسر شاہ میر کے ایما پر چھاپہ مارا گیا۔ کیونکہ تمہارے ٹال میں چوری کی لکڑی تھی۔“

”اس کا کوئی ثبوت ہے؟“ میں نے اپنے اندر کے اُبال پر یہ مشکل قابو پاتے ہوئے اسے پوچھا۔

”کیا کنزرویٹو آفیسر سے بڑا کوئی ثبوت ہو سکتا ہے؟“ وہ بولا۔

”آخر اس کے پاس بھی تو کوئی ثبوت ہو گا انسپکٹر!“ میں نے کہا۔

”ہاں..... تم نے ٹھیکے دار رمضان احمد سے جو خام مال لیا تھا اور اسے چیرنے کاٹنے کے بعد شہتروں میں بدل دیا تھا، وہ جنگل کی غیر قانونی کٹائی سے حاصل کردہ تھا اور متعلقہ فاریسٹ آفیسر نے اس کی رپورٹ کنزرویٹو آفیسر شاہ میر کو دے دی تھی۔“ اس نے تفصیل سے جواب دیا تھا۔

میں ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ اس حد تک تو یہ بات درست تھی کہ ہم نے کچھ روز قبل رمضان احمد ٹیکے دار سے خام مال کے دو راکٹ ٹرک خریدے تھے مگر احتیاط کے پیش نظر میرا اصول تھا جو اس سے ملے ماموں کا تھا کہ بے منٹ یکسٹ مگر تیسرے دن کی جاتی تھی۔ تو اس کا مطلب تھا کہ رمضان احمد نے ہمیں چوری کی لکڑی فراہم کی تھی۔

”ہو سکتا ہے آپ درست کہہ رہے ہوں۔“ میں نے معاملہ سمجھتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔ ”تم اٹا لئے پے منٹ تین دنوں کے بعد کرتے ہیں۔ میں نے پے منٹ نہیں دی۔ دوسری بات یہ کہ رمضان احمد سے ہمارے معاملات برسوں پرانے ہیں۔ آج تک اس نے ہمیں چوری کا مال فروخت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے ساتھ بھی کوئی دھوکا ہوا ہو گا۔“

انسپکٹر ٹمٹس نے اس بات پر زہریلی مسکراہٹ سے میرے چہرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ ”انسان کے ضمیر کو پلٹا کھانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے نادر علی خان!..... تحقیقات کی جارہی ہیں۔ متعلقہ محکمے (محکمہ جنگلات) سے انکوائری رپورٹ آنے تک مزید گرفتاریاں بھی عمل میں آ سکتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے..... میں تیار ہوں..... لیکن آپ پلیز! ہمارے نیجر کو تو رہا کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی میں آپ سے ٹال کی سیل کھولنے کی بھی درخواست کروں گا۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

”بہت مشکل ہے..... حتمی رپورٹ آنے تک کسی کو رہا نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ٹھیکے دار رمضان احمد کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ شکر کرو کہ تمہیں ہتھکڑیاں نہیں لگائی گئیں۔“ وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

میں نے فوراً کینچلی بدلتے ہوئے نرم گفتاری سے کہا۔ ”آپ کی مہربانی..... لیکن آپ ہمارے

کو تو رہا کر دیں۔ ٹال بے شک سیلڈ رہے۔“

”ٹھیک ہے..... پھر تم اپنے نیجر مشتاق کی جگہ سنبھال لو۔ اسے ہم باہر کر دیتے ہیں۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ میرے اندر دوبارہ ٹمٹس کی لہر ابھری۔ مگر میری گرم مزاجی سے حالات بگڑ سکتے تھے۔ انسپکٹر ٹمٹس کے بارے میں مجھے پورا یقین تھا کہ وہ ہمارے دشمنوں سے مل چکا تھا۔ میرا اتنا خیر خواہ یا ہمدرد تھا کہ اب تک اس نے مجھے ہتھکڑیاں نہیں پہنائی تھیں۔

کیونکہ ابھی جرم ثابت نہ ہوا تھا اور تحقیق جاری تھی۔ چھاپے کے بعد جو گرما گرمی ہونا تھی، وہ ہو چکی تھی۔ بہر طور میں نے اس سے نیجر مشتاق سے ملاقات کرنے کی اجازت چاہی، جو اس نے دے دی۔

میں لاگ اپ کی طرف آیا۔ نیجر مشتاق سلاخوں کے عقب میں چپکا کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر سنی کے ڈوگرے برس رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ داد و فریاد کے انداز میں بولا۔

”چھوٹے صاحب جی! یہ کیا ہو رہا ہے؟..... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”میری سمجھ میں آ رہا ہے۔“ میں پُر سوچ لہجے میں بولا۔ ”تم بالکل پریشان مت ہونا۔ میں تمہیں آج لاپا ہر نکال دوں گا۔“

”اچھا جی، کیا آپ مجھے گردن سے پکڑ کر سلاخوں کے بیچ سے ریشمی تھان کی طرح باہر نکالیں گے؟“ ”نہیں بے وقوف! میں تمہاری ضمانت کی کوشش کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”چھوٹے صاحب! ضمانتیں ثنائیت تو عادی مجرموں کی ہوتی ہیں..... میں تو ایک سیدھا سادھا اور لاپا ہر بندہ ہوں۔“

”تم فکر نہ کرو، میں کچھ کرتا ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دی اور تھانے کی عمارت سے باہر آ گیا۔ پھر لاپا ہر کے قریب آ کر اپنے سیل پر اعظم خان سے رابطہ کرنے لگا، انہوں نے مجھے تسلی دی کہ سر دست انجیر کی ضمانت ہی کروا سکتے ہیں..... باقی معاملات بعد میں طے ہوتے رہیں گے۔ میرے لئے یہی بات تھا۔

پھر میں نے گرین لاج میں ماں سے بھی رابطہ کر کے انہیں بھی آگاہ کر دیا۔ دشمنوں نے ہمیں اب ایک نئی پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا، شاہ میر اور نظر حیات دونوں ماحول سے ہمارے خلاف ایک ایسی سازش کے تانے بانے بننے میں مصروف ہو چکے ہیں جس سے وہ دونوں مردود ہمیں، معاشی طور پر بالکل تنگ دست کر سکیں۔ گویا وہ ہمیں اقتصادی اور معاشی طور پر کنزرویٹو کرنے کے ٹاسک پر کام کر رہے تھے۔ پہلے ٹال کی آتشزدگی عمل میں لائی گئی جس سے ہمیں لاکھوں کا نقصان ہوا تھا، پھر ٹال کی نئے سرے سے تیاری ہوئی اور اب ٹال پر چھاپا پڑا کہ اسے سیل کر دیا گیا تھا۔

نادر علی بہت بینک بیلنس تھا، وہ ٹال کی نئے سرے سے تعمیر میں خرچ ہو چکا تھا۔ اب روز کی آمدنی سے کچھ رہی ہوئی ادائیگیاں آہستہ آہستہ کر کے عمل میں لائی جارہی تھیں۔ اگر ٹال نادر علی کچھ عرصہ مزید سیل رہتا تو ٹھیکے دار پارٹیاں ہمیں مال سپائی کرنا تو بند کر ہی دیتیں، ساتھ ہی پے منٹ وغیرہ کی ادائیگی کے سلسلے میں بھی ان کا دباؤ بڑھتا جاتا۔

ادھر کالا ناگ کے زندہ بچ جانے اور اس کے پولیس کی کسٹڈی میں علاج و معالجے کی اطلاع نے لاپا ہر پریشان کر رکھا تھا۔ اور یہی نہیں..... بلکہ ایس پی وجاہت قریشی نے بھی اشاروں کنایوں میں نادر علی کو بھی کر دی تھی، جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ جیسے ہی کالا ناگ بیان دینے کے قابل ہوا، مجھے بھی نادر علی کی ادائیگی کے سلسلے میں بھی ان کا دباؤ بڑھتا جاتا۔

نادر علی کا جاسکتا تھا۔ علاوہ ازیں میرا اپنی ماں سے نگینہ کے سلسلے میں الگ اختلاف چل رہا تھا۔ ان پے



درجے پریشانوں اور الجھن آمیز سوچوں نے مجھے بری طرح اعصاب زدہ کر کے رکھ دیا تھا۔  
گنبد سے متعلق وادی کیلاش کی دشوار گزار مہم بھی اب مجھے اتوار کا شکار نظر آنے لگی تھی۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہاں کی حالتیں کیا ہیں۔ میرا نظریہ تھا کہ وہاں کی حالتیں میری توقعات سے بالکل مختلف ہوں گی۔ اس کی وجہ کیا تھی؟..... ماں سے میرا گنبد کے متعلق اختلاف، میری تسلیل پسندی، پھر..... گنبد!

بہر طور میں واپس گرین لاج آ گیا۔

سکین (فضل چاچا کی بیوہ) نے مجھے بتایا کہ ماں اپنے کمرے میں ہیں اور مجھے بلایا ہے۔

میں ڈرائنگ روم سے ہو کر ماں کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ اچانک قریب رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں ذرا چونک کر رکا۔ پھر ٹیلی فون کی طرف بڑھا اور ریسور کان سے لگا کر بیلو کہا تو دوسری طرف سے گنبد کی آواز ابھری۔

”نادر صاحب.....!“ اس کی آواز سنتے ہوئے مجھے اپنی سماعتوں پر دھوکا ہونے لگا۔ میرا دل بہ طرح دھڑک رہا تھا۔ تاہم دوسرے ہی لمحے میں نے کہا۔

”گنبد! میں نادر بات کر رہا ہوں۔ کب..... کیا تم نے مجھے پہچان لیا؟“

میرے مجبور لہجے میں بچوں کی سی امید تھی۔ دوسری طرف سے گنبد کی سپاٹ آواز ابھری۔

”مسٹر نادر! تم مجھے اغواء کرنا چاہتے ہو؟“ اس کی بات پر جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں سمیٹ لیا۔ وہ کہہ رہا تھا مجھے حیرت کا شدید جھکا بھی لگا۔ میں نے بہ مشکل کہا۔

”یہ..... تم سے کس نے کہہ دیا؟“

”مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو مسٹر!“ گنبد نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”میری بات کان کھول کر سن لو، میں تمہارے گھناؤنے عزائم کے بارے میں آگاہ ہو چکی ہوں۔ اگر تم نے دوبارہ مجھ سے بات کرنے کی یا میرے سامنے آنے کی ذرا بھی کوشش کی تو میں فوراً پولیس کو مطلع کر دوں گی۔ سمجھے تم؟“

نفرت انگیز اور غصیلے لہجے میں اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

میں پاگل دیوانوں کی طرح ”ہیلو!..... ہیلو!“ کرتا رہ گیا لیکن دوسری جانب مسلسل ٹون کی بجائے رحم اور سپاٹ آواز پر بالآخر میں نے ریسور کو ریڈل پر رکھ دیا۔ میرے دل و دماغ کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔

گنبد کے سرد اور غصے بھرے لفظوں کی چھین بڑھیوں کی طرح میرے اندر کو گھاسل کئے دے رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا اور غیر جذباتی ہو کر خنڈے دل و دماغ سے حالات اور گنبد کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے بد خصلت کبیر نے یہ بات بتا دی تھی کہ میں اسے اپنے ساتھ لے لے جانا چاہتا تھا۔ مگر اس انداز میں کہ گنبد اسے اپنی بھلائی کی بجائے اغواء پر محمول کرنے لگی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ کبیر والا مہرہ بھی میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے یہ بھی معاملہ مزید بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرا یہ خدشہ درست نکلا تھا کہ اسے اب میری بلیک میلنگ کی چنداں نہیں رہی تھی۔ وہ جان چکا تھا کہ میں اس کے شرم ناک کروت کسی کے سامنے نہیں لانا چاہتا۔ نتیجتاً

احتمانہ حرکت مسز جواد سے ہوئی ہوگی۔ اس نے میرے منع کرنے کے باوجود شاید اس سے ذکر کر دیا تھا۔

مجھے یہ بھی یقین ہونے لگا کہ اس نے یہ بات بھی کبیر سے کہہ دی ہوگی کہ میں یہ راز محض ایک شریف

معد و شوہر کی بیوی کو راز راست پر لانے کے لئے آشکارا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

صورت حال کچھ اُلجھ گئی تھی۔ ماں کا گنبد سے متعلق ایسی مٹم، ٹال پر چھاپہ اور غیر مشتاق سیال کی

رفاری، ایسی بی و جاہت قریشی کی پراسرار دھمکیاں، کالا ناگ کا زندہ بچ جانا اور اس کا پولیس کسٹڈی ہونا، گنبد کا کلیئر مسئلہ اور اب گنبد کا مجھے سخت لفظوں میں فون کرنا..... یہ تمام واقعات صورت حال کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر کئے جا رہے تھے۔ حالات کی پیچیدگی نے میرے اعصاب پر برا اثر ڈالا تھا۔ دباؤ نے لگا تھا۔

اس دباؤ سے چھٹکارا پانے کے لئے میں نے ایک گلاس پانی پیا۔ اپنے اعصاب کو پرسکون کرنے کی

رض سے بیڈ پر دراز ہو گیا۔ سب سے پہلے یہ تجزیہ کیا کہ ان میں جو سب سے اہم مسئلہ تھا اس پر توجہ دینی چاہیے اور وہ اہم مسئلہ گنبد کا تھا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں حیرت انگیز طور پر خود کو پرسکون محسوس

لئے لگا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دیگر معاملات اعظم صاحب کے سپرد کر کے میں خود کسی نہ کسی طرح گنبد

سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کیلاش کی طرف نکل جاؤں۔ اس کیلاشی عامل عاروب کا مجھے کبیر کی زبانی علم ہو چکا

تھا کہ وہ وادی کیلاش کے ایک مخصوص گروہ کا روحانی پیشوا تھا جو کلاشی آگرم میں آباد تھا۔ چونکہ وہ مشہور

نمیت تھا اس لئے اسے وہاں تلاش کرنا چنداں مشکل نہ ہوتا۔

”نادر.....!“ اچانک میری سماعتوں سے ماں کی سپاٹ آواز نکل گئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔

ان دروازے پر کھڑی تھیں۔ میں احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔ گنبد کے اچانک اور غیر متوقع فون پر میں بھول ہی

گیا تھا کہ ذرا دیر پہلے سکین نے مجھ سے کہا تھا کہ ماں نے مجھے بلایا تھا۔

”میں نے تمہیں بلایا تھا.....“ ماں نے اس طرح سپاٹ لہجے میں دوبارہ مجھ سے کہا تو میں شرمندہ

”معافی چاہتا ہوں ماں! دراصل وہ اچانک ایک فون آ گیا تھا۔“

”کس کا فون تھا؟“ ماں نے بہ غور میرے چہرے پر نظریں جما کر پوچھا۔ میں بری طرح شیشا گیا مگر

بہروراً ہی بولا۔

”گنبد کا۔“

”اوہ.....“ ماں نے ہولے سے کہا۔ ان کی مختصر سی ”اوہ“ میں طنز کی گہری کاٹ تھی۔ ”ظاہر ہے،

بہروراً تم نے اپنی ماں کو بھلا ہی تھا۔“ ماں کے اس کاٹ دار جملے نے مجھے چیر کر رکھ دیا۔

”میںیں ماں! ایسی بات نہیں تھی۔ دراصل وہ.....“ میں نے کہنا چاہا مگر ماں نے میری بات کاٹ

کر کہا۔

”جھوٹو یہ فضول تاویلیں..... تم یہ بتاؤ کہ غیر مشتاق سیال کی ضمانت کے سلسلے میں تم نے کچھ

کیا.....؟“

میں ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”میں نے تمہانے جا کر انسپکٹر اعجاز شمس سے ملاقات کی تھی۔“

”تمہیں اس کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی؟“ ماں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تمہیں تو فوراً حامد

سمرانی سے ملاقات کرنی چاہئے تھی۔ لیکن تم تو کہیں اور ہی اچھے ہوئے ہو۔ دشمن کی بیٹی نے تمہارے دل

و دماغ حتیٰ کہ تمہاری غیرت کو بھی زنگ لگا دیا ہے۔ تمہارے دل سے اپنوں کی بھلائی، باپ کا بے گناہ

فون سب کچھ مٹا کر رکھ دیا ہے۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ تمہارے جیسا بھرو بیٹا، جس پر مجھے ہمیشہ

خبر تھا، دشمنوں کی اس حسین مگر گھناؤنی چال میں آچکا ہے۔“ ماں کے ان بے رحم فقروں نے مجھے پھلتی کر

ڈالا تھا۔ وہ حقیقت نہیں جانتی تھیں اور نہ ہی سننا چاہتی تھیں۔

میں نے تڑپ کر کہا۔ ”ماں! ایسا مت کہو..... میں کچھ نہیں بھولا ہوں۔ گنبد دشمنوں کی گہری



ہو گیا ہے۔ یوں وہ میرے اندھیرے میں چلائے ہوئے تیر کا شکار ہو گیا اور تیزی کے ساتھ گیارے اندر داخل ہوا تو میں نے اس کے ساتھ بھی پہلے والے جیسا سلوک کیا۔ دونوں کو زیر کرنے کے بعد تیزی سے آگے بڑھا۔ گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ پختہ روش کے دائیں بائیں اٹان تھا جہاں ذرا ذرا فاصلے پر چند آہنی پائپوں پر دودھیا گلوب روشن تھے۔ میں یہاں پہلے بھی آچکا اس لئے مجھ سے کوئی کا اندرونی عمل وقوع پوشیدہ نہ تھا۔ میں گھنے پودوں اور بیلوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھتا تھا تو اچانک مجھے اپنی دائیں جانب ایک ہولناک غراہٹ سنائی دی۔ میں بری طرح ٹھک کر رک گیا اور آواز کی سمت دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میرے سامنے صرف چند قدموں کے فاصلے پر نیم کتا کھڑا میری طرف خوفناک چمکتی ہوئی نظروں سے گھور رہا تھا۔ یہ اسیٹھن کتا تھا۔ اسے بھونکنے کی عادت تھی۔ اس کی خوشخوار بھونکنے سے شکاری دانتوں کی خوفناک آواز کی بجائے پھر اس سے پہلے کے میں سمجھتا، اس نے دوسری بار غرا کر مجھ پر جست لگا دی۔ میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور غیر ارادی طور پر دفاع کے لئے اٹھنے والے میرے دونوں ہاتھوں کا ٹکنبہ مای گردن پر کس گیا۔ اگرچہ میں اس کے اچانک جھپٹنے سے گھاس پر پشت کے بل گر گیا تھا مگر میں نے اس کی گردن پر اپنے دونوں ہاتھوں کے شکنجے کی گرفت ڈھیلی نہ کی تھی۔ وہ میرا زرخہ بھنبھوننے کے چکر مارا اور میں جانتا تھا کہ اگر ایک بار میرا زرخہ اس کے لمبے لمبے شکاری دانتوں میں آ گیا تو اسے بڑے میں مطلق دیر نہیں لگائے گا۔ نیز وہ اپنے اگلے دو پنجوں سے میرے سینے کو بھی ادھیڑنے میں ف ہو گیا۔ اس کے لمبے لمبے، نوکیلے ناخنوں نے میرے سینے کو پھیل کر رکھ دیا تھا۔ پھر جیسے مجھ پر ہون سوار ہو گیا۔ میں غضب کی پھرتی کے ساتھ اپنے دائیں بازو کو اس کی گردن کے گرد حاصل کر کے ہاتھ کا زور دائیں بازو میں متوازن کرتے ہوئے پہلو کے بل ہو گیا اور اس کی گردن اپنے آرام کے زور پر دبانا چلا گیا۔ اس کے حلق سے اُٹنے والی گرہ غراہٹیں نکلنے لگیں۔ اور زراعی دیر بعد وہ دھیل پڑ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے ایک گہرا سانس خارج کر کے اسے گھنے پودوں کی اچھال دیا۔ میری شرٹ پھٹ گئی تھی اور سینے میں خراشوں کے سبب جلن سی ہو رہی تھی۔ چند ٹاپے لمبے سانس لینے کے بعد میں آگے بڑھا۔

کوئی کا وسطی بحرانی دروازہ بند تھا۔ البتہ بالکونی کے قریب نیچے کھڑی انٹرکولر چھت پر آ کر میں بالکونی اچھال گیا۔ اندر مختصر سے تاریک کوریڈور میں ٹھنڈے والے دروازے کے ذریعے داخل ہو کر میں نے نوباری کمروں میں جھانکنا شروع کر دیا۔ پہلے دو کمرے خالی تھے۔ البتہ یہ خواب گاہیں تھیں۔ اسی اٹان مجھے خیال آیا کہ میری شرٹ تار تار ہو چکی ہے۔ ہولٹ واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اٹان خاموشی سے ایک کمرے میں داخل ہوا اور الماری میں خوش قسمتی سے مجھے ایک شرٹ مل گئی۔ اسے روم میں مجھے زیرو پاور کے بلب کی نیلگوں روشنی میں نگینہ اپنے بیڈ پر گہری نیند سوئی نظر آ گئی۔ بڑے بڑے جبر سوا پا کر میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ مجھے اس کے سکون میں غفلت نے پردہ بھی ہوا۔ لیکن پھر میں نے خود کو سلی دی کہ میں یہ سب اسی کی بھلائی کی خاطر کر رہا ہوں۔ وہ نہایت کو، مجھے بھلا چکی تھی۔ کبیر جیسا شیطان صفت سنپولیا اس سے عنقریب منگنی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ میں نے جی کڑا کر کے اپنا سائلنسر لگا میکارڈ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور سبلا بھلا۔ مجھے اپنا دل مضبوط کرنا تھا۔ ذرا بھی جذباتی لڑکھڑاہٹ کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ اس کے قریب

میں نے اس پر ماتم کرنے کی بجائے صورت حال پر قابو پانے کا سوچا۔ میرے پاس اپنا آزمودہ میکارڈ موجود تھا جس پر میں نے سائلنسر چڑھا رکھا تھا۔ لیکن میں ان حالات میں ذرا سی بھی خون ریزی کا شکار نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ سب کام مجھے انتہائی خاموشی، ہوشیاری اور رازداری کے ساتھ نمٹنا تھے۔ شاہ میرن کوئی پر تعینات ان دونوں مسلح گارڈز پر شور شرابے کے بغیر پایا پانا ضروری تھا۔ ایک قریبی تاریک گوشے میں سٹ کر میں نے اپنے اطراف کا بغور جائزہ لیا۔ ان دونوں گارڈز پر نظریں جمادیں۔

اسٹریٹ لیمپس روشن تھے جس سے آس پاس کا ماحول خاصی حد تک روشن تھا۔ تاہم ان دونوں کے علاوہ دور تک کوئی ذی نفس نظر نہ آتا تھا۔ ان کا پہرہ دینے کا انداز بڑا منظم تھا۔ اپنے منھے ہوئے انداز، اطوار سے ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں کسی پرائیویٹ سکیورٹی ایجنسی کے باقاعدہ تربیت یافتہ گارڈز تھے۔ ان کے جسموں پر چست خاکی وردی تھی اور بیروں میں لاٹک بوٹ۔ سر پر پی کیپ تھی اور کانڈھوں پر حد نظر تک مار کرنے والی ایم پی فائبر رائفلیں تھیں۔ ان دونوں میں سے ایک گیٹ کے سامنے کھڑا ہوتا جبکہ دوسرا انھیں کے سامنے تقریباً بیس قدم دائیں اور پھر بیس قدم بائیں گشت لگاتا۔ اس دوران اس کی عقابی نگاہیں چار اطراف میں گردش کرتی رہتیں۔ جبکہ اس کا دوسرا ساھی گارڈ گیٹ کے سامنے کھڑا اپنے ساھی کو ٹریس کر رہا ہوتا۔ اس طرح پھر دوسرے کی باری آتی۔ مجھے اب بیک وقت دونوں پر قابو پانا تھا۔ میں نے بغور شاہ میر کی کوئی کی آخری حد کا جائزہ لیا۔ تب میں نے دیکھا، جہاں گشت لگانے والے گارڈ کی حد ختم ہوتی تھی، اس سے تھیں چند قدم کے فاصلے پر کوئی کی بیرونی دیوار کے قریب ایک تنگ سا گلیا تھا۔ کچھ سوچ کر میں واپس پلٹا اور عقب سے ہوتا ہوا اس تنگ گلیارے میں آ گیا اور دیوار سے چپکا چپکا اگلے سرے تک جا پہنچا۔ پھر ذرا سر ابھار کر دیوار کی آڑ سے دیکھا تو وہ گارڈ اپنا مختصر سا گشت پورا کر کے لوٹ رہا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ گیٹ پر جا کھڑا ہوا۔ دونوں گارڈ تھوڑی دیر تک وہاں کچھ دیر ٹنگ چیریز پر بیٹھے سگریٹ پیتے رہے پھر اس کے بعد دوسرا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پہلے بائیں طرف کا گشت پورا کیا، پھر گیٹ کے سامنے سے چلتا ہوا میری سمت آنے لگا۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پایا اور ایک پتھر اٹھا لیا۔ پھر جیسے وہ گارڈ اپنا دائیں طرف کا گشت پورا کر کے واپس لوٹنے لگا تو میں نے وہ پتھر اس کی طرف اچھال دیا۔ وہ ٹھک کر مڑا، پھر اس گلیارے کی طرف دیکھتا ہوا محتاط انداز میں قریب آنے لگا۔ میں مزید اندر کی طرف تاریکی میں ہو گیا۔ اور پھر جیسے ہی وہ گلیارے کے سامنے پہنچ کر رکا اور اندر کی نیم تاریکی میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، میں نے اپنے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکالنا شروع کر دیں۔ وہ اپنی آنکھیں سکیڑتا ہوا مزید قریب آیا تو میں نے جلی کی سی پھرتی کے ساتھ اس کی گردن ٹاپ لی اور اسے میکارڈ پستول کا فولادی دستہ اس کی کینٹھ پر بجا دیا۔ اس کے حلق سے گھنی گھنی کراہ خارج ہو گئی اور وہ تیرا کر گرا۔ اس دوران اس کا دوسرا ساھی اسے نکارتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے شاید خطرہ محسوس کر لیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے اب اپنے کانڈھے سے گن اتار کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی تھی۔

میں اب اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ ”کون ہے یہاں؟ باہر نکلو، ورنہ گولی چلا دوں گا۔“ وہ رائفل کی نال ہلاتے ہوئے دنگ لہجے میں لاکارا۔ مگر میں خاموشی سے تاریکی میں دیوار سے چپکا کھڑا رہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ابھی اندھیرے میں گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ میں نے گھنی گھنی آواز میں کہا۔ ”ادھر آؤ..... مجھے سس..... سانپ نے ڈس لیا ہے۔“ میں نے دانستہ ایسی آواز میں کہا کہ وہ شبہ نہ کر سکے۔ کیونکہ ایک تو اس نے مجھے ابھی تک نہ دیکھا تھا، پھر دوسرے یہ کہ اس سمت میں اس کا ساھی داخل ہو کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔ وہ یہی سمجھا کہ ضرور اس کا اپنا ہی ساھی کسی تکلیف میں

نے بھی سر سے کفن باندھ لیا ہے۔ مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں۔ مجھے صرف پینتیس لاکھ کی اشد ضرورت ہے تاکہ میں اپنی بیمار اور محبوب بیوی کا بیرون ملک علاج کروا سکوں۔ کیونکہ میں اس سے شدید بیمار ہوں۔ اس کے بغیر میری زندگی موت سے بھی بدتر ہے۔ وہ ایک موذی مرض کا شکار ہو چکی ہے جس کا علاج صرف بیرون ملک میں ممکن ہے۔ یہ سب میں تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں تاکہ تم میرے زائِم سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لو اور میرے ساتھ تب تک تعاون کرتی رہو جب تک تمہارا باپ اہم میرے پاس نہیں لے کر پہنچ جاتا۔ میں نے دانستہ دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔ میں نگینہ کے قریب چکا تھا، اس کی فطرت سے خوب واقف تھا۔ وہ اپنے اندر درد مند دل بھی رکھتی تھی۔ تاہم وہ تجسّس و جاسوسی کی مالک بھی تھی۔ جب اسے اچھی طرح میرے عزائم اور میری مجبوری کے بارے میں اندازہ ہو گا تو اس نے خود کو فوراً سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

”لیکن..... تم تو مجھے فون کر کے عجب و غریب باتیں کرتے تھے؟ تم میری نگینہ ہو، مجھے پہچاننے کی کوشش کرو..... پھر وہ سب کیا ڈراما تھا؟“

مجھے پورا یقین تھا کہ یہ سوال وہ ضرور پوچھے گی۔ لہذا میں نے جواب دیا۔ ”میں تمہیں اپنی جھوٹی بات کے جال میں پھنسانا چاہتا تھا تاکہ تمہیں بھلا پھسلا کر آسانی سے یرغمال بنا سکوں۔ مگر مجھے اب وہ طریقہ آزمایا پڑا۔“

اس اثناء میں ایک مسافر وگن آ کر رکی۔ میں اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے نگینہ کو آخری بار جان سے مارنے کی دھمکی دی۔ اسے یہ سب بتانے کا میرا مقصد یہی تھا کہ اچھی طرح سمجھ لے کہ میں اسے اس کی کسی غلط حرکت پر جان سے مارنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ اس طرح وہ پوری طرح سے میرے ”قابو“ میں آ گئی تھی۔

میں اسے وگن میں لے کر سوار ہو گیا۔ ذرا دیر بعد وگن اسلام آباد کی طرف روانہ ہو گئی۔ نگینہ میرے ساتھ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ خود میرا بھی دل انجانے اندیشوں سے بے طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں یہ شور و گرجا میرا بھانڈا نہ پھوڑ ڈالے۔ مگر خیریت گزری کہ اس نے ایسی کوئی حرکت نہ کی۔ اسلام آباد پہنچ کر ہم نے اسے اتارے تو میں نے اس سے کہا۔

”میری بات غور سے سنو..... اب ہم یہاں سے سیدھا بائی ایئر چترال کی طرف روانہ ہوں۔ تم مجھے کس تم؟“

”میری توقع کے عین مطابق پریشان ہو گئی اور بولی۔“ آخر تم مجھے اتنی دور کیوں لے جانا چاہتے ہو؟ میں نے کہا۔ ”میں نے یہی گولیاں نہیں کھلی ہیں۔“ میں نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔ ”یہاں تمہارے باپ کا لہجہ ہے۔ وہ یہاں کی پولیس انتظامیہ کو اپنے ساتھ ملا کر میرے خلاف کارروائی کر سکتا ہے۔ لیکن میں جیسے دور دراز علاقے میں وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس لئے کہ میرا اصل ٹھکانا بھی وہیں ہے۔ لہذا وہ میرے خلاف کوئی جال نہیں بچھا سکتا۔“

”مجھے تمہاری یہ منطق سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔“ نگینہ نے جھنجھلا کر کہا۔ میں دل میں مسکرایا مگر سنگدلی سے غرا کر بولا۔

”تمہیں اس سب سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے۔ میں اپنے تحفظ کے لئے وہی کروں گا جو بہتر ہوگا۔ تم اپنی چونچ بند رکھو۔“

پہنچ کر میں نے اسے زور سے جھنجھوڑا۔ میرا دل کنبیوں میں دھڑکنے لگا۔ اور پھر وہ جیسے ہی ہڑبڑا کر اٹھ کر میں نے اس کے منہ پر ہاتھ کر دیا کہ کہیں وہ مجھے دیکھ کر غیر ارادی چیخ نہ مار بیٹھے۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ ان سرگمیں اور مدد بھری آنکھوں میں میرے لئے محبت کا سمندر موجزن ہوتا تھا مگر آج وہ محبت جیسے عقدا ہو گئی تھی۔ بہر طور میں نے دل پر جبر کر کے اسے خونچکان نظروں سے گھورا اور غرا کر بولا۔

”خاموش!..... آواز نہ نکالنا۔ ورنہ یہ پستول دیکھ رہی ہو، اس میں سے خاموش گولی نکل کر تمہاری کھوپڑی میں پھوس ہو جائے گی۔ میں ہاتھ ہٹا رہا ہوں، اوکے۔“

اس کی آنکھوں میں سراپسنگی اتر آئی تھی۔ پھر اس نے ہولے سے اپنا سر ہلایا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کے دہن سے اپنا ہاتھ ہٹایا تو وہ کھٹی کھٹی سی، خوف زدہ آواز میں بولی۔

”ت..... ت..... تم کک..... کیا چاہتے ہو؟“

میں نے اسے مزید خوف زدہ کرنے کی خاطر جبراً اپنے ہونٹوں پر خونخوار مسکراہٹ سموتے ہوئے کہا۔

”مجھے رُم چاہئے۔“

”ت..... تمہیں..... جو کچھ چاہئے..... وہ..... وہ..... پلیر! ام..... مجھے مجبور.....“

”وہ..... وہ..... تمہیں.....“

میں نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔ ”مجھے معمولی رُم نہیں، پورے پینتیس لاکھ درکار ہیں۔ جو تمہارا باپ نادان کی صورت میں مجھے دے گا۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ اٹھو، میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ یہ کہہ کر میں نے اسے بازو سے پکڑ کر بیڑے سے اٹھا دیا۔

”ت..... تم مجھے کک..... کہاں لے جانا چاہتے ہو؟“ وہ ککنت زدہ لہجے میں بولی۔

”جہاں تمہیں لے جانا چاہتا ہوں، وہاں بہت جلد تمہارا باپ نوٹوں سے بھرے ہوئے بریف کیس سمیت پہنچ جائے گا۔ چلو میرے ساتھ۔“ پھر میں نے کہا۔ ”میں تمہیں ذرا بھی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے صرف اور صرف دولت سے غرض ہے۔ لیکن اگر تم نے ذرا سی بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو پستول دیکھ رہی ہو، اس پر سالٹسٹر لگا ہوا ہے۔ فائر کی ذرا سی بھی آواز نہیں اُبھرے گی اور تم اگلے جہاز میں پہنچ جاؤ گی۔ چلو اب۔“ وہ بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی اور یہی میں چاہتا تھا۔

بہر طور میں اسے لے کر جلدی سے باہر آ گیا۔ ہر طرف سانے کا راج تھا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا تیز تیز قدموں سے ایک طرف چل پڑا۔ فی الوقت میں نگینہ پر اپنا یہی تاثر قائم کرنا چاہتا تھا کہ میں نادان کی صورت میں اس کے باپ شاہ میر سے ایک خطیر رُم اٹھانے کے لئے ہی اسے یرغمال بنا چاہتا تھا تاکہ وہ بھی خود کو ذہنی طور پر اس کے لئے تیار کر لے اور بلا چوں چا میرا کہا مانتی رہے۔ ضروری تھا۔

دور مشرقی سمت اب پوہ پہنچنے لگی تھی۔ نماز فجر کی اذانوں کی روح پرور آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ میں اسے لے کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مسافر ویکوں کے اوڑے تک پہنچا۔ یہاں سے ٹیکسیاں بھی ملتی تھیں۔ لیکن اس وقت نہ کوئی ٹیکسی نظر آ رہی تھی اور نہ ہی کوئی مسافر وگن۔ ایک گھوٹے رکنے کے بعد ہم نے اپنی سائیس بحال کیں۔ میں نے میگا رڈ اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ نگینہ کی حالت اب بھی غیر تھی۔ میں نے اسے ایک بار پھر دھمکاتے ہوئے کہا۔

”سنو! میں جانتا ہوں کہ تمہارا باپ بہت دولت مند ہے اور اثر و رسوخ بھی رکھتا ہے۔ مگر یاد رکھو۔“

میں نے اپنی رست وچ میں وقت دیکھا، فلائٹ کی روانگی میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے ٹیکس کروائی، گنبد کے ساتھ عقبی سیٹ پر بیٹھا اور ٹیکسی والے کو ایئر پورٹ چلنے کا کہا۔ ٹیکسی روانہ ہو گئی۔ جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، میرے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی میں دزدیدہ نظروں سے گنبد کے چہرے کے تاثرات کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے اگرچہ اب ہراس کی کیفیت کم ہونے لگی تھی لیکن اب اس کی جگہ ایک اُبھرنے والی پریشانی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اسے غائب چترال لے جانے والی بات نے اُنکھن میں ڈالا ہوا تھا۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ عین طیارے میں سوار ہوتے وقت کوئی گل نہ کھلا دے۔ اگرچہ میں نے اسے خوف زدہ تو کر رکھا تھا مگر میں نے طیارے میں سوار ہونے سے قبل بھی دھمکی کی ایک ”ڈوز“ دینا ضروری سمجھا تھا۔ پھر جیسے ہی ہماری ٹیکسی ایئر پورٹ کے ذرا قریب پہنچی تو میں بری طرح چونک پڑا۔ وہاں نئے پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ مجھے یکا یک خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے فوراً ٹیکسی والے کو رکنے کا حکم دیا۔ کم بخت ٹیکسی والے نے بحث شروع کر دی۔

”ابو جی! ایئر پورٹ تک تو پہنچنے دیں۔“

میں نے فوراً میکارڈ نکال کر اس کی کینٹی پر رکھ دیا اور غرا کر اسے ٹیکسی روکنے کا کہا۔ ٹیکسی کی رفتار تھی۔ کچھ وہ بھی شاید سامنے پولیس کی گاڑیوں کو کھڑا دیکھ کر شک میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بہر طور، وہ ہٹول اور میرا جارحانہ انداز، اس نے خوف زدگی کے عالم میں یکدم بریک لگا دیئے۔ ٹیکسی کے ٹائر سڑک پر جام ہو کر زور سے چرچائے۔ پولیس والے یکدم ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ گنبد وقت غیر ارادی طور پر ہونے والی غلطی پر ماتم کرنے کا نہ تھا۔ میں نے ڈرائیور کو ٹیکسی سے باہر دھکا دیا۔ پولیس کی گاڑیوں کے قریب کھڑے اہلکاروں نے کچھ بھانپ لیا۔ میں نے ڈرائیورنگ سیٹ سے سنبھالتے ہی ٹیکسی ایک پوٹن لے کر بڑھا دی۔ آٹا فانا پولیس کی دو جھپیں اور ایک موبائل میرے پیچھے سائرن بجاتی ہوئی لگ گئیں۔ کھیل بگڑ گیا تھا۔

گنبد بھی پریشان ہو گئی تھی۔ میں نے غرا کر اسے اگلی نشست پر آنے کا کہا۔ وہ اُچھل کر میرے بلے کی سیٹ پر آ بیٹھی۔ میں ٹیکسی کو اب آندھی طوفان کی طرح اڑائے لے جا رہا تھا۔ کچھ ایسا لگتا تھا کہ شاہ میر نے اپنی بیٹی کے اچانک اور پراسرار غیاب پر ہنڈی سے لے کر اسلام آباد تک کی پولیس انتظامیہ کو میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ چونکہ کبیر میرے منصوبے اور میرے عجیب و غریب ایڈ وچر سے واقف تھا اس لیے بانی ہدایات دینے کی کسر اس نے پوری کر دی ہوگی۔ یہ میری فاش غلطی تھی۔ میں اس حقیقت کو بھلا جانے کے کبیر گنبد کو چترال لے جانے والی بات سے آگاہ تھا۔ پولیس نے سب سے پہلے ایئر پورٹ کی طرف شروع کر دی تھی۔ کیونکہ کبیر جانتا تھا کہ ایک تو گنبد کو اغواء کرنے والا میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرے میں اسے اغواء کر کے کہاں لے جانا چاہتا تھا؟ ایک خیال یہ بھی آیا کہ ہو سکتا ہے، پولیس کسی اور ہی وجہ سے وہاں موجود ہو اور پھر ٹیکسی کو مشتہ انداز میں اچانک بریک لگا کر دھکے دے دے۔

پچھے لگ گئی ہو۔ بہر طور اب میں اس بگڑی ہوئی صورت حال پر قابو پانے کے لئے ٹیکسی کو خاصی رفتار سے اڑائے جا رہا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں مخصوص سائرن بجاتی میرے تعاقب میں تھیں۔ انہیں ڈان دینا لازماً تھا۔ اس لئے میرا شہر کی مصروف شاہراہوں کی بھول بھلیوں میں جانا ضروری تھا۔ میں اس وقت انتظامیہ کیلٹر کی شاہراہ پر تھا۔ یہاں رش کم تھا اور سڑک بھی سیدھی تھی۔ مجھے تیز رفتاری کے ساتھ ٹیکسی دوڑانے ہوئے اس پر کنٹرول بھی قائم رکھنا تھا۔ ورنہ کسی قسم کا خطرناک حادثہ گنبد اور میری جان لے سکتا تھا۔

میں نے ایک موڑ کاٹا۔ نیشنل پارک سے بڑا خطرناک راؤنڈ ہاؤس ٹرن لیا تو کار دو پہیوں پر آ گئی۔ بڑے حلق سے چیخ نکلی اور وہ میرے اوپر آ گئی۔ میں نے اسے ایک ہاتھ سے فوراً پرے کیا۔ راؤنڈ ہاؤس سے گھومتے ہی میں شہر کے وسط میں آ گیا۔ یہاں سے نیشنل اسٹیبل کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اس ذرا ہی پہلے ایک تنگ سائڈلی یا اضافی موڑ دائیں جانب مڑتا تھا۔ میں نے ٹیکسی کی رفتار کم کر کے اس موڑ پر پہنچا۔ پھر سپریم کورٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے راول جھیل کی طرف جانے کی بجائے میں ٹیکسی ایسٹری روڈ کی طرف موڑ دی۔ یہاں کئی ایسٹریز کے دفاتر تھے۔ اس کے بعد ایک طویل رہائشی شروع ہوتا تھا۔ یہاں کئی موڑ تھے۔ میں نے فوری طور پر دو تین موڑ کاٹے۔ میں پولیس گاڑیوں کو دھکے دینے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ لیکن پھر جیسے ہی میں نے مین شاہراہ کی طرف نکلنے والے ایک تنگ رٹارڈ راستے کا انتخاب کیا تو اچانک پولیس کی ایک جیب سائرن بجاتی ہوئی سامنے آ گئی۔.....

تصادف یقینی تھا۔ وہاں اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں ٹیکسی واپس گھما سکتا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے پولیس بکرا کر ہی اپنی راہ نکالنی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس والے مجھ پر فارنگ نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ میں نے میرے ساتھ گنبد کی جھلک دیکھ لی تھی۔ البتہ جیسے ہی انہوں نے میری ٹیکسی کو زور کے بغیر حزیہ رکھتے دیکھا تو جیب کو یکدم بریک لگا کر پولیس والے بدحواس ہو کر جیب سے باہر کودنے لگے۔ بے دونوں ہاتھ مضبوطی کے ساتھ اسٹیرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ گنبد حواس باختہ سی دم بہ خود بیٹھی تھی۔ انے خود کو تقدیر کے سپرد کر دیا تھا۔

میری ٹیکسی جیب کے ہونٹ سے ٹکرائی۔ پولیس اہلکار چھلانگیں لگا کر پرے ہٹ گئے۔ ایک دھماکا لگی پولیس جیب کو دھکیلتی اپنے نکلنے کا راستہ بناتی مین شاہراہ پر آ گئی۔ میں نے جلدی سے گاڑی کو بائیں جانب موڑا تو اچانک عقب سے سائرن کی آواز اُبھری۔ میں نے بیک ویو مرر پر نظر ڈالی۔ وہ اس موبائل تھی۔ میں نے ہونٹ سمجھنے لئے۔ اچانک سامنے ایک مسافر کوچ آ گئی۔ میں نے فوراً بریک پاؤں رکھ دیا۔ ٹائر زور سے چرچائے۔ کوچ کے ڈرائیور نے فوراً اسٹیرنگ گھمایا۔ میں رائگ سائیڈ پر پہنچے۔ مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ میں پولیس کی تیوں گاڑیوں کو ڈانج دے چکا ہوں۔ لیکن پولیس مجھے گھیرنے چکروں میں تھی۔

بہر طور مسافر کوچ نے جیسے ہی مجھے راستہ دیا، میں نے بریک پر سے پاؤں ہٹا دیئے۔ بائیں جانب لائڈم کی ریلنگ تھی۔ نیچے جھاگ اڑا تا پانی تھا اور جگہ تنگ تھی۔ میری ٹیکسی ریلنگ توڑ کر کئی فٹ نیچے سے جھاگ اڑاتے پانیوں میں گر سکتی تھی۔ کیونکہ ہماری بھر کم کوچ نے مجھے بہت تنگ راستہ دیا تھا۔

میری ٹیکسی ریلنگ کو چھوئی ہوئی نکل گئی۔ دفعۃً مجھے عقب میں ساعت شکن دھماکا سنائی دیا۔ میں نے فوری طور پر بیک ویو مرر میں دیکھا، کوچ پولیس موبائل سے ٹکرا گئی تھی۔ گنبد نے اب چلانا شروع کر دیا۔

”روکو..... رکو..... گاڑی!“

میں پریشان ہو گیا۔ ماتم میں نے غرا کر کہا۔ ”چپ چاپ بیٹھی رہو!“

میں اب ویران سڑک پر آ گیا۔ عقب میں اچانک مجھے برست چلنے کی خوفناک ترتر ہٹ سنائی دی۔ بڑے حلق سے ہسٹرائی جھپیں بلند ہو گئیں۔ میں نے گھبرا کر بیک ویو مرر میں دیکھا، پولیس کی تیسری گاڑی میرے تعاقب میں تھی اور وہ اب میری کار کے ٹائر برست کرنے کے چکروں میں تھے۔ کھلی اور نسبتاً شاہراہ پر آنے کی وجہ سے انہوں نے یہ ہمت کر ڈالی تھی۔ میں ٹیکسی کو زگ زگ انداز میں

”جہاری ایک مجبوری ہے۔“ وہ بے پرواہی سے بولی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا فطری لاابالی پن لوٹ گیا تھا۔

”کچھ بھی سہی..... میں ایک انسان کی زندگی بچانے کے لئے دوسرے کی زندگی کو داؤ پر لگائے ہوں..... یہ بہر حال غلط ہے۔“

وہ میرا اشارہ سمجھ کر بولی۔ ”محبت میں سب جائز ہے۔ تمہیں کم از کم اپنی غلطی کا احساس تو ہے نا۔“ اس کی بات سے اچانک مجھ پر ایک عجیب سا سحر طاری ہونے لگا۔ وہ شاید میری فرضی اور من گھڑی بات سے متاثر ہو گئی تھی۔ میں نے کار کی رفتار مزید کم کر دی۔ سڑک دور تک دیران تھی۔ کوئی اکاؤ کا یا مسافر گزری کو چڑ گزر جاتیں۔ دائیں بائیں دیوار اور چیز کے پیڑوں کا گھٹنا سلسلہ سڑک کے دو طرف پھیلا نظر آتا تھا۔

دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ فضا میں گل بوٹوں کی خوشگوار مہک رچی ہوئی تھی۔ ”تو کیا میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ تمہاری نظروں میں درست ہے؟“ میں نے اس کی سرنگیں آنکھوں اپنی مفروضہ کہانی کی ”اثر پذیری“ بھانپنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”ہاں.....“ اس نے ہولے سے کہا تو مجھے چنداں تعجب نہ ہوا۔ وہ ایسی ہی فطرت کی مالک تھی۔ میں نے اسے اپنی کہانی کے اثر میں آتے دیکھا تو اچانک میرے دماغ میں ایک بہت ہی عجیب و غریب تصویر تشکیل پانے لگا۔ چنانچہ میں بولا۔

”لیکن میں جانتا ہوں، یہ طریقہ بہر حال غلط ہے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ مگر.....“

”کیا کروں مس گنیز! میں اپنی محبوبہ بیوی نگہت کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا..... نہیں دیکھ سکتا۔“

”مگر انگیز تاثر کو حقیقی بنانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے اپنے اندر گنیز کا غم سمولیا۔ میں نے نیکی دہی۔ وہ حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔

”احول میں آرزو سی خاموشی طاری تھی۔ میری آنکھیں گنیز کے غم میں بھگینے لگی تھیں۔ میں نے آبدیدہ اس سے گنیز کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”مس گنیز! ہو سکتے تو مجھے معاف کر دینا۔ اور پلیز، کوئی ایسی حرکت نہ کرنا کہ میں کوئی غلط قدم اٹھا لوں جو میرے ضمیر پر تمام عمر کا بوجھ بن جائے۔“

”مس گنیز! تم اسی طرح میرے ساتھ تعاون کرتی رہیں گے۔ میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ تمہارا دل سے احترام کروں گا۔ رقم مل جانے کے بعد جب میں نگہت لائے گا تو میرا وعدہ ہے کہ میں تمہارے پاس آکر اپنا سر جھکا دوں گا۔ پھر چاہے تم اور میں کبھی مل جائے، مجھے قبول ہوگی..... میری نگہت کو دوبارہ زندگی مل جائے، مجھے اور

میں نے دیکھا، گنیز کے چہرے پر کچھ عجیب سا ارتعاش ابھرا۔ وہ ایک تک میرا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

”میں نے ایک گہری سانس لے کر متاثر کن لہجے میں بولی۔

”مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم واقعی اپنی بیوی نگہت سے سچی محبت کرتے ہو۔ وہ واقعی بہت خوش قسمت ہے۔ اسے ہرگز نہیں مرنا چاہئے۔ لیکن نادر! تم نے یہ خطرناک قدم اٹھا کر پولیس کو اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ اس طرح تو تم نے خود کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ تم میرے پیٹا کو نہیں جانتے۔ وہ بہت اثر و رسوخ رکھتا ہے۔“

”تم نے میرے دکھ کا اندازہ کر کے ثابت کر دیا کہ تم واقعی ایک درد مند اور رحم دل لڑکی ہو۔ اب تو

دوڑا نہ لگا۔ لیکن اس طرح مجھے رفتار کم کرنا پڑ رہی تھی۔ یہ صورت دیگر نیکی کے اٹھنے کا احتمال تھا۔ میں نے زگ زگ انداز ترک کرتے ہوئے نیکی کی رفتار بڑھا دی۔ اچانک میرے موبائل کی بیل گنگناہٹ لگی۔ میرے پاس سر کھانے کا وقت نہ تھا، موبائل پر ہونے والی کال کہاں سن سکتا تھا۔ آگے ایک موڑ رہا تھا۔ میں نے فوری طور پر ایک خطرناک فیصلہ کیا اور دائیں ہاتھ میں میگا روٹ نکال کر پکڑ لیا۔

موڑ پر نیکی کی رفتار کم کرتے ہوئے میں نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر پولیس جیب کی ونڈ اسکرین کا نشانہ لے کر بلبی دبا دی۔ جیب کی ونڈ اسکرین ٹوٹنے کا چھٹا ہر طرف پھیلتا چلا گیا۔ میرے میگا روٹ کی خاموش گولی نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ پولیس جیب کا کیا حشر ہوا؟ مجھے نہیں معلوم۔ البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ اب وہ میرے تعاقب میں نہ تھی۔ میری نیکی اب شہر کے مضافات میں آندھی طوفان کی طرح دوڑے جا رہی تھی۔ میں شہر کی تنگ گلیوں سے دور نکل آیا تھا۔ راستہ صاف تھا۔ میں نے ایک نگاہ اپنے برابر میں ڈری سبھی نیکی پر ڈالی۔ وہ جیسے سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ مجھے اس طرح کے جاری تھے کہ اب میرے انسان ہونے پر بھی شبہ ہونے لگا ہو۔

”دیکھ لیا تم نے..... مس گنیز! میں نے سر سے کفن باندھ رکھا ہے۔ تمہیں خوب اندازہ ہو رہا ہوگا کہ مجھے اپنی بیمار اور موت کی گھڑیاں کتنی ہوئی بیوی سے کس قدر شدید محبت ہے۔ میں اس کی خاطر جان کی بازی بھی لگا سکتا ہوں..... اور تمہیں تمہاری ذرا سی لغزش پر موت کے گھاٹ بھی اتار سکتا ہوں۔“

آخری الفاظ پر میں نے دل ہی دل میں ”اللہ نہ کرے“ کہا تھا۔ لیکن یہ ضروری تھا۔ میں خوف زدہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ کسی قسم کی غلط حرکت کر کے مجھے مشکل میں نہ ڈال دے۔

میں نے دیکھا، گنیز کے چہرے پر اب عجیب سے تاثرات ابھرے تھے۔ میری نظریں ونڈ اسکرین کے پار چمکتی سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ تاہم میں گاہے گاہے دزدیدہ نظروں سے اس کے چہرے کو بھی دیکھ لیتا تھا۔

”تم اپنی بیوی سے واقعی اتنی شدید محبت کرتے ہو؟“ دفعۃً اس نے عجیب سے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ میں قدرے چونکا۔ پھر نیکی کی رفتار ذرا کم کر کے ایک گہری ہرکاری لے کر بولا۔

”ہاں..... بہت زیادہ۔“ میں نے کوشش کی تھی کہ میرے یہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکلیں۔

”بہت خوش قسمت ہے وہ..... کیا نام ہے اس کا؟“ گنیز نے پوچھا تو میرا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔ مجھے اداکاری کا یہ تاثر قائم رکھنا ضروری تھا۔ لہذا بولا۔

”نگہت۔“

”اسے کون سی بیماری ہے؟“ اس نے پوچھا۔ اسے اپنے معاملے میں دلچسپی لیتا دیکھ کر مجھے تعجب نہیں ہوا بلکہ خوشی ہوئی تھی۔ کیونکہ میں اس کے درد مند دل سے اچھی طرح واقف تھا۔ لہذا ایک بار پھر روٹا گونی سے کام لے کر آواز کو حد درجہ مغموم بنا کر کہا۔

”اسے برین ٹیور ہے۔“

”اوہ..... دیری سیڈ۔“ بے اختیار گنیز کے لبوں سے نکلا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف غور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں دکھ ہوا یہ سن کر؟“

”ظاہر ہے، میں بھی انسان ہوں۔“ وہ بولی۔

”لیکن میں تو تمہاری جان کا دشمن ہوں؟“ میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

”میں..... بہت عظیم ہو..... میں..... میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتا۔“  
ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی خاطر میں اس کے قدموں کی طرف جھکنے لگا تو وہ بے اختیار ہو  
پڑی۔

”ارے..... رے..... رے..... یہ کیا کر رہے ہو؟“ اس نے میرے کانڈھے کو  
ہاتے ہوئے ملاحت سے کہا۔ ”چلو آؤ۔ ویر ہو رہی ہے۔“ وہ بولی اور پھر ہم دونوں ٹیکسی میں آ بیٹھے۔  
بالکل غیر متوقع طور پر حالات نے اچانک اور بڑے ہی عجیب و غریب انداز میں جذباتی طور پر پلٹا  
ڈالا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اور نگینہ کے بیچ ”گم گشتہ“ تعلق خاطر کی ڈرامائی ”تجدید“ ہو  
چکی ہے۔ یہ جس قدر جذباتی صورت حال تھی اس سے زیادہ دلچسپ اور انوکھی تھی۔ اب میرا کام مزید  
ان ہو گیا تھا۔ گویا ”میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی“ والی بات تھی۔ میں بہ ظاہر نگینہ کو فریب  
دے رہا تھا۔ لیکن میرے اس فریب میں ہم دونوں کی بھلائی مضمر تھی۔

اس نے میری ”مشکل“ کو مزید آسان کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ ہم دونوں سب سے پہلے کسی دور  
”شہر کا رخ کریں اور پھر وہاں سے بذریعہ ٹرین پشاور کی طرف نکل جائیں۔ کیونکہ ایئر پورٹ اب  
لے لے ”غلیش پوائنٹ“ اختیار کر چکا تھا۔ وہاں سختی کے ساتھ جینگ ہو سکتی تھی۔ اس کا مشورہ  
میں نے جاس پر عمل کرنے میں کوئی برائی نہیں سمجھی۔

اب نگینہ میری رہنمائی کر رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا ”جنڈ“ نامی اسٹیشن سے ایک ایکسپریس ٹرین  
رہانی ہے۔ اس کے ذریعے ہی پشاور تک کا سفر ٹھیک رہے گا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ  
انٹرفری کا عالم رہا تھا کہ ہمارے پاس کھانے پینے کے لئے کچھ نہ تھا۔ تقریباً بیس بیس کلومیٹر کے  
لے والے پٹرول پمپ سے میں نے نیکی فل کروائی۔ منزل وائر کی بوتلیں اور کچھ جوس، بسکٹ اور  
بافروہ کے پیکٹ لئے۔ مجھے جنڈ کا راستہ معلوم تھا۔ کار چلاتے ہوئے میں نے نگینہ سے کہا۔

”نگینہ! آپ سے ایک سوال پوچھوں؟“

”ہاں پوچھو۔“ اس نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

”آپ جس طرح دو محبت کرنے والوں کی مدد کر رہی ہیں، ضرور آپ کے دل میں بھی کسی نے اس  
نقد و قیمت بٹھائی ہوگی۔ کیا آپ نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟“ یہ کہتے ہوئے میرے دل کی  
گہرائی پر ترتیب ہونے لگی تھی۔ میرے سوال پر اسے ایک پراسراری چپ لگ گئی تھی۔ میں نے کن  
سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی جیسے اپنے اندر کو کھنگالنے  
ل کر رہی ہو۔ پھر گوگو سے لہجے میں بولی۔

”شاید نہیں۔“

کیا مطلب؟..... شاید کہنے سے آپ کا جواب اثبات میں ہی محسوس ہوتا ہے۔“ میں نے فوراً کہا۔  
”ہاں..... کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسے..... جیسے میں بھی کسی سے بہت شدید محبت کرتی تھی.....  
محبت کہیں کھو گئی ہو۔“ اس کی آواز میں جتنی دوری تھی، اتنی ہی گہرائی بھی تھی۔ میرا دل یکبارگی  
میں نے فوراً کہا۔

”محبت کھو گئی ہے؟..... تو کیا آپ کے ساتھ کسی نے بے وفائی کی ہے؟“

”بات بات پر وہ فنی میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں..... شاید ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ بس کچھ ایسا لگتا  
ہو میرا کچھ کھو گیا ہو۔ کبھی کبھی میرے اندر..... سے ایک ہوک اٹھتی ہے۔ میرے دماغ میں، میرے

شاید میں واقعی تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ بلکہ حقیقت یہی ہے کہ میں تمہیں صرف خوف  
کرنا چاہتا تھا تاکہ تم بلا چوں چرا میرا حکم مانتی چلی جاؤ۔ نگینہ! تمہیں کار چلانی آتی ہے؟“ میں نے اپنے  
ایک جذباتی قسم کے نئے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”ہاں.....“ وہ بولی تو میں نے کہا۔

”تم جاسکتی ہو۔“

اس کی آنکھوں میں شدید حیرت ابھری۔ ادھر میں دروازہ کھول کر باہر اتر گیا اور ایک طرف ادا  
اور مغموم سا چل پڑا اور درخت کے تنے سے اپنی پیشانی ٹکائے رو پڑا۔ درحقیقت میرے اندر نگینہ سے  
جذباتی طور پر دوری کا غم جاگ اٹھا تھا۔ وہ میرے ساتھ تھی لیکن میری نہیں تھی۔ ایک گھٹاؤنی اور پراسرار  
سازش کے تحت اس کی لوح دل سے میری محبت، میرا نام، میرا اعتبار اور میری دیوانہ وار چاہت کو بڑی  
بے رحمی سے مٹا دیا گیا تھا کہ آج مجھے اس نقش محبت کو اور اس درس محبت کے متن کو دوبارہ رقم کرنے کے  
لئے یہ خطرناک قدم اٹھانا پڑا تھا۔ میں واقعی اور سچ سچ دل گرفتہ ہو کر رو رہا تھا۔ جبکہ ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی  
نگینہ یہ سمجھ رہی تھی مجھے اپنی فرضی بیوی نگینہ کا غم کھائے جا رہا تھا۔

تب پھر اچانک میرے کانڈھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں قدرے چونک کر پلٹا۔ میری آنکھوں میں  
آنسوؤں کی جھللاہٹ تھی اور اس جھللاہٹ میں مجھے نگینہ کا رخ روشن دکھائی دیا۔ میرا دل وحشی یکبارگی  
دھڑکا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ میں نے نگینہ کی نازک طبع اور نرم دلانہ فطرت کا جو بھر پور اندازہ  
لگایا تھا، وہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں یہ سب کچھ اسی کی خاطر تو کر رہا تھا۔

”تم..... گئی نہیں نگینہ.....؟“ میں نے جلدی سے اپنے گرم سویٹر کی آستین سے آنسو پونچھے  
ہوئے اس سے پوچھا۔

”نہیں.....“ وہ لرزن ہوئی آواز میں بولی تھی۔ لیکن میں نے اس کے لہجے کی مضبوطی کا بھی احساس  
کیا تھا۔

”کیوں.....؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا تم اپنی محبوب بیوی کا علاج نہیں کراؤ گے؟“ وہ عجیب لہجے میں بولی۔ اس کے نرم و گداز ہونڈ  
پر پراسرار مسکراہٹ لہرا رہی تھی۔

”الکل..... لیکن..... تم.....؟“

”میری فکر چھوڑو۔ سچ پوچھو تو میں تمہاری دکھ بھری کہانی سے اس قدر امپر لیس ہو گئی ہوں کہ مجھے  
تمہارا ساتھ دیتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ ایک بالکل ہی الگ تھلگ اور عجیب و غریب ایڈاپٹ  
ہے یہ میرے لئے۔“ وہ پہلی بار بالکل کرسکراتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری دکھ بھری چٹان کر میرے دل میں  
یہ خیال آیا تھا کہ میں میا سے خود ہی کسی طرح رقم کا بندوبست کر کے تمہارے حوالے کر دوں گی۔ لیکن  
میں اپنے پیا کی فطرت سے واقف ہوں۔ اوّل تو اتنی بڑی رقم شاید کبھی نہیں دیں گے۔ اگر دے بھی دیں  
تو یقیناً وہ مجھ سے سب سے پہلے یہ ضرور پوچھیں گے کہ میں اتنی بڑی رقم کس لئے لینا چاہتی ہوں؟“  
میں شاید اس سلسلے میں انہیں مطمئن نہ کر سکوں۔ اس لئے تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم وہی کرو، جو کہ  
رہے ہو۔“

اس کی بات سن کر میرا دل مسرت سے بلیوں اچھلنے لگا۔ تاہم میں نے ذرا چپ ہی سادھے رکھی۔  
پھر کھنڈرے پن سے بولی۔ ”اب کیا ہوا؟..... اب تو تمہارے لئے کوئی مسئلہ نہیں رہا؟“

”آپ..... رورہی ہیں..... مس نگینہ!“  
 اس نے اپنے آنسو پونچھنے کی بھی کوشش نہ کی، ایسے ہی بولی۔ ”ہاں..... مجھے لگتا ہے، میرے اندر  
 نی خفی نہیں۔ بس ایک اٹھا خاموشی ہے، بغیر سنا ہے۔ میرے دل و دماغ میں کبھی کبھی اپنے اندر کچھ  
 رونے کا احساس ہو کہ اس قدر شدت کے ساتھ اٹھتا ہے کہ..... میرے آنسو اٹھ پڑتے  
 ہیں۔ اس کے غم و اندوہ سے لبریز الفاظ نے میرے دل کو پارہ پارہ کر ڈالا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا  
 کہ اپنے تئیں کسی نامعلوم غم کا شکار ہے۔ ایسے میں بے اختیار میرا جی چاہا کہ اس کے غموں سے چور  
 ہو کر اپنی بانہوں میں سیٹھ لوں اور اس کا آنسو بن جاؤں۔

بالہی! یہ کیا امتحان تھا؟ یہ کیسی عجب و غریب اور بے چین کر دینے والی صورت حال تھی۔ میں نے  
 ایسی صورت کا سوچا بھی نہ تھا۔ اس قدر بے بسی میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھی جس کا مجھے اس  
 نہ سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

پھر اپنے حلق میں اترنے والی رقت پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اس سے بولا۔ ”نگینہ صاحبہ! آپ کو  
 کیا انجانہ۔ اور نہ معلوم دکھ میں پا کر خود میں بھی پریشان اور غم زدہ سا ہو رہا ہوں۔ پلیز! اگر آپ کا اب  
 میرے ساتھ جانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے تو میں آپ کو آپ کے پیا کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔“  
 رے نرم اور التجائیہ لہجے پر وہ مسکرائی اور بولی۔

”پھر..... پھر تم اپنی محبوب بیوی کا کس طرح علاج کراؤ گے؟“  
 میں دانستہ لاجواب ہو کر خاموش ہو رہا۔ مجھے چپکا پا کر وہ بھر بولی۔

”دیکھو نادرا! جانے کیوں اب میرا دل بھی تمہاری مدد کرنے کو چاہ رہا ہے۔ اسے تم کچھ بھی معنی دو، مگر  
 اب بہر حال نہیں چاہتی کہ تمہاری محبوب بیوی تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو۔ لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم  
 کو کسی مشکل میں نہ پھنسا لو اور سب کیا کر لیا دھرا رہ جائے، برباد ہو جائے۔“

میں نے اس کی بات پر کہا۔ ”نگینہ صاحبہ! میں آپ کے جذبہ ہمدردی کی قدر کرتا ہوں۔ یہ آپ مجھ  
 چھوڑ دیں۔ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ میں نے شادی سے پہلے نگینہ سے بہت طوفانی قسم کا عشق کیا تھا۔“  
 میں اتنا تکرار کر رہا تھا کہ انکھیوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے ایک بات محسوس  
 کی کہ وہ میری فرضی محبوب بیوی سے محبت کے متعلق باتوں کو بڑی غیر معمولی دلچسپی سے سنتی تھی۔

”آگے کہو نا..... تم رک کیوں گئے؟“ میری دانستہ ذرا طول پکڑی خاموشی پر وہ عجیب سی بے تابی  
 بولی۔ اس کے اشتیاق کو بھانپتے ہوئے میں نے اثر پذیرانہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔

”میرا آبائی گاؤں چترال میں ہے۔ نگینہ دوسرے قبیلے سے تعلق رکھنے والی لڑکی ہے۔ میں نے  
 بہت ٹوٹ کر چاہا تھا۔ مگر اس کے قبیلے سے ہماری بڑی پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ ہمارا ایک ہوتا  
 تھا بن چکا تھا۔ لیکن ہم دونوں کی محبت نے اسے بالآخر ممکن کر دکھایا اور ہم نے شادی کر لی۔ اب  
 اس طرف کے قبیلے ہماری جانوں کے دشمن ہو گئے۔ ہم ان سے بچتے رہے اور اس دوران بڑے سخت  
 حالات و مصائب سے گزرے۔ مگر ہم نے ہمت نہ ہاری۔ بالآخر ہمارے قبیلے کے لوگوں نے تھک مار کر  
 اپنی تلاش ترک کر دی اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا۔ البتہ ہم دونوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبیلے  
 سے نہیں بلکہ علاقے سے بھی بے دخل کر دیا۔ میں نے سخت مزدوری شروع کر دی۔ اور اب.....  
 بہ زرا سکھ کے دن آئے تو..... تو وہ بے چاری اس موذی اور جان لیوا مرض کا شکار ہو گئی۔“ میں  
 آخر میں دانستہ اپنے لہجے میں رقت سمولی تھی اور بونہی آنسو پونچھنے لگا۔ اچانک نگینہ نے میرے

خاندان میں کسی کی یاد تھی، جس پر دھند چھائی ہوئی ہے۔ میں نے بہت یاد کرنے کی کوشش کی مگر  
 رہی۔ وہ اتنا تکرار خاموشی ہو گئی۔ جبکہ اس کی بات پر میری رگوں میں خون کی گردش یککھت تیز ہو گئی۔  
 میرے جی میں آئی کہ اسے چیخ چیخ کر بتاؤں ”نگینہ! میری جان جاناں! تمہاری محبت کھوئی نہیں ہے۔“  
 تمہارے سامنے ہے۔ میں..... نادرا علی خان تمہاری پہلی اور آخری محبت جس نے اس سوئی ہوئی  
 کو دوبارہ جگانے کے لئے سر دھڑکی بازی لگا رکھی ہے۔ لیکن میں ابھی اس سے یہ کہنا نہیں چاہتا تھا۔  
 تاہم میں نے کہا۔

”مس نگینہ! کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ پیش آیا ہو جس نے آپ کی یادداشت  
 میرا مطلب ہے..... محبت والی یادداشت کا خزانہ خالی کر دیا ہو؟“  
 میری بات پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں جیسے کوئی چمک پیدا  
 تھی۔ پھر وہ ایک گہری ہنکاری بھرتے ہوئے اپنے سر کو پوسج انداز میں تھمکی جیش دیتے ہوئے بولی۔  
 ”ہاں..... کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔“

اس کے جواب نے میرے شوق کو بڑھا دیا۔ میں نے فوراً دھڑکتے دل سے پوچھا۔  
 ”لیکن آپ جس سے محبت کرتی تھیں، اس کے ساتھ تو ظاہر ہے کوئی حادثہ پیش نہ آیا ہوگا۔ پھر.....  
 پھر اس نے تو یقیناً آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہوگی اور..... اور آپ کو اپنی اس محبت کی  
 دلائے کی بھی کوشش کی ہوگی؟“

”پتہ نہیں.....“ اس نے مختصراً کہا اور میری امیدوں پر اوس پڑنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ فوراً  
 میری باتوں کا ذکر کرے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے دل و دماغ کو میری طرف سے اس قدر گہرا  
 کے ساتھ HYPNOTIC SLEEP کر کے MESMERIZE کر دیا گیا تھا کہ اسے مجھ سے محبت  
 ”پیش آمدہ“ اور موجودہ کے بارے میں کچھ یاد نہ رہا تھا۔ بہر طور میں نے دل کو مضبوط کر لیا، تقدیر  
 میرا یہاں تک ساتھ دیا تھا۔ انشاء اللہ آئندہ بھی مجھے کامیابی ہی بخشے گی۔

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ میں نے اب موجودہ حالات پر غور کرنا شروع کیا۔ مجھے بہت جلد  
 سے جان چھڑا لیتی تھی۔ گھنٹے بھر بعد ہم جنڈ کے ریلوے اسٹیشن کے قریب پہنچے۔ ٹیکسی میں نے ذرا  
 دیرانے میں چھوڑی اور نگینہ کے ساتھ اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا۔ یہ بہت مختصر سا اسٹیشن تھا۔ ایک  
 ٹرین روانگی کے لئے تیار کھڑی تھی۔

بلنگ آفس سے علم ہوا، یہی ٹرین پشاور جانے والی ہے۔ میں نے جلدی جلدی دو ٹکٹ خریدے  
 جیسے ہی ایک بوگی میں سوار ہوا، ٹرین نے ریتنا شروع کر دیا۔ بوگی میں مسافروں کا رش کم تھا۔ ملا  
 نگینہ آسنے سامنے کی دو سیٹوں پر براجمان ہو گئے۔

راولپنڈی (اسلام آباد) سے پشاور 172 کلومیٹر یعنی 107 میل مغرب میں تھا۔ بذریعہ جہاز پشاور  
 سے پشاور بہ مشکل نصف گھنٹہ لگتا تھا۔ جب ٹرین نے رفتار پکڑی تو مجھے ٹھیک ٹھاک اندازہ ہوا کہ  
 تین ساڑھے تین گھنٹوں میں ہمیں پشاور پہنچا سکتی تھی۔ نگینہ میرے سامنے کی سیٹ پر خاموش بیٹھی  
 کھڑکی سے باہر کے بھاگتے ہوئے مناظر دیکھتی رہی، پھر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بھی اس  
 چہرے سے اپنی پیاسی اور مجبور نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے اندر کہیں دور جھلکے  
 کوشش کر رہی ہو۔ اور تب میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں سے دکھ کا تاثر آنسو بن کر نکلا۔ اپنی محبت  
 جان جاناں..... اپنی نگینہ کو روکا دیکھ کر میرا اندر جھلپٹا ہو گیا۔ میں نے تڑپ کر بے تابی سے پوچھا۔



ایسی حاصل کر رکھی تھیں۔ میرا ارادہ پشاور سے چترال بذریعہ جہاز جانے کا تھا جو محض پچاس منٹ کی راہ پر تھا۔ میں نے اس بارے میں نگینہ کو آگاہ کیا تو اس نے کہا کہ ہمیں یہ سفر بائی روڈ کرنا چاہئے۔ یہ سفر نہایت تکلیف دہ اور تھکا دینے والا ہوتا۔ اسے شاید فضائی سفر مہنگا لگ رہا تھا۔ جبکہ میرے دل میں خطرہ رقم موجود تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ عاروب نامی عامل نگینہ کے علاج کے لئے کوئی بھی مطالبہ کر سکتا ہے۔ نگینہ کے ڈرامائی تعاون سے ہم کا پہلا مرحلہ کامیابی سے طے ہوا تھا۔ اس لئے مجھے اس کی طرف سے کوئی فکر نہ تھی اور اسی لئے میری خواہش تھی کہ ہم جلد از جلد چترال روانہ ہو جائیں۔ اور اس مقصد کے لئے فضائی سفر سب سے زیادہ مناسب تھا۔

ہم دونوں اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلے۔ مسافروں کا خاصا جھوم نظر آ رہا تھا۔ عمارت کے باہر خاصی ہل چلی تھی۔ میں نگینہ کا ہاتھ تمسکے اپنے اطراف کا چوکنا نظروں سے جائزہ لیتا ہوا ایک ٹیکسی کی طرف جا اور ٹیکسی ڈرائیور سے یادگار چوک چلنے کا کہا۔ میرے اور نگینہ کے پنجر سیٹ پر بیٹھتے ہی ٹیکسی چل ائی۔ پشاور بڑا بڑا روئی شہر ہے۔ ٹیکسی گورنمنٹ ہاؤس، کپتانی باغ سے گزرنے لگی۔ میرے لئے پشاور میں کی خطرہ تھا بلکہ ہر جگہ اور ہر علاقے میں پولیس، انتظامیہ اور دشمنوں کا خطرہ بدستور کھڑی تلوار کی طرح وجود تھا۔ کیونکہ شاہ میر کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ وہ اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ پھر سب سے اہم خطرہ کبیر کا نا جو میرے عزائم اور میری آئندہ کی ”مہم“ سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے مجھے ہر لمحہ بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

ہماری ٹیکسی جو بنی قصہ خوانی بازار کی طرف جانے والی سڑک سے مسجد مہابت خان کی طرف ہٹنے لگی تو اچانک مجھے تعاقب کا احساس ہوا۔ کیونکہ جیسے ہی ٹیکسی نے ایک موڑ کاٹا تو مجھے اپنے عقب میں ایک گہرے سبز رنگ کی ہائی روف مڑتی نظر آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں اسے ہائی وے سے اپنے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ان میں سوار افراد کو دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تب میں اپنے تعاقب کا یقین کرنے کی خاطر ٹیکسی ڈرائیور کو دانستہ مختلف شاہراہوں پر گھماتا رہا اور پھر ایک پڑاؤں دکان کے سامنے اسے رکنے کا کہا۔ اس نے ٹیکسی روک دی۔ میں نے عقب میں گردن گھما کر دیکھا، سبز رنگ کی وہ ہائی روف غائب تھی۔ میں نے ایک طویل سانس کھینچی اور اتر کر سٹور میں داخل ہو گیا۔ نگینہ ٹیکسی میں بیٹھی رہی۔ میں نے جلدی جلدی نگینہ کے ناپ کے چند سوٹ خریدے اور باہر نکل آیا۔ ہائی روف کے غائب ہونے سے مجھے خاصا اطمینان ہو گیا تھا۔ وہ یقیناً میرا وہم رہا ہوگا۔

یادگار چوک اتر کر ہم نے ایک ہوٹل میں کمرہ لیا۔ ٹیکسی سے اترتے وقت میں نے ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا مگر وہ سبز رنگ کی ہائی روف مجھے پھر دکھائی نہ دی۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے اسے ”مہم“ ہونے کو کہا اور وہ ملحقہ غسل خانے میں داخل ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے باہر سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے جھانک کر تو میری سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔ مجھے سبز رنگ کی وہی ہائی روف غری نظر آ گئی۔ پھر میں نے اس میں سے دو افراد کو نیچے اترتے دیکھا تو جیسے میں دوسرا سانس لینا بھول گیا۔ دل جیسے یکبارگی میری سانسیں سانس کرتی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ میں ان دو افراد کو ایک جھلک کر کوئی پہچان گیا تھا۔ وہ کبیر اور کالا ناگ تھے بلکہ کالا ناگ کو دیکھ کر تو جیسے میری رگوں میں ایسا کی لہو جگمگا لداؤ اچھلنے لگا۔ انہوں نے بڑی چالاکی سے مجھے ڈانچ دیا تھا۔ انہیں شاید بدقت یہ احساس ہو گیا تھا کہ مجھے اپنے تعاقب کا ادراک ہو چکا ہے۔ یوں انہوں نے عارضی طور پر خود کو میری نظروں سے ہٹ کر دیا تھا۔ لیکن میں اب بہ غور ان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ کبیر نے فوراً

کاندھے پر آہٹگی سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے قدرے چوک کر مغموم سی نظروں سے اسے دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے پر ایک عزم کی سی چمک محسوس ہوئی۔ وہ بولی۔

”نادر صاحب!..... آپ واقعی بہت بہادر اور حوصلہ مند انسان ہیں۔ اگرچہ تقدیر کے آگے کس کا بس چلتا ہے لیکن آپ نے تو اپنی تقدیر بھی پلٹ کر رکھ دی۔ میں آپ کی اپنی محبوب بیوی سے اس قدر بے لوث اور گہری محبت کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ آپ بہت عظیم ہیں۔“

”نہیں نگینہ صاحب!..... میں ایک خود غرض اور بے ضمیر انسان ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اپنی غرض کی خاطر میں نے آپ کی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ اگر میری نگہت کو یہ سب معلوم ہو جائے تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔“

”ارے، وہ کیوں؟ اب تو میری اپنی بھی مرضی شامل ہو گئی ہے کہ تمہاری مدد کروں۔“ وہ بولی۔ میں نے ہنسی مسکراہٹ سے کہا۔ ”کچھ بھی سہی نگینہ صاحب! یہ غلط ہے۔ کسی کی محنت کی کمائی پر اس طرح ڈاکہ ڈالنا کہاں کا انصاف ہے؟“

میری بات پر نگینہ بولی۔ ”پینتیس لاکھ کی رقم میرے پیار کے لئے بہت معمولی رقم ہے۔ اگر تم ان سے ایک کروڑ کا تبادلا بھی لو تو میری خاطر وہ تمہیں بڑی آسانی سے دے دیں گے۔ کم از کم اس طرح ایک انسان کی جان تو بچ جائے گی۔“

میں نے اپنی گفتگو کو مزید اثر انگیز بناتے ہوئے اس سے کہا۔ ”نگینہ صاحب! مجھے ایک کڑی نہیں، صرف پینتیس لاکھ کی ضرورت ہے۔ اور میں آپ سے یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ زندگی رہی تو میں یہ رقم آپ کے پیار کو واپس لوٹانے کی بھی کوشش کروں گا جو مجھ پر ایک قرض ہوگی۔“

”اچھا.....“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”تم بھلا اتنی بڑی رقم کیسے لوٹا سکتے ہو؟“

”خود کو بچ کر۔“ میں نے کہا۔

”خود کو بچ کر؟“ اس نے چوک کر دہرایا۔

”ہاں نگینہ صاحب!..... میں نے سنا ہے کہ بڑے بڑے امیر کبیر لوگ جن کے گردے خراب ہوتے ہیں، وہ بڑے مہنگے داموں مجھ سے ایک گردہ تو خرید ہی لیں گے منہ مانگے داموں پر۔“ میں نے درد بھرے لہجے میں کہا تو نگینہ نے اچانک میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی نرم و نازک خردلی انگلیوں کا لمس مجھے سرشار کر گیا۔ اگرچہ میں اس ”محبوب“ کس سے واقف تھا مگر اس لمحے مجھے وہ کس نہایت اجنبی اجنبی سا لگا۔ مجھے محسوس ہوا وہ ادھار میں ملنے والا کس تھا۔ پھر وہ میرے ہونٹوں سے اپنا ہاتھ ہٹا کر بولی۔

”ایسا مت کہو۔ بس اب تم وہی کرتے جاؤ جو تم کرنا چاہتے ہو۔“

میں خاموش ہو گیا۔

ایک سپر تیز ٹرین دو پہر دو بجے تک پشاور پہنچ گئی۔ اسٹیشن کے اریب قریب بھی کئی اچھے ہوٹل تھے لیکن میں کسی متوقع خطرے کے پیش نظر ریلوے اسٹیشن کے قریب والے ہوٹل میں کمرہ نہیں لینا چاہتا تھا۔ یوں تو میرا ہوٹل میں باقاعدہ ٹھہرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں تو شخص نگینہ کی خاطر تھوڑی دیر کے لئے کسی آرام دہ جگہ پر ذرا سناٹا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد ہمیں فوراً چترال اور پھر وہاں کے قصبے ”ایون“ سے گزر کر وادی کیلاش میں داخل ہونا تھا۔ یہ ایک دشوار گزار مہم تھی۔ وہاں کلاشی آگرم نامی بستی میں اس کلاشی عامل عاروب کو تلاش کرنا مشکل نہ ہوتا۔ میں نے چترال اور وادی کیلاش سے متعلق خاصی تفصیلی معلومات

اپنے بار غار کالا ناگ سے رابطہ کیا تھا اور شاید ان دونوں نے ہی میرا راستہ کھولنا کرنے کی کوشش کی تھی۔ کالا ناگ لاہور کے گجر چوک کا معروف بدمعاش تھا۔ جبکہ کبیر میرے عزائم سے پوری طرح واقف تھا۔ یہی سبب تھا کہ دونوں کا یہاں پایا جانا اچھے کی بات نہ تھی۔

میں ابھی یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کرتے کیا ہیں؟ اس وقت وہ دونوں ہائی روف کے باہر کھڑے تھے اور کالا ناگ کان سے موبائل لگائے کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ میرے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ مجھے تشویش ہو رہی تھی کہ یہ دونوں ابھی تک ہوٹل کی عمارت کے اندر کیوں نہیں داخل ہوئے۔ تب ذرا دیر بعد کالا ناگ نے موبائل آف کر کے جیب میں رکھا۔ پھر وہ کبیر سے باتیں کرنے لگا۔ میں کسی قدر فاسطہ کے باوجود واضح طور پر دیکھ رہا تھا کہ دونوں کے چہرے جوش سے تھمتھارہے تھے۔ میں بھی اپنی جگہ سے ہلے بغیر ان پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ دونوں ہوٹل سے باہر کیوں کھڑے تھے؟ انہیں تو اندر آکر مجھ سے حساب کتاب نشتانے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ اچانک میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کالا ناگ مقامی پولیس کو ہمارے بارے میں آگاہ کر رہا ہو؟

ابھی میں نے اتنا ہی سوچا تھا کہ اسی وقت ایک کار تیزی کے ساتھ ان کے قریب پہنچ کر ہلکی سی چڑچاہٹ کے ساتھ رکی۔ میں ٹھٹکا۔ میری نظریں اسی طرف جچی ہوئی تھیں۔ کار میں سے چار کیم نیم اور توند افزار برآمد ہوئے۔ اپنی سرخ و سفید رنگت کے باعث وہ مقامی دکھائی دے رہے تھے۔ کار سے اتر کر وہ کالا ناگ کی طرف بڑھ گئے۔ کالا ناگ انہیں ہوٹل کے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ بتاتے لگے۔ ان چاروں کے مؤدبانہ انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لوگ کالا ناگ سے بخوبی واقف تھے اور یقیناً کسی مقامی بدمعاش کی ہدایت پر گجر چوک کے نامی گرامی کالا ناگ کی مدد کرنے یہاں پہنچے تھے۔

ان چاروں نے ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیض پہن رکھے تھے اور پیروں میں پشاور کی چلیں تھیں۔ ان کے درمیان کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اس دوران کبیر خاموشی سے کھڑا ہوٹل کی سمت دیکھتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ چاروں مؤدبانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے ایک طرف ہو گئے جبکہ کالا ناگ اور کبیر نے ہوٹل کے دروازے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ خون جیسے لاوے کی طرح میری رگوں میں سنسنار رہا تھا۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ میں نے ملحق غسل خانے کی طرف نگاہ ڈالی۔ پانی گرنے کی ہلکی سی آواز اس کی مصروفیت کا پتہ دے رہی تھی۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ باہر کیا واقعات پیش آرہے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ جانے کس کیفیت میں، میں پلٹا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہ خاصا معیاری ہوٹل تھا۔ قدرے طویل کوریڈور میں چند وردی پوش ملازمین کے سوا مجھے کوئی ذی روح دکھائی نہ دیا۔ میں نے قمیض کے نیچے میگا رڈ کی موجودگی کو محسوس کیا اور برق رفتاری سے زینوں کی طرف بڑھا۔ ہمارا کمرہ پہلی منزل پر تھا اور زینوں کا اختتام ہوٹل کی ریسپشن پر ہوتا تھا۔

میں یہ صد احتیاط زینے تک پہنچا اور ذرا نیچے اتر کر میں ٹھٹکا کر ریلنگ سے چپکا کھڑا رہ گیا۔ میں نے دیکھا کالا ناگ اور کبیر ریسپشن پر موجود تھے اور ریسپشنسٹ سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ وہ یقیناً ہمارے بارے میں ہی اس سے استفسار کر رہے تھے۔ اچانک میرے دل میں خیال ابھرا اور پھر یکدم واپس پلٹا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے دروازہ بند کیا مگر اندر سے چٹنی نہیں چڑھائی۔ گلینہ اس دوران میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو چکی تھی۔ نئے لباس میں اب وہ خاصی نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔ تاہم مجھے پریشان یا کمرہ بھی چونک گئی۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں پیش آمدہ خطرے سے آگاہ کیا تو وہ متوجس سی نظر آنے لگی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”کالا ناگ! ٹھیک ہے، آج میں تمہارا وہ قرض بھی اتارے دیتا ہوں۔ لیکن یہ بھی اب کان کھول کر

”مجھنے صاحبہ! آپ بے فکر رہیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ کبیر ایک نامی گرامی غنڈے کالا ناگ ساتھ یہاں آن پہنچا ہے اور باہر اس کے چار مقامی بدمعاش بھی موجود ہیں۔“ یہ کہہ کر میں جلدی اسے کھڑکی کی طرف لایا اور نیچے موجود ان چاروں مقامی کیم نیم افراد کی جھلک دکھائی۔

”میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہاں رکنے کے بجائے آگے نکل جاتے ہیں۔ مگر تم نہیں سنو۔“ وہ بولی۔

تاہم میں نے اسے تسلی دی۔ ”میں ان پر قابو پا لوں گا۔ آپ اتنا کریں کہ ہاتھ روم میں چلی جائیں۔“

وہ حیران پریشان سی ہاتھ روم میں داخل ہو گئی۔ اسی وقت مجھے پرونٹی کوریڈور میں قدموں کی آہٹ آئی۔ میں کسی زخمی چیتے کی طرح دروازے کے قریب لپکا اور سانس روک کر دائیں جانب دیوار سے ٹکڑھا رہ گیا۔ ٹھیک اسی وقت دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور کالا ناگ دھڑ سے اندر داخل ہوا۔

کا خیال تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہو گا اس لئے اس نے غالباً دروازے کو لات مارنے میں پوری صرف کردی تھی۔ مگر دروازہ کھلا ہونے کے باعث وہ اپنی جھونک میں اندر گھستا چلا آیا۔ میں نے اس کی پشت پر ایک زوردار لات رسید کر دی جس کی وجہ سے وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ کبیر نے بچھینے کی کوشش کی تو میں نے اسے بھی اندر رگید لیا۔

میری پوزیشن چونکہ ایک اغواء کنندہ مجرم کی سی تھی اس لئے مجھے بہر حال یہ سب خاموشی سے غنٹانا تھا۔

ان کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا۔

اب کمرے کا یہ محدود ماحول اکھاڑا بن سکتا تھا۔ کبیر اور کالا ناگ میری طرف بڑی کینہ توڑ نظروں سے گھور رہے تھے۔ میں نے اپنا سالنکسر لگا میگا رڈ نکال لیا۔ کبیر تو میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر تشویش جھٹکا ہو گیا تھا جبکہ کالا ناگ کے چہرے پر کسی تشویش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ بہ دستور شیطانی برساتی نظروں سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ پھر دانت پیس کر نفرت انگیز لہجے میں بولا۔

”نار! اس کھلونے کو جیب میں رکھ لو۔ تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔“ اسے بھی شاید میری پوزیشن کا بارہ تھا کہ میں اس وقت مجرم تھا اور پولیس سے چھپتا پھر رہا تھا۔

میں نے اس کی یہ خوش فہمی رفع کرنے کی غرض سے غرا کر کہا۔ ”کسی بھول میں نہ رہنا کالا ناگ! ہمارے موت جھپیں یہاں پہنچ کر لاتی ہے۔ میں اپنے ماموں کے قاتل کو معاف نہیں کر سکتا۔“ یہ کہتے

اُسے میں پستول والا ہاتھ اٹھا کر اس کی مکر وہ سیاہ پیشانی کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبانا چاہتا تھا کہ اس نے نواہی مسکراہٹ سے جیسے مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

”نار! موت بھولو کہ میرا تم پر جاں بخشی کا قرض ہے۔ تم تو دشمنی میں بھی ایک معیار کے قاتل ہو۔

”نار! میری بات۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ہماری دشمنی خالصتاً اپنے زور بازو پر ہوگی، اس آتشیں

غبار سے تو کوئی گیدڑ صفت بزدل بھی شیر جیسے بہادر کو با آسانی ہلاک کر سکتا ہے۔“

اس کی بات نے مجھے لمحہ بھر کو دم بہ خود کر دیا تھا۔ میں اس کی یہ بات جھٹلا نہیں سکتا تھا کہ اس نے مکش

ہوالی مہم کے دوران جب میں اس کے پستول کی گولی کے رحم و کرم پر تھا، مجھے چھوڑ دیا تھا۔ مگر ساتھ ہی

برہمگی بھی دی تھی کہ وہ میرے انہوں کی لاشوں کا منظر مجھے دکھانے کے بعد ہلاک کرے گا۔ یہ ایک

رج سے اس کی ایک قسم تھی۔ تاہم میں نے کہا۔

”کالا ناگ! ٹھیک ہے، آج میں تمہارا وہ قرض بھی اتارے دیتا ہوں۔ لیکن یہ بھی اب کان کھول کر

سن لو، آج کے بعد میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

یہ کہہ کر میں نے اپنا میگارڈ واپس اڑس لیا۔ ٹھیک اسی وقت کالا ناگ نے بھرتی کے ساتھ اپنا جبر میں ہاتھ ڈالا۔ میں اس کی خباثت سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے جوں ہی اپنا پستول باہر نکالا، اس سے پہلے ہی میں نے میگارڈ سے اس کے پستول واسطے ہاتھ پر فائر کر دیا۔ میرے ”خاموش“ پستول سے گولی نکلی اور کالا ناگ کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر پڑے جاگرا۔

”میں اب تمہارا قرض اتار چکا ہوں۔“ میں نے خوشچاکا غراہٹ سے کہا۔ ”اور ہاں ..... اگر تمہیں شیر بننے کا اتنا ہی شوق ہے تو کتوں کے ساتھ میرے مقابلے پر نہ آنا۔ میں ان کے ساتھ تمہارا بھی برا شکر کروں گا۔ گجر چوک والے اڈے میں تمہیں بشیر چیرا کا انجام یاد ہو گا۔ اب تم ہوٹل کے باہر موجود ان چاروں کتوں کو لے کر دفعتاً ہو جاؤ۔“

”بس ..... اب تم اپنی بکواس بند کرو۔“ یکایک کبیر کی سر آواز ابھری۔ میں کالا ناگ سے الجھ کر اسے یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔ میں اس کی طرف پلٹا اور اپنی جگہ ٹھہم کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا پستول نظر آ رہا تھا۔

”مجھے گلینے ملے یا نہ ملے ..... مگر تم آج زندہ نہیں بچو گے۔“ اس نے سفاک لہجے میں کہا اور ٹرائیگر دبا دیا۔



کبیر کے تیور خطرناک تھے۔ مجھے اس کی آنکھوں میں وہی وحشیانہ چمک دکھائی دے رہی تھی جو ہمارے کو دیکھ کر درندوں کی آنکھوں میں اتر آتی ہے۔ اس نے بلا توقف اپنے پستول کا ٹرائیگر دبا دیا تھا۔ اس کا یہ عمل اس قدر غیر متوقع تھا کہ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ کمرے کی فضا میں کھٹکے کی آواز گونجی مگر کچھ بھی نہ ہو سکا۔ وہ اپنے اناڑی پن اور غیر معمولی جوش کے باعث پستول کا سیفٹی کچج ہٹانا بھی بھول گیا تھا۔ میرے لئے بس اتنا ہی موقع کافی تھا۔ میں زخمی درندے کی طرح اس کی طرف بڑھا اور وحشیانہ انداز میں اسے رگیدتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے سر کے عقبی حصے پر دیوار سے ٹکراؤ کے باعث ٹگنے والی ایک ہی شدید ضرب نے اسے نڈھال کر دیا۔ اس کے ساتھ میرے برستے ٹکوں اور لاتوں نے اس کا رہا ہاد ختم بھی نکال دیا۔ کبیر سے معرکہ آرائی کے دوران میں گجر چوک کے بدنام ہٹری شیر کالا ناگ سے بھی غافل نہیں تھا۔ تاہم حیرت انگیز طور پر اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ آنکھیں پھاڑے ہم دونوں کو باہم دست و گریبان دیکھتا رہ گیا۔ جوں ہی میں نے محسوس کیا، کبیر کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے ہیں، میں پیچھے ہٹا اور ایک ہی جست میں کالا ناگ کے ہاتھ سے نکلے پستول پر جاگرا۔ کبیر کے پستول کی مجھے کوئی پروا نہیں تھی کیونکہ وہ مجھے رگیدنے کے دوران اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور ایک کونے میں جاگرا تھا جہاں تک ان دونوں کے لئے رسائی حاصل کرنا اگر نامکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ وہ دونوں نہتے اور مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر تھے۔ میں نے اپنے میگارڈ کی نال کا رخ ان کی طرف کیا اور کہا۔

”دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر دیوار کی طرف گھوم جاؤ۔“

میں نے کالا ناگ کی آنکھوں سے غیظ کے شعلے نکلنے محسوس کئے تاہم اس نے میرے حکم کی تعمیل میں اپنا رخ موڑا تھا۔ کبیر بھی بری طرح کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اس کی ٹانگوں کی لرزش صاف طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ میری بے رحمانہ ضربوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے فزاً ہو گیا تاہم اس کے ہاتھ سر تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دیوار کا سہارا لیا ہوا تھا ورنہ شاید وہ کھڑا بھی نہ ہو سکتا۔

میرے دل میں آئی، ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دوں۔ مگر فوری طور پر اپنے قریب مجھے ایسی لٹی شے نظر نہ آ سکی جسے اس مقصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا۔ وہ دونوں دیوار کی طرف منہ کئے کھڑے تھے۔ اس لئے میری نگاہ غسل خانے کے دروازے کی طرف گئی۔ وہ با آواز کھل گیا تھا اور وہاں لیڈ جیران نظروں سے کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کی ہدایت کی اور اشارے سے بلایا۔ وہ دبے قدموں چلتی ہوئی میرے پاس آئی۔ میں نے کوئی لفظ ادا کئے بغیر اس کا ہاتھ تھاما اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میں ایک لمحہ وہاں رکتا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت تک

عشق کیا تھا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں اس کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے توصیفی انداز میں بولا۔ ”پھر تو لالہ! تم ضرور کامیاب ہوا ہو گا اپنے بی بی۔ اس لئے ہم پر یہ مہربانی کر رہے ہو۔“

”ہاں..... ہاں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ گل بدن شاید اس کی کوئی محبوبہ تھی جواب کی بی بی بن چکی تھی۔ وہ ٹیکسی دوڑانے لگا۔ میں بار بار عقب میں دیکھے جا رہا تھا۔ تب پھر اچانک میں نے اسی سبز رنگ کی ہائی روف کو تعاقب میں آتے دیکھا۔ میں نے اپنے ہونٹ جھنجھک لئے۔ پھر خان ایبور سے کہا۔

”لالہ! دشمن ہمارے پیچھے آرہے ہیں۔ سبز رنگ کی گاڑی میں۔“

”خوچہ! سبز رنگ کیا ہوتا ہے؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔

”نصاری رنگ کا گاڑی بابا!“

”او..... اچھا، اچھا۔ ایسا بولنا..... پر تم بے فکر رہو، امارا سائے تک بی نہیں پہنچے گا۔“ اس نے کہا اور ٹیکسی کی رفتار بڑھائی۔ اب وہ بھی گا بے گا بے یک یو مر میں دیکھتے ہوئے ٹیکسی دوڑائے جا رہا تھا۔

”لالہ! تم بہت بہادر اور خدا ترس آدمی نظر آتے ہو۔ ہمارے دشمن بہت خطرناک اور چالاک ہیں۔ باقی نہیں چکر دے سکو گے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت اس سے کہا۔ بصورت دیگر خود میرا ارادہ اب یونگ سیٹ سنبھالنے کا تھا۔ اس کی رگ پھر پھڑک اٹھی۔

”او خدا ہی خوار! تم ام کو بالکل ہی پھپھڑا رہا ہے۔ ام نے تمہیں بتایا نہیں کہ ام بھی گل بدن کے ہاتھ ایسا ہی مارا ماری والے حالات سے گزر چکا ہے۔“

”اچھا، اچھا لالہ! تمہاری مہربانی۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ ٹیکسی ہی نہ روک دے۔ اچانک عقب سے گولیوں کی بھیانک ترنٹراہٹ اُبھری۔ ٹیکسی اس وقت مین شاہراہ کی طرف موڑ رہی تھی۔ ایک کان پھاڑ دھا کا ہوا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ٹیکسی کا نائز برسٹ ہو گیا تھا۔ ٹیکسی قابو ہو کر سڑک کے کنارے بنے اوپن ایئر ہوٹل کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ یہاں لوگ میزوں کے

ب کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ فائرنگ اور نائز برسٹ کے دھماکوں پر ہماری طرف متوجہ ہوئے، پھر ٹیکسی نے قابو اپنی طرف آتے دیکھ کر اٹھ دوڑے۔ شکر تھا کہ خردماغ ڈرائیور نے فوراً اسٹیزرنگ پر قابو پاتے

ئے ٹیکسی روک دی۔ میں نگینہ کا ہاتھ پکڑے پھرتی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر لپکا۔ گولیوں کی آگ بوجھاڑنے ہمارا ناکام تعاقب کیا تھا۔ میں جھکا جھکا دوڑتا ہوا ہوٹل کے احاطے سے دوسری طرف

آ گیا۔ ہمارے آس پاس راہ کیروں کی چیخ پکار پھیل گئی تھی۔ بڑی زبردست ہڑبوغہ مچی ہوئی تھی۔ میں اٹھا کہ دشمن نگینہ کی بجائے صرف مجھے ہی نشانہ بنانا چاہتے تھے۔ میں اندرون شہر مصروف بازار کی طرف

یا۔ یہ یادگار چوک کا بہت معروف اور مصروف بازار تھا۔ دوپہر میں بھی یہاں خاصا رش نظر آتا تھا۔ میں ایک دکان میں گھس کر دوسری طرف نکل آیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے مجھے ٹھک کر رکنا پڑا۔

میں نے کالا ناگ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ دوڑتا ہوا دکھائی دیا۔ ان کا رخ میری ہی طرف تھا۔ ان ہاتھ خالی تھے۔ مجھے تو ہتھیار بند کالا ناگ اور کبیر سے کبھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تو وہ درہنہ نظر آرہا تھا لہذا میرا حوصلہ کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ تاہم میں اس موقع پر اس سے براہ راست ٹکراؤ

یقیناً نگینہ کی نگاہ کبیر پر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ اسے پہچان کر میری مدد سے بھی دستبردار ہو سکتی تھی۔ ویسے بھی کبیر ایک طرح سے اس کا عامل تھا، وہ اس کی بات کو رد کر ہی نہیں سکتی تھی۔

نگینہ کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ بے شمار سوال تھے مگر وہ خاموش رہی۔ کمرے سے باہر نکل کر میں نے دروازہ بند کر دیا اور نگینہ کو لئے عقبی زینے کی طرف دوڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ کالا ناگ فوراً موہاں پر پہنچے موجود اپنے ساتھیوں کو خبردار کر سکتا تھا اس لئے میں گراؤنڈ فلور پر پہنچنے ہی بیرونی دروازے کی

بجائے عقبی سٹ کی ایک راہداری میں بڑھ گیا اور ہوٹل کے پچھلے حصے کی طرف آ گیا۔ یہ انڈر گراؤنڈ کار پارکنگ تھی۔ میں نگینہ کو لئے عقب کی ایک ذیلی سڑک پر آ گیا اور دائیں بائیں ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ ٹیکسی کہیں دکھائی نہ دی۔ میں ایک طرف دوڑ پڑا۔ دفعۃً مجھے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز

سنائی دی۔ میں نے دوڑتے دوڑتے گردن گھما کر دیکھا۔ کالا ناگ کے دو بد معاش ہاتھوں میں پستول تھامے ہماری طرف دوڑے آرہے تھے۔

”ڑک جاؤ..... ورنہ گولی مار دی جائے گی۔“ ایک نے چلا کر مجھے دھمکی دی۔ جواب میں، میں نے دیوار کی آڑ لے کر میگار دے ان پر فائر جھونک دیا۔ میرے میگار دے خاموش گولی آگئی۔ میں نے اس کی ٹانگ کا نشانہ لیا تھا۔ وہ تیرا کر گر گیا۔ اسی اثناء میں اس کے دوسرے ساتھی نے فائر کر دیا۔ گولی

میرے چہرے کے قریب سے سنسنائی ہوئی گزر گئی۔ میں نے شست بانجی اور اس کی طرف بھی خاموش گولی ارسال کر دی۔ اس کے بعد ایک لمحہ ضائع کئے بغیر نگینہ کو ساتھ لے کر دوڑنا چلا گیا۔

فوراً ہی ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی نظر آئی۔ ٹیکسی ڈرائیور اس کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور نگینہ کو اندر دھکیلنے کے بعد خود بھی عقبی نشست پر سوار ہو گیا۔ میگار میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے بلا توقف اسے ٹیکسی ڈرائیور کی گردن پر رکھ دیا۔

”ٹیکسی دوڑاؤ..... جلدی کرو۔“ میں نے غرا کر کہا۔ وہ بھی کوئی ضدی پٹھان تھا۔ اس نے ٹیکسی آگے بڑھانے کی بجائے غصیلے لہجے میں کہا۔

”یہ کھلونا جیب میں رکھ لو۔ کرایہ دو گے تو میں تمہیں دنیا کے آخری کنارے پر لے جاؤں گا۔“ میں نے اس کی نفسیات سمجھتے ہوئے اس کی فطرت کے مطابق نرمی سے کہا۔ ”اچھا، اچھا خان صاحب! آپ کی مہربانی، ہمارے پیچھے دشمن لگے ہوئے ہیں۔ آپ کو اللہ کی قسم، یہاں سے فوراً نکل چلیں۔ میں آپ کو پورا کرایہ دوں گا۔“

”یہ ہوا ثبات خوچہ!“ اس نے مسرت انگیز انداز میں کہا۔ ”اب تم ہمارا کمال دیکھنا..... ہمارا ٹیکسی دیکھنا..... اس کا رفتار دیکھنا.....“ وہ تو جانے کیا کیا دکھانے پر آمادہ تھا مگر میں نے ہلکی سی

تھپکی دی تو اس نے زبان کے جوہر دکھانے کے کبیر لگایا اور جھٹکے سے گلچھوڑ دیا۔ اس دوران میں ایک سیلیبر کو خاصا سے کچھ زیادہ دبا چکا تھا۔ نتیجتاً ایک تیز چہراہٹ کے ساتھ ٹیکسی آگے کی طرف بڑھتی

چلی گئی۔ ”کیا کوئی عشق مشک (عشق مشق) کا چکر ہے؟“ ذرا آگے بڑھنے کے بعد اس نے گردن گھما کر ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں مجھے کھلنڈرے پن کی جھلک محسوس ہوئی۔

”ہاں لالہ!..... ایسا ہی سمجھ لو۔“ میں نے اس کی جرح سے بچنے کے لئے اس کی تائید کر ضروری سمجھا۔

”خوچہ..... فکر ماکو (فکر نہ کرو) ام تمہارے ساتھ ہے۔ ام نے بی گل بدن سے ایسا ہی مارا مارا

محبوب بیوی کی زندگی بچانے کی دھن سوار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کو بھی نہیں بھولا۔ آپ کی حفاظت بھی میرا اولین فرض ہے۔ میں اپنی ذاتی غرض کی خاطر آپ پر ذرا بھی کوئی آج نہیں دے دوں گا۔ نگینہ صاحبہ! میری نظروں میں آپ کی حیثیت ایک عظیم محسن کی سی ہے۔ اگر..... اگر..... اگر.....

میرا دوست آپ کو ذرا بھی کچھ ہوا تو میں ساری زندگی خود کو معاف نہیں کر پاؤں گا۔“ میں اتنا کہہ کر ہوش ہو گیا۔ مجھے اپنے عقب میں بیٹھی نگینہ کی رقت آمیز سکاری سنائی دی۔

”کیا ہوا؟..... کیا آپ رو رہی ہیں؟“ میں نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اچانک نگینہ نے چلا کر مجھے خبردار کیا۔

”ناور! دشمن کی گاڑی تعاقب میں آ رہی ہے۔“

میں سانسے میں آ گیا اور موٹر سائیکل کے عقب نما میں دیکھا۔ سبز رنگ کی ہائی روف فل اسپڈ سے آگے چلی آ رہی تھی۔ میں نے بھی بائیک کی رفتار بڑھا دی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا میں نے راہ لگایا کہ ہائی روف میں اس وقت صرف تین ہی افراد ہو سکتے تھے۔ کالا ناگ، کبیر اور ان کا ایک درگر۔

ہائی دے مضافات کی طرف جا رہی تھی۔ دشمنوں سے پیچھا چھڑانا لازمی تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں پہاڑی سلسلہ تھا۔ آگے ٹول پلازہ تھا۔ مگر اس سے ذرا پہلے ہی سڑک کے پہلو سے ایک تنگ سی بل کھائی کی سڑک پہاڑی سلسلے کی طرف جاتی دکھائی دی۔ میں نے فوراً اسی ذیلی سڑک کی طرف بائیک موڑ دی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ بائیک میں کتنا فیول باقی تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ میری بائیک ان کی فور کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وسط شہر کی بات کچھ اور تھی۔ چنانچہ میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا۔

اگر وہ میں کبیر کی متوقع موجودگی سے مجھے اس بات کی مطلق تشویش نہ تھی کہ یہ لوگ ہم پر فائرنگ کریں گے۔ البتہ دوسری حقیقت کا انہیں بھی یہ خوبی اندازہ ہو گا کہ اب اس طویل اور ویران سڑک پر یہ مجھے کسی لمحہ بھی ”چھاپ“ سکتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اب ان سے دودھ ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

لہذا تنگ موڑ کاٹتے ہی میں نے بائیک روک دی اور نگینہ کو لئے ایک چٹان کی آڑ میں آ گیا اور اس سے بولا۔ ”نگینہ صاحبہ! آپ ادھر ہی موجود رہیں۔ میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنے اور کالا دے جھینے ہوئے پستول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ ہائی روف غرائی ہوئی تیزی سے قریب آنے لگی۔ میرے شانے سے بہتا ہوا خون جننے لگا تھا۔ میں نے سگی آڑ سے نزدیک ہوئی ہوئی ہائی روف کی ٹرین کے پار دیکھا، ڈرائیونگ سیٹ پر ان کا گرگا تھا۔ برابر میں کالا ناگ اور بچھلی نشست پر مجھے نے بھی جھلک دکھائی دے گئی۔ ہائی روف نے موڑ کاٹا اور ”زن“ سے آگے نکل گئی۔ میں نے بے راہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔ پھر دوسرے ہی لمحے پلٹا، نگینہ کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ پکڑے اور پہاڑی سلسلے کے تنگ دروں کی طرف بڑھ گیا۔ پھر ایک ویران گھماہ دیکھ کر میں فوراً اس میں آ گیا۔ گھماہ اندر سے زیادہ گہری نہیں تھی۔ میں اندر جا کر بے دم سا ہو کر پتھر ملی زمین پر گر گیا۔

میں کی تکلیف اور جریان خون نے مجھ پر نقاہت طاری کر دی تھی۔ میں پشت کے بل لیٹ گیا اور لمبے سانس لینے لگا۔ مجھے نگینہ کی طرف سے یہ ڈر بھی پیدا ہونے لگا کہ کہیں وہ ان حالات کی کشائش سے اگر واپسی کا فیصلہ نہ کر لے۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کی زیادہ سے زیادہ ”ہمدردی“ حاصل کرنا چاہتا تھا اب یہی ایک طریقہ تھا اسے رام رکھنے کا۔ اس کی نگاہوں میں رشک تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ سب اسی کی وجہ سے تو کر رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں اپنی محبت کو بچانے کے لئے یوں

دیکھا۔ ایک موٹر سائیکل سوار شخص موٹر سائیکل سے اتر کر اسے اسٹینڈ کرنے والا تھا۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا اور اسے طوفانی دھکا دیا۔ اس اچانک افتاد نے اس کے اوسان خطا کر دیئے اور وہ بے خبری کے عالم میں زمین پر لڑکھنیاں کھانے لگا۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے کھ لگائی۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی۔ اس وقت تک نگینہ میرے پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے بائیک آگے بڑھا دی۔

راہ گیروں کو راہ سے ہٹانے کی غرض سے میں مسلسل ہارن بجا رہا تھا۔ اس کے علاوہ کچل اور ایکسیلیٹر کے ماہرانہ استعمال کے باعث موٹر سائیکل کے انجن کی تیز، کرفت اور ہمایاں آواز بھی وہاں موجود لوگوں کو دہلا رہی تھی۔ وہ گھبرا کر دائیں بائیں ہوتے جا رہے تھے۔ میں تیزی کے ساتھ میں شاہراہ پر آ گیا تو سانسے سے سبز رنگ کی ہائی روف کو آتے دیکھا۔ ڈرائیونگ کالا ناگ اور کبیر کے گرگے کے ہاتھوں میں تھی جبکہ پنجرہ سیٹ پر کبیر بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے چلا کر نگینہ کو مضبوطی سے سیٹ پر جھے رہنے کی تاکید کی اور ایک پاؤں سڑک پر رکھ کر بائیک کے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ بائیک کا پچھلا پیہر جام ہوا اور وہ تیزی سے ٹھوم گئی۔ میں نے دوبارہ ایکسیلیٹر کو گھمایا اور بائیک پچھلے ٹائر پر الٹ ہو گئی مگر میں نے مضبوطی سے ہینڈل پر قابو پائے رکھا۔ بائیک گرجتی ہوئی آگے کو دوڑی۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں سن ہو کر رہ گیا۔ سڑک کے سین پیچوں سے مردود کالا ناگ اپنے لمبے چوڑے وجود کے ساتھ ناخنیں مضبوطی سے سڑک پر جمائے ہاتھوں میں پستول تھامے کھڑا تھا۔ پستول کی نال کا رخ میری طرف تھا۔ بدینت ہوٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ تھی۔ لیکن میں نے بھی اپنی بائیک کی رفتار کم نہ کی۔ میرے ارادے دیکھ کر اس پر بدحواسی طاری ہو گئی تھی۔ اسی گھبراہٹ میں اس نے گولی چلا دی۔ ایک دھماکا ہوا اور مجھے اپنے دائیں شانے میں دھکتی ہوئی سلاح پیوست ہوئی محسوس ہوئی۔ میرے حلق سے غیر ارادی کراہ خارج ہو گئی۔ میرے عقب میں بیٹھی ہوئی نگینہ نے بھی ہراساں ہو کر چیخ ماری تھی۔ میں نے اپنے اوسان بحال رکھے اور کالا ناگ کے قریب سے ”زن“ سے گزر گیا۔ میرا دایاں شانہ زخمی ہو چکا تھا۔ اس میں گولی پیوست تھی۔ تکلیف کی شدت سے دائیں بازو کی طاقت سلب ہونے لگی تھی لیکن میں نے بائیک کی رفتار کم نہ کی۔ میرے زخمی شانے سے خون بہہ رہا تھا مگر مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ میں تو صرف نگینہ کو لے کر اس ”ڈنجر اسپاٹ“ سے نکل جانا چاہتا تھا۔

”ناور!..... تم..... تم بہت زخمی ہو۔“ اچانک نگینہ نے پرتشویش لہجے میں کہا۔ اس نے مجھے مضبوطی سے تھامے رکھا تھا اس لئے اسے بھی خون کی چھچھاہٹ محسوس ہو گئی تھی۔ ویسے بھی اس نے گولی چلنے اور میری کراہ کی آواز سن لی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی۔

بائیک اب مین شاہراہ سے نکل کر بیرون شہر نکلنے والی جی ٹی روڈ پر آ گئی تھی۔

”ناور!..... تم..... تم بہت زخمی ہو۔“ پلیر اپنے بارے میں کچھ سوچو۔“ نگینہ نے دوبارہ کہا۔ اس کے لہجے میں پریشانی اور حد رہے کی تشویش تھی۔ اسے اپنے بارے میں اس قدر متفکر پا کر مجھے ہرے معزوب شانے کی اذیت کا احساس ہوا ہو چلا تھا۔ تاہم اسے سمجھانا ضروری تھا، لہذا بولا۔

”نگینہ صاحبہ! آپ میری فکر نہ کریں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ کبیر نے پولیس کا سہارا لینے کی بجائے ایک بدنام زمانہ گینگسٹر کالا ناگ اور اس کے گرگوں کا سہارا لیا تھا۔ یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ میں ان کا مقابلہ کر سکتا ہوں مگر میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میری نگہت بہتر حالات زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی ہے اور میں اس کی اس مختصر ہوئی زندگی کی ان گھڑیوں کو ہر ممکن طریقے سے طویل سے طویل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے مت روکیں نگینہ صاحبہ! اس وقت میرے سر پر صرف اور صرف

وہی آخر تک اس عمل کے فریب میں رہ سکتا ہے؟ مجھے محبت کی قوت سے اس سحر کو توڑنے کی پیہم ہوش کرنا ہوگی۔ اس خیال نے مجھے اس لئے مہینہ کیا تھا کہ نگینہ خود بھی اپنی کچھ گم گشتہ یادوں کو اپنے ذہن میں لانے کی کوشش کرتی تھی۔ مجھے اس طرح اس کی خود کو کریڈیٹ ہونی سوچوں کو مزید تحریک دینا چاہئے تھی۔ یہ صورت دیگر مجھے ایک طویل اور ٹھن آرائش سے گزرتا پڑتا۔ یہاں تک تو مسئلہ خود ہی حل ہو چکا تھا کہ نگینہ میری فرضی کہانی سے متاثر ہو کر جذبہ ہمدردی سے میرا ساتھ دینے پر مجبور ہو گئی تھی مگر اس سے آگے اہم مرحلہ ابھی باقی تھا یعنی کیلاش وادی میں داخل ہو کر اس کیلاشی عامل عاروب کا پتہ لگانا۔ پھر اسے اس پر مجبور کرنا کہ وہ نگینہ پر دوبارہ عمل کر کے اس کے دل و دماغ میں سوئی ہوئی ”میرے حصے“ کی یاد کو دوبارہ تازہ کر ڈالے۔ یہ کوئی آسان کام تو نہ تھا۔ چنانچہ میں نے اس لمحے یہ اہل اور مستحکم فیصلہ کر لیا کہ میں خود بھی نگینہ کو SUGEST کرنے کی کوشش کروں گا۔ کیا معلوم اس کیلاشی عامل کا سحر ٹوٹ جائے گا اور نگینہ مجھے، میری دیوانہ وار چاہت کو پہچان لے۔ ایک امدید بھی اور شاید کسی معجزے کا آسرا تھا۔

بہر طور میں نے اسے اپنی فرضی داستانِ غم کے اس قدر ٹرائس میں لے لیا تھا کہ میں جب بھی اس کا ذکر کرتا یا وہ بوچھتی ایسا ہی ہوتا تھا تاہم میں نے اسے آبدیدہ پا کر اس سے کچھ نہ کہا۔ میرے شانے کی تکلیف بڑھنے لگی تھی۔

ذرا ٹھہراؤ آیا تو زخم نے سرد ہو کر درد کرنا شروع کر دیا تھا۔ مجھ پر نقاہت کے باعث غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ مگر اس وقت میری جان بلکہ میری محبت سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی قوت ارادی کے لیے ہر تکلیف اور کمزوری کے بڑھتے ہوئے غلبے کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ میری آنکھیں شدید نقاہت سے بھول ہو رہی تھیں مگر میں نے انہیں بند نہیں ہونے دیا۔ میں ڈھیلا پڑ کر خود کو بے ہوشی کی مایک وادیوں میں اترنے سے بچانے کی خاطر خود کو مصروف کرنا چاہتا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اپنی بے بسی اتاری اور زخم کا جائزہ لیا۔ دائیں شانے پر ہتھیلی کی ہڈی کے ذریعے گوشت میں گولی پیوست تھی اور ہاں سرخ گاڑا حاشا نشان موجود تھا۔ ایک قدرتی پردہ کے تحت خون بہہ بہہ کر جم چکا تھا جس کی وجہ سے خون بہنا از خود بند ہو گیا تھا۔ نگینہ نے میرا زخم دیکھ کر سکاری لی تھی۔ پھر یکدم اپنے دوپٹے کو اتار کر اسے برے زخم پر باندھنے کے لئے جھکی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر وہ دوپٹے سے اڑھاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں نگینہ صاحبہ!..... اس کی جگہ یہاں نہیں ہے۔ یہ زخم سوکھ چکا ہے۔ اسے باندھنے کی ضرورت نہیں۔“

”مگر.....“ وہ یک دم بولی تو میں نے اس کی بات کاٹی۔

”اس پر اگر اب پٹی باندھوں گا تو زخم پھر سے رسنا شروع کر دے گا۔ کوئی موقع دیکھ کر میں اس کی ناقصہ مرہم پٹی کرواؤں گا۔ ابھی میں دشمنوں کے گھرے میں ہوں۔“ میں نے اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ اچانک ایک آواز پر میں بری طرح چونک اٹھا۔ یہ بہت ہلکی آواز تھی۔ نگینہ نے شاید نہیں سنی تھی تاہم گھرے چہرے پر چونکنے کے آثار دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”کیا ہوا.....؟“

میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے ہاتھ میں کالا ناگ کا بھول پکڑ لیا۔ اس کے پستول میں ابھی کافی گولیاں تھیں۔ میرے میگارڈ میں دو تین ہی گولیاں باقی بچی تھیں جبکہ میرے کلیمبر کے پستول کے فاضل رائف ز میرے پاس موجود تھے۔

میں نے میض پھن لی اور کالا ناگ سے چھینا ہوا پستول دائیں ہاتھ میں پکڑا۔ اس کے بعد نگینہ کو اپنی

جان کی بازی لگائے بیٹھا تھا۔ دشمنوں کا خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ذرا آگے جا کر انہیں جب میری بانیک کی آواز سنائی نہ دے گی تو وہ فوراً گاڑی روک کر مجھ کے کتوں کی طرح میری تلاش میں پیدل ہی نکل پڑیں گے۔ مجھے شانے کی تکلیف نے غم حال سا کر دیا تھا۔ دفعۃً مجھے اپنی پیشانی پر نرم و گداز ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ ہاتھ کیا تھا، کیا جان فزا احساس تھا۔ وہ میرے درد اور دردِ دل کی دوا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ نگینہ نے اپنا ہاتھ میری پیشانی پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں کسی دور ویران جنگل کے تالاب کی سطح پر ابھرتے آداس چاند کا سا کس جھلانا محسوس ہوا۔ چہرے پر ایک نامعلوم جذباتی سار تعاش تھا اور نرم و گداز لیوں پر بن گئے لفظوں کی موہوم سی قمر قرعہ اٹھ۔

”نادر.....!“ بے اختیار اس نے مجھے پکارا۔ ”تمہارا زخم.....“

”میرا زخم بہت گہرا ہے نگینہ صاحبہ!“ میں نے مضروب شانے کی اذیت کو اندر ہی اندر پیٹتے ہوئے ہولے سے کہا۔ جانے کیوں اس کی آنکھیں چمک چکی پڑیں۔

”آ..... آپ..... آپ روکیوں رہی ہیں نگینہ صاحبہ؟“ میں نے بے اختیار تڑپ کر پوچھا۔ وہ گویا زخم پر جیسے اپنے ہاتھ کی ملاطمت آمیزی کا تریاق رکھتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں بولی۔ ”تم بہت زخمی ہو۔ پلیز، لوٹ چلو۔ میں تمہاری بیمار بیوی کے لئے کچھ کرنے کی کوشش کروں گی۔“

اس کی بات پر میرے ہونٹوں پر پھٹکی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”نہیں نگینہ صاحبہ! محبت کرنے والے آگے ہی آگے جاتے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھیں گے تو پتھر کے بن جائیں گے۔“

”مگر یہ دیوانگی ہے۔“ نگینہ نے کہا۔

”محبت کا دوسرا نام دیوانگی ہی تو ہے زن..... نگینہ صاحبہ!“ میری آواز ڈوبنے لگی تھی۔

”لل..... لیکن یہ بھی تو سوچو کہ تم زندہ نہیں رہے تو تمہاری بیمار بیوی کا کیا ہو گا؟..... دو..... دو بے چاری پھر زندہ بھی نہ رہ پائے گی۔“ نگینہ سکتے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”کوئی غم نہیں نگینہ صاحبہ! اگلے جہاں میں تو ہم دونوں مل جائیں گے۔ نا۔ اور پھر میں اپنی نگہت کے سامنے سرخو تو رہوں گا، میں اس کی جان بچانے کی خاطر کسی بھی مشکل سے پیچھے نہیں ہٹا۔“

اب تو نگینہ کی آنکھیں بھی چمک چکی پڑیں۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ اسے اس حد تک متاثر کروں کہ وہ میرا ساتھ نہ چھوڑے۔ پھر یہی وہ لمحہ تھا، جب نگینہ کی بایست زدہ اور غم آگس کیفیات کو بھانپتے ہوئے میرے ذہن میں یکبارگی ایک نہایت عجیب اور بالکل انوکھا خیال ابھرا تھا اور یہ عجیب اور انوکھا خیال اس لئے میرے دل میں ابھرا تھا کہ میں نے اب تک محسوس کیا تھا کہ نگینہ جب بھی میری فرضی کہانی کے ٹرائس میں آتی تو اداس سی ہو جاتی تھی۔ وہ کھو جاتی تھی۔ اس کے چہرے سے یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اپنے دل و دماغ کو کریڈیٹ کے عمل سے گزرتی تھی۔ کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا جذبہ محبت میں اتنی بھی قوت نہیں ہے کہ وہ اپنی سوئی ہوئی محبت کو نہ جگا سکے؟..... کیا محبت کا جذبہ اتنا کمزور بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ایک خاص عمل کے ذریعے سلا دیا جائے جیسا کہ اس مردود و ملعون شیطان کیلاشی عامل عاروب نے نگینہ کے ساتھ کیا تھا۔ جبکہ یہ الوہی جذبہ تو خود ایک مسریم ہے، ایک عمل ہے، ایک سحر ہے۔ جس طرح لوہا لوہے کو کاٹتا ہے، عین اسی طرح سحر سے سحر کو کاٹا جا سکتا ہے۔ اس مردود کیلاشی عامل نے یقیناً نگینہ پر اس طرح کی پٹانگ تکنیک آزمائی تھی۔ مجھے مسریم یا چنانچہ سحر کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات تو نہ تھیں تاہم جہاں تک مجھے علم تھا، اس کے مطابق کبھی بھی میں سوچتا تھا کہ بھلا

نہی تھے اور اپنے دشمنوں سے جان بچانے اس علاقے میں آئے تھے اور اس تک و دو میں مجھے ابھی لگی تھی۔ بوڑھے طبیب نے اپنی مہارت سے گولی نکال دی تھی اور اب ہم اس کے مہمان تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر اپنی پتلون کی جیبوں میں رقم کی موجودگی کی تسلی کرنے کے بعد نگینہ بولا۔ ”میرا خیال ہے، میرے دشمن بھگ گئے ہیں۔ ہمیں فوراً نکل جانا چاہئے۔“ میری بات پر نگینہ قدرے پریشانی سے بولی۔ ”ابھی ہمارا ٹکنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ تمہارا زخم بار پھر تازہ ہو سکتا ہے۔ اور پھر کیا خبر باہر پہاڑی وادی کی بھول بھلیوں میں دشمن گھات لگائے بیٹھے۔ اب تو اندھیرا بھی پھیلنے لگا ہے۔“

”ہمیں اسی اندھیرے سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن نادر!..... میں ابھی باہر نکلنے کے حق میں نہیں ہوں۔ صبح تو ہو لینے دو کم از کم۔ ہم تو اب بارہ شہر بھی نہیں جاسکتے۔“ وہ بولی۔ پھر باہر کسی کے ہولے سے کھانسنے کی آواز اُبھری۔ اس کے بعد ٹہا، ایک تونمند شخص اندر داخل ہوا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ نگینہ نے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ یہ بپ کا بیٹا زوار تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بہ غور عجیب نظروں سے میرے رانے بیٹھی نگینہ کو چند ٹاپے گھورتا رہا۔ مجھے اس کا یہ انداز انتہائی ناگوار گزرا۔ پھر میرے ذرا قریب آکر ہاتھ مسکراہٹ سے بولا۔ ”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ لہجہ مقامی اور خاصا اکھڑا تھا۔ تاہم اس نے اردو میں ہی بات کی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں اب..... تم لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں تمہارے بابا کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جنہوں نے میرا علاج کیا۔ وہ کہاں ہیں؟“

میری بات پر اس نے ایک بار پھر معنی خیز نظروں سے نگینہ کو گھورا، پھر مجھ سے بولا۔

”شکریے کی کیا بات ہے؟ یہ ہمارا فرض تھا۔ بابا اس وقت سو رہا ہے۔ مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری

نہایت معلوم کرتا رہوں۔“

وہ ذرا رکا تو میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری مہربانی۔ کیا تم ہماری

”اور مدد کر سکتے ہو؟“

”ہاں..... بولو۔“

”ہم یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔“

”اس وقت کہاں جاؤ گے؟“ وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔ اس نے ایک بار پھر نگینہ کی طرف دیکھا۔

”ہاں کا یوں بار بار نگینہ کو گھورتے رہنا بہت ناگوار گزرا تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

”تم کسی سواری کا بندوبست کر دو۔ ہم کسی ایسے قصبے کی طرف نکل جانا چاہتے ہیں جہاں سے ہمیں

مال ملے۔“

وہ کچھ سوچنے کے انداز میں مستغرق ہوا۔ ”تمہارا منزل کون سا ہے؟“

”چترال۔“ بے اختیار میں نے کہا۔ ”ہم چترال کی طرف روانہ ہونا چاہتے ہیں۔“

”اچھا.....“ وہ پُر سوچ انداز میں بولا۔ ”اچھا ٹھیک ہے، ابھی تم آرام کرو۔ میں صبح منہ اندھیرے

ہاں آؤں گا۔ ایک خچر گاڑی بھی ساتھ لاؤں گا۔ یہاں سے پندرہ سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا

بر ہے۔ وہاں سے تم کو بس تو نہیں البتہ کوئی جیپ مل جائے گی، جو تمہیں اس علاقے سے نکال کر وادی

جگہ پر رہنے کی تاکید کر کے گچھاء سے باہر نکلنے کے لئے قدم آگے بڑھائے تھے کہ اچانک وہ آواز دوبارہ اُبھری۔ اسی وقت میرے زخم میں بھی شدید نہیں اُبھری جس نے مجھے اندر تک بلبلاتا رکھ دیا۔ میں ایک بار پھر وہیں پتھریلی زمین پر بے سدھ سا لڑھک گیا۔ میری قوت ارادی جواب دینے لگی۔ نقابہت نے اس بار شدت سے حملہ کیا تھا۔ نگینہ میری طرف بڑھی۔ میرا دل و دماغ ماؤف ہونے لگا۔ میں بے ہوش نہیں ہونا چاہتا تھا۔ دشمن آس پاس منڈلا رہے تھے۔ میں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے جبا ڈالے مگر بے سود۔ مجھ پر شدید غنودگی کا حملہ ہو چکا تھا۔ پہلے میرے ہاتھ سے پستول لڑھکا تھا، اس کے بعد شاید سر بھی ایک جانب ڈھلک گیا تھا۔ میں شاید بے ہوش ہو چکا تھا۔

\*\*\*

بے ہوش ہونے سے ایک لمحہ قبل مجھے یوں لگا تھا جیسے اب میری آنکھ عالم بالا میں ہی کھلے گی۔ کیونکہ کبیر اور کالا ناگ میرے لہو کی بوسٹھتے پھر رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بے ہوشی کے عالم میں گولی مار کر ہلاک کر سکتے تھے۔ لیکن نہیں، مارنے والے سے تو بچانے والا زیادہ طاقت ور ہے۔ اسے ابھی میری زندگی عزیز تھی۔ اس نے ابھی مجھے انسان دشمن بھیڑیوں کے لئے موت بنانا تھا۔ اسے ابھی میری پاکباز محبت کی تحقیر منظور تھی۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے گرد نیم تاریکی محسوس کی۔ مجھے گھٹن کا بھی احساس ہونے لگا۔ چند ٹاپے تک تو میرا دماغ سوچنے سمجھنے سے عاری ہی رہا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے یکفخت میرے نیم غنودہ ذہن کی اسکرین پر ایک جھماکا ہوا اور گزرے واقعات کی پوری فلم ”فاسٹ فارورڈ“ کی طرح گھوم گئی۔ میں نے سب سے پہلے نگینہ کو پکارا۔ وہ میرے سر ہانے ہی موجود تھی۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ اس کی تشویش زدہ مگر مدھر آواز نے جیسے مجھے سرشار کر دیا۔

طمانیت کی لہری میرے پارہ پارہ وجود میں دوڑ گئی۔ میں نے اسے دیکھا اور مضطربانہ بے چینی سے کہا۔

”نن..... نگینہ صاحبہ! آ..... آپ خیریت سے تو ہیں نا؟..... یہ کون سی جگہ ہے؟“ میں آنکھیں پھاڑے نیم تاریکی میں گھورنے لگا۔

مجھے اپنے زخم میں بھی اب جلن کی بجائے ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا۔ تب میں نے دیکھا کہ میرا اُوپر کی جسم برہنہ تھا اور میرے دائیں شانے کے زخم پر کوئی عجیب و غریب مرہم لگایا گیا تھا۔ یہ شاید کوئی دیکھی طریقہ تھا۔

ہم دونوں ایک پھونس کے جھونپڑے میں تھے۔ جس کے وسط میں چھت کو سہارا دیتے بد نما بانس سے مدھم لو کی حامل لائین جھول رہی تھی۔ دروازے پر پوشیدہ ساٹھ جھول رہا تھا۔ باہر شام جھک آئی تھی۔ جھونپڑی کے محدود ماحول میں سردی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی، یہ سب کیا تھا..... ہم کہاں تھے؟

تاہم مجھے نگینہ نے بتایا کہ میرے بے ہوش ہوتے ہی وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ وہ میرے دشمنوں کے ڈر سے باہر کسی مدد وغیرہ کی تلاش میں بھی گچھاء سے نہیں نکل سکتی تھی۔ لیکن پھر جب اس نے دیکھا کہ میرے زخم کا منہ ایک بار پھر کھل گیا تھا اور اس میں سے خون رسنے لگا تو اسے مدد کے لئے باہر نکلنے کا رسک لینا پڑا۔ تب اسے اتفاق سے ایک خانہ بدوش کا مختصر سا قافلہ جانا دکھائی دیا اور نگینہ نے ان سے مدد کی درخواست کر ڈالی۔ پھر وہ لوگ مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے اور ایک بوڑھے طبیب نے دیسی لٹنے کے تحت میرے زخم کی مرہم پٹی کر دی۔ نگینہ نے بحالت مجبوری انہیں یہی بتایا کہ ہم دونوں

”تمہاری بہت مہربانی“ میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ پھر اس نے گنبد کی طرف ایک عجیب سی نگاہ ڈالی۔ اس کے بعد وہ گنبد کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے دوبارہ بولا۔ ”اگر تمہاری یہ زانی چاہے تو میری بیوی کے پاس سو سکتی ہے۔“

”نہیں..... اس کی ضرورت نہیں۔ میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔“ اس کی بات پر گنبد نے فوراً اس سے ساٹ لہجے میں کہا۔ وہ جانے کے لئے پلٹا۔ پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ وہ رک گیا۔ پھر اس مرتبہ میری بجائے گنبد سے مخاطب ہو کر بولا۔

”تم لوگوں کا کن سے دشمنی چل رہا ہے؟“ گنبد اس کے سوال پر ذرا گڑبڑا سی نگاہ میں نے جواباً کہا۔ ”ہمارا اپنا قبیلہ ہی ہماری جان کا دشمن بن گیا ہے۔“

”اوہ..... اچھا۔ ویسے بابا نے مجھے بتایا تھا کہ اس وادی میں تمہارا دشمن تم دونوں کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔“ اس نے آخر میں عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم فکر نہ کرو۔ تمہارے دشمن یہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموشی سے لوٹ گیا۔

”مجھے اس کے ارادے کچھ ٹھیک نظر نہیں آتے۔“ اس کے جانے کے بعد گنبد نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ میں اس کی بات جھٹلا کر اسے دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ لہذا اسے محتاط رہنے کی خاطر تائیداً کہا۔

”ہاں..... مجھے بھی اس خوفناک بدوش کی آنکھوں میں خباثت محسوس ہوئی ہے۔ لیکن گنبد صاحب! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں اس سے ایک ہل کے لئے بھی غافل نہیں رہوں گا۔ اگر اس نے آپ کے ساتھ غلط حرکت کرنے کی ذرا سی بھی کوشش کی تو اس کا بہت برا حشر کروں گا۔“

میرے جوش غیظ سے لبریز لہجے پر گنبد عجیب سی نگاہوں سے مجھے تنکے لگی۔ پھر اس کے گداز لبوں پر مودوم سی مسکراہٹ ابھری اور بولی۔

”پھر تمہارا کیا خیال ہے؟ اس پر بھروسہ کیا جائے کہ کل صبح منہ اندھیرے یہ ہمیں ایک خنجر گاڑی میں کسی مطلوبہ قصبے تک چھوڑ دے گا؟“

”دیکھتے ہیں..... صبح تو ہو لینے دیں۔“ میں نے کہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں جھکن اور نیند کے تاثرات بھانپ کر بولا۔ ”آپ ایسا کریں، تھوڑا سا آرام کر لیں۔ میری تو شاید طویل بے ہوشی میں نیند پوری ہو گئی ہے۔“

اسے شاید سردی لگ رہی تھی۔ میں نے گرم سویٹر پہن رکھا تھا، وہ میں نے اسے پہنا دیا۔ سوکھی پال پر ایک ہی بستر تھا جس پر میں بیٹھا ہوا تھا اس لئے میں نے گنبد کو اس پر آ جانے کا کہا اور اسے ڈھانچنے کے لئے چادر تھما دی۔ وہ جھجک رہی تھی۔ میں نے اس کے دائیں کاوندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے مضبوط اور مستحکم لہجے میں اس سے کہا۔

”گنبد صاحب! آپ بے فکر ہو کر سو جائیں۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گا۔“ یہ کہہ کر میں جھوپڑی سے باہر آ گیا اور دروازے کے قریب سکوڑ سٹ کر بیٹھ گیا۔ دور پہاڑیوں پر سرد شام اتر رہی تھی اور وادی میں سناٹا چھانے لگا تھا۔ مجھے چند اور جھوپڑیاں بھی دکھائی دی تھیں مگر وہ ہماری جھوپڑی سے خاصے فاصلے پر تھیں۔ یہ جھوپڑی الگ تھلگ مقام پر ایک ہموار قطع پر تھی۔ آسمان صاف تھا۔ وقت گزرتا

اب۔ گنبد اندر گہری نیند سو رہی تھی۔

سرد شام اب ٹھنڈی رات کی تاریکی میں بدل گئی تھی۔ شفاف آسمان پر ننھے ننھے تارے ٹٹھانے لگے تھے۔ میرے عین سامنے ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر دمکتا چاند کسی پہاڑی دوشیزہ کے کنوارے اور نوجوان کھڑے کی طرح جھانکتا نظر آ رہا تھا۔ دور کہیں وادی میں پہاڑی پرندے ”بو بو“ کی سوگوار سی ”بنکار“ ہو کر ابھری۔ رات دے پاؤں سرک رہی تھی۔ ہماری سہل کی طرح گزرنے والا ہر پہل ٹھٹھکے ہوئے دل و دماغ پر آنے والے وقت کے اندیشوں کی اسرار بھری دھمک دیتا ہوا گزر رہا تھا۔

اچانک مجھے کہیں قریب ہی آہٹ سنائی دی۔ میں نے چونک کر آہٹ کی سمت دیکھنے کی کوشش کی۔ ہلکی ہوئی چاندنی میں مجھے ایک سایہ نظر آیا۔ میرے اعصاب تن گئے اور میں نے بلا تاخیر اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ غالباً اس پر اسرار سائے نے بھی مجھے ٹھٹھکتے دیکھ لیا تھا۔ یہی سب تھا کہ وہ یکدم ایک طرف جھپٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اسے آواز دی۔ ”کون سیہ.....؟“

وہ ٹرک گیا۔ اس نے گرم اور موٹی چادر کی بکلی ماری ہوئی تھی۔ میرے پکارنے پر وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے پستول والا ہاتھ اس کی طرف کر دیا۔ وہ قریب آیا تو میں اسے پہچان گیا۔

وہ خانہ بدوش طیب کا بیٹا زوار ہی تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت ہلکورے لے رہی تھی۔ تب پھر اچانک میں نے اپنے قدموں کے سامنے پتھریلی زمین پر چاند کی روشنی میں ایک اور سایہ متحرک ہوتے دیکھا۔

’کوئی میرے عقب میں تھا۔‘ میرے اندر کوئی چیخا۔ میں یک لخت پلٹا مگر مجھ پر چھلاگ لگا دی گئی۔ سب سے پہلے مجھے میرے پستول سے محروم کر دیا گیا اور ایک زوردار ٹھوکر میرے پیٹ پر رسید کر دی گئی۔ میں اس اچانک حملے پر بلبل کر رہ گیا۔ وہ دو کیم نیم افراد تھے جن کا تعلق یقینی طور پر انہی خانہ بدوشوں سے تھا۔ مجھے یہ بھی سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ زوار خان اپنی کسی ناپاک سازش کے تحت ہی دو ساتھیوں کے

مراہ یہاں آیا تھا۔ بہر طور پیٹ پر پڑنے والی ٹھوکر کی شدید تکلیف کو دانتوں تلے دباتے ہوئے میں نے سنبھلنے کی کوشش کی اور رکوع کے بل جھک کر ٹھوکر مارنے والے کے پیٹ پر سر کی زوردار گھر رسید کر دی۔ وہ نونہل ہونے کے باوجود پیٹ پر پڑنے والی میری سر کی ٹھوکر پر ”اوغ“ کی آواز نکالتا ہوا کئی قدم پیچھے

جا پڑا۔ ادھر زوار خان اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے بیک وقت مجھ پر چھلائیں لگا دیں۔ شانے کی تکلیف کے باوجود میں نے بھرتی کا مظاہرہ کیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ میرے پاس میرا میگارد موجود تھا۔ وہ دونوں جیسے اپنی ہی جھونک میں آگے نکلے۔ میں نے بھرتی سے جب میں ہاتھ ڈال کر میگارد نکال لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے حلق سے تیز کراہ سی خارج ہو گئی۔ پہلے والے نے، جسے سر کی ٹکر میں

نے ماری تھی، اس نے ایک نوکیلا پہاڑی پتھر میرے پستول والے ہاتھ پر دے مارا تھا۔ نتیجتاً میرے ہاتھ سے میگارد بھی نکل گیا۔

اچانک مجھے گنبد کی چیخ سنائی دی۔ میں نے جھوپڑی کی طرف دیکھا۔ چاند کی روشنی میں مجھے وہ جھوپڑی کے باہر کھڑی نظر آئی۔ اس پہنگا سے وہ جاگ گئی تھی لیکن اس نے باہر نکلنے کی خست بے وقوفی کی تھی۔ زوار خان اور اس کا دوسرا ساتھی گنبد کی طرف جھپٹے۔ میں اپنے دونوں پستولوں سے محروم ہو چکا تھا۔ چاند کی روشنی میں ناہموار پتھریلی زمین پر پستول تلاش کرنا دقت طلب کام تھا۔

تب پھر اچانک میں نے زوار خان اور اس کے ساتھی کو گنبد کی طرف جھپٹتے دیکھا۔ گنبد نے خوف زدہ ہو کر چپختے کے لئے منہ کھولا تو زوار خان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرے سر پر جیسے خون سوار ہو



ہوش کی مگر میں زخم کھلنے کی وجہ سے کچھ زیادہ بھرتی کا مظاہرہ نہ کر پایا اور قرولی کے ظالم وار نے میرے پہلو میں جاں کشیدہ چکا لگا ہی دیا۔ میرے حلق سے کرب انگیز کراہ خارج ہو گئی۔ میرا دایاں پہلو اڑھ سا گیا تھا۔ اس نے منجھل کر دوبارہ مجھ پر قرولی سے وار کرنا چاہا۔ مگر اب مجھے نگینہ اور اس کی عزت کی حفاظت کے سوا کچھ یاد نہ رہا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کے قرولی والے ہاتھ کو دبوچتے ہی دائیں ہاتھ کا گھونسہ اس کی ناک پر جڑ دیا۔ وہ چند ثانیے کے لئے جھنجھنا کر رہ گیا تھا۔ اس کی زخمی ناک سے بھل بھل خون بہنے لگا تھا۔ میں نے اس لمحائی موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور قرولی پر اس کے ہاتھ کی گرفت کمزور پڑتے ہی میں نے قرولی اس کے ہاتھ سے چھینی اور اس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ وہ کریہہ چیخ مار کروہیں ڈھیر ہو گیا۔ نگینہ میری طرف لپکی۔

”چلو نگینہ!..... یہاں سے فوراً نکلنا ہو گا۔“ میں نے زخموں سے چور ہانپتی آواز میں اس سے کہا۔  
”اے!..... لیکن نادرا! ت..... تم بہت زخمی ہو گئے ہو۔“ وہ آنسو بھری آنکھوں اور درد سے لبریز لہجے میں بولی۔

”میں ٹھیک ہوں..... چلو..... جلدی۔“  
”مہمرو..... میں ابھی آئی۔“ اچانک جیسے اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ استفسار کرتا، وہ دوڑتی ہوئی جھوپڑی کے اندر داخل ہو گئی۔ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ نہ جانے وہ جھوپڑی کے اندر سے کیا لینے کی تھی۔ پھر چند ہی سیکنڈ بعد وہ پلٹی تو میں نے اس کے ہاتھ میں کوئی شے پکڑی ہوئی دیکھی، ہ تیزی سے دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی۔ میں اپنے ہتھیاروں سے محروم ہو چکا تھا، جنہیں تلاش کرنا بے حد ضروری تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میرا میگرد مجھے نظر آ گیا جسے میں نے لپک کر اٹھالیا۔ میرے دشمنوں کی کراہیں بدستور گونج رہی تھیں۔ قبیلے والے جاگ جاتے تو معاملہ سنگین ہو سکتا تھا۔ میں اور نگینہ ہر طرف پھیلی چاندنی میں نامعلوم سمت کی طرف بڑھ گئے۔

نگینہ نے مجھے بتایا تھا کہ بوڑھے طبیب نے مرہم کی بقیہ مقدار دیں جھوپڑی میں رہنے دی تھی۔ وہ وہی اٹھانے کے لئے لپکی تھی۔ تھوڑی دور نکل آنے کے بعد ہم ایک تنگ درے سے نکلے اور ایک قدرتی طور پر بنے چٹائی جھجے تلے بیٹھ گئے۔

میں پتھریلی دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔ نگینہ جلدی جلدی مرہم کی پوٹلی کھولنے لگی۔  
میں نے اس سے کہا۔ ”نن..... نگینہ صاحبہ!..... آ..... آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“  
میری بات پر اس کے پوٹلی کو کھولتے ہوئے ہاتھ قہقہہ گئے۔ وہ کک زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔  
پھر چلتی لہجے میں بولی۔

”تم..... تم کس مٹی کے بنے ہوئے ہو؟ تمہاری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم باہیار میری خیریت پوچھتے رہتے ہو۔ تم زندہ رہو گے تو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرو گے نا۔“  
”لیکن نگینہ صاحبہ! میرے ذمے آپ کی بھی حفاظت فرض ہے۔“  
”میری فکر نہ کرو..... صرف اپنے مقصد اور مفاد کی فکر کرو۔“ وہ بولی تو بے اختیار میرے لبوں سے بھی نکل گیا۔

”میرا مقصد اور میرا مفاد صرف تم ہو۔“  
”میں.....؟“ وہ چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی اور مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔  
میں نے جلدی سے بات بتاتے ہوئے کہا۔

گیا۔ نگینہ کو خبیث زوار خان اور اس کے بدخلصت ساتھی کے قبضے میں بے بس چڑیا کی طرح پھڑپھڑانا دیکھ کر میرے رگ و پے میں آتش غیظ و جنوں کی نفرت انگیز سنسنائیں دوڑ گئیں۔  
”کتے!..... کیونے!“ میں حلق کے بل چیخا اور جیسے ہی قدم بڑھائے تھے کہ دوسرے ساتھی نے میرا راستہ روک کر میرے چہرے پر ایک گھونسہ جڑ دیا۔ اس کے بھاری بھر کم کے کی زوردار ضرب سے مجھے اٹھنا جبراً اٹھنا محسوس ہوا۔ ایک لمحے کو میرا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ پھر میرے کانوں سے زوار خان کی پُر غیظ آواز نکل گئی۔ وہ میرے مقابل سے بولا۔

”شودک! اے سنبھالو اور ختم کر کے کسی گہری کھائی میں پھینک کر آ جاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ ہراساں نگینہ کو کھینچتے ہوئے ایک طرف لے جانے لگا۔ میرے اندر کا آتش فشاں غضب ناک لاوا اگلنے لگا تھا اور نگینہ سے کہے ہوئے اپنے الفاظ میرے دل و دماغ میں گونجنے لگے۔ ”نگینہ صاحبہ! آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ پر آج تک نہیں آنے دوں گا۔“

بس تو پھر جیسے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مجھے اپنے ان الفاظ کی لاج رکھنا تھی، اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر۔ میں زوار خان اور اس کے بدخلصت ساتھی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ شاید مجھے تر نوالہ کچے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس کا حکم پاتے ہی وہ جوں ہی میری جانب بڑھا تو میں نے اچھل کر زوردار فلائنگ کلک اس کے سینے کی بجائے چہرے پر جڑ دی۔ اس فلائنگ کلک میں وہ غیر معمولی قوت تھی کہ وہ کسی قدم دور جا کر پتھر ملی زمین پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ میں اب کہاں رکسے والا تھا۔ میں نے فوراً ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ وہ آواز نکالے بغیر وہیں ساکت ہو گیا۔ اس کے بعد میں وحشتانہ غراہٹ کے ساتھ زوار خان اور اس کے ساتھی کی طرف لپکا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے فوراً اپنی میٹھی کے اندر سے ایک قرولی نکال لی۔ زوار خان نگینہ کو دبوچنے کھڑا ہو گیا۔ نگینہ اس کے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس کے ساتھی نے قرولی اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور اپنے چاروں ہاتھ پاؤں پھیلا کر میرے حملے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وحشتانہ چمک تھی۔ میں نے بھی یہی انداز اختیار کر لیا تھا۔ ادھر زوار خان دوبارہ نگینہ کو دبوچنے ایک طرف کھسکتا شروع ہوا تو میں نے قرولی بدست کو چھوڑ کر زوار خان کی طرف دوڑ لگائی۔ وہ میرے اس ڈانچ میں آ گیا۔ چنانچہ جیسے ہی وہ میرا راستہ روکنے کے لئے میری طرف حملے کی پہل کرتے ہوئے جھپٹا، میں نے نہایت پھرتی کے ساتھ راستہ کاٹتے ہوئے جھکائی دی اور اس کے قرولی والے ہاتھ کی کلائی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر دائیں ٹانگ کا گھٹنا اس کے پیٹ میں رسید کر دیا۔ وہ دبی دبی کراہ کے ساتھ جیسے ہی رکوع کی حالت میں جھکا، میں نے اس کی جھکی ہوئی ناک پر کنبی کی زوردار ضرب رسید کر دی اور اس کا ہاتھ مروڑ کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ پہاڑی جوان تھا تو میری پرورش بھی انہی علاقوں میں ہوئی تھی۔ قد و قامت اور ذیل ڈول میں کسی طرح بھی ان سے کم نہ تھا۔ میرے مد مقابل کی کلائی والی ہڈی ٹوٹنے کا کڑا اکا اٹھا تھا۔ میں نے جیسے ہی قرولی چھین کر اپنے قبضے میں کی تو زوار خان نگینہ کو چھوڑ کر مجھ پر جھپٹا، اس کی یہ حرکت میرے لئے اچانک اور بالکل غیر متوقع تھی۔ یہی سبب تھا، وہ میرے زخم پر گھونسا رسید کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مارے اذیت کے میرے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ اس نے میرا قرولی والا ہاتھ دبوچ لیا۔ میرا زخم کھل گیا تھا اور اس میں سے خون بہنے لگا تھا۔ ظالم نے بڑی نازک جگہ پر وار کر کے مجھے نہ محال کر دیا تھا۔ اس نے قرولی میرے ہاتھ سے چھین لی اور بڑی نفرت خیز غراہٹ کے ساتھ میرے پیٹ میں گھونپنا چاہی تو نگینہ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ میں نے بروقت ایک طرف ہونے کی

”تمہیں بھوک اور پیاس تو لگی ہوگی۔“ اچانک اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”مجھے تو ان لوگوں نے دودھ فیرہ ملا دیا تھا مگر تم.....؟“ اس نے جیسے بھانپتے ہوئے کہا۔

”نہیں.....“ میں نے جھوٹ بولا۔ پھر موضوع بدلنے کی غرض سے مزید کہا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں ملنا چاہیے۔ خانہ بدوشوں کے تین آدمی میرے ہاتھوں بری طرح زخمی ہو چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی ایک آدھ مر بھی گیا ہو۔ ایسا نہ ہو اب ان کی بھی دشمنی بگڑنا پڑے۔“

گنبد کے چہرے پر پھر تشویش کے آثار ابھرے۔ تاہم وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”ایک بات سمجھ لی نہیں آ رہی۔“

”کون سی بات؟“

”کبیر اور اس کے ساتھیوں نے پولیس کی مدد کیوں نہیں کی؟“

میں اسے کیا بتانا کہ کبیر اور کالا ناگ میری جان کے دشمن تھے۔ پولیس کو شامل کر کے وہ میرا تحفظ کیوں چاہتے۔ یوں تو میں بیک وقت دو محاذوں پر برسرِ کار تھا۔ ایک طرف دشمن میرے خون کی بو محسوس کر رہے تھے اور دوسری طرف پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ کبیر اور کالا ناگ جیسے مکار اور نظر ناک دشمنوں سے کوئی بعید نہ تھا کہ وہ وقت پڑنے پر پولیس کو بھی میرے پیچھے لگا سکتے ہیں۔ لیکن میں گنبد کو اصل بات ابھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ لہذا بولا۔

”شاید وہ خود سرخرو ہونا چاہتے ہیں۔“

معارات کے پہر اور دم بہ خود سنانے میں کہیں قریب ریل کی مخصوص ”چھکا چھک..... چھکا چھک“ مائل دی۔ میں چونک پڑا۔ گویا ریلوے لائن کہیں قریب ہی تھی۔ میں دیوار کا سہارا لے کر اٹھا۔ گنبد کو لے کر آواز کی ست بڑھ گیا۔ سنگلاخ پہاڑی سلسلے کا یہ وسطی علاقہ نہ ہونے کی وجہ سے شاید یہاں کھائیاں کم تھیں۔ تاہم میں گنبد کو لئے پہاڑی دروں اور تنگ دراڑوں سے ہوتا ہوا دوسری سمت نکلا تو مجھے سامنے ٹھنڈی چاندنی میں قوس کی صورت چمکتی ہوئی ریلوے لائن دکھائی دی۔ جو بل کھا کر ایک طرف سنگلاخ اور تاریک سرنگ میں داخل ہو رہی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے سرنگ کے اندر روشنی ہونے لگی۔

میں رکنا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد ریل کا دخانی سیاہ انجن اپنی چمپنی سے گاڑھا سیاہ دھواں فضا میں اٹکنا اور سرنگ سے باہر آنا دکھائی دیا۔ اس کے اوپر تیز سرچ لائٹ نمالبل روشن تھا۔ رفتار ست تھی۔ وہ مال گاڑی تھی اور خاصی طویل بھی۔ اس کا رخ مضامفات کی طرف تھا۔ مال گاڑیاں یوں بھی ست رفتار سے ہی چلتی تھیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی تھی۔ شاید سکیل کیسر نہ تھا۔ بالآخر وہ رگ لگ گئی۔ رات کے پہر سنانے میں انجنوں کی مخصوص گھر..... گھر..... گھر..... عجیب سی لگ رہی تھی۔ میرے ذہن میں اچانک ایک خیال ابھرا۔ میں نے گنبد کو ساتھ لیا اور ذرا تیز تیز قدموں سے رگ کی طرف بڑھنے لگا۔ انجن سرنگ کی حدود سے کافی دور نکل آیا تھا جبکہ بوگیاں ابھی سرنگ کے اندر تک ہی تھیں۔ مال گاڑیاں یوں بھی طویل ہوتی ہیں۔

میں گنبد کے ساتھ سرنگ کے قریب پہنچا۔ میرا ارادہ مال گاڑی کی کسی بوگی میں سوار ہونے کا تھا۔ لیکن جہاں تک میں دیکھ سکتا تھا، بوگیوں کے دروازے بند اور سیل تھے۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور بڑی کے ساتھ ساتھ بوگیاں دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔ اچانک ایک بوگی پر مجھے سیل نظر نہ آئی مگر بوگی کے دروازے کو آہنی کنڈا چڑھا ہوا تھا۔ میں آگے بڑھا اور کنڈا کھول دیا۔ ٹھیک اس وقت گاڑی نے ریٹینا ٹوڑ کر دیا۔ میں دروازہ کھول چکا تھا اور جلدی سے آگے بڑھ کر گنبد کے نرم و نازک وجود کو بازوؤں

”بے شک، ایک طرح سے میرا مفاد آپ کی زندگی سے وابستہ ہے۔ تاکہ میں آپ کے باپ سے تادان کے طور پر ایک خطیر رقم حاصل کر سکوں۔ مگر مجھ پر یہ بھی تو لازم ہے کہ میں آپ کا بال بھی پکاز ہونے دوں۔ کیونکہ میں یہ تو جانتا تھا کہ وہ کمینہ زوار خان اور اس کے دونوں بدخلصت ساتھی آپ کو جان سے مارنا تو نہیں چاہتے تھے لیکن آپ کی عزت پر بھی میں ذرا آج نہیں آنے دوں گا۔“

”کیوں؟..... تمہیں میری عزت سے کیا لینا دینا؟“ وہ چلا کر بولی۔ ”اگر وہ تمہیں ہلاک کر دیتے تو..... تمہاری بیوی کا علاج کس طرح ممکن ہوتا؟ وہ تو بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتی۔ اگر وہ بدخلصت زوار خان میری عزت سے کھیل کر مجھے چھوڑ دیتا تو کیا برا تھا۔ میں زندہ تو رہتی تا۔ مگر تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر.....“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔ رات کے سکتے ہوئے سنانے میں ”چٹاخ“ کی آواز ابھری اور گنبد دم بہ خود میرا چہرہ ہٹکے لگی۔

”تت..... تم نے ایسا کیوں کہا؟“ میں اسے گھورتے ہوئے فرط جوش سے سرخ ہو کر بولا۔ ”مجھے تمہاری عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ کیوں کہا تم نے ایسا؟..... جواب دو مجھے گنبد! تم نے میری محبت کو اتنا لاوارث کیوں سمجھا؟“

مجھ پر گویا پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اور گنبد..... وہ مارے حیرت کے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتا جا رہی تھی۔ اچانک مجھے کچھ احساس ہوا، میں نے فوراً اپنی جلتی سکتی کیفیات پر قابو پایا اور اپنا سر چٹائی جھجکے کی پتھر ملی ناہموار دیوار سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ پھر میں چند گہری گہری سانس لے کر اپنے وجود میں دیکھتے اُبال پر قابو پاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”گنبد صاحب! ام..... مجھے معاف کر دینا۔ مجھے آپ پر ہاتھ اٹھانے کا کوئی حق نہ تھا۔ کوئی حق نہ تھا مجھے۔“ یہ کہہ کر میں اپنے دائیں ہاتھ کا منکا بنا کر چٹائی جھجکے کی تنگی دیوار پر مارنے لگا۔ یہاں تک کہ اس میں خراشیں پڑ گئیں۔ مگر گنبد نے فوراً اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تمام لیا اور بولی۔

”یہ کیا پاگل پن ہے؟..... تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھا کر کوئی غلطی نہیں کی۔ چلو چھوڑو۔ اپنی قمیض اتارو۔ میں یہ مہم لگا دوں۔“

پھر اس نے قمیض اتارنے میں میری مدد کی۔ میرا اوپری مضبوط جسم برہنہ ہو چکا تھا اور گنبد چند ٹاپے میرے کشادہ سینے کو گھورتی رہی۔ پھر جیسے میرا دل بہلانے کی غرض سے سکرا کر بولی۔

”تم خاصے ہینڈسم اور خوبو ہو۔ تمہاری بیوی گنبد یقیناً بہت خوش قسمت ہے کہ اسے تم جیسا جڑی، غیرت مند، بہادر اور مضبوط شوہر ملا۔“ گنبد کی تعریف نے میرا سید خون بڑھا دیا اور میرے جی میں آئی کہ میں اسے کہہ دوں۔ ”گنبد! میری جانِ جانان! پنجاب کی ذرخیز زمین کا یہ پہاڑی نوجوان، تمہاری ہی تو ملکیت ہے۔ خدا را اسے پیچانو۔ اپنی محبت کو پیچانو۔ مگر میں ابھی یہ اس سے نہیں کہہ سکتا تھا۔“ ابھی تک یہی سمجھ رہی تھی کہ میں اسے چڑا ل اپنے ٹھکانے پر لے جاؤں گا اور بعد میں اس کے باپ سے تادان طلب کروں گا۔

اس نے مہم نکالا۔ جبکہ میرا مہم تو وہ تھی۔ اس نے میرے زخموں پر آہستہ آہستہ مہم لگانا شروع کر دیا۔ مجھے اپنے زخموں کی ٹیسوں پر ٹھنڈی آہنی محسوس ہونے لگی۔ مہم لگانے کے بعد مجھے ذرا سکون ملا تو دبی ہوئی بھوک اور پیاس کا احساس ہوا۔ گنبد نے تو شاید کچھ کھاپی لیا ہو گا مگر میں نے طویل بے ہوشی کی وجہ سے کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔

میں اٹھا کر بوگی کے اندر داخل کیا اور پھر خود بھی سوار ہو گیا۔

بوگی میں اناج کی بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ ایک خالی جگہ پر میں اور نگینہ سکرسمٹ کر بیٹھ گئے۔ گاڑی نے معمول کی رفتار پکڑ لی تھی۔

میری پہلی منزل چترال تھی جو انتہائی شمالی کنارے پر تھی۔ اس کے بعد کیلاش وادی، چترال شہر سے کوئی 40 کلومیٹر (25 میل) کے فاصلے پر تھی۔ لیکن اس سست رفتار مال گاڑی پر چترال تک کا سفر محال اور عبث تھا۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ یہ کم از کم مجھے یہاں دشمنوں کے ناپیدہ ٹھکانوں سے کوسوں دور لے جاسکتی تھی۔

خانہ بدوشوں کے بوڑھے طبیب کا مرہم جادو اثر ثابت ہوا تھا۔ نگینہ نے بھی میرے زخموں پر سارے ہی مرہم کا لپچ کر دیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زخم تھے ہی نہیں۔ ٹیسوں کی بجائے اب ٹھنڈکی پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ میری توقع کے برخلاف مال گاڑی معمول سے زیادہ رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ بوگی کا دروازہ میں نے ذرا کھلا رہنے دیا تھا۔ چاند کی مدھم روشنی اندر کی تاریکی کو کسی قدر دور کر رہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ مال گاڑی کہاں جا رہی تھی۔ تاہم اتنی تسلی تھی کہ یہ مجھے کسی نہ کسی بڑے اسٹیشن پر تو اتار ہی سکتی تھی۔

مال گاڑی کا سفر جاری تھا۔ وہ اس وقت وسطی پہاڑی سلسلے، گہری کھائیوں، تاریک سرنگوں میں تیزی سے گزر رہی تھی۔ ایک دو اسٹیشن بھی آئے۔ میں نے دروازہ بند کر کے جھری بنا کر جھانکا بھی کہ شاید کسی بڑے اسٹیشن پر رکے تو میں نگینہ کو لے کر اتر جاؤں۔ بالآخر پوہ پھنٹے ٹرین ”کھیلانہ“ کے اسٹیشن پر رکی۔ مال گاڑیوں کو عموماً پلیٹ فارم کی بجائے ”لوپ لائن“ پر روکا جاتا تھا۔ میں نے یہاں پوچھ گچھ کرنا ضروری سمجھا اور نگینہ کو اپنی جگہ بیٹھے رہنے کی تاکید کر کے احتیاط سے نیچے اترے۔ ہماری ”مال بوگی“ اسٹیشن سے ذرا دور تھی۔ میں نے بوگی کا نمبر ذہن نشین کیا اور تیز تیز قدموں سے پلیٹ فارم پر پہنچا۔ وہاں ایک بے خبر ٹرین موجود تھی۔ پتہ چلا کہ یہ بے خبر ٹرین مردان اور درگی تک جاتی ہے۔ درگی اس کا ٹرمس (آخری اسٹیشن) تھا۔ مال گاڑی جانے لگتی دیر یہاں کھڑی ہوتی، اس لئے میں جلدی سے واپس لوٹا اور نگینہ کو اتار کر مذکورہ ایکسپریس ٹرین کا ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہو گیا۔

درگی پہنچ کر ہم اتر گئے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ بذریعہ ٹرین چترال کا سفر ناممکن اور مشکل تھا۔ البتہ تیز رفتار لکڑی مسافر کوچز چلتی تھیں جو ضلع ”دیر“ کے علاقہ ”چلارہ“ سے ہوتی ہوئی مین سٹی ”دیر“ تک جاتی تھی۔ وہاں سے ہمیں دوسری کوچ چترال کی مل سکتی تھی۔ میں نے کوچ کے دو ٹکٹ لئے اور اس میں سوار ہو گیا۔ ہم دونوں پہلے ہی مشکلات کے ستارے ہوئے تھے۔ اس لئے کوچ کی آرام سیٹوں اور پرسکون ماحول نے کافی اطمینان بخشا۔ سفر شروع ہو گیا۔ ناشتہ وغیرہ ہم نے درگی میں کر لیا تھا۔

”دیر“ اترنے کے بعد وہاں سے ہم چترال کی کوچ میں سوار ہو گئے۔ سہ پہر تک ہم چترال پہنچ چکے تھے۔ یہاں ہم نے ایک ایسے سے ہوٹل میں لُچ کیا۔ نگینہ نے مجھے بتایا کہ مجھے اپنے لئے کچھ بین کراہنی انفلو میٹری میڈیسن اور اسٹین بائیونک لے لینی چاہئیں۔ میں ڈاکٹروں کے مشورے کے بغیر سیلف میڈیکیشن کا استعمال اچھا نہیں سمجھتا تھا مگر مجبوری تھی۔ ورنہ لمبے چوڑے کھٹ راگ میں پڑ سکتا تھا۔

ہلکی پھلکی روزمرہ کی ادویات مجھے یاد تھیں۔ اس کے توجہ دلائے پر میں نے ایک میڈیکل اسٹور سے ادویات خریدیں۔ چونکہ ”ماشاء اللہ“ ہمارے ملک میں سیلف میڈیکیشن کا چلن عام ہے اور بالخصوص میڈیکل سٹورز کے حضرات اس ”کار خیز“ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں چنانچہ میڈیکل سٹور والے نے

مجھے اپنی تجویز کردہ ادویات دے دیں۔ جب میں نے قیام کے لئے ہوٹل کا رخ کیا تو نگینہ نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا اس ہوٹل میں رہتے ہوئے تمہیں تاوان درکار ہے؟“

اسے اب قائل کرنا ضروری تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”دیکھیں نگینہ صاحبہ! آپ کے چپا اور کبیر ہرے سب ٹھکانوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ بہر حال اب ہماری منزل زیادہ دور نہیں ہے۔“

وہ الجھی گئی۔ اس کے حلق میں ایک بار پھر یہ بات شاید اٹھنے لگی تھی کہ آخر مجھے تاوان کی رقم حاصل کرنے کے لئے اتنے لمبے چوڑے کھٹ راگ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی اور میں اسے قائل کرنے کی ہی کوشش کرتا رہا تھا۔ مگر اب چترال سے بھی آگے نکلنے پر وہ ایک بار پھر الجھن کا شکار ہونے لگی تھی۔

ب میں نے اسے ایک اور جواب گھڑ کر بتایا کہ وہ صرف میرا علاقہ تھا۔ وہاں میں اسے (نگینہ کو) اپنوں ہی چھوڑ کر بس کے باپ سے تاوان کی خطیر رقم حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ حالات کچھ ایسے گزرتے تھے کہ نگینہ کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ اصل ماجرا کیا تھا۔ تاہم جیسے جیسے یہ معاملہ طول پکڑتا جا رہا تھا، نگینہ کو شبہ ہونے لگا تھا کہ معاملہ کچھ اور ہی تھا اور اب اس نے کھل کر اس کا اظہار کر دیا تھا۔

”نادر صاحب!..... مجھے تو یہ کچھ اور ہی چکر نظر آتا ہے۔ کوئی ایسا پراسرار اور گہرا چکر جو مجھ سے پہلے جا رہا ہو۔“

میں چونک سا گیا۔ ایک ایسی مجھے یوں لگا جیسے اب میں زیادہ دیر تک اسے اپنی فرضی کہانی سے بہلا نہ پاؤں گا۔ تاہم ہنس کر بولا۔ ”آپ تو پتہ نہیں کیا سوچنے لگیں؟“

”میری طرف دیکھو.....!“ اس نے اچانک تجنب سے لہجے میں مجھ سے کہا اور میں اس کی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی بغور میری آنکھوں کی گہرائیوں کے راستے دلی مجبوری عین گہرائیوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

”پتہ نہیں کیوں نادر! مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم یہ سب تکلیفیں، مصائب و آلام اور کٹھنائیاں اپنی بیمار ہڈی کی خاطر نہیں بلکہ میری خاطر برداشت کر رہے ہو۔“

میرے اندر جھماکا ہوا مگر میں کچھ بولے اور بغیر پلک جھپکائے اسے نکتا رہا۔ اسے بولنے کا موقع دیتا۔ وہ جیسے اپنی رو میں کبے جا رہی تھی۔ ”ہاں نادر! تمہارا میرا احترام کرنے کا انداز ایک عجیب سا والہانہ نالگہ ہے۔ ان چند دنوں کے دوران تم خود کس قدر تکلیف میں رہے لیکن..... لیکن تم نے مجھ پر آج نہ نہ آنے دی۔ ان کٹھنائیوں اور جاں کسل حالات میں تم نے پل بلی میرا اتنا خیال رکھا۔ اور پھر جب بل عزت پر حرف آنے لگا تو اس وقت بھی تم بالکل مختلف نظر آنے لگے۔ تمہارے چہرے اور آنکھوں کا جوش آمیز جنوں کا جولاؤ اللہ نے لگا، اس کی پیش مجھے اپنے سینے میں چھائی ہوئی کسی پراسراری دھند کو ابھارتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر تمہارا اس بد خصلت زوار خان پر چھپنا..... یہ سب کیا تھا نادر؟ یہ کیا ہے؟..... مم..... مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم یہ ساری صعوبتیں، یہ تکلیفیں، یہ خون ریز ایلے اپنی بیمار بیوی نگینہ کو بچانے کی خاطر نہیں بلکہ..... بلکہ میری خاطر کر رہے ہو۔ مجھے جواب..... میرے دل و دماغ تمہاری طرف اتنا بے اختیار کیوں کھینچے لگتے ہیں؟ مجھے ایسا آخر کیوں لگتا ہے تمہاری ذات سے میری ذات کا کوئی گہرا، صدیوں پرانا تعلق ہے؟ پلیز! مجھے حقیقت بتاؤ نادر! یہ سب کیا ہے؟“

وہ اتنا کہہ کر ہانپنے لگی۔ فرط جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ آنکھوں سے نمی ایک ازلی پیاس

رو۔ میں..... میں تمہیں اپنی بے لوث محبت کو قصرِ فنا میں گرنے سے بچانا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں  
حقیقت کی لاش وادی لے جانا چاہتا ہوں تاکہ اس بد بخت کی لاشی عامل عاروب کے ذریعے تمہارے اندر  
کی دھند کو صاف کر سکوں جو مجھے..... مجھے تم سے ذہنی اور دلی طور سے دور کرنے کی ایک گھناؤنی  
پوش کے تحت تمہارے اندر پھیلا دی گئی ہے۔ ہاں گنیمت! اس بد بخت کی لاشی عامل عاروب کے ذریعے  
پیر اور کالا ناگ نے تم پر یہ خاص عمل کروایا ہے۔ وہ عامل مجھے ٹیلی بیسی کا ماہر معلوم ہوتا ہے۔ اب  
وہ بھی تمہارے دل و دماغ سے میری گم گشتہ یادوں کو دوبارہ تازہ کر سکتا ہے۔“  
”حیرت انگیز!..... مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا وہ عامل پر اسرار علوم کا ماہر ہے؟“ گنیمت نے حیرت  
پوچھا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”نہیں..... وہ پر اسرار علوم کا ماہر نہیں ہے مگر لگتا ہے وہ ٹیلی بیسی کی خاصی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔  
ان نے تمہارا Partially برین واش کر دیا ہے۔ گنیمت تمہارے خاندانِ دل و دماغ سے صرف اور صرف مجھ  
سے متعلق یادداشت کو صاف کر ڈالا ہے۔ جبکہ تم اپنے پیا اور دیگر عزیزوں کو پہچان سکتی ہو۔“  
”لیکن تم اب آخر کس طرح اس کی لاشی عامل عاروب کو مجبور کرو گے کہ وہ مجھ پر عمل کر کے میرے  
بر تمہارے حصے کی یادوں کو دوبارہ ابھار سکے؟“ گنیمت نے مضطربانہ لہجے میں پوچھا تو میں نے زہریلی  
راہٹ سے کہا۔

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو گنیمت! میں اسے مجبور کر کے ہی رہوں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے اس کی جان  
ایکوں نہ لینی پڑے۔“ میرے مضبوط اور مستحکم لہجے نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔  
میں بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ عجیب سی کشش سے دوچار نظر آرہی تھی۔ شاید اسے  
کی بات ماننے میں تامل تھا۔  
پھر وہ میری طرف دیکھنے لگی اور ہولے سے مسکرائی۔ میرا دل خوشی سے بیوں اچھلنے لگا۔ کیونکہ میں  
اس کے چہرے پر ایک خاص اور معنی خیز چمک دیکھی۔

”نادر! اگر یہ سچ ہے تو یقیناً میرے لئے ایک حیرت انگیز فریڈی ہے۔ جو ناقابل یقین بھی ہے۔“  
”یہ سچ ہے گنیمت! یہ سچ ہے۔“ میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ وہ عجیب کشش میں مبتلا نظر آتی تھی۔  
ماننے ہولے سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے گنیمت؟“

”نادر! میں سوچ رہی تھی کہ اگر یہ سچ ہے تو..... تو کیوں نہ ہم واپس اپنے گھروں کو لوٹ چلیں۔  
پھر میں سوچتی ہوں کہ تمہاری یادوں کا، تمہاری باتوں کا سرمایہ میرے دل و دماغ میں یقیناً کسی  
انے، کسی سرمایہ حیات سے کم تو نہ ہوگا۔ تب اپنے واپس جانے کا ارادہ یہ سوچ کر ترک کر لیتی ہوں  
میں بد بخت کی لاشی عامل نے مجھے اپنی جھنجھی ہوئی ستارِ یاد دل داری واپس لے لینی چاہئے۔“  
”ایسا ہوگا گنیمت!..... یقیناً ایک دن ایسا ہوگا۔ تم مجھ پر بھروسہ کرو اور میرے ساتھ اسی طرح تعاون  
فرماؤ۔“ میں جوشِ مسرت سے بولا۔

”ہاں نادر! اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے تمہاری شرافت، بہادری اور بردباری نے بہت متاثر کیا  
بدو جیسے ”ابھی“ سے ”گم“ ”بھی“ میں کھوتے ہوئے بولی۔ میں اس مژدہ جانِ فرا پر خوشی سے جھوم اٹھا۔  
گنیمت اب ذہنی طور پر میرا بھرپور ساتھ دینے پر تیار ہو گئی تھی۔ اسے بھی اب یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ  
ہاں کوئی قیمتی شے کھو گئی ہے جو اسے ہر وقت اداس، رنجور اور کسی نامعلوم سے ”غم دروں“ میں مبتلا  
کرتی ہے۔

کی صورت جھلکانے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے اب وقت آ گیا تھا کہ میں اسے حقیقت بتا دوں۔ کیونکہ اب  
وہ خود ذہنی طور پر یہ پراسرار حقیقت جاننے پر ہائل ہے۔ شاید اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی دھند  
مجھے دیکھ کر ”اپنے پن“ کی صدائے غیب ابھرنے لگی تھی۔ ایسے میں مجھے ہر کل شعر یاد آ گیا۔ تب میں نے  
اس بار اسے ”گنیمت صاحبہ“ کے لائق سے پکارنے کی بجائے اس کے نام سے پکارتے ہوئے کہا۔  
”گنیمت! میں تمہیں پہلے ایک شعر سنائوں..... یہ شعر شاید میرے دل کی، میرے حصولِ مقصد کی  
میری پیہم کوششوں کی ترجمانی کر دے۔ یہ جتنا سادہ اور آسان شعر ہے، اتنی ہی اپنے اندر گہری معنویت  
بھی رکھتا ہے۔“

”ہاں..... سنائو۔“ اس کی آواز مرقش لبوں سے نہیں، جیسے دل کی گہرائیوں سے ابھری تھی۔  
تب میں اسے وہ چند شعر سناتے لگا جو موجودہ حالات کے عین مطابق اور ہر کل تھے۔  
”نئی طرح سے نبھانے کی دل نے ٹھانی ہے  
وگر نہ اس سے محبت بہت پرانی ہے  
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ میں کسی سے سنوں  
کہ تُو نے بھی غمِ دنیا سے ہار مانی ہے  
میں کتنی دیر اسے سوچتا ہوں مسکن  
کہ جیسے اس کا بدلنا کوئی کہانی ہے“

مجھے یہی چند اشعار یاد تھے۔ میں خاموش ہو گیا۔ وہ ایک تک میرا چہرہ ٹکے لگی۔ وہ درونِ خانہ ایک  
زبردست کشاکش سے گزر رہی تھی۔ ان ہر کل اشعار نے جیسے اس کے اندر اپیل سی مچا دی تھی۔ اس کے  
چہرے پر ارتعاش کی سی کیفیت طاری تھی۔ پھر اس کے لب متحرک ہوئے اور اس کی لرزیدہ آواز ابھری۔  
”نادر! تم..... تم کس کرب سے گزر رہے ہو؟ مجھ سے مت چھپاؤ۔ میں ان اشعار کا مطلب سمجھ  
گئی ہوں۔ مجھے بتاؤ، آخر تم کون سی جتو میں ہو؟..... تم جب بھی میری طرف دیکھتے ہو تو مجھے تمہاری  
آنکھوں سے ایک گہرا کرب چھلکا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایک غم نہاں کی کیفیت تمہارے چہرے سے ستر  
نی نظر آتی ہے۔“

پھر جیسے میں اپنے آپ میں نہ رہا۔ میرے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ میرے اندر کا درد، ان کہا دکھ  
و خاشاک کی طرح اس روانی سے مجھے بہا لے گیا کہ میں نے اسے حقیقت بتا دی۔ وہ جیسے پتھر کی صورت  
بن گئی۔ کئی سوچتی، دھڑکتی ساعتیں خاموشی سے گزر گئیں۔ کئی دم بہ خود لکھات کسی اپنے پن کی تشنہ آرزو  
کے ساتھ پیاس بن کر بیت چلے۔ میری پُر امید نظریں گنیمت کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اس دباؤ  
کی دھڑکتی کیفیات سے گزر رہا تھا۔ گنیمت کو حقیقت بتانے پر یہ دھڑکا بھی تھا کہ وہ میری من گھڑت  
(نیار بیوی والی کہانی) کا بھانڈا پھوٹے دیکھ کر مجھ سے پہلے کی طرح بدظن نہ ہو جائے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔  
اس نے میرے ساتھ جو لکھات گزرا ہے تھے، کم از کم ان کی سچائیوں کو وہ جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ اور پھر تو  
اس کے خود اس کے اپنے دل نے بھی ”اپنے پن“ کی گواہی دی تھی اور اس نے خود مجھ سے حقیقت بتانے  
کی درخواست کی تھی۔ پھر اس کے لبوں پر کچھ اٹھ ابھری۔

”نن..... نادر! کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟“  
”ہاں گنیمت! ہاں..... یہ سچ ہے۔ یہی سچ ہے کہ میری یہ ساری جتو اور تک و تاز صرف اور صرف  
تمہارے لئے اور تمہاری وجہ سے ہے۔“ میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ”گنیمت! میری بات کا

اس کا خیال تھا کہ پشاور کی طرح یہاں چترال میں بھی ہمیں دشمنوں سے خطرہ تھا بلکہ جیسے جیسے ہم اپنی منزل سے قریب ہوتے جا رہے تھے، یہ خطرہ مزید بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی شام ہونے لگی تھی۔ نگینہ کا خیال تھا کہ ہمیں یہ مہنگا ہوٹل چھوڑ کر کسی اوسط درجے کے بلکہ کسی سستے ہوٹل میں یہ رات گزارنی چاہئے تھی۔ کیونکہ پشاور کی طرح یہاں کے ہر اچھے اور اوسط درجے کے ہوٹل ہمارے دشمنوں کا ٹارگٹ بن سکتے تھے۔ میں نے اس کی تجویز پر صاف کیا اور ذرا ستانے کے بعد ریسپشن پر ایک دن کا کرایہ ایڈوانس چھوڑ کر ہم وہاں سے نکل پڑے۔

ملک کا انتہائی شمالی حصہ ہونے کی وجہ سے یہاں زیادہ زیادہ سردی پڑ رہی تھی۔ اور پھر اگلے دن صبح الصبح ہم نے وادی کیلاش کی طرف روانہ ہونا تھا اس لئے ہم نے بازار میں گرم کپڑوں کی ہلکی پھلکی شاپنگ کی اور ایک سستا سا ہوٹل تلاش کر کے اس میں ڈبل بیڈ کا کمرہ لے لیا۔ نگینہ کو بعد اصرار میں نے بیڈ پر لٹا دیا اور خود رات زمین پر بیڈ کے قریب ٹیک لگائے گزار دی۔ صبح ہم نے ناشتہ کیا اور کوچ کے اڈے پر جا پہنچے۔ مجھے ہر بل دشمنوں کا خطرہ تھا۔ تاہم گرم شالوں نے ہمارے چہرے چھپانے کا کام موثر انداز میں کیا تھا۔

اگرچہ وادی کیلاش سے متعلق میری معلومات خاصی محدود تھیں لیکن میں نے چترال کے کچھ مقامات سلجھے ہوئے لوگوں سے تھوڑی بہت معلومات حاصل کر لی تھیں جس کے مطابق چترال سے جیپ کے ذریعے کسی بھی کیلاش وادی میں جانے کے لئے دو سے تین گھنٹے لگتے ہیں۔ جیپ فی سواری کرایہ کے حساب سے بھی ملتی ہے۔ لیکن عموماً جیپ کی بکنگ کروانی پڑتی ہے اور کرایہ ملے کرنے کے لئے خاصی دودھ بھری کرنی پڑتی ہے۔ عموماً آٹھ سو سے ایک ہزار روپے ڈرائیور حضرات طلب کر لیتے ہیں۔

چترال سے وادی کیلاش تک کا راستہ خاصا پیچیدہ اور دشوار گزار ہے اس لئے اگر آپ اپنی گاڑی جانا چاہیں تو صرف نور و ہیل ڈرائیو ہی مناسب رہے گی۔ لیکن اب تیز رفتار فلائنگ کوچر بھی چلنے لگی ہیں۔ وادی کیلاش تین دیہات ”ریمبور، بھریت اور بریر“ پر مشتمل ہے۔ اگر چترال پاکستان کے انتہائی شمال میں واقع ہے تو وادی کیلاش چترال کے جنوب مغربی سمت میں ہے جس کو چاروں طرف ہندوکش کے عظیم پہاڑی سلسلے نے گھیر رکھا ہے۔ وادی کیلاش کے ان مذکورہ تین دیہاتوں میں صرف بھریت میں رہائش اختیار کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ یہاں ہر معیار کے ہوٹل مل جاتے ہیں۔ تین سو روپے سے لے کر ہزار روپے تک۔ بلکہ سیزن میں بسا اوقات اس سے بھی زیادہ کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ بھریت میں پختون اور بعض چترالی لوگوں کے آنے کی وجہ سے وہاں حقیقی کیلاشی کھچر میں کچھ کمی دکھائی دیتی ہے لیکن دوسرے دونوں کیلاشی دیہات ریمبور اور بریر نسبتاً زیادہ نمایاں کیلاشی کھچر کی تصویر پیش کرتے ہیں وہاں ہوٹل کم ہیں اور زیادہ اچھی رہائش نہیں ملتی۔

کوہ ہندوکش میں موجود یہ پہاڑی قبیلہ قریباً تین سے چار ہزار کیلاشیوں پر مشتمل ہے جو عظیم فار سکندر اعظم کی یاد دلاتا ہے۔ کیلاشی کھور (KHOWER) اور کالاور (KALAHWAR) زبانیں بولتے ہیں۔ ان زبانوں کا کوئی رسم الخط نہیں۔ کیلاشیوں کا مذہب کچھ خاص حدود و قیود کا پابند نہیں ہے۔ لیکن ان کے ہاں دیوی اور دیوتا کی پرستش کا تصور بڑا نمایاں ہے۔ ڈی زاؤ (DE ZAO) سب کا خالق دین سا جگور (SAJIGOR) چوپایوں اور مال مویشی کا دیوتا، ماہن ڈوئی (MAHAN DOE) شہد کی پٹی کا دیوتا، جیسٹک (JASTAK) گھر اور خاندان کا دیوتا ہے۔ ان کی اپنی داستانیں، رسم و رواج، مختلف تہوار کی مناسبت سے پہناوے اور ان کے اپنے نام ہیں۔ کیلاشیوں کے تہواروں میں (CHAOMAS)

ہمیں ”اوس“ کا تہوار سب سے بڑا تہوار ہے۔ اس کو (BALOMAIN) دیوتا کے حوالے سے منایا جاتا ہے۔ مقامی زبان میں کیلاش کا لفظ کپڑے پہننے والوں کو کہا جاتا ہے۔ ان کی عبادت گاہ یا کیوٹی ہال کو ”بک“ کہتے ہیں۔

بھرپور میں اور نگینہ فلائنگ کوچ میں بیٹھے اور تقریباً اڑھائی گھنٹوں کے بعد بھریت پہنچے۔ یہاں بڑی لکے کی سردی تھی۔ ہم نے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں قیام کیا۔ یہاں کی اکثر مقامی عورتوں کو نے ہمیشہ کالے رنگ کے روایتی کپڑوں میں ملفوف دیکھا۔ جن پر سپیوں، گھونٹوں، سکوں اور بنٹوں کو انتہائی مہارت اور خوبصورتی کے ساتھ ٹانگ کر دلفریب بنایا گیا تھا۔ ان وادیوں میں جہاں گھنے اٹ کے ساتھ ساتھ کئی اور گندم کے سرسبز کھیت دکھائی دیتے ہیں، وہاں سیب، خوبانی، ناشپاتی اور ل کے جھنڈ بھی نظر آتے ہیں۔ میں اور نگینہ باوجود درگروں حالات کے اس حسین و ظہمائی وادی کے میں کھوسے گئے تھے۔ نگینہ نے مجھے ایک گاؤں رکھے کی تجویز دی تھی۔

میں نے تگ و دو کی تو ایک نوجوان چترالی لڑکا داور خان مجھے مل گیا۔ داور خان کی عمر یہ مشکل اٹھارہ سال تھی۔ وہ ایک یتیم، بے سہارا لڑکا تھا۔ اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ مگر اسے یہاں کے بارے میں ناگزیر معلومات حاصل تھیں۔ میں نے اسے مستقل طور پر ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بھی خوش ہو گیا۔ اب مسئلہ اس کیلاشی عامل عاروب کو تلاش کرنے کا تھا جسے بھر حال راز رکھنا تھا۔ میں نے داور خان کو کہا کہ ہم دونوں میاں بیوی (میں اور نگینہ) ایک اخبار سے تعلق رکھتے ہیں اور کیلاش وادی کی سیر بھی اچاہتے ہیں اور سیر حاصل معلومات بھی۔

وہ بڑی مستعدی اور جوش سے بولا۔ ”صیب جی! میں آپ کو پوری کیلاش وادی کی سیر کراؤں گا۔ آپ ماہے غم ہو جاؤ۔“..... ”بے غم ہو جاؤ“ اس کا تکیہ کلام تھا جسے وہ بار بار استعمال کر رہا تھا۔ ”کیونکہ زخمی پیدا ہی ادھر ہوا ہوں۔ چلو پھر میں سب سے پہلے آپ کو لوگوں کو بھریت کی سیر کراتا ہوں، اس پورے پور اور بریر لے چلوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”بھئی، ہم بھریت تو گھوم ہی چکے ہیں۔ تم ایسا کرو ہمیں ریمبور لے چلو۔ وہاں رہائش کا انتظام تو ہو گا نا؟“

”ہاں، ہاں صیب جی! کیوں نہیں..... مگر.....“ وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رکا تو میں نے پوچھا۔ ”مگر کیا.....؟“

”صیب جی! ریمبور اور بریر اس وادی کے اندرونی دیہات ہیں۔ وہاں رہائش کے لئے اچھے ہوٹل تو ہیں۔ لیکن رات پڑ گئی تو آپ لوگوں کو کسی ”مزمری“ میں رہائش اختیار کرنا ہوگی۔“

”مزمری؟..... یہ کیا ہوتی ہے؟“

”صیب جی! ”مزمری“ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کو کہتے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”باہر سے آنے والے لوگوں کے مقامی لوگ رات بسر کرنے کے لئے کرائے پر دیتے ہیں۔“

”اچھا، اچھا..... ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ ہم کون سا ہمیشہ کے لئے رہنے آئے ہیں۔ اپنا کام کرنے کے بعد دو ایک روز میں لوٹ ہی جائیں گے۔ تم چلو۔“ میں نے کہا۔

”بھریت سے روانہ ہوئے۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے کا مکمل تھا۔ ہم ایک خچر گاڑی میں بیٹھ کر اپنے اپنے راستے میں داور خان نے بتایا کہ آج کل ”چاموس“ کا خاص تہوار منانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ اس موقع پر خصوصاً عورتوں نے مخصوص سیاہ لبادے پہن رکھے ہوتے ہیں جسے مقامی زبان

میں ”چھینو“ کہا جاتا ہے۔ بالوں کی چونیاں بناتی ہیں۔ گلے میں ڈھیروں مالائیں پہنتی ہیں اور سر پر ”کوپاس“ لیا جاتا ہے۔ یہ کوپاس اون کے کپڑے، موتیوں، پھولوں، گھنٹیوں وغیرہ سے بنایا جاتا ہے۔ چتر گاڑی سے اترے تو میں نے دانستہ داور سے مذہبی عبادت گاہوں کی سیر کرنے کا کہا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ مردود کیلاشی عال عاروب ایک مخصوص گروہ کا روحانی پیشوا بھی تھا۔ میں باتوں باتوں میں داور کے ذریعے اس کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ داور ہمیں عبادت گاہ میں دکھانے چل پڑا۔ ان میں ڈیڑا ساچی گور، ماہن ڈوئی، جیتک کے نام قابل ذکر تھے۔ مگر مجھے عاروب نامی وہ کیلاشی عال کہیں دکھائی دیا۔ اگرچہ میں اسے پہچانتا تو نہیں تھا مگر میں نے ابھی سوائے ان دیوتاؤں کے کسی روحانی پیشوا کا تذکرہ نہیں سنا تھا۔ جب میں نے خود ہی داور خان سے پوچھا۔ ”ان لوگوں کا آخر کوئی روحانی پیشوا تو ہوگا؟“

”بہت کم۔“ داور بولا۔  
”تمہیں ان سے واقفیت ہے؟“  
”اگر آپ کو ان سے ملنا ہے تو ان کے جشن میں شامل ہونا پڑے گا۔“ وہ بولا۔  
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تہوار کے پہلے دن کی ابتداء ہو چکی تھی جو ”عیشا و جیک“ کہلاتا تھا۔ اس کے بعد جشن چلم جیش منایا جاتا۔ اب یہ اتفاق تھا یا ہماری خوش قسمتی کہ یہ دیکر کا ہی مہینہ تھا اور ان کے تہوار اسی مہینے میں منائے جاتے تھے۔

ہمارے نو عمر گائیڈ داور کے کہنے کے مطابق یوں تو اپریل سے لے کر ستمبر وادی کیلاش میں رہنے کے لئے بہترین ہیں۔ البتہ ونٹر ٹریلنگ کے شائقین کی الگ بات ہے۔  
ذرا شام ہوئی تو تہوار عروج پر پہنچ گیا۔ ایک تہوار کی تقریب ”کالا شی آگرم“ میں ہو رہی تھی۔ یہ ذہن ٹھک گیا۔ مجھے یاد آیا کہ عاروب اس وادی کے ایک مخصوص گروہ کا روحانی پیشوا تھا۔ ہم وہاں آگے گئے تھے۔ کالا شی آگرم سب سے اونچا گاؤں تھا اور دریا کے ساتھ تھا۔ دوران تہوار مرد و عورت کی آگ

”عیشا و“ بناتے ہیں۔ یہ ایک مخصوص انداز کی روٹی ہوتی ہے۔ وہاں کوئی عورت نہیں ہوتی۔  
گنہگار زندہ سی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ میری طرح اسے بھی یہ بالکل ایک الگ تھلک دنیا محسوس رہی تھی۔ میں بہ غور ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس دوران عورتیں اور لڑکیاں مخصوص گیت گاتی دہار گئیں۔ تب میں نے ایک عمر رسیدہ کیلاشی کو دیکھا۔ وہ قبیلے کا بزرگ تھا۔ وہ ایک مخصوص لکڑی سے عورت کے سر کو تین بار چھوتا۔ چیز کی مشعلیں روشن تھیں۔ علاوہ ازیں بہت بڑا الاؤ بھی روشن تھا۔  
نظر سے اس عمر رسیدہ کیلاشی پر جمی ہوئی تھیں۔ اب خواتین کے ہاتھوں پر پانی ڈالا جا رہا تھا اور مردانہ اپنی پکی ہوئی روٹیاں دے رہے تھے۔ وہ عمر رسیدہ چھڑی چھوٹے ہوئے بار بار ایک مخصوص لفظ ”سودو“ ادا کرتا جا رہا تھا۔ اس رات عورتوں نے بھی ایک مخصوص روٹی پکائی جسے ”جھاؤ“ کہا جاتا تھا۔ اس خصوص روٹی میں پیڑ اور کچلے ہوئے اخروٹ وغیرہ بھرے جاتے تھے۔ میں نے جب اس عمر رسیدہ آدمی کا پوچھا تو مجھے مایوسی ہوئی۔ اس کا نام عاروب نہ تھا۔

اگلا روز مردوں کے نہانے اور بالومین کے لئے تیاری کا تھا۔ داور خان کے کہنے پر ہم واپس ہو اور ایک مڑھی کرائے پر لے لی۔  
اگلا دن بھی ان کا تہوار دیکھتے ہوئے گزرا۔ میں اب ”کالا شی آگرم“ سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ وقت ”چھانجن رات“ کی تقریب تھی۔ یہ رات مشعل بردار جلوس کی شکل میں تھی۔

ان کا روحانی پیشوا نظر آتا ہو۔ ایک کیلاشی عورت نے گنہگار سے مسکرا کر کہا۔  
”ایشیتے بابا! پور لیتا تازہ۔“ گنہگار اس کی زبان نہ سمجھ پائی تو داور خان نے مسکرا کر اس کا ترجمہ کرتے ہوئے گنہگار سے کہا۔

”مہڈم! یہ آپ سے پوچھ رہی ہیں کہ پیاری بہن! کیا حال ہیں؟“  
تب گنہگار نے مسکرا کر اشاروں کی بین الاقوامی زبان میں اسے بتایا کہ وہ ٹھیک ہے۔ داور خان نے اسے بتایا کہ یہ لوگ آپ کو مخاطب کرنے کے لئے ”بابا“ یا ”بھایا“ کہیں گے۔  
بہر طور وہ دن بھی یونہی ناکام گزر گیا۔

تیسرے دن جوینی سورج بلند ہوا، داور خان ہمیں ”جیتک“ عبادت گاہ لے گیا۔ کالا شی روایت کے لائق جیتک، گھر اور خاندان کی دیوی ہے۔ یہ عبادت بالنگورہ میں ہوتی ہے۔ ہم وہاں جا پہنچے۔ یہاں داور نے مجھے ایک کام کی بات بتائی۔

اس نے جلوس میں موجود ایک گروہ کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ لوگ یہاں کے ایک مخصوص گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا اپنا انداز عبادت اور دیوتا ہوتا ہے۔ ان کا ایک روحانی پیشوا بھی ہے۔  
میرا ذہن بری طرح ٹھنک گیا۔ کبیر نے مجھے عاروب کے بارے میں بتایا تھا کہ عاروب نے وہاں بلاشیوں کا ایک الگ تھلک مخصوص گروہ بنایا ہوا ہے۔ میں نے اضطراب، جوش و بے چینی سے پوچھا۔

ان کے روحانی پیشوا کا نام.....؟“  
”میں نہیں جانتا۔“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مگر میں ناامید نہ ہوا۔ داور خان بولا۔  
”صیب جی! ویسے یہ گروہ بہت پراسرار سرگرمیوں کا حامل گروہ ہے۔ اگر آپ ان کا انداز دیکھنا چاہتے ہیں تو ابھی تھوڑی دیر بعد یہ لوگ الگ ہو کر اپنی عبادت گاہ لوٹ جائیں گے۔ وہیں ان کا روحانی پیشوا بھی آگے۔“

”چلو، پھر میں تیار ہوں۔“ میں نے فوراً کہا۔  
پھر ذرا دیر بعد یہ مخصوص گروہ ان سے الگ ہو گیا۔ ہم ان کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ بیرونی دنیا سے یہاں آنے والے سیاحوں کا یہ معمول تھا۔ اس لئے کسی نے ہم پر خاص توجہ نہ دی تھی۔ ہم جس فوس گروہ کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے، ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں ٹوکریاں اٹھا رکھی تھیں جن پر اخروٹ، خشک میوہ جات اور پھل وغیرہ تھے۔ ہم ان کی عبادت گاہ میں پہنچے جو آبادی سے ذرا ہٹ کر تھی۔ میرے دل میں جانے کیوں بے چینی سی پیدا ہونے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کچھ ہونے والا تھا۔  
میری چھٹی حس بار بار خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔

بہر طور ہم ان لوگوں کے ساتھ ان کی عبادت گاہ پہنچے۔ میں نے ان کے روحانی پیشوا کی تلاش میں رن دوڑا۔ بار بار داور خان سے اس کے بارے میں استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اب میں ہر حال سے پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔

اس عبادت گاہ میں آگ جلانے کا خصوصی انتظام کیا گیا تھا۔ لوگ باگ اپنے ساتھ لائی ہوئی مالک کا ایک حصہ ایک بہت بڑی اجتماعی باسکٹ میں ڈال رہے تھے۔ اس بارے میں ان کا خیال تھا مان کے آباؤ اجداد کی روحیں آکر اسے قبول کر لیں گی۔ یہ عمل عبادت گاہ کے باہر ہوتا تھا۔  
عبادت گاہ سے باہر مردوں نے چیز کی لکڑی سے ایک اہرام سا بنایا تھا جسے ”کونک“ کہا جا رہا تھا۔  
اگر مری ہوئی تو وہ لوگ عبادت گاہ میں داخل ہونے لگے۔ میں نے بھی اندر جانا چاہا تو داور گھبرا کر

میں نے بہ مشکل خود پر قابو پا رکھا تھا۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ مخصوص اور پراسرار گروہ کا یہ کبزار وحانی پیشوا یقیناً وہی کیلاشی عاروب تھا جس نے کبیر اور کالا ناگ کے ایما پر میری گنجنے کی ذہنی روایت کر میری دنیا کو تہ بالا کر ڈالا تھا۔ آج میں طویل مسافت کے بعد بڑی شوریدہ سری کے عالم میں گنجنے کو لے کر یہاں اپنی دل کی دنیا کو بچانے کے عزم کے ساتھ آیا تھا۔

میں نے دیکھا، نگینہ چبوترے کے قریب پہنچ کر رک چکی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کبلے گئے  
نے نہایت دھیمی گھر پر تاثر آواز میں اسے مخاطب کر کے کچھ کہا جسے میں نہ سن سکا۔ میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ  
اجملہ سننے کے بعد نگینہ کے ٹھہرے ہوئے قدم دوبارہ حرکت میں آ گئے تھے۔ وہ اسی طرح دھیمی رفتار  
سے چلتی ہوئی چبوترے کی سیڑھیوں تک پہنچی اور ایک ایک سیڑھی چڑھ کر چبوترے کے اوپر پہنچ کر اس پیشوا  
کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

صاف ظاہر ہوتا تھا کہ عینہ اس کے ٹرانس میں تھی اور یقیناً یہی میرا مطلوبہ شخص کیلاشی عامل عاروب تھا۔ اب یہ عینہ سے کیا بات کرنا چاہتا تھا، یہ سننے کے لئے میں نے بھی خاموش کھڑے مجمع کے ارمیان دھیرے دھیرے چبوترے کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیئے تھے۔ اور پھر قدرے قریب پہنچ کر ہی خاموش کھڑا ہو گیا۔ سینے میں میرا دل اس وقت کسی اور ہی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں مگر کان پوری طرح عامل کی طرف لگے ہوئے تھے۔ شاید اس لئے میں نے وہ منمنائی ہوئی آواز نہ لی۔

”مجھے پورا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن تم ضرور آؤ گی۔ ہماری روحانی طاقت تمہیں ہمارے گروہ میں اہل ہونے پر مجبور کرتی رہے گی۔ میں نے غلط تو نہیں کہا..... گنیز؟“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔ اس لازبان پر گنیز کے نام نے میرے گمان کو حق الیقین میں تبدیل کر دیا۔ اس کی گفتگو سن کر میری رگوں میں خون کی گردش کھولتے ہوئے لاوے میں بدل گئی۔ تب مجھے گنیز کی جیسے کہیں دور سے آتی ہوئی آواز ملنی دی۔ وہ اس کیلاشی عامل عاروب سے کہہ رہی تھی۔

”ہاں!..... مجھے واقعی کوئی ان دیکھی طاقت یہاں کھینچ لائی ہے..... تمہارے پاس..... میں یہاں سے نہیں جانا چاہتی۔“

گنگنی کی آواز سن کر میں نے چہرہ اوپر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی بات پر کلیاشی عامل کی چھوٹی ہوئی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک ابھری۔ پھر اس کے بدبیت ہونٹ باجھوں تک پھیلے اس کے بعد لادھیٹ نے مجمع پر نظر ڈالی اور اس کی متلاشی نظریں میرے چہرے پر گڑ گڑ کر رہ گئیں۔ میرا دل یکبارگی اس سے دھڑکا۔ گنگنی کی جوابی گفتگو نے مجھے پہلے ہی ہولا کر رکھ دیا تھا۔ اب جو کلیاشی عامل کی نظریں مجھ پر جم گئیں تو مجھے یہ خدشہ ہوا کہ کہیں یہ بد بخت مجھے بھی اپنے ٹرائس میں نہ لانا چاہتا ہو۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ کھڑا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس گھورے جا رہا تھا۔ اگرچہ مجھے لاکھ مسلسل گھورتی ہوئی مقناطیسی نظروں میں ایک کھنچاؤ کی سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن میں اپنی لڑنے سے مس نہ ہوا۔ معاً میں نے محسوس کیا کہ اس کلیاشی عامل کی آنکھیں ایک ایسی بے تاثر ہو چکی ہیں۔ جیسے اس کا جادو مجھ پر نہ چل سکا ہو۔ اس خیال نے مجھے یک گونہ قفاخر آئینہ تسکین بخشی تھی۔ تب کلیاشی عامل نے میرے چہرے سے نظریں ہٹا دیں اور اپنے دو برو کھڑی گنگنی کو تکتے ہوئے اس سے لڑنے بارے میں پوچھا۔

”تمہارے ساتھ آنے والا یہ شخص کون ہے؟“

بولا۔ ”صیب جی! یہ بہت پر اسرار اور جادو ٹونا کرنے والے لوگ ہیں۔ مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔“  
 میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ لوگ ہمیں اندر داخل ہونے نہیں دیں گے؟“  
 ”نہیں۔ یہ لوگ تو خوش ہوتے ہیں کہ کوئی اجنبی ان کے ساتھ اندر داخل ہو۔“ وہ بولا۔ ”اس سلسلے  
 میں ان کے روحانی پیشوا کا کہنا ہے کہ اس طرح ان کا گردہ بڑھے گا۔“  
 میں نے دل ہی دل میں لعنت بھیجی۔ میں ان کے رنگ میں رنگنے نہیں آیا تھا۔ میرا مقصد تو کچھ اور  
 تھا۔ لہذا دور تو اندر نہیں گیا، میں اور نگینہ اندر داخل ہو گئے۔

میں نے احتیاط کے پیش نظر بالخصوص نگینہ کا چہرہ ایک گرم شال میں چھپا رکھا تھا کہ اگر واقعی یہاں عاروب سے ٹکراؤ ہو جائے تو وہ نگینہ کو دیکھ کر ہماری طرف سے ٹھنک نہ جائے۔ میں اور نگینہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ داور خان البتہ باہر حیران و پریشان کھڑا رہ گیا تھا۔

جب سب اندر داخل ہو گئے تو عبادت گاہ کے دروازے پر موٹا سا بروہ ڈال دیا گیا جسے دو آدمیوں نے پکڑ رکھا تھا۔ سامنے ایک چبوترہ تھا۔ چیز کی مشطوں سے اندر کی فضا گرم تھی۔ ہمیں گرم کپڑوں میں اب گرمی سی محسوس ہونے لگی۔ میرے لئے یہ حیرت کی بات تھی کہ کسی نے بھی ہم پر توجہ نہ دی تھی۔ یہ بخروٹی چھت والی بڑی ہی عجیب وضع کی عبادت گاہ تھی۔ سامنے ایک اونچا چبوترہ تھا جس پر ایک بڑی سی مورتی تھی۔ مورتی کی صورت بڑی خوف ناک تھی۔ عجیب طلسماتی اور دلوں پر نامعلوم سا خوف پیدا کر دینے والا ماحول تھا۔ گھینے نے گرمی کے مارے شامل اتار دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد چوتے پر ایک کبڑا، ادھیڑ عمر شخص نمودار ہوا۔ اس نے سیاہ رنگ کا لمبا سا جیف پہن رکھا تھا۔ سرخنا تھا۔ ناک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ چہرہ سیاہ اور آنکھوں میں ایک عجیب سی مقناطیسی کشش تھی۔ بدبیت، سیاہ چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ شاید یہی ان کا روحانی پیشوا تھا۔ اس کے منگی چوتے پر آتے ہی وہاں موجود اس کے پیروکاروں نے اپنے سر جھکا دیئے اور با آواز بلند اٹھیں۔ زبان میں کچھ پڑھنے لگے۔ میں اور نگینہ جوں کے توپ کھڑے تھے۔ اس کبڑے، عمر رسیدہ شخص کی مقناطیسی نظریں ہم پر پڑیں اور پھر نگینہ پر اس کی نظریں جم گئیں۔ اب سب لوگ سر جھکائے بالکل خاموش کھڑے تھے۔ ماحول کو جیسے ایک ایسی سانپ سٹکھ گیا تھا۔ وہ پراسرار کبڑا بدستور اب نگینہ کو ہی اپنی مقناطیسی نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

میں نے گنگینہ کو دیکھا تو چونک گیا۔ وہ بھی یک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ گنگینہ نے آپ جہتوڑے کی طرف قدم بڑھانے شروع کر دیے۔ اس کا انداز تو یہی عملِ زہر اثر کسی معمول کا سا تھا۔ میں جیسے سناٹے میں آ گیا۔

گنگینے کا یوں میکا کی انداز میں چہوڑے کی طرف دھیرے دھیرے بڑھتا میرے لئے سخت حیرت باعث تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں تذبذب کا شکار تھا۔ ہال میں موجود سب لوگ دست بستہ خاموش اور سر جھکائے کھڑے تھے۔ ماحول میں پراسرار سناٹا طاری تھا۔ چیر کی مشعلوں سے بلند ہوئے شعلہ جیب ہلکی ہلکی جھجھکی کی آواز بلند کر رہے تھے۔ میں کبھی دم بہ خود چہوڑے کی طرف کٹھاں کشاں بڑھتی گنگینے کو دیکھنے لگتا تو کبھی چہوڑے پر موجود اس سیاہ پوش کبڑے روڈوٹ کو جس کی مقناطیسی آکھبھ مسلل گنگینے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا گنجائش مشعلوں کی روشنی میں چمٹا ہوا نظر آ رہا تھا اور طوطے کی چونچ جیسی مڑی ہوئی ناک کے نیچے بدیہت ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ رکھاں تھی جس میں خفاشت کا عنصر غالب تھا۔

”میں اسے نہیں جانتی..... میں اس معبد کے باہر کسی شخص کو نہیں جانتی۔ میں..... میں صرف اپنے عامل یعنی تمہیں جانتی ہوں..... اور بس۔“ گنبد نے جواباً خوابیدہ کیفیت میں کہا اور ایک بار پھر اس کیلاشی عامل کے بددیت ہونوں پر اسرار بھری مسکراہٹ ابھری تھی۔

اب میرے لئے یوں خاموش تماشا ہی بنے کھڑے رہنا قطعاً ناممکن ہو چکا تھا۔ میں اپنی نگینہ کو وہی طور پر پانے کی خاطر مصائب و آلام جھیلتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا اور اس بد بخت غیبت عامل عاروب نے میری نگینہ کو جیسے ایک بار پھر مجھ سے چھین لیا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟..... یہ مجھ سے کیسی بھیا تک غلطی ہو گئی تھی؟..... ایک انتہائی کرب انگیز خیال، پیچھتاوے کے خنجر کی صورت میرے سینہ سوزاں میں پیوست ہو کر رہ گیا اور پھر جیسے میرے پورے وجود میں غیظ و غضب کی بجلاں سی دوڑ گئیں۔

میں نے تیزی سے حرکت کی اور آسمانی بجلی کی طرح چوترے کی طرف لپکا۔ ٹھیک اسی وقت عامل عاروب نے میرے جارحانہ تیور بھانپ کر وہاں ہال میں موجود چیز کی مشطیں تھامے اپنے تومند خدام کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ بیک وقت غیر معمولی پھرتی سے حرکت میں آئے۔ میں ابھی چوترے کی بیڑیوں تک پہنچا ہی تھا کہ دائیں بائیں ابھرنے والے چار عدد تومند خدام نے مجھے دبوچ لیا۔ جبکہ مزید دو خدام نے ماؤز نکال کر ان کی مہیب نالوں کا رخ میرے چہرے کی طرف کر دیا۔

مجموع سے چند لوگوں نے مختصری ہونے والی کھڑپڑ کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ میں نے حلق کے بل چیخ کر نگینہ کو پکارا۔

”نگینہ!.....“ مگر جیسے نگینہ نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا بھی گوارا نہ کیا۔ اچانک کیلاشی عامل عاروب کی تحکمانہ آواز ہال میں گونجی۔

”اسے باہر کا راستہ دکھا دو۔ اگر یہ نہ مانے تو اسے گولی مار دیتا۔“

عاروب کے یہ مسلح پیر و کار مجھے کھینچتے ہوئے ہال سے باہر لے آئے۔ پھر مجھے درشت لہجے میں وہاں سے چلے جانے کا کہا۔ میں نے سردست ہوش و حواس سے کام لینے کا سوچا اور پھر بہ ظاہر خاموشی کے ساتھ سر جھکائے ان کی عبادت گاہ سے دور چلا گیا۔

یہ تو شکر تھا کہ انہوں نے مجھے چھوڑ دیا تھا ورنہ یہ مجھے قید بھی کر سکتے تھے۔ اب کم از کم میں آزاد ہو گیا تھا۔ میرے دل میں عجیب عجیب سے ہول اٹھ رہے تھے۔ نگینہ ایک بار پھر اس کے ٹرانس میں آچکی تھی لیکن میں نے یہ بات محسوس کی کہ عاروب نے شاید مجھے بھی اپنے ٹرانس میں لینے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے جرات اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کر کے اسے شکست دے ڈالی تھی۔ جبکہ نگینہ کا اس کے ٹرانس میں آنا سمجھ میں آتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک طرح سے پہلے ہی اس کے ٹرانس میں تھی۔ اگرچہ میں زور محبت سے کسی حد تک نگینہ کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ وہ کن پر اسرار حالات و کیفیات کا شکار ہے مگر اب مجھے ان ساری کوششوں پر پانی پھرنا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے اپنے منتشر ہوتے حواس پر قابو پایا اور ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کی اس اچانک اور غیر متوقع کا کیا پلٹ کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگا۔ اپنی آزادی کو غنیمت جاننے کے بعد میں نے ایک مربوط لاٹھ لکھ تیار کیا۔ میں اب ان کی عبادت گاہ سے ذرا دور جا کر ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھ گیا تھا۔

میرا دوبارہ دیکھ لیا جانا، نہ صرف میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا بلکہ میرے مقصد میں رکاوٹ کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ اس لئے میرا سب سے پہلے حلیہ بدلنا لازم تھا۔ لیکن میں ان کی نظروں میں آئے بغیر پہلے اس مرد کیلاشی عامل عاروب کے ٹھکانے سے واقف ہونا چاہتا تھا، اس کے بعد ہی میں کوئی بھی

”میں اسے نہیں جانتی..... میں اس معبد کے باہر کسی شخص کو نہیں جانتی۔ میں..... میں صرف اپنے عامل یعنی تمہیں جانتی ہوں..... اور بس۔“ گنبد نے جواباً خوابیدہ کیفیت میں کہا اور ایک بار پھر اس کیلاشی عامل کے بددیت ہونوں پر اسرار بھری مسکراہٹ ابھری تھی۔

اب میرے لئے یوں خاموش تماشا ہی بنے کھڑے رہنا قطعاً ناممکن ہو چکا تھا۔ میں اپنی نگینہ کو وہی طور پر پانے کی خاطر مصائب و آلام جھیلتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا اور اس بد بخت غیبت عامل عاروب نے میری نگینہ کو جیسے ایک بار پھر مجھ سے چھین لیا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟..... یہ مجھ سے کیسی بھیا تک غلطی ہو گئی تھی؟..... ایک انتہائی کرب انگیز خیال، پیچھتاوے کے خنجر کی صورت میرے سینہ سوزاں میں پیوست ہو کر رہ گیا اور پھر جیسے میرے پورے وجود میں غیظ و غضب کی بجلاں سی دوڑ گئیں۔

میں نے تیزی سے حرکت کی اور آسمانی بجلی کی طرح چوترے کی طرف لپکا۔ ٹھیک اسی وقت عامل عاروب نے میرے جارحانہ تیور بھانپ کر وہاں ہال میں موجود چیز کی مشطیں تھامے اپنے تومند خدام کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ بیک وقت غیر معمولی پھرتی سے حرکت میں آئے۔ میں ابھی چوترے کی بیڑیوں تک پہنچا ہی تھا کہ دائیں بائیں ابھرنے والے چار عدد تومند خدام نے مجھے دبوچ لیا۔ جبکہ مزید دو خدام نے ماؤز نکال کر ان کی مہیب نالوں کا رخ میرے چہرے کی طرف کر دیا۔

مجموع سے چند لوگوں نے مختصری ہونے والی کھڑپڑ کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ میں نے حلق کے بل چیخ کر نگینہ کو پکارا۔

”نگینہ!.....“ مگر جیسے نگینہ نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا بھی گوارا نہ کیا۔ اچانک کیلاشی عامل عاروب کی تحکمانہ آواز ہال میں گونجی۔

”اسے باہر کا راستہ دکھا دو۔ اگر یہ نہ مانے تو اسے گولی مار دیتا۔“

عاروب کے یہ مسلح پیر و کار مجھے کھینچتے ہوئے ہال سے باہر لے آئے۔ پھر مجھے درشت لہجے میں وہاں سے چلے جانے کا کہا۔ میں نے سردست ہوش و حواس سے کام لینے کا سوچا اور پھر بہ ظاہر خاموشی کے ساتھ سر جھکائے ان کی عبادت گاہ سے دور چلا گیا۔

یہ عبادت گاہ کی شمالی دیوار کا حصہ تھا۔ یہاں اوک اور کنڈ باری کی جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ میں عبادت گاہ کے اس حصے کا انتخاب کر کے یہاں ٹھہرا تھا۔ کیونکہ یہاں مجھے ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آتا تھا۔ یہ سنگ پت کا دروازہ تھا اور قرآن سے پتہ چلتا تھا کہ یہ یقیناً کسی سنگی زینے پر کھلتا تھا جو عبادت گاہ کی اوپری منزل کی طرف جاتا تھا۔ کیونکہ اس جانب ایسا ہی ابھارتا تھا جو کسی گردش زینے کو ظاہر کرتا تھا۔ تین تین فٹ کے فاصلے سے ایک دوسرے کے اوپر در پیچے بنے ہوئے تھے۔ کچھ ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ غیبت عامل عاروب کا حجرہ نما ٹھکانہ اوپری منزل ہی کی طرف تھا اور اس کا ایک دروازہ اندر بھی کھلتا تھا۔ لیکن عبادت گاہ کے باہر کھلنے والے اس مختصر سے سنگ پت والے دروازے کا مقصد مجھے سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن ذہن طیار نے اسے ہی آزمانے کا طریقہ سوچ لیا تھا۔

فضا خاموش تھی۔ ماحول میں دھڑکتا ہوا سناٹا طاری تھا۔ دور کہیں برف پوش پہاڑیوں سے جانوروں بولنے کی آوازیں کبھی کبھی گونجتی سنائی دیتی تھیں اور پھر وہی آہستہ سناٹا محسوس گدھ کی طرح نیچے گاڑا تھا۔ سردی بھی زوروں پر تھی۔ میں نے گرم آونی شال اوڑھ رکھی تھی۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ہر کونے دل کے ساتھ مذکورہ دروازے کی طرف دے پاؤں مگر تیز تیز قدموں سے بڑھنا شروع کیا۔ اندر کے قریب پہنچ کر میں رکا اور دیوار سے پشت کے بل چپک کر دم سادھے کھڑا ہو گیا۔ چند ثانیے آف میں جائزہ لینے کے بعد میں نے سنگ پت والے دروازے کا جائزہ لیا۔ باہر سرے سے کنڈی



”وہ تمہارا کیا لگتا تھا؟“ عاروب نے بھوس سیکڑ کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، وہ میرا کیا لگتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کون ہوں، کہاں ہوں؟..... مجھے ایسا ہے جیسے میرے ذہن کی اسکرین رفتہ رفتہ صاف ہوتی جا رہی ہے۔ میرے دل و دماغ بالکل کورے ہو چکے ہیں۔ میں کون ہوں؟..... کیا ہوں؟..... آہ!“ گنبد جیسے بے خودی میں کہتی جا رہی اور اس کی اس حالت پر میرا جگر جھلٹی ہوئے لگا۔ میں خود پر بہ مشکل قابو پائے دم سادھے دیوار کی آڑ لگاؤں کی باتیں سن رہا تھا۔

”الوکی!..... اب تمہیں اس دنیا سے کچھ نہیں لینا دینا۔ تم اب یہیں رہو گی ہمیشہ کے لئے۔ ساری بری کینسر بن کر۔ میری باندی بن کر۔“ عامل عاروب نے کھر کھرائی اور بارعب آواز میں کہا جس کلمہ نے غصہ بھی غالب تھا۔ مجھے اس خبیثت کے گنبد کے متعلق مکروہ عزائم جان کر طیش چڑھ گیا۔ میرے ہی آئی کر اسی وقت اپنے میگارڈ کی ساتوں گولیاں اس مردود کبڑے کے ناپاک وجود میں اتار دوں۔ ”نہیں..... میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ میں اپنی دنیا میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ مجھے جانے دینا۔“ گنبد نے یکدم تڑپ کر کہا تو میں نے دیکھا، عامل عاروب نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا اور

از بلند حکمانہ لہجے میں اس سے کہا۔ ”میری طرف دیکھو.....“ گنبد نے آبدیدہ نگاہیں اس کے چہرے پر ڈال دیں۔ عامل عاروب نے بغیر پلک جھپکائے گھورتا رہا۔ میرے دماغ میں جیسے آتش فشاں چمکناڑنے لگا اور میں غیظ و غضب سے ہلکا ہوا گیا۔ پھر جیسے ہی میں نے درانہ اندر داخل ہونے کا ارادہ کیا، اچانک میرے سر پر جیسے ٹوٹ پڑی اور میرے حلق سے ایک کرب انگیز کراہ خارج ہوئی۔ اس کے بعد میں ہوش و حواس کی سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

\*\*\*

آنکھ کھلی تو اندھیرے کے سوا مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے سر کو دو تین بار جھونکا تو تاریکی کا پردہ چاک ہو گیا کچھ دیکھنے کے قابل ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے سر کے پچھلے حصے میں ایک اذیت پس کی بھی احساس ہوا اور میرے حلق سے کراہی خارج ہو گئی۔

میں ایک خستہ حال، ننگے فرش پر رن بستہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ کمرہ چھوٹا اور میرے سوا ہر شے سے تھا۔ دیواریں پتھر کی تھیں۔ چھت البتہ خاصی بلند اور ڈھلوان تھی۔ کمرے میں روشنی کا کوئی ذرہ نہ تھا۔ البتہ ایک درتچے سے باہر پھیلی ہوئی چاندنی کے باعث کچھ آجالا ہو رہا تھا۔ باہر شاید مطلع ہو چکا تھا اور کہیں دور برف پوش پہاڑیوں سے چاند سر اُبھار رہا تھا۔ میری دونوں ٹانگوں کو ٹانگوں کی نمونہ رسیوں سے جکڑا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ پشت کی سمت موڑ کر اسی طرح بندھے ہوئے تھے۔ شکر میرا ذہن اچھی طرح کام کر رہا تھا۔

میں گنبد اور عاروب کی باتوں میں کھو کر اپنے گرد و پیش سے بے خبر اور بے پرواہ ہو گیا تھا اور یہی اب سے بڑی اور فاش غلطی تھی۔ کسی خادم نے اچانک کسی کندھے سے میرے سر پر وار کر کے زنا و مافیہا سے بیگانہ کر دیا تھا۔ یہ میری بد قسمتی تھی۔ ایک غلطی تھی۔ میری یہ انتہائی کوشش بری طرح اٹوٹی تھی کہ میں دوبارہ عامل عاروب اور اس کے کارپرداز کی نظروں میں نہ آؤں۔ میں ان کا ہدف بن گیا تھا اور ان کی نظروں میں آچکا تھا۔ مجھ سے جلالت آمیزی میں بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ گنبد کو بھی شاید ہر کچھ کچھ چکا تھا اور خود کو بھی اب جیسے کھونے لگا تھا۔ صورت حال نازک اور گمبیر ہو گئی اور خطرناک بارے میں اس خبیثت سے پوچھ رہی تھی۔

ہی غائب تھی۔ میں نے ہولے سے اسے اندر باہر دھکیلنے کی کوشش کی مگر عبث۔ وہ اندر سے بند تھا۔ لیکن ذرا ہلانے جلانے سے مجھے اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ سن رسیدگی کے باعث تختے کا پٹ کچھ کمزور ہو چلا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ایک نظر گرد و پیش پر ڈالی، اس کے بعد مذکورہ کمزور تختے کو ہلا جلا کر دیکھنے لگا۔ میرے ہلانے سے تختے کی مختصری چوٹی چوٹ کے درمیان خاصی موٹی درز بن گئی۔ میں نے جھک کر فوراً اپنی آنکھ چپکا دی۔ اندر مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ روشنی میں مجھے اندر ایک سنگی گردشی زینہ دکھائی دیا جو اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن مدھم روشنی زینے کے سامنے والی دیوار کے بغیر دروازے والی کھلی چوٹ سے آ رہی تھی جہاں سے ہال کا وہ چوڑا نظر آ رہا تھا جہر کانی دیر نکل عاروب اور گنبد کھڑے تھے۔ اب وہاں اس خوف ناک صورت والی مورتی کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

عاروب اور گنبد کو اب وہاں نہ پا کر مجھے ایک حقاقت سا اندازہ ہونے لگا کہ وہ دونوں یقیناً اس گڑھ زینے سے اوپر منزل پر جا چکے تھے۔ میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ایک بار پھر اپنے عقب اور گرد و پیش میں نگاہ دوڑائی۔ پھر تختے کی موٹی درز کے اندر اپنی دو انگلیاں گھسیڑ کر تختے کو کھینچنے لگا۔ میری کوشش رنگ لائی اور دو تین بار زور لگانے کے بعد تختہ اٹھ کر گیا۔ اب سنگل پٹ والے دروازے میں اتنا خلا ہو گیا تھا کہ جس سے ایک آدمی اندر داخل ہو سکے۔ لیکن میں نے کسی خیال کے تحت اپنا پورا بازو اس مختصری چوٹی چوٹ کے اندر ڈال کر کنڈی سٹار کی۔ میرا دل یکبارگی مسرت سے دھڑکا۔ کنڈی تک میرا ہاتھ با آسانی پہنچ چکا تھا اور اس پر تالا بھی بند ہو گیا تھا۔ میں نے جلدی مگر آہستگی سے کنڈی کھولی اور دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ پھر دوبارہ دروازہ بند کر کے اٹھڑا ہوا تختہ دوبارہ جما دیا تاکہ بعد میں کسی کوشش نہ ہو سکے۔ میں نے زینے پر کھڑے ہو کر ایک نظر ہال میں ڈالی۔ چند مشعلیں روشن تھیں۔ اس کے علاوہ کوئی نظر نہ آیا۔ اس کے بعد میں سر اٹھا کر گردشی زینے کی طرف دیکھا۔ اپنے سینے میں اڑے ہوئے میگارڈ کی موجودگی کی تسلی کی۔ میں نے میگارڈ کا جیمیر چیک کیا۔ چار گولیاں تھیں۔ میں نے مزید تین ڈال کر ساتوں کی تعداد مکمل کی اور پھر دیرے دیرے زینے طے کرنے لگا۔

زینے کی پتھر کی دیوار کے ساتھ ہر چکر پر چھوٹا سا مچھری در پچہ تھا جس سے باہر کا منظر نظر آتا تھا۔ میں اوپر چڑھنے لگا۔ اندازاً آٹھویں چکر پر مجھے سامنے دائیں جانب قدرے چوڑے نٹوں والا دروازہ نظر آیا جو چوٹ کھلا ہوا تھا۔ میں نے میگارڈ نکال کر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دل کی دھڑکنوں پر تالا پاتے ہوئے میں ذرا مزید آگے کھسکا اور دیوار سے چپکا ہوا آگے بڑھ کر اندر جھانکا تو جیسے میری کینڈیل سنسناتا اٹھیں۔ دس بائی بارہ کے کمرے کے بالکل وسط میں زمین پر بچھے دبیز قالین پر مجھے گنبد دوزانو نظر نظر آئی۔ اس کے سامنے عاروب بیٹھا تھا۔ دونوں کے وسط میں دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ وہ کھانے کے مصروف تھے۔ اندر چڑکی مشعلوں سے خاصی روشنی ہو رہی تھی۔ دو خدمت گار بھی موجود تھے۔

گنبد کے چہرے پر اب ابھرنے والی آئینہ پریشانی کے تاثرات تھے۔ صاف لگتا تھا جیسے اب وہ عامل عاروب کے ٹرائس سے باہر آچکی تھی۔ وہ مخصوص تنویری کیفیت جو پہلے گنبد پر طاری تھی، اب غفا ہو چکی تھی۔ شاید اس کی پریشانی کی وجہ بھی یہی تھی۔

”م..... مجھے بتاتے کیوں نہیں..... م..... میرا وہ ساتھی کہاں گیا؟“ معا گنبد نے اسے عامل عاروب سے ہراساں لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے میں ایک تڑپ تھی، ایک التجا تھی۔ وہ میرے بارے میں اس خبیثت سے پوچھ رہی تھی۔

اگر میرے ہاتھ پاؤں آزاد ہوتے تو اور بات تھی۔ بندشوں میں جکڑا میں ہاتھ ہلانے تک سے بھی بھر تھا۔ سفر..... گویا موت کا سفر جاری رہا۔

موسم کے تیور پھر بدلنے لگے تھے۔ ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو چکی تھی۔ انتہائی شمالی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں بارش اور پل کے بل برف باری میں کہاں دیر لگتی تھی۔ خنجر گاڑی ایک دشوار گزار کھائی کے زب آ کر رک گئی۔

میرا دل کا پینے لگا۔ موت کے تصور سے نہیں، اس ہولناک تصور سے کہ میرے بعد گیند کا کیا بنے گا؟ باوجود ساری عمر اس مردود و ملعون عامل عاروب کی باندی بن کر زندگی گزارے گی؟..... کیا وہ میری عمر میں کم ہو جائے گی؟..... نہیں نادر علی! نہیں..... تم نے آج تک دلیری اور بہادری سے ان کڑے اور نامساعد حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ کچھ کرو..... کچھ کرو۔ بہادری کی زندگی ہر دلوں کے لئے ہوتی ہے۔ گیند کو اس شیطان سے بچالو۔ میرے ذہن نے اب تیزی سے بھا کی جنگ شروع کر دی۔

خنجر گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بوند باندی سے میں شرابور ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے دونوں پشت کی طرف بندھے ہوئے ہاتھوں کو تیزی سے جنبش دینا شروع کر دی۔ بارش نے پانی سے رستی ذرا پھسلاواں ہونا شروع ہو گئی تھی مگر ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں نے خنجر گاڑی کو چوبی تختے پر لیٹے لیٹے زور آزمائی شروع کر دی مگر عبث۔ مجھے فوراً ان دونوں کارپردازوں نے کھینچ لیا۔ نیچے گہری برف سے ڈھکی کھائی تھی۔ چشم زدن میں انہوں نے مجھے نیچے لڑھکا دیا..... بے فکر میرے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ میں کسی گیند کی طرح برفیلی ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ میرا ذہن ریلی میں دوڑتا چلا گیا۔ پھر اچانک میرا سر کسی نوکیلی برفیلی چٹان سے ٹکرایا اور میں ہوش و خرد سے بیگانہ بنا چلا گیا۔

ہوش آیا تو برف باری شروع ہو چکی تھی۔ میں جیسے برف کے گولے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ میں نے سر و دو تین بار جھٹکے دیئے۔ چہرے سے برف جھٹکی اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں بہت گہرائی میں جا رہا تھا۔ شاید برف سے ڈھکی ہوئی کھائی کی وجہ سے مجھے کچھ زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ البتہ چہرے اور کمر کے دوسرے حصوں میں خراشیں ضرور پڑ گئی تھیں۔ میں نے زندگی بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ مگر مایہاں ادھ موٹی حالت میں پڑا رہا۔ میرا جسم بری طرح دکھنے لگا تھا۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا تو لگیا۔ یہ کھائی کا کوئی سطح قطعہ تھا۔ ایک بالکل کم رتے والا گوشہ۔ ورنہ تو اب بھی دائیں بائیں اس سے ابھرا اور بھی کھائیاں تھیں۔ یعنی میں ابھی کم گہرائی میں گرا تھا اور یہ بھی خوش قسمتی کہ برفیلی کھائی کے ٹوٹی جگہ پر پڑا تھا۔ میں نے اپنی نگاہ دو تیز کر دی۔ اچانک مجھے اپنی پشت پر ایک تیز جھپٹ کا احساس ہوا۔ میں نے بہ مشکل اپنے رن بستہ وجود کا زاویہ بدلا اور مڑ کر دیکھا تو ایک نوکیلا اور کند چٹانی علاقہ مجھے دکھ کر میرے ذہن میں فوراً ایک خیال ابھرا۔ اگر میں دونوں ہاتھوں کی رستی کو نوکیلے پتھر کی طرح مسلسل رگڑتا تو میری یہ پیچہ کوشش رنگ لاسکتی تھی۔ میں نے ذرا سرک کر پشت کو اس نوکیلے ابھار طرف کیا اور پھر ہاتھوں کی رستی کو اس پر زور زور سے رگڑنے لگا۔ پہلے پہل تو مجھے یہ سہل کام محسوس ہوا لیکن کچھ دیر بعد مجھے دانوں پسینہ آ گیا۔ مگر میں نے بھی کوشش ترک نہ کی اور تھوڑے تھوڑے فاصلے سے یہی عمل پیچہ دہراتا رہا۔ حتیٰ کہ رستی ادھیڑ ڈالی اور پھر میں نے دونوں رن بستہ ہاتھوں کو اور زور سے رگڑنا شروع کر دیئے۔ بالآخر رستی ٹوٹ گئی۔ دونوں ہاتھ آزد ہوتے ہی میں نے بے اختیار آسودہ

بھی۔ مگر ہمت ہارنا میں نے بھی نہیں سیکھا تھا۔ میں نے پریشان کن خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور لکیر پینے کی بجائے آگے کے حالات پر غور کرنے لگا۔ یقیناً مجھے میرے مرغوب ہتھیار میگاڈ سے بھی محروم کر دیا گیا ہو گا۔

بہر طور میں نے اپنے ہاتھوں پیروں کے گرد بندھی رستی پر زور آزمائی شروع کر دی لیکن ٹائیلوں کی باریک اور مضبوط رستی کیا ٹوٹی تھی، الٹا میرے ہاتھ پاؤں چھل گئے۔ اس لا حاصل کوشش سے میں ہار کر رہ گیا۔ بے بسی، پچھتاوے اور جھنجھلاہٹ کے مارے میرا دماغ اٹنے لگا اور کسی جال میں پھنسے ہوئے درندے کے مانند میرے میرے منہ سے غرائشیں بھی برآمد ہوئیں۔

کانی دیر اس بے بسی کے عالم میں بیچ و تاب کھاتے ہوئے گزر گئے۔ میں یونہی رن بستہ گھڑی کی مانند ننگے فرش پر پڑا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ میں نے چیخا چلاؤ شروع کر دیا۔ لیکن کوئی نہ آیا۔ میری آواز بیٹھ گئی۔ گلا دکھنے لگا۔ ہونٹ خشک ہو گئے۔ ناچار میں نے اپنی تنی ہوئی گردن ڈھیلی چھوڑ دی اور نگلی اینٹوں والے فرش پر سر رکھ دیا۔

کسی نے سچ ہی کہا، نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ میری بھی آنکھ لگ گئی۔ اچانک کسی نے میرے منہ پر پانی پھینکا تو میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے سامنے خدام کھڑے تھے۔ لائے تھکے، خنومند۔ جن کے بائیں کانوں میں بڑے بڑے بالے جھول رہے تھے اور آنکھوں میں وحشتانہ چمک بھکورے لے رہی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں ماؤزر تھے۔ جبکہ ایک کے دوسرے ہاتھ میں پانی کی بالٹی تھی جسے میرے ہوش میں آنے کے بعد اس نے ایک کونے میں پھینک دیا۔ ذرا ہی دیر گزری تو دروازے پر مجھے دنیا کا منحوس و ملعون ترین شخص نظر آیا۔

لبے سیاہ چہنے میں ملیں کبڑا شیطان، عامل عاروب میرے سامنے تھا۔ اس کی چندی چندی آنکھوں میں ہلا کی خباثت تیر رہی تھی اور پتلے پتلے سیاہ رو بدایت ہونٹوں پر مکروہ اور اسرار بھری مسکراہٹ۔ ”لگتا ہے تم ہی اس لڑکی کے وہ عاشق بے مراد ہو جسے وہ بھلا بیٹھی ہے۔“ وہ ختم خنجر میری طرف چند قدم بڑھاتے ہوئے مکروہ لہجے میں بولا۔

میں اسے خوں ناک نظروں سے گھور کر دانت پیٹتے ہوئے بولا۔ ”ہاں..... شیطان کی اولاد! میں ہی وہ تیری موت ہوں جس کے خلاف تو نے میرے دشمنوں کے کہنے پر اس معصوم لڑکی کی ذہنی رو پٹ دی ہے۔“

”اوہ..... چیخ، چیخ..... تمہارے ساتھ میں نے بڑا ظلم کر دیا۔“ وہ جیسے میری بے بسی سے حظ اٹھاتے ہوئے پچکار کر بولا۔ پھر جیسے ایک ایک اس کی چھچھوند جیسی آنکھوں میں معاندانہ چمک ابھری اور اسی لہجے میں غرا کر بولا۔ ”مگر اب تمہیں اس لڑکی کو ہمیشہ کے لئے بھلانا پڑے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے قریب کھڑے اپنے مسلح کارپردازوں سے حکمانہ کہا۔ ”اسے اسی حالت میں لے جا کر کسی گہری کھائی میں پھینک دو۔“ یہ بے رحمانہ حکم صادر کر کے وہ واپس لوٹ گیا۔ میرے منہ سے اس کے لئے مخالفت کا طوفان اُٹھ پڑا۔

اس کے دونوں کارپردازوں نے مجھے بوری کی طرح اٹھالیا اور زینے طے کرتے ہوئے نیچے پہنچے۔ پھر اس کے بعد مجھے ایک خنجر گاڑی میں ڈال کر دور دور برف پوش پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں خنجر گاڑی کے چوبی تختے پر بری طرح جکڑ لے کھا رہا تھا۔ مجھے اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی۔ میں ایسی ہی کسی کی موت نہیں مرنے چاہتا تھا۔ لیکن اب تن بہ تقدیر ہونے کے سوا چارہ ہی کیا تھا میرے پاس؟

سی گہری سانس خارج کی۔ اپنی کلائیوں پر پڑے نسل کا جائزہ لیا اور پھر دونوں پیروں کی رتی کھول ڈالی۔ اب میرا دوسرا مسئلہ کھائی سے باہر نکلتا تھا۔ میں نے برقی بلند یوں کی سمت سر اٹھا کر دیکھا، پھر اطراف کا ایک بار پھر اچھی طرح گہری نظروں سے جائزہ لیا تو مجھے ایک ڈھلوان پر درزی نظر آئی۔ میں آگے بڑھ گیا۔ درز زیادہ چوڑی نہیں تھی اور قدرے عمودی تھی۔ یعنی اوپر سے نیچے آ رہی تھی۔ چونکہ درز بہت تنگ تھی اور میرے لئے یہی سودمند تھا لہذا میں نے اس کی دونوں دیواروں پر ہاتھ پھنسائے دھیرے دھیرے اوپر کی طرف چڑھنا شروع کر دیا۔

بوند باندی اگرچہ بند ہو گئی تھی لیکن برف باری اور بوند باندی سے پھسلن سی ہو گئی تھی۔ مگر میں نے اپنی کوشش ترک نہ کی۔ تھوڑی ہی اونچائی پر پہنچا تھا کہ میری سانس بری طرح پھول گئی۔ میں نے چند ٹائپے رک کر پھولی ہوئی سانسیں درست کیں اور پھر اوپر چڑھنا شروع کیا۔ کم و بیش مجھے اوپر تک آنے کے لئے ایک گھنٹے سے زائد کا عرصہ لگا تھا۔

کھائی سے زندہ سلامت باہر آنے کے بعد میں پتھریلی زمین پر بے سدھ ہو کر گر پڑا اور گہری گہری سانس لینے لگا۔ جب حواس اور جسمانی مکان قدرے دور ہوئی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں سے نکلا اور آبادی کی طرف بڑھ گیا۔

اب میں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے سب سے پہلے اپنی مڑھی میں آیا۔ وہاں میرا نوجوان گائیڈ اور موجود نہ تھا۔ وہ شاید چلا گیا تھا۔ البتہ مڑھی کے مالک سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے کرایہ مانگنے لگا۔ شکر تھا کہ میں نے تھوڑے بہت پیسے اپنے مختصر سے سامان میں چھپا رکھے تھے۔ میں نے اسے تین دنوں کا بیٹھن کرایہ ادا کر دیا۔ مجھے ریسیور (کالاش آگرم) میں آج کم و بیش چوتھارہ روز تھا۔ میں اپنے ہدف تک پہنچ تو گیا تھا اور اس بد بخت عامل عاروب سے بھی میرا ٹکراؤ ہو چکا تھا مگر کامیابی سے ابھی دور تھا۔

عامل عاروب نے گنیز کو اب ایک طرح سے یرغمال بنا لیا تھا۔ بے شک وہ پہلے اس کے ٹرانس میں آ کر اس کی طرف از خود چھٹی چلی گئی تھی لیکن بعد میں جب میں نے اس کے کمرے میں نقب لگا کر دونوں کی باتیں سنی تھیں تو گنیز اس کے ٹرانس سے نکل چکی تھی۔ لیکن عاروب کی باتوں سے اس کے کردہ عزائم کا اندازہ بھی ہو چکا تھا۔ وہ رذیل اور ختم خنزیر شخص اب اس کے دل و دماغ کو ہمیشہ کے لئے گم گشتہ کر دینا چاہتا تھا اور اسے اپنی کینر بنانے کی کھاناؤنی سازش کر رہا تھا۔

یہ سب سوچ سوچ کر میرا دماغ جلنے لگا۔ دماغ کی شریانوں میں مجھے خون کا شدید دباؤ محسوس ہونے لگا۔ میں اسے حالات کی ستم ظریفی ہی کہوں گا کہ گنیز کو میں بڑی مشکلوں اور بڑے دشمن حالات میں یہاں تک لایا تھا کہ اس کی لاشی عامل عاروب کے ٹرانس سے اسے نجات دلاؤں گا۔ مگر یہاں پہنچ کر حالات اس کے برعکس ہو چکے تھے۔

میں گنیز کے معاملے میں اب پولیس وغیرہ سے بھی مدد نہیں لے سکتا تھا کہ وہ خود میری تلاش میں تھی۔ کیونکہ میرے ازلی رقیب کبیر نے گنیز کے اچانک غیاب پر اس کے باپ شاہ میر وغیرہ کو بھی بتایا ہو گا کہ گنیز کو میں نے ہی اغواء کیا تھا۔ لیکن بہر حال اس نے انہیں یہ بتانے سے احتراز ہی برتا ہو گا کہ میں گنیز کو درحقیقت کیلاش وادی میں لے جانا چاہتا تھا کیونکہ یہ بات صرف وہ اور اس کا یا ر کالا ناگ ہی جانتے تھے اس لئے ان دونوں نے اپنے گماشتوں کے ساتھ میرے تعاقب کی راہ اختیار کی تھی جس کی ایک مثال پشاور کے ہوٹل میں سامنے آ چکی تھی۔

گویا اب کسی وقت بھی میرا ان سے ٹکراؤ ہونے والا تھا۔ ابھی میں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ اچانک بی مڑھی میں داور خان داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر ذرا چونک سا گیا۔

”ارے داور!..... تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر پوچھا تو وہ راؤھر دیکھنے کے بعد بولا۔

”صیب جی! آپ کے ساتھ وہ لڑکی تھی۔ کہاں چلی گئی وہ؟“ اس کے گنیز کے بارے میں استفسار کو فطری تجسس سمجھا تھا لہذا میں نے دروغ گوئی سے کام لیا اور کہا۔

”وہ بھی ادھر ہی ہے۔ تم بتاؤ..... کیسے آنا ہوا؟“

اس کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات اُبھرے۔ پھر وہ بولا۔

”صیب! مجھے کچھ لوگ ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”تمہیں؟..... مگر کیوں؟“ میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔

”صیب! کسی نے انہیں بتایا کہ پشاور سے آنے والے ایک مرد اور عورت کے لئے گائیڈ کی خدمات مانے پیش کی ہیں۔ پھر وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں آن پہنچے۔ میں واپس چترال نہیں گیا تھا، ادھر چنے دور پار کے عزیزوں کے ہاں مقیم تھا۔ پھر وہ لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آن پہنچے۔ مگر یہ! درحقیقت وہ آپ کو ڈھونڈ رہے تھے۔“ اس نے آخر میں جیسے ایک دھماکا کیا اور میں اس کی بات پر لاپرواہ ٹھنکا۔ تب پھر اچانک مڑھی کا ٹاٹ ہٹا کر یکدم دو افراد اندر داخل ہو گئے..... میں انہیں پکڑ کر جیسے سکتے میں آ گیا۔

وہ دونوں میرے ازلی اور خون کے پیارے دشمن کبیر اور کالا ناگ تھے۔ مگر دونوں غیر مسلح تھے اور ہر طرف خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔ وہ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر مجھ سے آ ٹکرائے۔ جبکہ وہ چترالی لڑکا داور خان گھبرا کر وہاں سے کھٹک چکا تھا۔

”کوئی غلط حرکت مت کرنا دار!“ کالا ناگ نے درشت لہجے میں مجھے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

”گنیز کہاں ہے؟“ اس بار کبیر نے کرخت لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے فوراً خود کو سنبھالا اور پھر ایک گہری سانس خارج کر کے خوف زدہ ہوئے بغیر دانت پیس کر لا۔ ”وہ تمہارا کیا بھگت رہی ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے ساری بات بتا دی جسے سن کر چند لمحوں کے لئے اس کے چہرے پر بھی گہری تشویش آمیز ابھمن کے تاثرات عیاں ہونے لگے۔

”تمہیں اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟..... وہ بھی زبردستی۔ جواب دو؟“ معا کبیر نے لہجے میں کہا۔

میں بھی اس سے مرعوب ہوئے بغیر درشت لہجے میں بولا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے گنیز کو ہال کیوں لانا پڑا۔ البتہ اب یہ فضول سوال بار بار مجھ سے مت پوچھنا۔“ میری بے خونی نے کبیر کے ہاتھ کھڑے میرے ماموں حیدر گل کے قاتل کالا ناگ کو بری طرح تھملا کر رکھ دیا اور وہ باؤ لے کتے کی طرح خونخوار لہجے میں بولا۔

”زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، سمجھ تم۔ اور تم نے جو بکواس کی ہے، ہمیں اس پر عمل پیرا نہ نہیں ہے۔“

میں نے اسے لہو رنگ نظروں سے گھورا اور پھر اسی لہجے میں بولا۔ ”کالا ناگ! میں تجھ جیسے رذیل انہوں کے معاملے میں کبھی خوش فہمی کا شکار نہیں رہتا۔ جو سیدھی اور دونوک بات تھی، وہ میں نے بتا دی۔“

اس لیے کو یہ سمجھا دو۔ اگر اس نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں معاہدہ فراموش کر ڈالوں گا۔  
”اس کی تم فکر نہ کرو۔“ کبیر نے جلدی سے کہا۔ ”یہ میرے حکم سے انحراف نہیں کر سکتا۔ تم اپنی بات کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم ہم دونوں کو ہی دھوکا دینے کی کوشش کرو۔“

”میری طرف سے تم بے فکر رہو۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ ہمیں مل کر نگینہ سے متعلق یہ نازک معاملہ حل کرنا چاہئے۔“ میں نے کہا تو کبیر کالا ناگ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”کالا ناگ! تم نے سن لیا..... اب ہم کام کی بات کریں؟“

”ٹھیک ہے..... تمہیں منظور ہے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ چاہے عارضی طور پر ہی سہی، مجھے اسے برداشت کرنا پڑے گا۔“ وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ لیکن مجھے اس کے لہجے سے منافقت اور جھوٹ کی نو صاف محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں بھی وحشتانہ تناؤ اور بغض کی چمک صاف عیاں تھی۔ میں بھی اس سے غافل ہو کر نہیں رہنا چاہتا تھا۔

”چلو..... اب آرام سے کہیں بیٹھ کر کوئی لائحہ عمل طے کرتے ہیں۔“ کبیر نے کہا تو میں بولا۔

”میں عاروب کے غنڈوں کی نظروں میں آچکا ہوں۔ پھر وہ تم دونوں کو بھی اچھی طرح پہچانتا ہے۔ وہ ہمارے خلاف کوئی خطرناک قدم اٹھا سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں ادھر ہی بیٹھ کر کوئی منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔“  
”چلو ٹھیک ہے..... بیٹھو!“ وہ رضامند ہوتے ہوئے بولا۔ پھر فرش پر بیٹھ کر درمیانی مارتھ پر بیٹھا تو

ہنچ گیا۔ کالا ناگ بھی ناک بھوس چڑھاتے وہیں براہمان ہو گیا۔ میں بھی ان کے سامنے درمیانی مارتھ پر بیٹھا تو اچانک ایک لڑکا ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا۔ ٹرے پر تین چھوٹی چھوٹی گرم تھوے کی دھواں اُٹکتی پیالیاں دھری تھیں۔

یہ مڑھی کے مالک کا بیٹا تھا اور یہ مہمان نوازی اسی نے کی تھی۔ بہر طور میں نے شکر یہ کہہ کر لڑکے سے ٹرے لے لی اور وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ ہم تھوے کی پیالی تھامے ہلکی ہلکی چسکی لینے لگے۔

یہ صورت حال جتنی عجیب تھی، اتنی ہی دلچسپ بھی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے مگر ایک مشترکہ مفاد نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ تاہم مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ میں ایک حد تک ہی ان کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ کبیر اور کالا ناگ نگینہ کو قبضے میں کرتے تو میرا کام تمام کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کریں گے۔

یہ سب سوچتے ہوئے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ!



تم لوگوں میں اگر ہمت ہے تو جا کر اس خنزیر صفت عامل عاروب سے مل لو۔ آخر کو وہ تم دونوں کا دوسرے ہے۔ ہو سکتا ہے وہ نگینہ کو تمہارے حوالے کر دے۔“

”زبان سنہال کر بات کرنا دار!..... میں چاہوں تو اسی وقت تیرا قصہ نمٹا سکتا ہوں۔“ میری جوابی کارروائی نے اسے مزید مشتعل کر دیا تھا۔

”خاطر جمع رکھو۔ ابھی تو تم نے میرا قرض چکانا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو کبیر یکدم جھنجھلا کر کالا ناگ سے بولا۔

”یار! بس اب تم اپنی بحث چھوڑو۔ مجھے تو نگینہ کی فکر ہو رہی ہے۔ نادر جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ ورنہ نگینہ اس وقت یہاں ہوتی۔“

”ٹھیک ہے پھر۔ میں اس کا ابھی خاتمہ کئے دیتا ہوں۔“ کالا ناگ نے نفرت سے ہونٹ سکیز کر کہا اور پھر پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔ کبیر نے فوراً اس کے ہاتھ سے پستول چھٹ لیا۔

”یہ کیا بے وقوفی کر رہے ہو؟..... اب ہم تینوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ تم نے نادر کی بات نہیں سنی؟ وہ حرام زادہ عامل عاروب نگینہ کو اپنے ٹرائس میں لے کر زبردستی اپنی باندی بنانا چاہتا ہے۔“

”یہ جھوٹ بول رہا ہے کبیر!“ کالا ناگ نے غرا کر کہا۔ ”مجھے اس کا قصہ نمٹانے دو۔ یہ میرے بھائی کا قاتل ہے۔ مجھے دو پستول۔“

”خود پر قابو رکھو کالا ناگ! یہ وقت آپس کے قصے نمٹانے کا نہیں ہے۔“ کبیر نے اسے ذرا تیز لہجے میں سرزنش کی۔ ”نادر علی نگینہ کے معاملے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔“ یہ کہہ کر وہ گہری متانت کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”نادر! اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو یہ نگینہ کے ساتھ یقیناً اچھا نہیں ہوا ہے۔ اگر اس بد بخت عامل عاروب نے نگینہ کا مکمل برین واٹ کر ڈالا تو یہ ہم سب کے لئے بہت برا ثابت ہوگا۔ اور خود نگینہ کے لئے بھی۔“

”میں نگینہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کبیر! کہ میں نے جو کہا، سچ کہا ہے۔“ کبیر کا رویہ چاہے مصلحتی ہی سہی، بدلتا دیکھ کر میں نے معقول مگر مستحکم لہجے میں کہا تو کبیر کے چہرے کی تشویش مزید گہری ہو گئی۔ میں نے مزید کہا۔ ”کبیر! عاروب پر ہمیں بہت سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔ یہاں اس کے پیروکاروں کی کمی نہیں۔ علاوہ ازیں اس نے اپنے مسلح غنڈے بھی پال رکھے ہیں۔ ہمیں نگینہ کی خاطر ہی سہی، آپس کا جھگڑا فراموش کر کے اسے عاروب کے شیطانی منہ سے بچانا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر یہ اہم کام ہمیں مل جل کر کرنا ہوگا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ کالا ناگ نے فوراً درشت لہجے میں کہا جو پہلے ہی کبیر کے میرے ساتھ مصلحت آمیز رویے پر اندر ہی اندر ہلکا رہا تھا۔ ”یہ میرا جانی دشمن ہے۔ دھوکے سے ہمیں ہلاک بھی کر سکتا ہے۔“

”ہمیں ایک معاہدہ کرنا ہوگا۔“ کبیر نے پرسوج لہجے میں کہا۔

”کیسا معاہدہ؟“ کالا ناگ بولا تو کبیر اس سے مخاطب ہونے کی بجائے مجھ سے بولا۔

”نادر! میں سمجھتا ہوں کہ اب ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم مل کر نگینہ کو اس عامل عاروب کی قید سے چھڑاتے ہیں تو تمہیں نگینہ کی آزادی اور سلامتی تک یہ لڑائی بھولنی ہوگی۔ کیا تمہیں یہ معاہدہ قبول ہے؟“

میں نے ایک نظر کالا ناگ کی طرف دیکھا پھر کبیر سے بولا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن تم اپنے

چہرے سے اپنی نظریں ہٹا لی تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے، اس کا ٹیلی پیٹھی یا ٹرانس میں لانے کا عمل قوت ارادی سے کمزور بنایا جاسکتا ہے۔ لہذا اگر اس نے ہمارے ساتھ اس قسم کی کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو ہم اسے با آسانی ناکام بنادیں گے۔“

”لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ہم اسے گنیز کے بارے میں کیسے مجبور کریں گے؟..... وہ اگر اس پر اپنا عمل کرنے پر رضامند نہ ہوا تو پھر؟“ کبیر نے پُر نظر لہجے میں کہا۔

”اس کے لئے ہمیں اس پر جبر کرنا ہوگا۔ ویسے بھی وہ ہمارے قبضے میں ہوگا اور اسے بتا دیا جائے گا کہ ہم سے اس کی جان صرف اسی صورت میں چھوٹ سکے گی اگر وہ گنیز کی یادداشت بحال کر دے ورنہ.....!“ میں نے اس کے خدشے کا جواب دیا۔

”ٹھیک ہے..... سب سے پہلے گنیز کو اس عامل عاروب سمیت اپنے قبضے میں لینا ہوگا۔ اس کے بعد.....“ کبیر نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کالا ناگ نے درمیان میں مداخلت کی۔ وہ اب تک خاموشی سے ہماری گفتگو سنتا رہا تھا۔

”تم لوگ نہ جانے کن پتھروں میں ہو۔ میرے پاس اس مسئلے کا آسان حل موجود ہے۔“ اس کی مداخلت پر ہم دونوں نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کا جملہ ختم ہوتے ہی کبیر نے بے ساختہ پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

”عاروب کو گولی سے اڑا دیا جائے۔ سارا قصہ خود ہی منٹ جائے گا۔“ ہم دونوں اس کی بات پر مزید چونک اٹھے۔ یہ ایسی بات تھی جس کا کبیر تو کیا، خود مجھے بھی خیال نہ آیا تھا۔

”کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے؟“ کبیر نے مجھ سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں پُر جوش ارتعاش تھا۔ ”یقیناً ایسا ہی ہونا چاہئے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اگر خدا نخواستہ معاملہ اس کے برعکس ہو گیا تو ہم ساری عمر کے لئے گنیز کو کھودیں گے۔“

”نہیں..... پھر ہمیں یہ رسک نہیں لینا چاہئے۔“ کبیر نے گھبراتے ہوئے کہا۔ ”ہرگز نہیں۔“ میں نے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔ ”ہم گنیز کے معاملے میں کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتے۔“ درحقیقت خود مجھے بھی عاروب کے اس پراسرار عمل کی نوعیت کا ٹھیک طرح سے علم نہ تھا۔ کیا خبر اس کے مرنے کے بعد گنیز ساری عمر کے لئے ہم سے بگڑا نہ ہو جاتی۔ آخر کسی حادثاتی واقعے میں بھی تو انسان اپنی یادداشت گنوا دیتا ہے اور کسی کو نہیں پہچان پاتا۔ عین ممکن تھا کہ گنیز کے لئے عاروب کا وہ عمل سائنسی نوعیت کا کوئی ایسا ہی حادثہ بن جاتا۔ چنانچہ ہم دونوں نے ہی کالا ناگ کے خیال کو رد کر دیا۔

”یہ کام ہمیں نہایت ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔ ورنہ اس کے بد معاش حواری اور پیر و بھارہ ہماری جانوں کے دشمن بن جائیں گے۔“ میں نے کہا تو کبیر قہقہے انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔

”تو پھر یہ کام ہمیں رات کی تاریکی میں ہی انجام دینا ہوگا۔“

”یہ مناسب رہے گا۔“ میں نے تائید کی۔

ان لوگوں کے ساتھ چار مسلح ساتھی بھی تھے جو یقیناً کالا ناگ کے گروہ کے ارکان ہوں گے۔ میرا دل ہلنے کیوں کالا ناگ کی طرف سے عجیب سی بے چینی کا شکار تھا۔ اس کے گم صم سے انداز سے عیاں تھا کہ وہ ہمارے خلاف کوئی گل کھلانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ میری سوچ غلط ہوئی مگر موجودہ صورت حال میں میرا اس طرح سوچنا فطری تھا۔ اگرچہ حقیقت یہی نہیں تھی کہ مجھے نہ صرف کالا ناگ بلکہ کبیر ہلاک سے ہی محتاط اور چوکنا رہنے کی ضرورت تھی۔ کالا ناگ کی طرح کبیر بھی میرا ہرگز خیر خواہ نہیں تھا۔ میں

ہم ایک دوسرے سے محتاط تھے۔ میرا ان سے مصالحت کرنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ مجھے گنیز کے سلسلے میں کبیر یا کالا ناگ کی مدد درکار تھی، تاہم یہ بھی درست تھا کہ میں نے محض گنیز کی بھلائی کی خاطر ان وحشیوں سے مصالحت کی تھی۔ البتہ حقیقت یہ بھی تھی کہ گنیز اس وقت واقعتاً نہایت خطرناک صورت حال سے دوچار تھی اور میں اپنی تمام تر توجہ اسے صرف اور صرف اس کبڑے عامل عاروب کے شیطانی چنگل سے چھڑانے پر ہی مرکوز کرنا چاہتا تھا۔ کبیر اور کالا ناگ سے ٹکراؤ کی صورت میں میری توجہ بٹ جاتی جس کا فائدہ یقیناً شیطان عاروب کو ہوتا۔ اس میں ہم دونوں کا ہی نقصان تھا۔

جہاں تک ہمارے مشترکہ مفاد کا تعلق تھا تو وہ صرف میرے اور کبیر کے درمیان تھا۔ کالا ناگ اس سے مستثنیٰ تھا۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد تھا، مجھ سے انتقام۔ اور یہی سبب تھا کہ اسے میری اور کبیر کی یہ ”وقتی مصالحت“ ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ میں جانتا تھا کہ کالا ناگ کبیر اور اس کے باپ نظر حیات کا ایک زرخیز کتا بن چکا تھا اور وہ یہ ”کڑوا گھونٹ“ پینے پر مجبور تھا۔ لیکن اس میں ایک پیچیدگی بھی تھی۔ یہ تو طے ہو چکا تھا کہ گنیز کو اپنی عبادت گاہ میں دیکھنے کے بعد اس کبڑے عامل عاروب کی نیت اچانک بدل گئی۔ وہ اب اس کا مکمل برین واش کر کے سب کی طرف سے بالکل کورا کر دینا چاہتا تھا جبکہ میں چاہتا تھا کہ گنیز اس کے ساتھ اس کے عمل سے بھی چھٹکارا حاصل کر کے ٹرانس سے آؤٹ ہو جائے۔ جبکہ یہ بات کبیر کے مفاد میں ہرگز نہیں تھی۔ وہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ گنیز پر کیا گیا عمل ختم ہو اور وہ میری طرف ملتفت ہو جائے۔ تاہم گنیز کا کلی برین واش اس کے لئے بھی نقصان دہ تھا۔ میں یہی سب کچھ سوچ کر الجھنے کے باوجود قسمت کی ستم گرئی پر مسکرا رہا تھا کہ کس طرح ہم دو جانی دشمن ایک مفاد کی خاطر ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔

”کیا سوچنے لگے؟“ کبیر کی آواز نے مجھے خیالات کے بھنور سے واپس کھینچ لیا۔ وہ دونوں اپنی قبوے کی پیالیاں ختم کر چکے تھے جبکہ میری پیالی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ایک ہی گھونٹ میں وہ خوش ذائقہ اور تروتازہ کر دینے والا نیکس قبوہ ختم کرنے کے بعد پیالی سامنے دری پر رکھ دی، پھر کبیر سے بولا۔

”میرے ذہن میں ایک لائحہ عمل آرہا ہے۔“ کبیر غور سے میری بات سننے لگا۔ جبکہ کالا ناگ کے انداز و اطوار سے بیزاری اور بے اعتنائی جھلک رہی تھی۔

”ہمارا مقصد صرف گنیز کو ہی عامل عاروب کے چنگل سے چھڑانا نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں عامل عاروب کو پرغال بھی بنانا ہوگا۔ کیونکہ گنیز یقیناً اب تک اس کے کلی ٹرانس میں آچکی ہوگی اور اس کے اس ٹیلی پیٹھک عمل کو صرف عاروب ہی ختم کر سکتا ہے۔“

”لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ ضبیٹ ہمیں بھی اپنے شیطانی ٹرانس میں لے لے۔“ کبیر نے اپنی دانست میں زوردار نکتہ نکالا تھا مگر میرے پاس اس کا جواب موجود تھا۔

”وہ ہمارے قابو میں ہوگا۔ لہذا اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور ویسے بھی مجھے تجربہ ہو چکا ہے۔ پہلی بار جب میرا اس کا سامنا ہوا تھا تو اس نے مجھے بھی ٹرانس میں لانے کی کوشش کی تھی مگر میں نے فوراً اس کے

ہند صرف گنیز کو عاروب کے چنگل سے چھڑانا نہیں ہے بلکہ اس کے ٹرائس سے اسے جی طور پر آزاد بھی کرنا ہے۔ چلو، ہم کسی طرح عاروب کو گن پوائنٹ پر مجبور کر کے یہ کام کرا لیں گے۔ لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ ظاہر ہے، گنیز عاروب کے ٹرائس سے نکلنے کے بعد خود بخود تمہاری طرف ملتفت ہو جائے گی۔“ پھر وہ کبیر کی طرف مڑا۔ ”اب تم خود ہی سوچو کبیر! کہ سارے کھٹ راگ میں کس کا فائدہ ہوا؟ تمہارا یا نادر علی کا؟“

کالا ناگ کو آج تک میں نے صرف دھواں دھار گولیاں برسانے والا، سفاک دشمن ہی جانا تھا۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ حد درجہ زود فہم اور مکار انسان تھا۔ اس نے دور اندیشی سے کام لے کر موجودہ صورت حال کا انتہائی باریک بینی سے تجزیہ کیا تھا۔ کبیر الجھ کر رہ گیا تھا، تاہم وہ بولا۔

”ہم عاروب کو مجبور کریں گے کہ وہ اسی حالت میں گنیز کو ہمارے ساتھ کر دے۔“

”اب تم میری بات سمجھو۔“ کالا ناگ نے پرجوش مکاری سے کہا۔ ”یہ یقیناً نادر علی کے مفاد میں نہ ہو گا اور عین وقت پر یہ کوئی از جن پیدا کر دے گا۔ تو کیوں نہ ہم اسے ادھر ہی جہنم واصل کر کے خود ہی یہ مہم سر کر لیں؟“ اس کی سفاکانہ دلیل پر میری رگوں میں خون کی گردش یکدم تیز ہو گئی۔ صورت حال کی اچانک تبدیلی نے مجھے یکنخت محتاط کر دیا تھا۔ اس کے ارادے کو بھانپتے ہی میں نے اپنا وادارہ میگا رڈ باہر نکال لیا۔ کالا ناگ اور اس کے چاروں ساتھیوں نے اپنی گنیں مجھ پر تان لیں۔ میری کنپٹیوں میں بری طرح سائیں مائیں ہونے لگی۔ مڑھی کی محدود فضا یکدم ہی کشیدہ ہو گئی تھی۔

”کالا ناگ!..... رک جاؤ۔ یہ کیا بے وقوفی کر رہے ہو؟..... ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔“ کبیر نے اسے روکتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ”خود کو سنبھالو کالا ناگ! ہم اس وقت بہت ہی حساس مقام پر موجود ہیں۔ اس طرح سب کی نظروں میں آ جائیں گے۔“

”تو پھر اس سے حساب کس طرح بے باقی کیا جائے؟“ کالا ناگ نے بدستور پرجو نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کبیر سے کہا۔

”کر لیں گے اس سے حساب اپنا بے باق۔ یہ ابھی ادھر ہی ہے۔ مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“ کبیر نے بالآخر جھجھکا کر کہا۔ چند لمبے تک کچھ سوچنے کے بعد وہ ایک لمبی ہماری کرتے ہوئے کالا ناگ سے بولا۔ ”تمہاری اگر یہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے۔ ہم نادر کو اپنے ساتھ اس مہم میں شامل نہیں کریں گے۔ یہ اپنی کوشش کرے گا اور ہم اپنی۔“ یہ کہنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”نادر! ہمارے درمیان طے پانے والا معاہدہ اسی لئے منسوخ سمجھو۔ لیکن اتنا ضرور یاد رکھنا کہ اس مہم کے دوران اگر ہمارا انکراؤ ہوا، جو لازماً ہوگا تو تمہاری زندگی کی ضمانت ختم ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے..... پھر میں بھی تم لوگوں سے کوئی رعایت نہیں برتوں گا۔“ میں نے بھی سرد لہجے میں کہا۔ کالا ناگ کی آنکھوں میں خونخوار چمک مزید گہری ہو گئی۔

اس کے بعد وہ دونوں اپنے چاروں ساتھیوں کے ساتھ مڑھی سے نکل گئے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں بھی مڑھی سے باہر نکل آیا اور انہیں وہاں سے جانا ہوا دیکھنے لگا۔ وادی میں شام کی کچلا ہٹ دھیرے دھیرے اترنے لگی تھی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں واپس مڑھی کے اندر آ گیا۔

بد بخت کالا ناگ کے اچانک رائے بدلنے سے سارا کھیل بگڑ گیا تھا جس سے صورت احوال خندوش بلکہ مزید کشیدہ ہو گئی تھی۔ میں نے کبیر سے یہ عارضی مفاہمت صرف گنیز کے لئے مجبور ہو کر کی تھی اور کبیر کو بھی ایسا ٹی کرنا چاہئے تھا۔ لیکن وہ کالا ناگ کی باتوں میں آ گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ دو مخالف گروپوں کی صورت میں ہمارا عامل عاروب سے ٹکرانا خود گنیز کے لئے اشد خطرناک ہو سکتا تھا۔ یہ بہت خطرناک

اس کے باپ کا جانی دشمن تھا اور وہ میرا مسلمہ رقیب تھا۔ رات ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ سارے معاملات طے ہو چکے تھے اور اب ہمیں کارروائی کے وقت کا انتظار تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کالا ناگ کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ کسی زبردست ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس کی یہ کیفیت کبیر کی نظروں سے بھی چھپی نہ رہی۔ تاہم ہم دونوں نے اسے مخاطب کئے بغیر پیش آمدہ مہم پر اپنی گفتگو جاری رکھی۔ ہم نے یہ مشکل ایک گھنٹہ گزارا ہو گا کہ اچانک کالا ناگ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں چونکے۔ میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر اسرار برسرے سنائے اترے ہوئے تھے۔ وہ میری جانب ہی سنسناتی نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ خاصی دیر کی اپنی اندرونی کشمکش کے بعد اچانک ہی کسی نتیجے پر پہنچ گیا ہو۔ یہ محسوس کرتے ہی میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ کبیر نے بے اختیار اس سے پوچھا۔

”کیا ہوا؟“

”کبیر! میں تم لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔“ کالا ناگ نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟..... یہ اچانک بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا ہو گیا؟“ کبیر کے لہجے میں پریشانی اور حیرت تھی۔ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں بھی انجاناً خطرہ محسوس کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔ ”بس مجھے اس مہم میں دشمن کا ساتھ پسند نہیں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں کبیر سے بولا اور میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ ”کبیر! میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا، نادر علی سے الگ ہو جاؤ۔ ہم خود ہی یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟..... اس وقت ہم آپس کے جھگڑوں میں پڑ کر اپنا ہی نقصان کر بیٹھیں گے اور یہ حقیقت نادر بھی اچھی طرح جانتا ہے۔“ کبیر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے پہلے ایک بات کا جواب دو کبیر!“ کالا ناگ جس بات پر کافی دیر سے اندرونی کشمکش میں مبتلا تھا، بالآخر اس کا اظہار کرتے ہوئے کبیر سے بولا۔ ”بالفرض ہم گنیز کو عامل عاروب کے چنگل سے چھڑا لیتے ہیں تو یہ فیصلہ کون کرے گا کہ گنیز کس کی ملکیت ہوگی؟..... تمہاری یا نادر کی؟“

اس کی بات پر کبیر کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ میری سوچ کے مطابق کالا ناگ واقعی کالا ناگ تھا۔ زہر کو زہر ہی جانتا تھا۔ وہ میرا جانی دشمن تھا اور وہ مجھ سے نباہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ کبیر کی بات دوسری تھی۔ دشمن وہ بھی تھا لیکن چونکہ ہمارے سچ گنیز بھی اس لئے وہ مجھ سے مفاہمت کرنے پر مجبور ہوا تھا۔

کبیر کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کالا ناگ نے گویا گرم لوہے پر ایک اور چوٹ لگائی۔

”کبیر! نادر علی ہمارے ساتھ بہت بڑی چال چل رہا ہے۔ ہمارے کاندھوں پر بندوق رکھ کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تم خود سوچو، عاروب کے عمل سے نجات پاتے ہی گنیز اس کی طرف ملتفت ہو جائے گی۔ تمہارے ساتھ ہرگز جانا نہیں چاہیے گی۔“

اس کی بات پر میں نے بھی لب کشائی کرنا ضروری سمجھا۔

”مجھے کسی کی مدد کی پرواہ ہے نہ ضرورت۔ رہی بات گنیز کے میری طرف ملتفت ہونے کی تو اب تک وہ اس غصیٹ عامل عاروب کے ٹرائس میں آکر ہم سب کو ہی فراموش کر چکی ہوگی۔“

میری بات پر کالا ناگ کے بدبیت سیاہ ہونٹوں پر زہر ٹی مسکراہٹ چھن گئی اور وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر زہر خند سے بولا۔

”نادر علی! تم بات کو گھما پھرا کر الجھانے کی کوشش نہ کرو۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارا

دیتی رہی تھی۔ میں عبادت گاہ کے علاقے کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ اب کسی بھی وقت میرا عامل عاروب اور کالا ناگ وغیرہ سے ٹکراؤ ہو سکتا تھا۔

وادی میں شام گہری ہونے لگی تھی جو بتدریج رات کی تاریکی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے رہ رہ کر عجیب کا خیال پریشان کر رہا تھا۔ جانے کس حال میں ہوگی۔ خود سے بیگانگی ہوگی یا پھر اپنے نصیبوں پر رورہی ہوگی۔ اس کے ساتھ بڑی ٹریڈی ہوئی تھی۔ وہ بڑے دردناک اور عذاب ناک لمحات سے گزر رہی تھی۔ اسے یاد کر کے میرے دل میں آ رہے سے چل رہے تھے۔ سینے کی ہلچل طوفانوں میں بدلنے لگی تھی۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ اچانک میری نگاہ مشعل بردار جلوس پر پڑی جو مشرقی سمت سے آ رہا تھا۔ اس کا رخ عامل عاروب کی عبادت گاہ کی طرف تھا۔ ان سب نے سیاہ لائے جنے پہن رکھے تھے حتیٰ کہ سر اور چہرے بھی ڈھانپے ہوئے تھے۔ یہ یقیناً عاروب کے گروہ سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ مگر یہ اس کے اور پیروکاروں سے وضع قطع میں ذرا مختلف نظر آ رہے تھے۔ شاید یہ کوئی دوسرا گروہ تھا۔ کوئی خاص ٹولہ۔ ان کے ایک ہاتھ میں چپڑ کی مشعلیں تھیں تو دوسرے ہاتھ سے ایک ہڈی تھامی ہوئی تھی۔ یہ ہڈی خاصی بڑی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی بڑے جانور کی ران اور پیڑو کی ہڈی تھی۔ یہ ٹولہ میرے محتاط اندازے کے مطابق بیس پچیس افراد پر مشتمل تھا۔ وہ لوگ فی الوقت عبادت گاہ سے ذرا دور تھے۔ میرے ذہن میں فوراً یہ خیال ابھرا اور میں چھپتا چھپاتا ان کے راستے پر آ کر ایک آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ اب یہ ٹولہ ادھر سے گزرنے والا تھا۔ پھر جب وہ میرے بالکل قریب سے گزرنے لگا تو میں ہوشیار ہو گیا۔ پھر جیسے ہی ٹولے کا آخری فرد میرے قریب سے گزرنے لگا، میں جیتے کی سی مستعدی اور خاموشی سے عقب میں ابھرا اور اسگردن سے جھپٹ کر یکدم آڑ میں کھینچ لایا۔ اس نے تھلا کر عجیب وضع کی ہی سے مجھ پر وار کرنا چاہا مگر میں نے اپنے دونوں بازوؤں کے مخصوص ٹکڑے میں اس کی گردن جکڑ کر جھٹک دیا۔ کڑا کے کی آواز ابھری اور گردن کی ہڈی ٹوٹنے پر اس نے اپنے ہاتھ پر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ میں نے جلدی جلدی اس کا سیاہ چنڈا اتار اور خود پہن لیا۔ پھر زمین پر گری جلتی ہوئی مشعل اور وہ عجیب وضع کی ہڈی ہاتھوں میں اٹھا کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے اس سیاہ پوش ٹولے میں شامل ہو گیا۔ اب میرا چہرہ سیاہ چنے کے ”گھونگھٹ“ میں چھپ گیا تھا۔ ذرا دیر بعد میں ٹولے سمیت عامل عاروب کی تحریکی چھت والی عبادت گاہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ میرے سینے میں بڑی پکڑ کھڑکی ہوئی تھی۔ قسمت سے عاروب کی شررگ تک پہنچنے کے لئے جو راستہ ملا تھا، میں اسے ٹھونٹا نہیں چاہتا تھا۔ عبادت گاہ میں داخل ہونے کے بعد یہ مخصوص ٹولہ چوڑے کے سامنے قطار اندر قطار مودبانہ کھڑا ہو گیا۔ میں درمیانی صف میں کھڑا تھا۔ چنے کے گھونگھٹ سے سامنے چوڑے پر میری نظریں جمی ہوئی تھیں جہاں اسی عجیب و غریب اور بدوضع مودی کے قریب منحوس عاروب کھڑا تھا۔ نگینہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ البتہ عاروب کے چہرے نیم نیم خوفناک صورتوں والے خاص محافظ مستعدی کے ساتھ اس کے دائیں بائیں موجود تھے۔ معا عاروب نے ایک نظر اس مخصوص سیاہ پوش ٹولے پر ڈالی اور اپنا دایاں ہاتھ بلند کر کے گونج دار آواز میں کہا۔

”مقدس“ دا بولا مینزی“ کے پچار یو! مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ تم لوگوں کی خاص توجہ اور محنت سے ہمارے پیروکاروں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن ابھی ہماری منزل بہت دور ہے۔ جب تک پوری وادی کیلاش کے لوگ مقدس دا بولا مینزی کے دائرے میں نہیں آ جاتے، ہمارا مشن جاری رہے گا۔ ہم جانتے ہیں، کیلاش وادی کا سردار اگر موٹی ہماری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اور اس نے ہمیں اس وادی سے بے دخل کرنے کی خاطر ہر قسم کی کوششیں کر کے دیکھ ڈالیں مگر مقدس دا بولا مینزی نے اس کی ہر سازش ناکام بنادی ہے۔ اس لئے تم ذرا بھی نہ گھبرانا اور اسی طرح پوری وادی کے لوگوں کو مقدس دیوتا دا بولا مینزی کے بارے

صورت حال تھی اور مجھے اس پر قابو پاتے ہی نگینہ کے لئے کچھ کرنا تھا اور ان مردودوں کا بھی سامنا کرنا تھا۔ گویا میرے لئے ایک نہ شدہ و شدہ والی بات تھی۔ میں خاصی دیر تک اسی پریشانی میں بیٹھا رہا۔ پھر ارادہ کر کے اٹھا اور عامل عاروب کی عبادت گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

مذکورہ عبادت گاہ آبادی کے جنوبی مضافات میں تھی۔ یہ علاقہ خاصا ویران اور سنسان تھا۔ میں اپنی دھن میں مگن جا رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ چند مقامی لوگوں کے درمیان مجھے دو ایسے افراد کی جھلک اس وقت نظر آئی تھی جب میں نے یونہی غیر ارادی طور پر اپنے عقب میں مڑ دیکھا۔ میں نے بھی بروقت حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بظاہر یونہی ادھر ادھر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد سیدھنا چلنا شروع کر دیا تھا۔ ان دونوں کو میں بہر حال پہچان چکا تھا۔ وہ دونوں کالا ناگ کے ان چار ساتھیوں میں سے تھے۔ میرے ذہن میں فوراً ہی ایک منصوبے نے سر ابھارا۔ میں بظاہر بے پرواہانہ انداز میں اپنی ہی دھن میں مگن تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔ آبادی سے قدرے دور نکل آنے کے بعد میں اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اچانک ہی ایک طرف مڑا اور فوراً ہی چٹان کی آڑ لیتے ہوئے گھات لگا کر دم سادھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ دونوں اس وقت میرے تعاقب میں آ رہے ہوں گے۔ یہ طے تھا کہ ان دونوں کو میرے پیچھے لگا کر کالا ناگ خود کبیر اور ان دونوں ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا ہوگا۔ کچھ دیر بعد میں نے تھوڑا سا سر ابھارا تو چونک گیا۔ وہاں کوئی ذی نفس نہ تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ دونوں میرے پیچھے آتے آتے کدھر نکل گئے تھے؟..... میں اسی الجھن میں تھا کہ مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ میں جھکی کی سی تیزی سے پلٹا اور مجھے ان کی جھلک دکھائی دی۔ وہ دونوں مجھ پر بیک وقت چل پڑے تھے اور مجھے زمین پر رگید ڈالا۔ میں نے خود کو ان کی گرفت سے ایک جھٹکے سے آزاد کیا اور ایک حملہ آور کی ٹھوڑی پر بھر پور دھکا رسید کر دیا۔ وہ کھٹی کھٹی کراہ کے ساتھ اُلٹ گیا۔

دوسرے نے اپنی جیب سے پستول نکالنا چاہا مگر اس کے پیٹ پر پڑنے والی میری لات نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ وہ ڈکراتا ہوا چٹان سے ٹکرایا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اس اثناء میں پہلا والا اپنی جیب سے پستول نکالنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے بلا توقف مجھ پر گولی چلا دی مگر میں اس سے پہلے جھکا کر دے چکا تھا۔ عین اسی وقت دوسرے ساتھی نے ایک بے وقوفانہ حرکت کر ڈالی۔ وہ یقیناً پیٹ پر ٹکرنے والی ضرب کے نتیجے میں بری طرح بوکھلا چکا تھا اس لئے وہ ذرا سا سنجالا لے کر بری طرح مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میں تو گویا اس کے لئے تیار تھا۔ میں نے پھرتی سے اسے دو بچا اور دھکیل دیا اور دوسرے ساتھی سے ٹکرایا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ہم تینوں ہی گر پڑے۔ میں نے گرتے گرتے بھی پہلے والے کے ہاتھ سے پستول جھپٹ لیا۔ یہ سب کچھ آنا فانا ہو گیا۔ میں نے زمین پر گرتے ہی لوٹ لگائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”خبردار!..... کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ گولی سے اڑا دوں گا۔“ میں نے کرخت آواز میں کہا۔ وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کینہ تو زلفوں سے مجھے گھورنے لگے۔

”تم دونوں اپنے ہاتھ بلند کر لو۔ جلدی..... میرے پاس وقت کم ہے۔“ میں نے درشت لہجے میں تھمنا نہ انداز میں کہا تو دونوں نے اپنے ہاتھ سر سے بلند کر لے۔ میں نے انہیں دوسری طرف منہ پھیرنے کو کہا۔ اس کے بعد دونوں کی جیبوں کی تلاشی کی تو مزید ایک ایک خنجر اور کچھ فاضل راؤنڈ برآمد ہوئے۔ میں نے یہ ساری چیزیں قبضے میں لے کر ان دونوں کی ایک ایک ٹانگ پر باری باری گولی چلا دی۔ گولیوں کے دھماکوں کی آواز وادی میں دور تک گونجتی چلی گئی۔ وہ کرب انگیز کراہ کے ساتھ زمین بوس ہوتے گئے اور میں بڑے آرام سے آگے بڑھ گیا۔ ان کے دہانوں سے برآمد ہونے والی مغلظات کی بازگشت مجھے دور تک سنائی

ہماروں سے چھینے ہوئے پستولوں سے پوری طرح مسلح تھا۔ فاضل راؤ غڑ بھی میرے پاس موجود تھے۔ چنانچہ میں نے اپنے ارتعاش پر قابو پایا اور دائیں ہاتھ سے پستول نکال لیا۔ ابھی پستول والا ہاتھ میرے سیاہ چنچے کے اندر ہی موجود تھا اور پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی حرکت کرتا، اچانک ہال میں گنیز کی تیز چیخ ابھری اور وہ کھڑے کھڑے وہیں چپوڑے پر گر پڑی۔ میں پوری جان سے لرز اٹھا۔ گنیز کو یوں اچانک بے سدھ ہو کر چپوڑے پر گرنا دیکھتے ہی میرے اندر ہولناک طوفان سر اٹھانے لگے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر مجھے مزاحمت کرنے سے روک رہا تھا۔ اسی وقت عامل عاروب کی آواز ابھری۔

”اس خوب صورت دوشیزہ کی قربانی مقدس دابولا میزنی نے قبول کر لی ہے۔ ہم نے اسے اپنے عمل کی ہر گرفت سے آزاد کر دیا تھا تا کہ یہ مکمل طور پر ایک عام اور معصوم دوشیزہ کی طرح قربان ہونے کے لئے تیار ہو جائے۔“ مجھے اس کی بات پر ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس کا یہ کہنا کہ ہم نے اب اسے اپنے عمل کی ہر گرفت سے آزاد کر دیا تھا مجھے بری طرح چونکا گیا تھا۔ کیا اس مردود نے مجھ پر نادانستی میں یہ احسان کر دیا تھا کہ گنیز..... میری گنیز اب اس کے جزوی ٹرانس کے عمل سے بھی آزاد ہو چکی تھی؟ یعنی..... یعنی کیا گنیز کے دل و دماغ میں اب میری حکومت دوبارہ قائم ہو چکی ہے؟ اور..... اور کیا اب میری گم گشتہ دنیائے محبت مجھ مل گئی ہے؟

ایسے کئی مسرت انگیز خیالوں اور خوش امید یوں نے میرے اندر ہلچل مچا دی۔ گنیز شاید اس کے جزوی ٹرانس کے عمل سے آزاد ہونے کے رد عمل میں بے ہوش ہو گئی تھی۔

میں دم بہ خود کھڑا سامنے چپوڑے پر بے سدھ پڑی گنیز کو تنکے جا رہا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ گنیز کے وجود نے ہلکی سی جنبش کی تھی۔ میرا دل یکبارگی دھڑکا۔ مجھے یوں لگا جیسے اب آج سے کروڑوں سال پہلے والا ”بگ بینک“ ہوگا اور میری کائنات، میری دنیا ”دفائے کن“ سے وجود میں آجائے گی۔ اور پھر یہی ہوا۔ گنیز نے ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے جوتھ ادا کیا، وہ میرا نام تھا۔

”نادر!..... نادر!..... تہ..... تم کہاں ہو؟“ وہ ہولے ہولے بڑبڑاتے جا رہی تھی۔ اس خوب صورت پکار نے میرے وجود کی گہرائیوں تک کو اک عجیب مسرت سے معمور کر دیا تھا۔ سرشاری، خوشی اور مسرت کے احساس نے جیسے میرے پورے وجود پر قبضہ جما لیا تھا۔ اس کیفیت نے میرے اندر کے اچھے جوش کو بھی ہوش کی راہ دکھلا دی تھی۔ اب مجھے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہئے۔ اگرچہ حالات ”اب نہیں تو کبھی نہیں“ کے مصداق تھے مگر اس کے باوجود میں ہوش و خرد سے کام لینا چاہتا تھا۔ گنیز نے ہوش میں آتے ہی بے اختیار دل سے مجبور ہو کر مجھے پکارنا شروع کر دیا تھا۔ عامل عاروب کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ ابھری۔ ادھر گنیز یکدم اٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر اس کے قدم ڈمک گئے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ برسوں کی نیند سے جاگ رہی ہو۔ عامل عاروب نے اپنے دو گرگوں کو خوف سا اشارہ کیا۔ دونوں نے حرکت کی اور گنیز کو ایک بار پھر بازوؤں سے پکڑ کر دبوچ لیا۔ گنیز چیخنے چلائی گئی اور ہراساں نگاہوں سے اس ماحول کو دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہ بد وضع مورتی پر پڑی۔

”میں کہاں ہوں؟..... تہ..... تم لوگ کون ہو؟ مجھے بتاؤ۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔“ گنیز ہسٹریائی انداز میں چلائی تو عامل عاروب سنگدلانہ نظروں سے اسے گھور کر بولا۔

”خاموش ہو جاؤ لڑکی! تمہیں اب مقدس دیوتا دابولا میزنی پر قربان کیا جانے والا ہے۔ تم بہت خوش قسمت ہو کہ مقدس دابولا میزنی نے تمہاری قربانی قبول کر لی ہے۔“

گنیز نے جو یہ سنا تو خوف و دہشت سے کانپ کر رہ گئی۔

میں آگاہ کرتے رہنا کہ وہ جلد از جلد اس کے پیر و کار بن جائیں۔ ورنہ بہت جلد پوری وادی پر عذاب نازل ہونے والا ہے۔ اس عذاب سے صرف مقدس دابولا میزنی کے پیر و کار ہی بچ سکیں گے۔ جو اس کے حلقہ اثر سے باہر ہوگا، وہ فنا ہو جائے گا۔ کیونکہ اس سرزمین پر صرف اور صرف مقدس دابولا میزنی ہی کی حکمرانی ہے، جو طاقت کا دیوتا ہے۔“

وہ اپنی بکواس ختم کر کے خاموش ہوا تو مخصوص سیاہ پوش ٹولے میں سب سے اگلی قطار میں کھڑے ایک سیاہ پوش نے مودبانہ لہجہ میں عامل عاروب سے کہا۔ ”کیلاشی سردار اگر موتی کی ہمارے خلاف چیرہ دستیوں روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس نے اب باقاعدہ کچھ لوگ مخصوص کر دیے ہیں جو کیلاشی وادی کے لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکانے کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ پہلے کے مقابلے میں اب ہماری کوششیں اگرچہ تیزی اختیار کر چکی ہیں لیکن افسوس کہ کیلاشی سردار اگر موتی کے مخصوص افراد نے ہماری ان کوششوں اور کاوشوں پر پانی پھیر دیا ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں بہ غور ان کی باتیں سن رہا تھا۔ عامل عاروب نے غور سے اپنے پیر و کار کی بات سنی، اس کے بعد وہ بلند آواز سے بولا۔

”ٹھیک ہے..... ہم آج مقدس دابولا میزنی کے آگے ایک بھیٹ چڑھائیں گے اور اس سے کیلاشی سردار اگر موتی کو نیست و نابود کرنے کی التجا کریں گے۔“

”ہم بھیٹ دینے کو تیار ہیں اے مقدس دابولا میزنی کے پیر و کار! ہم تیار ہیں۔“ سیاہ پوش مخصوص ٹولے نے بیک زبان ہو کر بلند آواز سے کہا تھا۔

”نہیں۔“ عامل عاروب نے اچانک گونج دار آواز میں کہا۔ ”مقدس دابولا میزنی ہماری بھلائی، کامیابی اور ہماری زندگیوں کے تحفظ کی خاطر تو ہماری اپنی قربانی یا بھیٹ قبول کرتا ہے لیکن کسی دشمن کو نیست و نابود کرنے کے لئے اسے کسی باہر کے آدمی کی بھیٹ چڑھانا ہوگی۔“

”اے مقدس دابولا میزنی کے پیر و کار! ہمیں حکم کرو۔ ہم وادی سے باہر کا کوئی آدمی پکڑ لاتے ہیں۔“ اگلی صف میں کھڑے اسی سیاہ پوش پیر و کار نے عامل عاروب سے مودبانہ کہا۔

”نہیں..... یہ بھیٹ ایک خوبصورت اور جوان دوشیزہ کی ہوگی جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔“ عامل عاروب نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا اور میری کنپٹیاں بری طرح سنسنائے لگیں۔ میرا خیال فوراً گنیز کی طرف چلا گیا تھا۔ معاً اس مردود عامل عاروب کی دوبارہ آواز ابھری۔

”اور یہ بھیٹ ابھی اور اسی وقت چڑھائی جائے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی۔ اس کے گرد کھڑے مستعد محافظوں میں سے دونوں حرکت میں آئے اور اوپری منزل تک جانے والے گردش زینے کی چوٹ کی طرف بڑھ گئے۔ میرے اندر زبردست ہلچل مچنا شروع ہو گئی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ دونوں غیبت یقیناً گنیز کو لینے کے لئے ہی گئے تھے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ گنیز کو دوپے چپوڑے پر لے آئے۔ گنیز کو دیکھتے ہی میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی تھی۔

وہ بری طرح ہراساں نظر آرہی تھی۔ مجھے ایک تسلی تو ہوئی تھی کہ وہ مکمل طور پر عامل عاروب کے ٹرانس میں نہیں آئی تھی۔ میری نظریں چپوڑے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا، عامل عاروب یک تنگ گنیز کے چہرے کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کے انداز پر ایک پُر اندیش خیال سے میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ کہیں یہ غیبت مکمل طور پر تو گنیز کو اپنے ٹرانس میں نہیں لے رہا؟ تا کہ وہ بہ رضاد و رغبت اپنی بھیٹ اس دابولا میزنی کی مورتی کو دینے کے لئے تیار ہو جائے۔

یہ خیال آتے ہی میں نے دراندہ وار حملہ کرنے کا سوچا۔ میں اپنے میکار اور کالا ناگ کے ان دونوں



”یہ سب کیا ہے؟..... تم..... میں پاگل ہو جاؤں گی۔ تم اللہ کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو..... آہ..... نادر!..... تم کہاں ہو؟“ وہ پھر ہسٹریائی انداز میں چیختی لگی۔

نادر علی! تم کب تک خاموش تماشائی بنے کھڑے رہو گے؟..... تمہاری نگینہ، تمہاری محبت تمہیں پکار رہی ہے۔ جاؤ، اپنی نگینہ کو ان منحوس و مردود شیطانوں سے بچالو۔ بڑھو اور..... میرے اندر کوئی چیختی لگا۔

”اے مقدس دابو لامینزی کے قدموں میں لے آؤ اور زنجیروں سے جکڑ دو۔“ عاروب نے حکم دیا۔ وہ دونوں گر گئے نگینہ کو مورنی کی طرف کھینچنے لگے۔ میں غیر محسوس انداز سے دھیرے دھیرے چپوترے کی طرف کھٹکنے لگا۔ آخری سرے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ وہاں سے چپوترہ نزدیک تھا۔ چپوترے پر میزے عین مقابل عاروب کھڑا تھا۔ میں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر اسے ہی تختہ مشق بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ دابو لامینزی کے پیروکاروں کے روحانی پیشوا کو گن پوائنٹ پر لینا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ ایک بہت بڑا اور جان لیوا حد تک خطرناک رسک تھا۔ مگر میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہ تھی۔ یہ جست لگا کر با آسانی چپوترے پر چڑھ کر عامل عاروب کو گن پوائنٹ پر لے سکتا تھا۔ پھر میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر جھڈا تار پھینکا اور چپوترے پر چھلانگ لگا کر عامل عاروب پر جھپٹا۔ کبڑا ہونے کے باعث اس کی گردن پہلے ہی جھکی ہوئی تھی اس لئے میں نے با آسانی اپنے بائیں بازو کے شکنجے میں اس کی گردن جکڑ کر پستول کی نال اس کی کینٹی پر لگا دی۔ یہ کام میں نے بل کے بل نمٹا دیا تھا۔ جواب میں کئی وحشیانہ چیخیں اُبھریں۔ چپوترے پر موجود عاروب کے مستعد محافظ اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئے۔ میں نے دھاڑ کر کہا۔

”خبردار!..... کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے عاروب کی کینٹی پر پستول کی نال کا دباؤ ڈالتے ہوئے اس سے کہا کہ وہ محافظوں کو نگینہ کو چھوڑنے کا حکم دے۔ ادھر نگینہ مجھے دیکھ کر گویا کھل سی اُٹھی تھی۔ عاروب کو میرے خونخوار ارادے کی خطرناکی کا احساس ہو گیا تھا۔ لہذا اس نے پھنسی پھنسی آواز میں ان دونوں گروگوں کو حکم دیا کہ نگینہ کو چھوڑ دیا جائے۔ انہوں نے فوراً نگینہ کو چھوڑ دیا۔

نگینہ مسرت سے چیختی ہوئی میری جانب بڑھی۔ ”نادر!.....!“ وہ میرے ساتھ آن لگی۔ ہال میں موجود عاروب کے پیروکاروں کے چہرے طیش اور غیظ و غضب سے سرخ ہو رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ میرے اس ناقابل معافی جرم پر میری نکابوئی کر ڈالیں۔ لیکن اس وقت ان کے روحانی پیشوا کی جان خطرے میں تھی، جس نے انہیں اپنی جگہ کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”اپنے اس روحانی پیشوا کی زندگی چاہتے ہو تو سب لوگ ایک دیوار سے لگ کر منہ دوسری طرف پھیر کر کھڑے ہو جاؤ اور ہاتھ سر سے بلند کرلو۔ میں باہر نکلتے ہی تمہارے اس روحانی پیشوا کو چھوڑ دوں گا۔ لیکن اگر کسی نے ذرا سی بھی چالاکی دکھائی تو پھر اس کی موت کے ذمے دار تم خود ہو گے۔“ میں نے گرج دار آواز کے ساتھ کہا اور ساتھ ہی عاروب کی مرئی کی طرح دیوچی ہوئی گردن کو بھی ہولے سے جھکا دیا۔ درد کی شدت سے بے اختیار اس کے حلق سے ایک کراہ خارج ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اس نے پھٹی پھٹی آواز کے ساتھ اپنے پیروکاروں کے سامنے لفظ بلفظ میرا حکم دہرایا۔ وہ لوگ اندر ہی اندر بری طرح کھول رہے تھے مگر عاروب کی وجہ سے بے بس تھے۔ ناچار انہیں یہ حکم ماننا پڑا۔ ابھی میں نے نگینہ اور عاروب کو ساتھ لے قدم بڑھائے ہی تھے کہ اچانک ایک خونخوار اور دھاڑتی ہوئی آواز ہال میں گونجی۔

”خبردار نادر!..... اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔“ یہ دھاڑتی ہوئی آواز ہال کے بیرونی دروازے سے اُبھری تھی۔ میں نے ٹھک کر آواز کی سمت دیکھا۔

میرے ساتھ ڈری سبھی کھڑی نگینہ کے حلق سے بے ساختہ دلی دلی سی چیخ اُبھری۔ ہال کے دروازے پر کالا ناگ اور کبیر کھڑے تھے۔ ان کے دونوں گر گئے بھی ساتھ کھڑے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے جن کی نالوں کا رخ میری جانب تھا۔

میں نے اپنے حواس پر قابو پایا اور چلا کر کہا۔ ”نگینہ کی جان خطرے میں ہے۔ یہ لوگ اسے اپنے دیوتا کی بیعت چڑھانا چاہتے تھے۔ تمہاری کوئی بھی حماقت نگینہ کے لئے نہیں بلکہ ہم سب کے لئے خطرناک ثابت ہوگی۔ کیونکہ ان کے پیروکار پہلے بھر میں ہماری نکابوئی کر ڈالیں گے۔“

میری بات پر کالا ناگ اور کبیر وغیرہ نے قدم آگے بڑھائے۔ پھر ذرا قریب پہنچ کر کالا ناگ نے زہر خند کے ساتھ مجھ سے کہا۔ ”تم نے ہمارا کام آسان کر دیا۔ نگینہ کو ہمارے حوالے کر دو اور خود جاؤ جہنم میں۔“ مردود کالا ناگ کی بات پر میں دانت پیس کر رہ گیا۔ اس سے خبر کی توقع فضول تھی۔ وہ انتقام کی آگ میں اندھا ہو رہا تھا۔ میں نے کبیر سے مخاطب ہو کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”کبیر!..... اپنے زر خرید کتے کو سمجھاؤ۔ اس وقت ہم سب کی جانیں خطرے میں ہیں۔ ہمارا پہلا مسئلہ یہاں سے نگینہ کو با حفاظت لے کر نکلتا ہے۔ ورنہ یہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ میرا خیال تھا کہ کبیر صورت حال کو سمجھتے ہوئے میری بات مان لے گا۔ لیکن وہ بھلا اپنے دشمن کی بات کیونکر مان سکتا تھا۔

”نادر! زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو..... تم اچھی طرح جانتے ہو کہ نگینہ ہمارے پاس بھی محفوظ ہی رہے گی۔ رہی بات تمہاری تو تم نگینہ کو ہمارے حوالے کر دینے کے بعد بھی کبڑے کو ڈھال بنا سکتے ہو۔“ میں نے بے بسی اور غصے کے مارے تھلا کر رہ گیا۔ تب نگینہ نے ہمت کی اور چلا کر کبیر سے بولی۔

”کبیر! ہوش کے ناخن لو۔ تمہاری نادر سے دشمنی میرے دل میں تمہاری نفرت میں اضافہ ہی کا باعث بنے گی۔ تم نے اور اس بد معاش کالا ناگ نے ہی مجھے آج اس مقام تک پہنچایا ہے۔ میرے نادر کو کچھ ہوا تو میں تمہیں ساری عمر معاف نہیں کروں گی۔“ نگینہ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر کبیر ہکا بکا رہ گیا۔

”ادھر..... تو یہ بات ہے۔ تم نے بالآخر اپنی منزل پا ہی لی۔“

”کبیر! اب نگینہ تو کئی تمہارے ہاتھ سے۔ کیوں نہ اس پر پی جوڑے کا ادھر ہی قصہ پاک کر دیں۔“ اچانک کالا ناگ نے انتہائی سفاک لہجے میں کبیر سے کہا۔ اس کے لہجے کی سنناہٹ پر مجھے اپنے وجود میں لاتعداد چیونٹیاں سی رنگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میں ایک لمحے کے لئے اندر سے لرز سا گیا۔ وہ مردود مجھ پر بری طرح ادھا رکھائے بیٹھا تھا۔ لیکن اب مجھے دیکھنا یہ تھا کہ کبیر کیا فیصلہ کرتا ہے؟

ہال میں اعصاب شکن سناٹا طاری تھا۔ عاروب کے پیروکار اور سرخ محافظ بدستور دیوار کی طرف منہ کئے خاموش کھڑے تھے۔ وہ اتنا تو سمجھ ہی گئے تھے کہ دو مخالف گروپوں کے درمیان بری طرح ٹھن چکی ہے۔ اب خاموشی سے فیصلے کے منتظر تھے۔ تاہم میں ان کی طرف سے غافل نہیں تھا۔

”کالا ناگ.....!“ اچانک کبیر کی عجیب سی آواز اُبھری۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں سرد مہری اور سفاکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ”تم سچ کہتے ہو۔ نگینہ اگر میری بیٹی نہ ہو تو کسی کی بھی نہیں ہو سکتی۔ اُڑا دو گولیوں سے ان دونوں کو۔“

بد بخت اور کینہ پرورد کبیر نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک ایک کی ہال میں گولیوں کی بھیانک ترنٹراہٹ اُبھری۔

\*\*\*

زندگی اسی کا نام ہے۔ کبھی موت کی لپک اور کبھی زندگی کی جھپک۔ لیکن طاقت اور برتری کے دعوے دار

تاریک آسمان پر بادل چھائے ہونے کی وجہ سے آس پاس گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ یہ اندھیرا ہمیں تحفظ بھی فراہم کر سکتا تھا اور قضا کے گھاٹ بھی اتار سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں آس پاس اندھی کھائیوں کی کمی نہ تھی۔ میں نے نگینہ کا ہاتھ پکڑا اور سنبھل سنبھل کر آگے بڑھنے لگا۔ کئی بار میرا اور نگینہ کا پاؤں پھسلا مگر ہم نے خود کو سنبھال لیا۔ بلکہ ایک بار تو میں گرنے سے خود کو بچا ہی نہ پایا اور نیچے گرنا چلا گیا۔ وہ تو شکر تھا، کھائی کم گہری تھی اس لئے بچ گیا۔

بہر طور میں اور نگینہ تاریکی کا حصہ بنے سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے رہے۔ نگینہ کو پالنے کے بعد جیسے اب میرے حصول کے بادیان آسمان تک بلند ہو چکے تھے۔ میں اس کا نرم و گداز ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ ہم ایک دوسرے سے کھل کر اور تعصبات گفتگو کرنے کو بے تاب تھے مگر ہمیں ابھی تک اس کا موقع ہی نہیں مل پایا تھا۔ شوریٰ آوازیں بتدریج قریب آتی جا رہی تھیں۔ مجھے اب تشویش ہونے لگی۔ میرا جرم معمولی نہ تھا۔ ان کے ہتھے چڑھنے کا مطلب یقینی موت تھا۔ تشویش مجھے اس بات کی تھی کہ یہ لوگ اس گنجلک اور پُر پیچ وادی کے چپے چپے سے واقف تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بھی تاریکی میں ہمیں ڈھونڈ سکتے تھے۔ جبکہ ہم کھلی آنکھوں سے راستہ تک نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ لیکن میں نے ہمت ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اور پھر اب تو میری نگینہ میرے ساتھ تھی۔ وہ میرا سب کچھ تھی۔ میرا حوصلہ، میری دلیری، میرا عزم، کبھی کبھ۔ اور میں ہمت اور حوصلے کے ساتھ اپنی اور نگینہ کی بقاء کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ دن کا اچالا شاید ہمارے لئے سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔ کالا ناگ کا میرے ہاتھوں عبرت ناک انجام حسب توقع تھا۔ وہ روز بروز میرے اور نگینہ کے لئے زہر یلا بنتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ ماموں حیدر گل کا ایک طرح سے قاتل بھی تھا۔ میری ماں بھی اسی کے ہاتھوں مرتے مرتے بچی تھی۔ کبیر بھی کم خطر ناک نہ تھا۔ کالا ناگ کے ساتھ رہتے رہتے اس میں بھی زہر چڑھنے لگا تھا۔ یہی سبب تھا کہ آخری لمحات میں جب اس نے دیکھا کہ نگینہ مکمل طور پر اس کبڑے عامل عاروب کے اثرات سے نکل کر مجھے پہچاننے لگی ہے تو اس نے ہم دونوں کا ہی قصہ پاک کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مگر میرے چار حانہ اقدام نے اس کے گھناؤنے ارادوں کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ کالا ناگ تو یقیناً جہنم واصل ہو چکا تھا کیونکہ میرے پستول سے نکلی ہوئی گولی نے اس کا بھیچے اُڑا دیا تھا۔ جبکہ کبیر کے بارے میں کتنی طور پر میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ تاہم وہ میری گولی سے زخمی ضرور ہوا تھا۔ یہی حال کبڑے عاروب کا تھا جو کالا ناگ کے ایک نمک خوار کی گولی کی زد میں آ گیا تھا۔

”نادر!..... وہ لوگ ہمارے قریب پہنچنے والے ہیں۔“ اچانک نگینہ کی ہراساں آواز مجھے خیالوں سے باہر نکال لائی۔ ”اوہ..... اب آگے بڑھنے کی بجائے ہمیں کہیں چھپنا ہوگا۔“

”یہ خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔“ میں نے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔ ”مگر اس طرح ہم دھر لئے جائیں گے۔ کیونکہ وہ لوگ تو اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ پھر ان کے پاس مشعلیں بھی ہیں اور ہم انجان ہیں۔ تم ہمت کرو، ہمارا چلتے رہنا ہی زیادہ سودمند ہے۔“

وہ میری بات پر چپ ہو گئی۔ پھر لمبے بھر بعد دوبارہ بولی۔ ”نادر! آخر یہ سب کیا ہے؟..... یہ کون سی جگہ ہے اور ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟..... میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“

”نگینہ! اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہیں سب بتا دوں گا۔ فی الوقت تو ہمیں ان سفاک لوگوں سے خود کو بچانا ہے۔“

”آہ.....“ اچانک نگینہ کے حلق سے بے اختیار کراہ خارج ہو گئی۔ اس کے نرم و نازک وجود کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ کسی اندھی کھائی میں گرنے ہی والی تھی۔ مگر چونکہ میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا اس

یہ بھول جاتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ کالا ناگ نے بڑے سفاکانہ لہجے میں اپنے جوڑی دار کبیر کو بھیاں کرائے دی تھی۔ فیصلہ کبیر کے ہاتھ میں تھا جو یقیناً ہمارے حق میں نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب نگینہ کو وہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس نے جیسے ہی کالا ناگ کے فیصلے پر صاد کیا، میں اپنے پستول کا رخ کالا ناگ اور کبیر وغیرہ کی طرف کر کے ٹرائیگر دبا دبا چلا گیا۔

ہال میں ابھرنے والی گولیوں کی بھیاں تک ترزاہٹ میرے ہی پستول کی نال سے برآمد ہوئی تھی۔ پہلی گولی کالا ناگ کی عین پیشانی پر لگی اور وہ آواز نکالے بغیر ہی بل کے بل واصل جہنم ہو گیا۔ جبکہ دوسری گولی کبیر کو لگی۔ وہ کرب ناک چیخ کے ساتھ تورا کر گرا تھا۔ باقی دونوں گر گئے بھی زخمی ہو کر لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے گئے تھے۔ میں نے خالی پستول پھینک کر دوسرا ابھرا ہوا پستول نکال لیا۔ ہال میں لوگوں کی وحشت ناک چیخیں ابھر رہی تھیں۔ ان لوگوں کو اپنے روحانی پیشوا عاروب کی جان کی فکر تھی۔ وہ خیریت جاننے کے لئے میری طرف مڑے تھے، مجھ پر اس وقت بری طرح خون سوار تھا۔ میں نے گرج دار آواز کے ساتھ انہیں دوبارہ دیوار سے جکڑے رہنے کا حکم دیا۔ نگینہ کے حلق سے بھی ہذیبانی چیخ ابھر رہی تھی۔ اب بظاہر میرے سامنے میدان صاف تھا۔ کیونکہ کالا ناگ کے دونوں گماشتے زخمی ہو کر فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ میں نے نگینہ کو ساتھ لیا اور عاروب کو ڈھال بنائے دروازے کی طرف پیش قدمی کا ارادہ کیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے مجھے چوتھے کے زینے والے اس سنگل پٹ کے دروازے کا خیال آیا جو میرے بائیں ہاتھ کے بالکل قریب تھا۔ ہو سکتا تھا ہال کے بیرونی دروازے کے ابھر کالا ناگ کے وہ دونوں زخمی گماشتے میری گھات میں بیٹھے ہوں اور میرے بیرونی دروازے سے باہر نکلتے ہی مجھ پر حملہ کر دیں۔ یہ سوچ کر میں نے زینے والے دروازے کا رخ کیا اور باہر نکل آیا۔

”نادر!..... ہوشیار۔“ اچانک نگینہ چلائی اور مجھے دھکا دیا۔ گولی چلنے کی آواز ابھری اور اس کے ساتھ ہی کبڑے عاروب کے حلق سے کرب ناک چیخ نکلی۔ نگینہ کے دھکا دینے سے نامعلوم سمت سے چلنے والی گولی کبڑے عاروب کے بدن میں اتر گئی۔ میں نے سمجھتے ہی آواز کی سمت دیکھا۔ وہ کالا ناگ کے ان دو زخمی گرگوں میں سے ایک تھا جس نے شاید کالا ناگ کا کچھ زیادہ نمک کھالیا تھا اس لئے اسے حلال کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ بروقت نگینہ کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ وہ عبادت گاہ کی جنوبی سمت کی دیوار کی آڑ سے اچانک ہی ابھرا تھا۔ میں نے زمین پر لوٹ لگا ہی اس کے دوسری بار گولی چلانے سے پہلے اس کا نشانہ لیتے ہوئے ٹرائیگر دبا دیا۔ وہ کریہہ چیخ کے ساتھ گرا تھا۔ کبڑا عاروب گولی کھا کر بری طرح ترپ رہا تھا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔

”بھو گنہ!“ میں زور سے چلا یا اور اس کا ہاتھ پکڑے دور تاریکی میں دوڑنا چلا گیا۔ ترپ کا پتہ جو ہماری زندگیوں کی ضمانت تھا، وہ میرے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ یوں بھی میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ مگر ہم ابھی خطرے میں بری طرح گھرے ہوئے تھے۔

میں اور نگینہ بے تحاشا دوڑے جا رہے تھے۔ ابھی ہم ذرا ہی دور گئے ہوں گے کہ ہمارے عقب میں ماؤزر کے دھماکے ابھرے۔ میں نگینہ کو لے کر فوراً ایک چٹان کی آڑ میں آ گیا۔ ہمارے سانس بری طرح پھولے ہوئے تھے۔ میں نے ذرا زک کر سر ابھارا اور عقب میں دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ مشعل بردار افراد کا پورا جلوس ہمارے تعاقب میں دوڑا چلا آ رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کالا ناگ کے اس ”نمک حلال“ کی چلائی ہوئی گولی نے کبڑے عاروب کا کیا بگاڑا تھا؟ وہ زندہ بھی تھا یا جہنم رسید ہو چکا تھا؟ لیکن بہر حال اسے گولی لگی تھی۔ اس کے پیروکار مسلح محافظ ہماری کابوئی کر ڈالنے کے لئے سخت مشتعل اور بے تاب تھے۔

اعلان کی سطح نامہوار تھی۔ میں اس کے رخنوں اور کہیں کہیں ابھرے نوکیلے پتھروں پر اپنے پاؤں ٹکائے بیچے رہا تھا۔ گنیز بھی اپنے تئیں بڑی چابک دستی اور ہوشیاری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ میں اگر اسپورٹس میں تھا تو ابھی اسپورٹس ویمن تھی۔ اسے بھی حالات کے مطابق خود کو ڈھالتا آتا تھا۔

گنیز کو سہارا دینے کا مقصد میرا یہ تھا کہ کہیں خوف و ہراس میں اپنا توازن ہی نہ بگاڑ لے اور ڈانٹا خوستہ نیچے ہی نہ لڑھک جائے۔

میں اب اوپری بلندی کی طرف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تاہم میں نے ہلکی آواز میں گنیز سے پوچھا کہ وہ ذرا اوپر دیکھ کر مجھے بتائے کہ ہمارے تعاقب میں نیچے اترنے والے ہم سے کتنی دوری پر ہیں۔ اس نے اوپر دیکھ کر مجھے بتا دیا۔ اگرچہ وہ ہم سے خاصے دور تھے لیکن ان کے نیچے آنے کی رفتار ہم سے ہمیں زیادہ تیز تھی۔ میں پن کر پریشان ہو گیا۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے نیچے سرکنے کی رفتار تیز کر دی۔ اس کوشش میں دو فی مرتبہ میرا توازن بگڑنے لگا تھا لیکن میں نے چابک دستی سے خود کو سنبھال لیا۔ یہ نہایت خطرناک صورت حال تھی۔ نیچے کھائی میں گرنے کا خدشہ الگ تھا تو اوپر ان چاروں دشمنوں کی آمد کا دھڑکا الگ۔

ٹھٹھرا دینے والی سردی کے ساتھ اب تو لہو کو رگوں میں جمادینے والی کاٹ دار ہوائیں بھی چلتا شروع ہو گئی تھیں۔ اس جاں گسل کوشش میں میرے ہاتھ پاؤں شل ہو چکے تھے اور زنجی بھی۔ میرے چہرے اور جسم پر خراشیں پڑ گئی تھیں۔ میرا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ اچانک میرے دونوں پاؤں خلا میں جھولنے لگے۔ میری روح فنا ہو گئی۔ میں اپنے دونوں پاؤں اب دوبارہ کیڑ نہیں سکتا تھا۔ پیروں سے ڈھلان کی سطح ٹپکتے ہی مجھے اپنا وجود ہوا میں مطلقاً محسوس ہونے لگا جس کی وجہ سے بوجھ کا احساس بڑھنے لگا۔ میری پیش قدمی رک گئی تھی۔

”کیا ہوا نادر؟“..... تم رک کیوں گئے؟..... دشمن قریب آرہے ہیں۔“ مجھے رکتا محسوس کر کے گنیز نے ہراساں لہجے میں کہا۔ میں نے اسے صورت حال کی نزاکت بتائی

”گنیز تم ذرا میرے کانڈھوں سے اپنے پاؤں ہٹا کر ڈھلان سے لگ جاؤ۔ میں ذرا اپنا زاویہ بدل کر ہر راستہ دیکھتا ہوں۔“

”نادر! اپنا خیال رکھنا..... کہیں تم نیچے.....“ اس نے اپنا جملہ دانستہ ادھر اور اُدھر جھوڑا تو میں نے کہا۔

”اللہ سے دعا کرو..... وہ ہمارے ساتھ ہے۔“ یہ کہہ کر میں اور ذرا نیچے سرکا کہ اچانک میرا دل خوشی کے احساس سے بیوں اُچھل پڑا۔ میرے دونوں پاؤں ڈھلائی سطح سے ٹکرائے تھے۔ تب مجھے ایک خوش آئند احساس ہوا کہ میرے پیر وہاں کی غار کے دہانے میں تھے۔ میں ذرا سامنے بید سرکا۔ میرے دونوں پیر اب تک چکے تھے۔ وہ واقعی کوئی اندھیری گچھا تھی۔ میں نے گنیز کو ہولے سے آواز دے کر نیچے سرکنے کا کہا۔ وہ نیچے اترنے لگی۔ میں نے دونوں ہاتھ بلند کر لئے۔ پھر جیسے ہی اس کی دونوں ٹانگیں فضا میں جھولنے لگیں، میں نے انہیں تھام لیا اور پھر دھیرے دھیرے گنیز نے اپنا وجود میرے بازو پر ڈھیلا جھوڑ دیا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے آہستگی سے اسے خلا میں اتارا اور اندھیری گچھا ٹول کر معائنہ کرنے لگا۔ گچھا زیادہ گہری نہیں تھی۔ اس کا دہانہ اگرچہ قدرے وسیع تھا مگر اندر سے چھ سات فٹ سے زیادہ گہرائی نہ تھی۔ میں نے گنیز کو اندر ایک کونے میں آرام سے بٹھا دیا اور خود گچھا کے سرے پر آکر اوپر بلندی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ چاروں مشعل بردار دشمن پہاڑی مکڑوں کی طرح تیزی سے نیچے آرہے تھے۔ ان کا رخ بھی ہماری گچھا کی طرف تھا۔ میرا ذہن اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے تیزی سے کام کر رہا تھا۔ تب یکبارگی پھر سے ذہن میں ایک خیال ابھرا اور میں چونکنا ہو کر گچھا کے سرے میں کھڑا ہو گیا۔

لئے فوراً اسے گرنے سے بچاتے ہوئے غیر ارادی طور پر اپنے سینے سے لگا لیا۔

ان نامساعد حالات میں اس کے نرم گرم جسمانی قرب نے میرے اندر عجیب سی سرشاری گھول دی۔

”نادر! مجھے چھوڑنا مت۔“ یہ جملہ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

”پاگل! بھلا اپنی روح اور اپنی زندگی کو کبھی کوئی چھوڑتا ہے؟“ میں نے محبت پاش لہجے میں کہا۔ اپنے عقب میں آوازوں کا شور بہت قریب سے سنائی دینے لگا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، روشنی کا سیلاب سا اندر پڑا تھا۔ وہ لوگ یقیناً ہم سے بہت قریب آگئے تھے۔ ان کی نظریں ہم پر پڑ گئی تھیں۔ اسی وقت وادی کا سکوت ماؤز کی گرج دار آواز سے ٹوٹ گیا اور میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ خود کو گنیز سمیت نیچے گر دیا اور پھر جیسے ہم دونوں کسی گہری کھائی کی ڈھلان پر لڑھکتے چلے گئے۔ گنیز کے حلق سے اضطرابی انداز میں ہسٹریائی چیخیں بلند ہوئیں۔ میں نے لڑھکنے کے دوران خود پر قابو پانے کی کوشش کی، لیکن جلد ہی مجھے محسوس ہو گیا کہ ڈھلان زیادہ عمودی نہیں تھی بلکہ خاصی حد تک افقی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک جھاڑی میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے اسے ایک ہاتھ سے دبوچ لیا۔ گنیز میرے سر پر لڑھکتی چلی آ رہی تھی۔ میں نے اس کے وجود کو دوسرے ہاتھ سے روک لیا۔ وہ بری طرح ہانپنے لگی۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”گنیز! ہمت مت ہارنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ کھائی زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہمارے لئے پناہ گاہ ثابت ہو سکتی ہے۔“

گنیز نے میری بات پر ہولے سے سر ہلا دیا۔ میں نے ذرا اوپر سر اٹھا کر دیکھا۔ ہم خاصی گہرائی میں لڑھک آئے تھے۔ نیچے اتھاہ گہرائیاں ہولناک تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ یہ کھائی بہت وسیع رہتے پر پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے بلندی پر شور سنائی دیا۔ میں اور گنیز ڈھلان سے چپک گئے۔ میں نے دیکھا، کھائی کے سرے پر ان مشعل بردار افراد کے ہیولے متحرک تھے۔ ان میں کئی نیچے جھک کر مشعل کی روشنی ڈالنے لگے۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں نے گنیز سے کہا۔ ”گنیز! اسی طرح چپکی پڑی رہو۔ حرکت مت کرنا۔ وہ لوگ بلندی سے جھانک رہے ہیں۔“ وہ خاموش رہی۔ تاہم اس نے میری بات سن لی تھی۔ کئی لمحے ہم یونہی بے حس و حرکت گچھے دار جھاڑیاں اپنے ہاتھوں کی مٹھی میں پکڑے دم سادھے چپ رہے۔ تاہم میری نظریں بلندی پر کھائی کے سرے پر جمی ہوئی تھیں۔

پھر معاویہ ہوا، جس کا مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ میں نے چار عدد مشعل برداروں کو ڈھلان میں اترتے دیکھا۔ وہ شاید ہمارے نیچے گرنے کی اچھی طرح تسلی کرنا چاہتے تھے۔ اب ہمارا اس مقام پر جے رہنا مناسب نہ تھا۔ میرے پاس اگرچہ دو پستول تھے اور فاضل راؤ نڈز بھی تھے مگر بہر حال ان کی تعداد عدد دہائی جبکہ دشمنوں کی تعداد خاصی کثیر تھی۔ میں ان پر فائرنگ کر کے انہیں اپنے پیچھے نہیں لگانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے گنیز سے کہا۔

”گنیز! دشمنوں کے چند آدمی نیچے آرہے ہیں۔ ہمیں مزید گہرائی میں اترنا ہو گا۔ تم ایسا کرو، اپنے دونوں پاؤں میرے کانڈھوں پر ٹکا دو۔ ہاتھوں کی مدد سے میرے ساتھ ساتھ نیچے اترنے کی کوشش کرو۔“

”اُل!..... لیکن نادر!..... تم.....“

”گنیز! یہ وقت بحث کا نہیں ہے۔ جیسا میں کہہ رہا ہوں، ویسا کرو۔ جلدی۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”وہ ابھی دور ہیں۔ ہم ان سے پہلے نیچے پہنچ جائیں گے۔“

گنیز نے ایسا ہی کیا۔ اس نے ڈھلان سے چپکے چپکے اپنے جسم کا زاویہ بدلا اور اپنے پاؤں میرے کانڈھوں پر ٹکا دیئے۔ پھر میں نے ڈھلان کا سہارا لیتے ہوئے دھیرے دھیرے نیچے سرکنا شروع کر دیا۔

روشنی قریب آتی جا رہی تھی۔ اچانک پھر وہی ہوا جس کا میں منتظر تھا، گھمبھار کے خلا میں اوپر سے دو ٹانگیں نیچے جھولتی نظر آئیں۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ان دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر ایک زوردار جھٹکے سے اپنے اس طرح کھینچا کہ دشمن چنٹا چلا تا ہوا نیچے گہری تاریکی میں گرنا چلا گیا۔ باقی تینوں دشمنوں کو جیسے سائب سوئچ لگا گیا۔ وہ اپنی جگہ پر رک گئے تھے۔ میں نے یہ کام اس قدر ہوشیاری اور چالاکدستی سے کیا تھا کہ وہ الجھ کر ہی رہ گئے تھے کہ آخر ان کے ساتھی کے ساتھ ہوا کیا تھا۔ پھر جیسے وہ اسے ایک اتفاقی حادثے پر محمول کر کے پھر نیچے سرکنے لگے۔

دو دشمن گھمبھار سے دور تھے جبکہ ایک گھمبھار کی بلندی کے سرے پر تھا۔ پھر جیسے ہی اس کی جھولتی ہوئی ایک ٹانگ نظر آئی، میں نے بہ سرعت اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹانگ پکڑ کر اسے زوردار جھٹکا دیا۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ وہ چنٹا چلا تا ہوا نیچے تاریکی میں جا گرا۔ مگر اس بار کی میری حرکت چھپی نہ رہ سکی۔ گھمبھار کی داہنی جانب نیچے سرکنے والے دو مشعل بردار دشمنوں کو فوراً احساس ہوا کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ دال میں کچھ کالا تھا۔ وہ ان دشوار گزار راستوں کے عادی تھے اور بڑے چچ گزر گاہوں سے آگاہی بھی رکھتے تھے۔ انہیں جیسے ہی میری سمت کا اندازہ ہوا، انہوں نے گھمبھار کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ میں اب محتاط ہو گیا تھا اور ان سے دوسرے طریقے سے نمٹنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً پستول نکال کر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا اور گھمبھار کے دائیں سمت والی پتھریلی دیوار کی آڑ سے جا لگا۔ پھر ذرا سر ہمار کر دیکھا تو یکدم میں نے اپنا سر اندر کر لیا۔ میں نے ایک دشمن کو اپنی مشعل گھمبھار کی طرف پھینکتے دیکھا تھا۔ پہلے تو میں اس کی اس حرکت کا مطلب نہیں جان سکا۔ مشعل جب گھمبھار کے سین سرے پر گری اور پوری گھمبھار اندر تک روشنی میں نہا گئی تو میں اس کی چالاک بھانپ کر سن ہو گیا۔ یقیناً ان کی نگاہوں میں ڈھلوانی گھمبھار آچکی تھی۔ میں نے مشعل کی روشنی میں مڑ کر گھمبھار کی طرف دیکھا۔ وہ ایک کونے میں سکڑی سٹی بیٹھی تھی۔ میں نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش بڑے رہنے کا اشارہ کیا اور پھر پستول پکڑے دم سادھے دیوار کی آڑ سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ دفتہ ماؤزر چلنے کی گرج دار آواز ابھری۔ میں بری طرح دھل کر رہ گیا۔ گولیوں کے شیل گھمبھار کی سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر ادھر ادھر گرے۔ گھمبھار اضطراری انداز میں چلائی۔

اچانک سناٹا چھا گیا۔ میرا دل جیسے یکبارگی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ پھر معافی ایک پُر غیظ، جوش بھری آواز میری ٹھٹھی ہوئی ساتھیوں سے ٹکرائی۔

”وہ دونوں اس گھمبھار میں موجود ہیں..... تم دوسری سمت سے آگے بڑھو۔“ ایک دشمن نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا تھا۔

میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی۔ وہ دونوں اطراف سے اب گھمبھار کے اندر داخل ہونے کا منصوبہ بناتے ہوئے تھے۔ ممکن تھا کہ وہ اس طرف پیش قدمی بھی شروع کر چکے ہوں۔ یہ سوچتے ہی میں پہلے سے زیادہ چوکنا ہو گیا۔ ایک دشمن کی پھینکی ہوئی مشعل گھمبھار کے سرے پر گری تھی اور محدود ماحول کو روشن کئے ہوئے تھی۔ اب میں دیوار کی آڑ سے سر ابھار کر دشمنوں کی حرکات و سکنات کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرح گھمبھار میں ہونے والی روشنی کی وجہ سے میں تو انہیں دیکھنے سے قاصر تھا جبکہ وہ میری ذرا سی جھلک واضح طور پر دیکھ سکتے تھے۔ میں بری طرح محبوس ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک ایسی جگہ میں لگا جیسے یہ گھمبھار ہمارے لئے چوہے دان بن گئی ہو۔ میں نے جلدی سے گھمبھار کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ مجھ سے چٹ گئی۔ خطرے کو محسوس کرتے ہی اس کا نرم و نازک جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح کا پتہ لگا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور اپنے عقب میں کر لیا۔ میں گھمبھار کے سرے پر کھڑی جلتی ہوئی مشعل کو بھی اٹھ

کر نہیں پھینک سکتا تھا۔ اس طرح مجھے کھلے حصے کی طرف آنا پڑتا اور کوئی بعید نہیں، دشمن نے اسے اپنا ٹارگٹ ہار کھا ہو۔ بہر طور..... اب میں گھمبھار کے ایک سرے پر کھڑا تھا اور دوسرے سرے پر بھی نظریں جمائیں تھیں۔ اب مجھے دشمن کی طرف سے یہ خطرہ تھا کہ اگر وہ بیک وقت گھمبھار کے دونوں سروں پر ابھرے تو صورت حال ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ پھر بھی میں اپنے طور پر پوری طرح محتاط اور مستعد کھڑا تھا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر اچانک مجھے سامنے والے سرے پر کسی کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سانس روک لی۔ ایسی ہی آہٹ مجھے اپنے ساتھ والی آڑ سے بھی سنائی دی۔ میرا دم خشک ہونے لگا۔ دونوں دشمن بہت مکاری اور چالاکي سے ہمیں گھیر کر گولیوں سے بھون ڈالنے کو بے تاب تھے۔ میں نے بھی ہونٹ بھیج کر خود کو ان سے مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح سے تیار کر لیا تھا۔

میں گھمبھار سمیت چند قدم ذرا پیچھے کو سر کر گیا تھا۔ اب اگرچہ میں دونوں دشمنوں کے ٹارگٹ پر آ گیا تھا مگر اس طرح میں نے بیک وقت گھمبھار کے دونوں سروں پر اپنی نظریں بھی جمائیں تھیں۔

پھر اچانک ہی مجھے سامنے والے سرے پر ماؤزر کی ہیمیاٹک ٹال نظر آئی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور مہیب ٹال کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا۔..... گولی چلنے کا دھماکا ابھرا اور میں نے ماؤزر کو تارکی میں آؤتے دیکھا۔ ٹھیک اسی وقت میرے ساتھ والی آڑ سے دشمن کا دوسرا مسلح ساتھی درانہ وار آگے بڑھا۔ گھمبھار کی خوف سے چیخ نکلی گئی۔ وہ جوش غیظ میں آ کر میرے سامنے آ گیا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر گولی چلاتا، میں نے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اس کے سینے میں پھونک ہو گئی اور وہ مکروہ چیخ کے ساتھ واڈی کی تاریک گہرائیوں میں گرنا چلا گیا۔ دوسرا دشمن نہتا تھا۔ میں جلدی سے دوسرے سرے کی طرف بڑھا اور ذرا ابھر کر دوسرے دشمن کو دیکھنا چاہا۔ اچانک میرے پستول والے ہاتھ پر زور سے ایک پتھر لگا۔ مارے تکلیف کے میرے حلق سے کراہ خارج ہو گئی اور پستول نیچے کھائی میں جا گرا۔ پتھر یقیناً گھات میں بیٹھے ہوئے میرے دشمن نے ہی اچھا لگتا تھا۔ اس نے بھی مجھے نہتا کر دیا تھا۔ میں نے اپنے میکار دو ٹوک لٹنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہی میرا دشمن اچھل کر میرے سامنے آ گیا اور مجھے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ مجھے بھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورے جا رہا تھا اور میں اسے جارحانہ نظروں کے حصار میں لئے ہوئے تھا۔ وہ دانت کچکا جا رہا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے وحشتانہ غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جھپٹا۔ میں نے فوراً جھکائی دی۔ وہ اپنی جھونک میں آگے نکل گیا۔ میں نے اسے تنہیلنے کا موقع دینے بغیر پھرتی سے اٹھا کر گھمبھار کی پتھریلی زمین پر پٹخ دیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ خاصی بلند تھی۔ وہ وحشی انسان تھا۔ ضرور طاقت رکھتا تھا۔ مگر اس کا استعمال اسے نہیں آتا تھا۔ لہذا وہ میری چال سمجھے بغیر ایک بار پھر غراتا ہوا میری طرف لپکا۔ گھمبھار کا یہ حصہ اتنا زیادہ کشادہ نہ تھا کہ میں پینترے بدلتا۔ مختصر حصے میں رہتے ہوئے ہی مجھے اس وحشی انسان پر قابو پانا تھا۔ یہ کڑے عاروب کے مقرنین خاص میں سے ایک تھا۔ مگر لگتا تھا کہ یہ لوگ صرف اسلحہ ہی چلانا جانتے تھے۔ وہ دودھ بھی کسی کے ساتھ نیچہ آزمائی نہ کی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ایک بار مار کھانے کے باوجود دوبارہ اندھا ہند میری طرف لپکا تھا۔ اس بار میں نے فیصلہ کن قدم اٹھانے کا ارادہ کیا۔ پھر جیسے ہی وہ میرے قریب آیا، میں اس سے بھڑ گیا اور سر کی زوردار ضرب اس کی ناک پر رسید کر دی اور ساتھ ہی دائیں ٹانگ کا گھٹنا اس کے پیٹ پر رسید کر دیا۔ وہ اونگ کی غراہٹ سے مشابہہ آواز کے ساتھ رکوع کے بل جھکا۔ اور میں نے وہی گھٹنا دوبارہ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ پھر اس کی گردن اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ کراکے کی آواز ابھری اور اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ جون ہی اس نے ہاتھ پاؤں وھیلے چھوڑ دیئے، میں نے بھی اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ دھب کی آواز سے گرا۔

میں جلدی سے گھماہ کے سرے پر آیا اور بلندی کی طرف سراٹھا کر دیکھا۔ مشعلوں کی روشنیاں ہنوز نظر آ رہی تھیں۔ پھر مجھے تشویش نے آن گھیرا۔ وہ شاید اپنے ان چاروں ساتھیوں کے منتظر تھے جو میرے ہاتھوں جہنم رسید ہو چکے تھے۔ اب گھماہ میں ہمارا زیادہ دیر موجود رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ میں نے مشعل اٹھا کر نیچے گہرائی میں جھانکا۔ گھماہ کے نیچے کی ڈھلان خاصی سہل تھی۔ میں نے نگینہ کو لیا اور ایک لمبے خالص کئے بغیر دوبارہ پہلے کی طرح ہم دونوں دھیرے دھیرے نیچے گہرائی میں سرکنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ بلندی پر موجود کبڑے عاروب کے مشعل پیردار جب اپنے چاروں ساتھیوں کی واپسی سے مایوس ہو جائیں گے تو ضرور ان میں کوئی نیچے پیش قدمی کرے گا۔ بلکہ کوئی بعد نہ تھا کہ وہ سارے ہی نیچے کو آنے لگتے۔

میں نے جلتی ہوئی مشعل نیچے پھینک دی۔ پھر اسے بہ غور نیچے لڑھکتے دیکھتا رہا۔ وہ محض ستراسی فٹ کی گہرائی کے بعد کھائی کی پتھری بنا ہوا زمین سے ٹکرائی تو مجھے کھائی کی کم گہرائی کا اندازہ ہوا۔ نیچے خوردو جھاڑیوں کی خاصی بہتات تھی۔ جلتی ہوئی مشعل سے جھاڑیوں نے آگ پکڑ لی۔ اب کھائی کا اندرونی حصہ خاصا منور ہو گیا تھا۔ میں نے اور نگینہ نے اب تیزی سے نیچے سرکش شروع کر دیا۔ خاصی دیر بعد ہم کھائی کی تاہوار پتھریلی زمین تک پہنچ گئے۔ ہم دونوں ہی ہانپ رہے تھے۔

میں نے مشعل اٹھائی اور گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ کھائی خاصی طویل، کسی گہری نہر کی مانند آگے سے بل کھاتی جا رہی تھی۔ میں نے نگینہ کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گیا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے تک بھی چلنے اور کبھی سستانے کے بعد بالآخر مجھے ایک دراڑی نظر آ گئی۔ یہ ایک ”آدم گرازا“ دراڑ تھی۔ خاصی چوڑی تھی۔ ایسی دراڑیں عموماً زلزلوں یا جغرافیائی فطری تغیر کا نتیجہ ہوتی ہیں جس سے از خود تنگ و تاریک گزرگاہیں بن جایا کرتی تھیں۔

یہ بھی ایک پہاڑی علاقہ تھا جس کا بیشتر حصہ برف سے ڈھکا رہتا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ دراڑ ہمیں کہاں پہنچاتی ہے؟..... ایک خیال یہ بھی آتا تھا کہ دراڑ آگے سے بند بھی ہو سکتی تھی۔

اچانک نگینہ نے ہراساں آواز میں کہا۔ ”نادر! وہ..... وہ دیکھو، وہ لوگ نیچے آرہے ہیں۔“ اس کا اشارہ بلندی کی طرف تھا۔ میں نے اشارے کی سمت سراٹھا کر دیکھا اور بری طرح ٹھٹکا۔ بلندی پر موجود مشعل برداروں کا پورا جلوس نیچے کھائی میں اتر رہا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، نگینہ کا ہاتھ پکڑا اور دراڑ کی طرف بڑھ گیا۔

”یہ تو قبر کی طرح تاریک ہے نادر!..... اس میں کیسے داخل ہوں گے ہم؟“ نگینہ نے میرے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے گویا میرا ارادہ بھانپ کر کہا۔

”نگینہ! اس وقت یہی قبر ہمیں پناہ دے سکتی ہے۔ ورنہ یہ ہمارا برا حشر کر کے رکھ دیں گے۔ آؤ چلو۔“ میں نے کہا اور ہم دونوں دراڑ میں داخل ہو گئے۔ ذرا دور تک تو دراڑ سیدھی رہی، مگر پھر وہ ترچھی ہو گئی۔ بلکہ کہیں کہیں سے اس قدر تنگ ہو گئی کہ بہ مشکل میں اور نگینہ ایک ایک کر کے گزر پاتے۔ لگ بھگ کوئی نصف گھنٹے بعد ہم دوسری جانب ابھرے اور میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

سامنے بڑا دلربا منظر تھا۔ وسیع و عریض رہنے پر پھیلی ہوئی پیالہ نما وادی تھی جو برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ آسمان صاف ہو چکا تھا جس پر نکلے مکمل چاند کی روشنی نے پوری برف پوش وادی کو منور کر رکھا تھا۔ ہر طرف طلسماتی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ ہم وادی کے اندر موجود تھے۔ نگینہ بری طرح تھک کر چور ہو رہی تھی۔ خود مجھے بھی کافی تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔

ہمیں اپنی منزل کا کچھ علم نہ تھا۔ بس ایک دھن سر پر سوار تھی کہ کبڑے عاروب کے خون آشام

دھاروں کی پہنچ سے جس قدر ممکن ہو سکے، دور نکل جائیں۔

”نگینہ! پلیز، تھوڑی اور ہمت کر لو۔ ہمیں اس وادی سے نکلنا ہو گا۔“ میں نے نگینہ کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے محبت پاش لہجے میں کہا۔

”نادر! تم نے میری خاطر بہت صعوبتیں اٹھائی ہیں۔ لیکن پلیز! مجھے یہ تو بتا دو کہ آخر یہ سارا کیا بھید ہے؟“ اس نے بڑے رसान سے ملتیانہ لہجے میں کہا تو میں نے ایک گہری ہکاری بھر کر اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ حیرت زدہ سی رہی۔ ساری کہانی سنی رہی، پھر ایک ایک اس کے چہرے سے ساری ٹھکان اور کٹھن مسافروں کی باتیں غائب ہو گئیں اور اس کی جگہ فطری شوخی اور زندہ دلی نمودار آئی۔

”نا قابل یقین..... حیرت انگیز.....“ وہ تحیر خیز لہجے میں بولی۔ ”نادر! تم نے واقعی محبت کی لاج لی۔ اگر..... اگر تم آج میری خاطر یہ سب نہ کرتے تو میں..... میں شاید ہمیشہ کے لئے اندھیروں میں ہو جاتی۔ آہ، نادر!..... میں کس قدر خوش قسمت ہوں۔ میں..... میں دنیا کی خوش نصیب ترین لالہ ہوں کہ مجھے تم جیسے سچی محبت کرنے والے شخص کا ساتھ میسر آیا۔“ وہ جیسے عالم سرشاری میں یہ کہتے ہوئے میرے سینے سے لپٹ گئی۔

میں نے بھی جیسے اسے دھور جذبات سے بھینچ لیا۔

”نادر! آئی لو یو..... آئی لو یو ٹوچ۔“ وہ جیسے میرے اندر جذب ہو کر عالم بے خودی میں بولی۔ ”آئی لو یو ٹو ٹیگنہ!..... آئی لو یو ٹو۔“ میں اس کے ریشمی گھنیرے بالوں پر اپنے لب ترساں رگڑتے ہوئے دل و جان کی گہرائی سے بولا۔ گہرائی سے نکلتے ہوئے الفاظ گہرائی میں ہی اترے تھے۔ اور یہی سبب بلکہ ہم دونوں خاصی دیر تک وہیں پتھریلی زمین پر باہم پیوست کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ نگینہ کی فطری بے اپوری شد و مد کے ساتھ لوٹ آئی تھی۔ اس نے بے اختیار میرے ہونٹوں پر بوسہ دے ڈالا۔ میں اس کی بے دیکھ کر ہولے سے مسکرا دیا، پھر دھیرے سے بولا۔

”چلو اٹھو!..... آگے بڑھتے ہیں۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے مڑ کر دراڑ کی طرف نظر ڈالی۔ کچھ ایسا لگتا تھا جیسے ہم اس بار دشمن کو نکلنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ لیکن باوجود اس کے میں اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ آہ تک پھیلے ہوئے اس برف زار میں کوئی نہ کوئی آبادی مل ہی جائے گی اور میں وہاں سے کسی راستے کی پابستاداری کی طرف نکلنے کی کوشش کروں گا۔ اگرچہ میرے پاس اب برائے نام ہی رقم رہ گئی تھی لیکن یہ بعد کا تھا۔ کیونکہ اس کے بارے میں بھی میں نے کچھ سوچ رکھا تھا۔ خاصی دیر سستانے کے بعد ہماری ٹالوٹ آئی تھی اور ہم دونوں تیز تیز قدموں سے ذرا سنبھل کر آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔

دیکھنا تک برف پھیلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں روئیدگی اور خوردو جھاڑیاں بھی تھیں۔ سردی بھی کافی بڑھ رہی اس میں کاٹ نہیں تھی، ایک خوشگوار تھی۔ میں اور نگینہ اسی طرح چلتے رہے۔ تنگ گھاٹیاں، ٹھہری ایل، چٹائی دروں اور دشوار گزرا راستوں اور گزرگاہوں سے ہوتے ہوئے اس پیالہ نما وادی کو بھی پار کر کے اب ہمارے اطراف میں سر بفلک برف پوش پہاڑیاں تھیں۔ دشمنوں کی حدود سے نکل آنے کی تسلی ہو مجھے اب ایک نئی تشویش نے آن گھیرا تھا۔ ہمیں جلد از جلد اس ویران اور سرد جہنم سے نکلنا تھا جہاں غورا کا آسرا نظر آرہا تھا اور نہ ہی پانی کا کوئی وسیلہ۔ کیونکہ اس بریفے موسم میں چشمے اور جھرنے بھی برف بن جاتے تھے۔

اپنی دور نکل آنے کے بعد ہم پھر ایک جگہ پر بیٹھ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نگینہ کو بری طرح نیند نے ستایا

ک کو سدھارنے میں چنداں دینہیں لگی۔ وہ بڑے آرام سے ہمیں اپنی پشت پر بٹھائے ایک راستے پر اڑتا تھا۔

”نادار! مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“ معانگینہ نے مجھ سے کہا۔ اسے یقیناً بھوک بھی لگی ہوگی۔ لیکن پیاس مدت نے شاید اسے زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ میں نے ملاحت سے کہا۔

”ذرا برداشت کر لو..... شاید کوئی چشمہ یا ندی دکھائی دے جائے۔“

”نادار! مجھے تو اس جانور سے بھی ڈر لگ رہا ہے۔ اگر اس نے بدک کر ہمیں گرا دیا تو؟“ عکینہ نے اپنے ٹٹے کا اظہار کیا۔ میں نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

”حوصلہ رکھو۔ ایسا نہیں ہوگا۔ یہ بہت امن پسند اور انسان دوست جانور ہے۔“

وہ میری تشفی پر چپ ہو گئی۔ میں یاک کی گردن کے لیے لمبے بال پکڑے ہوئے اسے اپنی مرضی سے ایک راستے پر لے جا رہا تھا۔ عموماً یہ جانور خاصی بلندی پر ہوتے ہیں۔ لیکن شاید بھوک اور رات بھر ہونے برف باری، خوراک کی کمیابی کا باعث بنی تھی جس نے اسے نیچے ترانیوں میں آنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

ہمارا یاک پر سفر جاری تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اپنے اطراف میں بھی نظریں دوڑاتے جا رہا تھا کہ کوئی خطر آجائے۔ یا پھر کسی آبادی کے آثار بھی دکھائی دے جائیں۔ مگر ہنوز کوئی امید بر نہ آئی۔ حتیٰ کہ ہمیں پر سفر کرتے کرتے ایک گھنٹے سے بھی زیادہ وقت بیت گیا۔ لیکن ان برف زاروں میں مجھے کسی بھی ہاکے آثار تک نظر نہ آئے۔ میں ایک اندازے کے تحت یاک کو ہٹاتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ پھر مزید گھنٹہ اور بیت گیا۔ اب تو ہمارے جسم بھی یاک کی پشت پر بیٹھے بیٹھے شدید اکڑن کا شکار ہونے لگے۔ بیزار، کوفت اور مایوسی نے ہم پر شدت کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ہم کب تک مرتے ویرانوں میں در بدر پھرتے رہیں گے۔ یہ سرد جہنم تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ سورج ہمارے سروں پر چمک رہا تھا اور پہاڑوں سے برف رفتہ رفتہ پکھلنے لگی تھی۔ پانی کا مسئلہ حل ہوتا نظر آیا تو نے یاک کو روک دیا۔

ایک جانب بیٹھتے پھرنے کا جلتنگ سا شور سنائی دیا۔ میں اور عکینہ یاک کی پشت سے اتر گئے۔ اچانک نے زور زور سے خرخرانا شروع کر دیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، وہ بھی بری طرح بے چین رہا تھا۔ میرا دل ایک لرزہ خیز خیال سے کانپ اٹھا۔ پھر دفعۃً مجھے آس پاس کئی خونخوار غراہٹوں کی آواز دی۔ خوفناک غراہٹوں کی آواز قریب سے ہی سنائی دی تھی۔ اور شاید یاک کی بے چینی کی وجہ بھی یہی تھی۔ ان نے مذکورہ سمت دیکھا، آوازیں میرے دائیں جانب سے آتی محسوس ہوتی تھیں۔ مذکورہ سمت ٹنڈ منڈ اڑیوں کی اوٹ سے مجھے دو قد آور بھیڑیے نظر آئے، جو اپنے خوفناک جبرے کھولے ہماری طرف ہوئے غرارے تھے۔ ان کے بڑے بڑے دونوں کیلے شکاری دانتوں کی جھلک صاف نمایاں تھی۔ وہ یوں نئے تھے جیسے کسی پل بھی ہم پر حملہ آور ہونے والے ہوں۔ عکینہ کے حلق سے متوحش چیخ کی خارج ہو رہی تھی۔ میں نے عکینہ کو دھکی سرگوشی میں خاموش رہنے کا کہا۔ میری شکاری حیات یکدم بیدار ہو گئی تھیں۔

ک اپنی جگہ اسی مقام پر کھڑا کھڑا رہ گیا تھا۔ میں اور عکینہ بدستور اس کی پشت پر سوار تھے۔ ان دونوں بھیڑیوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ دونوں نہ، مادہ تھے اور غالباً ہماری ”فضل در ماسعولات“ نے ڈسٹر ب“ کر ڈالا تھا۔ میں نے یاک کی پشت پر بیٹھے بیٹھے ہوئے سے ہاتھ پھیرا اور اس کا راستہ بدل مری سمت ہو لیا۔ میں نے اب ان دونوں بھیڑیوں کی طرف سے دانستہ نظریں ہٹا لی تھیں۔ تاہم مان کی غراہٹوں پر لگی ہوئی تھیں جواب ہمیں سمت بدل کر جاتا دیکھ کر معدوم ہونے لگی تھیں۔

ہوا تھا۔ رات بھی اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ چاند بھی کہیں جھپک چکا تھا۔ آسمان پر البتہ چمکتے تاروں کی فوج ظفر موج نظر آتی تھی جس سے کسی حد تک ارد گرد کا منظر واضح ہوتا تھا۔ میں ایک گھنٹی خود رو جہاز یوں کا سلسلہ دیکھ کر وہاں رک گیا۔

یہ پہاڑی کے ساتھ والا ایک مختصر سطح قطعہ اراضی تھا جہاں خود رو جہاز یوں اور جنگلی پودوں کی بہتات تھی۔ میں پہاڑی سے پشت نکا کر بیٹھ گیا تھا اور عکینہ کا سر اپنی گود میں رکھ کر اسے سلا دیا تھا۔ ہر سو ٹھنڈا دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اطراف کا منظر پر اسرار سی ویرانی اور سنائے میں بہت ہولناک نظر آ رہا تھا۔ عکینہ میری گود میں اپنا سر رکھتے ہی سو گئی تھی۔ میں نے بھی اپنا سر چٹائی دیوار سے نکا کر ذرا دیر کو آنکھیں موند لی تھیں اور پھر اسی طرح پڑے پڑے مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب میری آنکھ لگ گئی۔

\*\*\*

اچانک میری آنکھ ایک عجیب سی خرخراتی آواز پر کھلی اور نظریں ایک بھاری بارکھم یاک (YALK) پر پڑیں جو ہمارے قریب ہی جہاز یوں پر اپنا تھو تھنا دے بڑے مزے سے چر رہا تھا۔ میں اسی طرح اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ صبح ہو چکی تھی۔ بلکہ خاصا دن نکل آیا تھا۔ تھکن اور بے آرامی کی وجہ سے شاید ہم کافی دیر تک سوئے رہے تھے۔ عکینہ بھی ابھی اسی طرح میرے زانو پر سر رکھے گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ دھوپ چاروں طرف اس برف زار میں پھیل چکی تھی۔

اپنے قریب ہی اس بھاری بھر کم یاک کو بے فکری سے چرتا ہوا دیکھ کر میرے ذہن طباع میں اچانک ایک خیال اُبھرا تھا۔ اس دشوار گزار وادی میں یہ ہمارے لئے بہترین ”سواری“ کا کام کر سکتا تھا۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے بہت آہستگی سے عکینہ کا سر اپنے زانو سے اٹھا کر زمین پر نکالیا، پھر ایک ہاتھ سے جہاز یوں اور جنگلی پودوں کا کچھا توڑ کر اس کا موٹھ بنایا اور یاک کی طرف کر کے اسے دھیرے سے پکچارا۔

میرے پکچارنے کی آواز سے وہ تھوڑا سا بدکا اور پھر ڈر کر ذرا ڈور کھسک گیا۔ مجھے مایوسی ہوئی مگر پھر اسے ذرا دور تھک کر دوبارہ کھڑے ہوئے دیکھ کر میرے اندر پھر امید جاگی۔ وہ شاید ابھی تک سیر نہیں ہوا تھا۔ وہ گہرے سرخی رنگ کا تھا اور اس کا بھاری بھر کم جسم گھنے لائے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پاؤں (کھر) اس کے بہت پتلے پتلے تھے۔ وہ اپنی موٹی موٹی اُبھرواں ڈیلیوں والی آنکھوں سے میری جانب یک یک نگے کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے ذرا حرکت کی اور پھر اپنے موٹے موٹے نتھنوں سے خرخراتی آوازیں نکالتا ہوا دھیرے دھیرے میری جانب بڑھنے لگا۔ میرا دل خوشی سے لمبوں اچھلنے لگا۔ میرے قریب آ کر اس نے اپنے خرخراتا ہوا تھو تھنا بڑھا دیا اور میرے ہاتھ میں پکڑی موٹھ پر منہ مارنے لگا۔ میں نے بھی ذرا جسارت کی اور اس کے تھو تھنے کو پیار سے سہلانے لگا اور کھڑا ہو گیا اور اسے جنگلی پتے اور جہازیاں توڑ ڈر کھلاتا رہا۔ اب میں اس کے بالوں سے ڈھکی ہوئی پشت کو بھی سہلانے لگا۔ وہ میری طرف سے اب بالکل بے فکر ہو کر چلنے لگا۔ میں نے ہولے سے عکینہ کو آواز دی۔ وہ بھی اس کھڑ پٹر سے جاگ سی گئی۔ پھر مجھے ہنگامہ پڑی تو میں نے اسے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد میں نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے میرے قریب آئی۔ میں نے اسے سرگوشی میں اپنا مقصد سمجھایا، پھر اسے اٹھا کر بھارا بھر کم یاک کی پشت پر لا دیا اور خود بھی اچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔ وہ یاک تھوڑا سا کسایا تھا پھر میں اسے گردن پر ہلکی سی تھپکی دی تو وہ از خود ایک طرف چل دیا۔

ماموں حیدر گل (مرحوم) کے ساتھ میں بارہا جنگل اور ایسے علاقوں میں شکار وغیرہ کے لئے جایا کرتا تھا۔ مجھے جنگلی جانوروں کی فطرت سے واقفیت تھی اور مجھے انہیں ”سدھارنا“ بھی آتا تھا۔ اس لئے

وئے بغیر کھر کھر اچھیرنے میں مگن تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے پہلے سلام کیا۔ اس نے میرے سلام کا واب تو نہ دیا البتہ اپنے خچر کی پشت پر کھر کھر اچھیرنا بند کر دیا اور میری طرف ساٹ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ”تم ہمیں چڑا ل جانے والی بس تک پہنچا سکتے ہو؟“ میں نے کہا تو اس نے کوئی جواب دینے کی بجائے یک طرف اشارہ کر دیا۔ میں نے میکا کی انداز میں اپنی گردن اشارے کی سمت موڑ دی تو مجھے ایک اور خچر ان نظر آیا جو اپنے خچر کی لگام درست کرتے ہوئے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نگینہ کو لے کر اس کی طرف ڈھ گیا۔

”عجب خشک مزاج لوگ ہیں یہاں کے۔“ نگینہ نے بڑبڑاتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”ہاں..... لیکن میرا خیال ہے، ان کا مزاج ہی ایسا ہے۔“ میں نے کہا۔ وہ خچر بان مجھے ضرورت مند لگا۔ میں نے اس سے وہی سوال کیا تو وہ بولا۔ ”پانچ سو روپے لوں گا۔“ میرے پچاس ہزار روپوں میں سے تیس ہزار کے لگ بھگ ختم ہو چکے تھے۔ باقی پندرہ تیس ہزار کے قریب لمبی تھی جو میں نے کیلاش والی جھونپڑی سے روانہ ہوتے وقت اپنی شلوار کے نیچے میں اڑس لی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ خوش ہو گیا۔ میں اور نگینہ اس پر سوار ہو گئے۔ خچر بان نے ایک چوبی تختے پر کھٹے ہی لگا میں سنبھالیں اور اپنے خچر کو رخ ٹھادیا۔ خچر گاڑی نے چوں چک، چوں چک کی آواز کے ساتھ ریٹکنا شروع کر دیا۔

”کتی دور جانا پڑے گا بابا ہمیں؟“ میں نے خچر بان سے پوچھا۔

”صرف پندرہ کلومیٹر۔“ وہ بولا تو میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”کیا کیلاش وادی کی طرف سے چلو گے؟“

میری بات پر اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا وہاں تمہیں کوئی کام ہے؟“ ”نہیں..... ایسے ہی میں نے پوچھ لیا تھا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ کیلاش وادی سے ہو کر نہ گزرے۔ کیونکہ مجھے وہاں اس مردود عامل عاروب کے خونخوار پیر و کاروں سے مڈبھڑکا خدشہ تھا۔ تاہم خچر بان بولا۔

”وہاں سے اگر ہم چلیں گے تو پورے پچاس کلومیٹر کا راستہ طے کرنا پڑے گا۔ میں اس وادی سے ہٹ کر چلوں گا تاکہ راستہ قریب پڑے۔“

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے بابا! یہی بہتر رہے گا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ پھر چند ثانیے بعد اس سے یونہی پوچھا۔ ”ویسے بابا! یہ کیوں سا علاقہ ہے؟ کیا یہ کیلاش وادی کا علاقہ نہیں ہے؟“

”ہاں، یہ کیلاش وادی کا ہی علاقہ ہے۔ مگر نورستان کی سرحد کے قریب ہے اور کیلاش وادی سے دور۔“ ”نورستان؟“ میں استفسار یہ انداز میں بڑبڑایا۔

”ہاں..... نورستان۔ درحقیقت یہ افغانستان کا ایک سرحدی علاقہ ہے۔“ اس نے مختصر آیتایا۔ ”اچھا.....“ میں نے ہولے سے کہا۔

سفر جاری رہا۔ تنگ برقی گھاٹیوں، گہری کھائیوں اور گھٹک دروں سے گزرتے، راستہ پائنتے ہوئے، بھول اس بوڑھے کے ہم ریسور کے قریب قریب سے ہوتے ہوئے اس اڈے تک جا پہنچے۔ یہاں مقامی لوگوں کی خاصی چہل پہل نظر آتی تھی۔ میں اور نگینہ نیچے اتر آئے۔

اس ساٹ اور تختہ دار جیسی خچر گاڑی میں ہمارے جسم کی چولیس تک مل کر رہ گئی تھیں۔ ہم نیچے اتر آئے۔ میں نے پانچ سو کا نوٹ خچر بان کو دے کر اسے فارغ کیا۔ پھر سب سے پہلے ہم نے ایک چھپر ہوٹل میں

جب خاصی دور نکل آئے تو نگینہ نے بے اختیار جیسے اپنے سینے میں اٹکی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”شکر ہے..... میں تو ڈر رہی تھی۔“

”ہاں..... یہ بات ڈرنے کی تھی مگر خوف زدہ ہونے کی نہیں۔“ میں نے کہا۔

”اچھا، اب یہ عجیب اور قلفیانہ گفتگو چھوڑو اور آگے کی سوچو..... آخر کدھر جا رہے ہیں ہم؟“ وہ بولی تو میں نے اپنے چہرہ اطراف نظریں دوڑائیں۔ مجھے برف زار کے سوا کچھ نظر نہ آیا تاہم میں نے نگینہ کو تسلی دینے کی غرض سے کہا۔

”کہیں نہ کہیں آبادی نظر آتی جائے گی۔ وہاں کسی سے چڑا ل کا راستہ پوچھ کر آگے نکل جائیں گے۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ ایک اپنی مستانی چال سے چلا جا رہا تھا۔ ہم نے ایک درے کو پار کیا تو

”اورے، رے..... رے“ کی آواز گونجی۔ یہ کسی جانور کو ”بشکارا“ دینے کی آواز دی۔ یہی سبب تھا کہ پاک چلتے چلتے رک گیا۔ میں نے ہشکارے والی آواز کی سمت دیکھا، وہ ایک نو عمر لڑکا تھا۔ اس نے سمور پہن رکھا تھا۔ پاک نے اپنے حلق سے خرخر کی آواز نکالی اور نو عمر لڑکے کی طرف دوڑ پڑا۔ لڑکے کے قریب پہنچ کر پاک رک گیا۔ لڑکے کی رنگت سرخ و سپید تھی اور وہ حیران حیران اور اپنی موٹی کالی آنکھوں سے ہماری طرف نکلے جا رہا تھا۔ میں پاک کی پشت سے اتر اور پھر اس لڑکے کی طرف بڑھا۔ لڑکے کے چہرے پر اب حیرانی کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔ وہ نگینہ کی طرف دیکھ کر تیز لہجے میں بولا۔

”اُترو نیچے..... اُترو میرے پلٹر وکی کمر سے۔“

میں سمجھ گیا کہ اس کا یہ ”پلٹر و“ پاک پالتو تھا۔ میں نے نگینہ کو نیچے اترنے کا کہا۔ وہ خاموشی سے نیچے اتر گئی۔ لڑکا آگے بڑھ کر اپنے ”پلٹر و“ کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ میں نے لڑکے کے ذرا ترس

ہو کر پیار سے مسکراتے ہوئے پہلے معذرت کی، پھر پوچھا۔

”تمہارا یہ پلٹر و بہت اچھا ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔ جیسے اس نے ہماری مدد کی ہے، یقیناً تم بھی ہمارا مدد کرو گے۔“

لڑکا اپنی اور اپنے ”پلٹر و“ کی تعریف پر خاموش ہو گیا اور بولا۔ ”تم کون ہو؟“

”بیٹا! ہم مسافر ہیں۔ راستہ بھول کر ادھر نکل آئے ہیں۔ چڑا ل جانا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہماری مدد کر سکتے ہو؟“ میری بات پر وہ چند ثانیے کچھ سوچتا رہنے کے بعد بولا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“

میں اور نگینہ اس کے ساتھ چل پڑے۔ وہ تو خود اپنے ”پلٹر و“ پر سوار ہو گیا اور ہم دونوں پیدل اس کے عقب میں چل پڑے۔ جانے وہ ہمیں کہاں لے جا رہا تھا؟ لیکن ذرا ہی دیر بعد وہ ہمیں ایک ڈھلانی آبادی میں لے آیا۔ یہاں گوبے اور مڑھیوں کی طرز کے خروٹی چھپر نما جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ وہاں ہم عورتیں، بچے اور بوڑھے مرد دکھائی دیئے جنہوں نے فقط سمور پہن رکھے تھے۔

میرا خیال تھا کہ وہ پہلے ہمیں اپنے کسی جھونپڑے میں لے جائے گا اور ہماری خاطر مدارات کرے گا لیکن وہ ہمیں آبادی کے بچوں سے نکال لے گیا..... آگے چند فرلانگ کے بعد خچر گاڑیاں کھڑی





ہی ہنڈی پہنچے، پولیس ہمارے استقبال کے لئے پہلے ہی سے موجود تھی۔ ان میں انسپٹر اعجاز شمس کو دیکھ کر ری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ مجھے فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ نگینہ نے جلا جلا کر میری بے گناہی کا ن دیا مگر مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ شاہ میرے اسے ٹیلی فون کے ذریعے اپنی بیٹی نگینہ کے بیان سے متعلق گاہ کرتے ہوئے بریف کر دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ انسپٹر اعجاز شمس نے بڑی مکاری کے ساتھ میری گرفتاری کا وجہ کو نگینہ کے اغواء سے متعلق نہیں کیا تھا بلکہ ”نقص امن“ کا جواز بنایا تھا۔ میں نے اس ”نقص امن“ لے اشارے سے ہی یہ اندازہ لگایا تھا کہ یقیناً شاہ میرے ہی اس بنیاد پر زور دیتے ہوئے انسپٹر اعجاز شمس کو یہ راہ بھائی ہوگی۔ بہر طور میں نے نگینہ کو تسلی دی اور پھر پولیس جپ میں سوار ہو گیا۔

\*\*\*

مجھے ایک بار پھر سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔ انسپٹر اعجاز شمس سے میرا پہلے بھی سامنا ہو چکا تھا۔ وہ بہت کمینہ اور بغض رکھنے والا شخص تھا اور میرے لاف ہر قسم کے اوجھے جھکنڈے استعمال کرنے کی جستجو میں لگا رہتا تھا۔ اس نے اس سے پہلے مجھ پر کئی لمین جراثیم عائد کئے تھے، جو بعد میں جھوٹے ثابت ہوئے تھے۔ مگر اس بار ایسا کوئی سنگین جرم اس کے ہاتھ نہ آیا تھا البتہ نقص امن کے سلسلے میں مجھے تھوڑی بہت تشویش تھی۔ میں نے نگینہ کے ”اغواء“ سے لے کر اب تک کے پیش آمدہ حالات پر باریک بینی سے غور کرنا شروع کیا کہ اپنا دفاع کرسکوں۔

نگینہ کو اغواء کرنے کی نیت سے میں نے پہلا قدم جو اٹھایا تھا، وہ یہ تھا کہ اس رات چوری چھپے شاہ میری ٹوٹی میں داخل ہوا تھا جہاں دو گارڈ متعین تھے۔ انہیں اس سے پہلے میں چابک دستی کے ساتھ بے ہوش کر چکا تھا۔ وہاں میں نے کوئی ثبوت چھوڑا تھا اور نہ ہی مجھے سلاخ گارڈز نے دیکھا تھا۔ رہی بات نگینہ کو زبردستی وہاں سے ٹیکسی میں نکال لے جانے کی، اس دوران انسپٹر اعجاز شمس نے پولیس گاڑی میں میرا تعاقب کیا تھا اور اس سے ذرا مارا ماری بھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انسپٹر اعجاز شمس اس بات کو جواز بنا کر میرے خلاف کوئی قانونی کارروائی عمل میں لاسکتا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا، اس کے باوجود انسپٹر اعجاز شمس میرا کچھ نہیں بڑھا سکتا تھا کیونکہ اب یہ معاملہ ”میاں بیوی راضی.....“ والا بن چکا تھا۔ میں نے بس اہم مقصد کی خاطر اس خطرناک مہم کا آغاز کیا تھا اس کا انجام کامیابی پر ہی منبج ہوا تھا۔ دیکھنا اب یہ تھا کہ انسپٹر اعجاز شمس جیسا بدطینت آدمی اس وقت میرے خلاف کس نوعیت کا جال بن سکتا تھا۔ نگینہ کو یقیناً اس کے اپ شاہ میر کے ہاں روانہ کر دیا گیا ہوگا۔

ذرا دیر بعد مجھے انسپٹر اعجاز شمس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

وہ کرسی پر بیٹھا معاندانہ نظروں سے میری طرف گھورے جا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ اٹھا اور میرے قریب آ کر دانت پیستے ہوئے بولا۔ ”نادر! تم نے جس چالاکی اور عیاری سے نگینہ کو دغا لایا ہے، وہ قابل داد ہے اور یقیناً تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گے کہ اب قانون تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن نادر! یہ خوش فہمی اپنے ذہن سے نکال پھینکو۔“

وہ خاموش ہوا، پھر ہلٹ کر چند قدم پیچھے مڑا اور دوبارہ میری طرف گھوما۔ ”ہو سکتا ہے نگینہ کے اغواء والا معاملہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ لیکن میں تم پر غور سے کو پولیس کی حراست سے فرار کروانے کا جرم ثابت کرسکتا ہوں۔“

میں جواب تک انسپٹر اعجاز شمس کی بے بسی پر اندر ہی اندر حط اٹھا رہا تھا، غور سے کی پولیس حراست سے

”بالکل انسپٹر صاحب!“ نگینہ نے بلا تردد کہا۔ ”ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ میرے بچا کو نادر علی سے جانے کیا پر خاش ہے، یہ ان کے خلاف سازشیں اور.....“

”نگینہ!“ میں نے جواب تک دانستہ خاموشی اختیار کر کے ہوئے تھا، اچانک نگینہ کی بات کاٹ کر اس سے کہا۔ ”پلیز نگینہ! میرا مشورہ تمہیں یہی ہے کہ تم ابھی اپنے بچا کے ساتھ چلی جاؤ۔“

نگینہ نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر جیسے میری بات کا مطلب سمجھ کر وہ جپ ہو رہی۔ انسپٹر عارف علی بخش ایک سمجھ دار اور فرض شناس پولیس آفیسر تھا۔ وہ ایک لمحے میں اصل معاملہ بلکہ ”معاملہ دل“ کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ وہ شاہ میر کو مخاطب کر کے مشورہ دینے والے انداز میں بولا۔

”شاہ میر صاحب! میں سروسدست اتنا کر سکتا ہوں کہ ہنڈی پولیس انتظامیہ کو مطلع کر کے یہ معاملہ دوبارہ انہی کے سپرد کردوں۔ ہمارا کام ختم ہوا۔ آپ لوگ وہیں مقیم ہیں۔“

اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اور نادر میاں! مجھے امید ہے تم وہاں بھی قانون سے پورا تعاون کرو گے۔ کیونکہ وہاں تمہاری وجہ سے نقص امن کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ تم مزید کوئی غیر قانونی حرکت کر کے اپنے جرم کو زیادہ سنگین بنانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ اسے تم نہ صرف میری صیحت سمجھو بلکہ ایک نہایت مخلصانہ مشورہ بھی۔“

”تھینک یو انسپٹر صاحب!..... آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”مگڈ!“ شاہ میر جو کرسی پر بیٹھا بری طرح تلملا رہا تھا، بے چینی کے ساتھ پہلو بدلتے ہوئے انسپٹر سے بولا۔ ”آپ کمال کرتے ہیں۔ اس نے میری بیٹی کو دغا لایا اور آپ اسے گرفتار کرنے کی بجائے اپنے مخلصانہ مشورے سے نواز رہے ہیں؟“

انسپٹر عارف علی بخش نے سنجیدہ نظروں سے شاہ میر کو گھورا اور بولا۔ ”شاہ میر صاحب! آپ نے اپنی بیٹی نگینہ کا بیان سن لیا ہے۔ میں آپ کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ آپ نے نادر کے خلاف جو بھی قانونی کارروائی کرنی ہے، وہ اپنے علاقے کے متعلقہ تھانے اور عدالت میں ہی کریں۔ یہی آپ کے لئے مناسب بھی ہوگا۔“

”ٹھیک ہے..... میں دیکھ لوں گا اسے بھی۔“ اس کی بات پر شاہ میر نے میری طرف گھورتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلو نگینہ بیٹی!“

”چلا! آپ جائیں۔ میں نادر کے ساتھ ابھی ساڑھے آٹھ بجے کی فلائٹ سے اسلام آباد پہنچ رہی ہوں۔ ہماری ٹیمیں کفرم ہو چکی ہیں۔“

”خوب بیٹا!..... تم نے اپنے باپ کے دشمن کے سامنے میری خوب عزت کی۔ لیکن بیٹا! میں بھی تمہارا باپ ہوں اور تم میری لخت جگر۔ تم مجھے پھر بھی قبول ہو۔ میں تمہارا گھر پر انتظار کروں گا۔“ جواباً شاہ میر نے اپنے لہجے میں پدرانہ رقت سوتے ہوئے کہا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اور نگینہ نے انسپٹر عارف علی بخش کا شکریہ ادا کیا اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں اور نگینہ تھانے کی عمارت سے باہر آ گئے۔ میں آج پہلی بار خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ آج میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ نگینہ بھی خود کو کافی فریٹش محسوس کر رہی تھی۔

مقررہ وقت پر ہم ایئر پورٹ پہنچے اور مطلوبہ فلائٹ کے ذریعے اسلام آباد پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے دس بجے کا عمل تھا۔ میں اور نگینہ اسلام آباد ایئر پورٹ پر اترے اور پھر وہاں سے ایک مسافر وین کے ذریعے

”زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرنا داری علی خان!“ میری بات پر وہ کھول کر رہ گیا تھا۔ درحقیقت وہ بے بس تھا اور کھسیانی لمبی کی طرح کھبانو پننے کی کوشش کر رہا تھا۔ غالباً اسے مجھ پر کوئی قانونی شق لگانے کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔ یہ سب گنیز کے میرے حق میں بیان دینے کی وجہ سے ہوا تھا اور گنیز کا میرے حق میں اچانک بیان دینا انسپکٹر اعجاز محسن کے لئے ہی نہیں بلکہ گنیز کے باپ شاہ میر کے لئے بھی غیر متوقع تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے گنیز مجھے پچپانے تک سے قاصر تھی۔ اب دونوں کو (شاہ میر اور انسپکٹر اعجاز محسن کو) کیا معلوم تھا کہ میں نے کس طرح اپنی جان جو حکم میں ڈال کر ایک پرخطر اور دشوار گزار مہم جونی کے بعد گنیز کی یادداشت اپنے حق میں لوٹانے میں کامیاب ہوا تھا۔

گنیز نے بعد میں میری ماں کو اس تازہ صورت حال سے مطلع کر دیا تھا اور میری ماں نے فوراً ایڈووکیٹ حامد صدیقی اور اعظم خان کو اطلاع دی۔ وہ تینوں پنڈی کے اس تھانے آ گئے۔ یوں میری گلو خلاصی ہوئی۔ ایڈووکیٹ حامد صدیقی نے تو اپنی راہ لی جبکہ میں، ماں اور اعظم خان کے ساتھ واپس مری گرین لاج آ گیا۔ ماں کے چہرے پر عجیب سی گھبراہٹ تھی۔ وہ مجھ سے ناراض لگ رہی تھیں۔ تاہم اب میرے پاس ماں کو قائل کرنے کا جواز موجود تھا۔ لیکن اعظم خان صاحب کی موجودگی میں ماں نے گنیز سے متعلق بحث نہیں چھیڑی تھی۔ سردست ہماری گفتگو کا روئے سخن غفور کے کاپولیس کی حراست سے فرار تھا۔ ”خان صاحب! غفور کے کاپولیس کی حراست سے فرار ہونا ہمارے حق میں اچھا ہی ہوا۔ ورنہ تو میری نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ کیونکہ یہی وہ واحد شخص تھا جو میرے ازلی دشمنوں شاہ میر اور نظر حیات کی میرے خلاف سازش کے ثبوت کی آخری کیل ثابت ہو سکتا تھا۔ ماں نے کسی قدر خوش ہو کر اعظم خان سے کہا تو وہ ہولے سے کھٹکھار کر معنی خیز مسکراہٹ سے پہلو بدلتے ہوئے بولے۔

”ہاں..... اگر میں ایسا نہ کرتا تو یقیناً میں اور آپ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتے۔“  
”میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ شرارت آپ ہی کی ہوگی۔“ ماں نے تفاخر آمیز مسکراہٹ سے کہا تو میں نے بھی پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے اعظم خان سے کہا۔  
”لیکن انگل! اس کے باوجود غفور کے کیلوار خطرے کی صورت میں ہمارے سر پر لٹکی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے اسے آپ کسی طرح دور بھیج دیں یا پھر اس کی موت کا ڈرامہ رچانے کے بعد اسے کسی اور ملک کی طرف ہمیشہ کے لئے نکال دیں۔“

”نار! تمہیں غفور کے کیلوار خطرہ ہے، اس سے زیادہ مجھے گنیز سے ہے۔“ دفعۃً ماں نے میری طرف دیکھ کر قدرے تلخ لہجے میں کہا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولیں۔  
”دشمن کا یہ نیا اور اوجھا بھٹکانا غفور سے زیادہ ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ غفور کے کو تو ہم ٹھکانے بھی لگا سکتے ہیں..... مگر گنیز.....“

”ماں! گنیز بھلا ہمارے لئے کیا خطرہ بن سکتی ہے؟“ ماں نے جب یہ موضوع چھیڑ ہی دیا تھا تو میں بھی پیچھے ہٹنے والا نہ تھا۔ میں مزید بھی ماں سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ماں نے اچانک درمیان میں یہ کہہ کر مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا کہ اس موضوع پر بعد میں گفتگو ہوگی۔ چنانچہ وہ ایک بار پھر اپنا روئے سخن غفور کے کی طرف موڑتے ہوئے خان صاحب سے بولیں۔

”خان صاحب! غفور کے موضوع پر پھر بھی بات نہیں ہوگی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ بات آؤٹ نہ ہو جائے۔ کیونکہ دشمن بڑے خوب صورت طریقے سے گرین لاج کی دیواروں میں نقب لگا چکا ہے۔“

فرار پر بری طرح چونک اٹھا۔ غفور اصدف مرڈر کیس اور ملک سردار خان مرڈر کیس کا ایک اہم مطلوب یہ شخص تھا۔ غفور کے ذکر پر کچھ عرصہ پہلے کا وہ اندہناک منظر میری چشم تصور میں کسی ”ری وائسڈ“ کی ہونی فلم کی طرح لیے ہوا۔ اس رات جب میں گنیز کے مغالطے میں ملک سردار خان کو اس شک پر کہ اس نے ہی گنیز کو اغواء کیا تھا، اسے گن پوائنٹ پر لے کر مری کے دور افتادہ ویران کالج تک پہنچا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ مغویہ گنیز نہیں بلکہ اصدف تھی جسے ملک سردار خان کے ایماء پر اس غفور نے نامی شخص نے گلا گھونٹ کر قتل کر دیا تھا۔ میں نے مغلوب الغضب ہو کر ملک سردار خان کی پیشانی پر گولی پوسٹ کر دی تھی۔ مجھے قتل کرتے ہوئے غفور نے دیکھا تھا جو بعد میں راہ فرار اختیار کر گیا تھا۔

پولیس غفور کے کی تلاش میں سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ کیونکہ ان کے خیال میں غفور ہی وہ واحد شخص تھا جس کی گرفتاری کے بعد اس دہرے قتل کی واردات کا قفیہ منٹ سکتا تھا۔

بالآخر پولیس نے اسے کچھ روز قتل تلاش کر کے گرفتار بھی کر لیا تھا۔ بہر حال ہم تینوں یعنی میرے، ماں اور اعظم خان کے حق میں اچھا نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ غفور، اعظم خان کا ہی آدمی تھا جو بعد میں جانے کیوں اس سے متفر ہو گیا تھا۔ یہ خبر مجھے ہمارے ایڈووکیٹ حامد صدیقی صاحب نے دی تھی اور ہم بری طرح پریشان ہو گئے تھے۔

لیکن آج..... اور ابھی یہاں انسپکٹر اعجاز محسن کی زبانی یہ سن کر کہ غفور پولیس کی حراست سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا اور یہ قول اس کے اس میں میرا ہی ہاتھ تھا، اس بات سے قطع نظر مجھے غفور کے فرار نے ایک ایک گونہ سرت اور دلی سکون بخشا تھا۔

”کیا سوچنے لگے نار!..... کہ مجھے اس کا کیوں کر علم ہوا؟“ میری طول پکڑتی پڑ سوچ خاموشی کو جانے کس بات پر محمول کر کے انسپکٹر اعجاز محسن نے احساسِ تفاخر سے اکڑ کر کہا تو میں نے کسی خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

”انسپکٹر! غفور اکب فرار ہوا تھا؟“  
”یہ سوال کر کے تم کیا مجھ پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ میں یہ سمجھ لوں گا، تم نے اس کا فرار نہیں کروایا؟“ وہ زہر خند مسکراہٹ سے بولا تو میں نے کہا۔

”حقیقت یہی ہے کہ میں نے غفور کو فرار نہیں کروایا بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اسے گرفتار کرنے کے بعد کہاں رکھا گیا تھا؟..... اور دوسری بات یہ کہ میں پچھلے کئی روز سے پنڈی یا مری میں تھا ہی نہیں۔“

”اوہ..... تو اب تم مجھ سے یہ چالاکی چلو گے۔ تمہارے پاس اپنی غیر موجودگی کا کوئی ثبوت بھی ہے؟“ وہ زہریلے لہجے میں بولا تو میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ترکی بتر کی کہا۔  
”میں تو ثبوت پیش کر دوں گا انسپکٹر! مگر تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں نے ہی غفور کے کاپولیس کی حراست سے فرار کروایا؟“

میری اس جچی تلی جوابی کارروائی پر انسپکٹر اعجاز محسن کے چہرے پر جوش غلیظ کی تندہر ابھری مگر وہ اسے گویا اپنے دانتوں تلے پس کر بولا۔ ”غفور بذاتِ خود ثبوت ہے، تمہارے اور تمہاری ماں کے گھناؤنے جرائم کا۔“ مجھے صاف محسوس ہو گیا کہ وہ میرے سوال پر آئیں بائیں شائیں کر گیا تھا۔

بہر طور میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔ ”تو ٹھیک ہے پھر..... غفور کے کو آپ ڈھونڈ کر میرے خلاف ثبوت کے طور پر پیش کر دیں۔“

آخری جملہ ماں نے میری طرف طنز یہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ میں بھی سمجھ گیا تھا، ماں کا اتنا ہنگینہ کی طرف تھا۔ ماں کے دل میں اب یہی غلط فہمی بیٹھی ہوئی تھی کہ شاہ میر اور نظر حیات کی ملی بھگت سے ہنگینہ کو دانستہ ایک ”خوب صورت“ ہتھیار کے طور پر ہمارے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا۔ جبکہ یہ بات سرے سے غلط تھی۔ لیکن میرے دعوے کا ماں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر اعظم خان ماں کی بات کا ”اشارہ“ سمجھتے ہوئے غمخواری سے متعلق مزید کوئی بحث کئے بغیر اٹھ کر چلے گئے تو ماں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں ماں کو اٹھتا دیکھ کر بے چین سا ہو گیا اور بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔ ”ماں! میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ابھی تم آرام کرو اور ٹال کے معاملات سنبھالو، تاکہ میں دوسری طرف بھی یکسوئی سے توجہ دے سکوں۔“ ماں نے ذرا رک کر میری طرف دیکھے بغیر سپاٹ، سر دلچے میں کہا اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ماں کی اس مسلسل سرد مزاجی نے میرا دل بری طرح مسوس کر رکھ دیا تھا۔ پھر جب میں بھی آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے کی طرف اٹھ کر جانے لگا کہ اچانک قریب دھڑے ٹیلی فون کی ٹھنٹی بجی۔ میں نے آگے بڑھ کر ریسور سے کان لگایا اور پہلو کہا۔

”نادر! تمہیں رہائی مل گئی..... شکر ہے خدا کا۔“ دوسری جانب سے ہنگینہ کی پُرسرت آواز ابھری۔

ہنگینہ کی مترنم آواز پر میرا دل یکبارگی دھڑکا اور پھر میں نے کہا۔

”ہنگینہ! کیا تم نے میری گرفتاری سے متعلق ماں کو مطلع کیا تھا؟“

”ظاہر ہے..... اور کسے انفارم کرنی میں؟“ ہنگینہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”تم سے ماں نے اور کوئی بات کی تھی؟“ ایک اچانک خیال کے تحت میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ انہوں نے بس مجھ سے شہریہ ہی کہا تھا اور فون رکھ دیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”نادر! ایک بات تو

بتاؤ۔“ دفعۃً ہنگینہ نے دوبارہ کہا۔

”ہاں..... کہو۔“

”آپنی کالچہ جانے کیوں مجھ سے بات کرتے وقت بہت اُکھڑا اُکھڑا سا تھا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ وہ

مجھ سے لمبی چوڑی اور پیار بھری باتیں کریں گی۔“

اس کی بات پر میں نے ایک گہری ہرکاری خارج کی اور بولا۔ ”شاید وہ میری وجہ سے بہت پریشان ہوں

گی۔ اس لئے فون بند کر کے انہوں نے مجھے تھانے سے رہائی دلانے کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی۔“

میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے میری اور ماں کے درمیان کچھ عرصے

سے ہونے والی سرد جنگ کے متعلق بتاؤں۔ وہ بے چاری دُکھی ہو سکتی تھی۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ میری

ماں کے دل میں اس کے لئے کیا جذبات تھے۔ میں نے اسے عامل عاروب کے شکنجے سے تو چھڑا دیا تھا مگر

اب اپنی ماں کو قاتل کرنا مجھے قطعاً ناممکن لگ رہا تھا۔ میری قریب آتی منزل ایک مرتبہ پھر دور ہو رہی تھی۔

